اُردو اکادمی، دہلی کا ماہانہ رسالہ

ایوانِ اُردو

دہلی

فہرست

اشاعتِ ثانی

جلد: ۲، شمارہ: ۸

اس شمارے کی قیمت
دس روپے

ادارۂ تحریر
سیّد شریف الحسن نقوی، مخمور سعیدی

فون نمبر: ۲۷۶۲۱۱، ۲۶۳۴۴۸

سرورق اور تزئین: ارشد علی خاں

خوشنویس: تنویر احمد

مولانا آزاد کی آخری یادگار تقریر

۱۵ فروری ۱۹۵۸ء کو اردو کانفرنس، منعقدہ پریڈ گراؤنڈ دہلی میں مولانا آزاد نے یہ آخری تقریر کی تھی۔ ٹھیک ایک ہفتے کے بعد ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وہ ہمیشہ کے لیے ہم سے رخصت ہو گئے۔

جنابِ صدر اور دوستو!

جہاں تک مجھے اندازہ ہوا ہے۔ آج آپ نے یہ مجلس اس لیے منعقد کی ہے کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی زندگی میں اُردو کی جو واقعی جگہ ہے، وہ ملنی چاہیے۔ یہ نہیں کہ کسی زبان کی جگہ خالی کی جائے، اور وہ اسے دی جائے۔ آپ اُردو کے حامی ہیں لیکن کسی زبان کے مخالف نہیں۔ جیسا کہ ابھی میرے دوست پنڈت جی (پنڈت سُندر لال) نے کہا — یہاں ایک شخص بھی ایسا نہیں جو ہندی کا مخالف ہو۔ یہی صحیح اسپرٹ ہے اور اسی اسپرٹ سے حل کا راستہ صاف ہوتا ہے۔ تیس یا چالیس سال پہلے زبان کے بارے میں یہ جھگڑا تھا، کہ ملک کی زبان کیا ہو۔ جو لوگ اُردو کے حامی تھے وہ چاہتے تھے کہ اُردو ملک کی زبان ہو، اور جو ہندی کے حامی تھے، اُن کی خواہش تھی کہ ہندی ہو۔ یہ معاملہ اس وقت گہرائی تک پہنچ گیا تھا۔ کیوں کہ دونوں زبانیں ایک دوسرے کی رقیب بن کر کھڑی ہو گئی تھیں۔ اُردو والے کہتے تھے کہ اگر ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کیا گیا تو اُردو ختم ہو جائے گی۔ اور ہندی والے کہتے تھے کہ اگر اُردو کو ملک کی زبان مان لیا گیا تو ہندی ختم ہو جائے گی۔ ہم ہر وقت اس نگاہ سے اس سوال کو دیکھتے تھے اور اسی کے عادی ہو گئے تھے۔ چنانچہ جب یہ سوال سامنے آتا تو اسی ترازو میں تولا جاتا۔ اسی حالت میں ملک آزاد ہوا۔ وقت آیا۔ دستور بنا۔ اسمبلی میں کافی بحث ہوئی۔ اور اکثریت کے ساتھ ہندی کو ملک کی زبان تسلیم کر لیا گیا۔ جس کے نتیجے میں اُردو کی حیثیت میں ایک بنیادی انقلاب آ گیا۔ اور اُردو کی بات ایک رقیب کی حیثیت سے کم تر ہو گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا جو آئین کا وفادار ہے، فرض ہے کہ اسے مانے۔ وہ اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اُردو کی کیا جگہ ہے۔ اس کی وہی حیثیت ہے جو دوسری زبانوں کی ہے۔ بہت سے لوگ اب بھی رقیب کی حیثیت سے دیکھنے لگے ہیں۔ حالاں کہ اب یہ بات نہیں ہے۔ اب یہ سوال تو اٹھتا ہی نہیں کہ پورے ملک کی زبان کون سی ہوگی۔ ہندی کو جو جگہ ملنی چاہیے، وہ اُسے مل گئی۔ اب ہر ہندوستانی کا خاص فرض ہے کہ اس کے آگے سر جھکائے، لیکن اسی کے ساتھ اُردو کی جو جگہ ہے، وہ اسے ملنی چاہیے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو کثرت کے ساتھ بولی جاتی ہے۔ نہ صرف شمال میں بلکہ جنوب میں بھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد، تلنگانہ کے علاقے میں اُردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اُردو بولتے ہیں۔ اسی آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یو پی، بہار، دلّی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں کے لاکھوں اور ہزاروں آدمی اُردو بولتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ کانفرنس جس مقصد کے لیے بلائی گئی ہے، اس میں اسے کامیابی ہوگی، اور جب کہ وزیرِ اعظم نے اس کانفرنس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً یہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔

——— ابوالکلام آزاد

حرفِ آغاز

ابوالکلام آزاد نمبر پیشِ خدمت ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مولانا آزاد اس صدی کی ان عظیم شخصیتوں میں سے ایک تھے جن کے نام سے یہ صدی پہچانی جائے گی۔ اس دور کی کوئی ادبی، علمی اور سیاسی تاریخ ایسی نہیں لکھی جا سکتی جس کے اوراق مولانا آزاد کے گوناگوں کارناموں کے ذکر سے خالی رکھے جا سکیں۔ ایسی عظیم شخصیت کی سیرت و سوانح اور افکار و اعمال کی مختلف جہات کا احاطہ چند سو صفحات میں ممکن نہیں پھر بھی ہم نے کوشش کی ہے کہ یہ صفحات مولانا آزاد کی ذات و صفات کا مفصّل نہیں تو ایک مجمل خاکہ ہمارے قارئین کے سامنے ضرور لے آئیں۔ اس کوشش میں اگر ہمیں کچھ کامیابی ہوئی ہے تو اس کے لیے ہم ان حضرات کے ممنونِ منّت ہیں جنھوں نے ہماری درخواست پر مضامین لکھے اور مولانا کے بارے میں ایسا معلوماتی مواد بہم پہنچایا جو اس سے پہلے [illegible] میں تھا یا جزوی طور پر ہی سامنے آ سکا تھا۔

نمبر کو ہم نے [illegible] حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں وہ مضامین شامل کیے گئے ہیں جو مولانا کی نجی زندگی کے ساتھ ساتھ ان کی پبلک لائف کے بعض اہم [illegible] روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے مہد سے لحد تک مولانا کے شب و روز کا ایک واضح خاکہ ذہن میں مرتب [illegible] مطالعے سے بھی خاطر خواہ آگاہی ہو جاتی ہے۔ دوسرے حصے میں وہ مضامین درج کیے گئے ہیں جو احوال و آثار کے ساتھ [illegible] بھی بحث کرتے ہیں اور علم و ادب اور مذہب و سیاست کے شعبوں میں ان کی فکری اور عملی فتوحات کو سامنے [illegible] مولانا کی چند منتخب تحریریں پیش کی گئی ہیں جو ان کی فکر اور ان کے ذہن و ذوق کی مکمل طور پر آئینہ دار ہیں۔

[illegible] ہیں وہ ہمیں جناب گلمر رشون کی عنایت سے حاصل ہوئی ہیں جو مولانا آزاد کے قائم کردہ ادارے آئی سی سی آر [illegible] ہے۔ مضمون "مولانا آزاد کی انتظامی صلاحیتیں" کے ساتھ آئی سی سی آر کی دفتری فائلوں پر مولانا کے احکامات کا عکس [illegible] موصوف ہی نے مرحمت کیا ہے۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ مولانا کے قلم کی کچھ اور تحریریں بھی ہمیں 'ایوانِ اردو' کے آئندہ [illegible] گے۔ ہم ان کے تہہ دل سے ممنون ہیں۔

"[illegible]" کے وہ [illegible] حصے جو اس کتاب کے پہلے ایڈیشن میں شامل نہیں تھے اور مولانا کی وصیت کے مطابق ان کی وفات کے تیس برس بعد [illegible] عام پر آئے ہیں، ان دنوں عام بحث کا موضوع بنے ہوئے ہیں۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ ان کا ایک تعارفی تجزیہ بھی اس نمبر میں شامل کر لیا جائے۔ جناب پروانہ ردولوی نے ہماری درخواست پر بہت ہی کم وقت میں یہ محنت طلب کام انجام دیا ہم ان کا بھی دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ یہ مضمون اور مولانا آزاد کی شریکِ حیات زلیخا بیگم کی ڈائری کا عکس جو ہمیں خواجہ منیر احمد صاحب کی طرف سے اس وقت حاصل ہوا جب کاپیاں پریس جا رہی تھیں، آخری صفحات میں "انتظاریہ" کے زیرِ عنوان دیے گئے ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ مولانا آزاد صدی تقریبات کے سلسلے میں ہماری یہ حقیر پیشکش آپ کو پسند آئے گی۔

——— سید شریف الحسن نقوی

مولانا ابوالکلام آزاد نمبر



نقشِ صفات:

آئینۂ ذات وصفات:

انتظاریہ:

سید شریف الحسن نقوی (ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر) نے شمر آفسیٹ پریس دہلی ۱۱۰۰۰۶ سے چھپوا کر دفتر اردو اکادمی نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲ سے شائع کیا۔

उपराज्यपाल
दिल्ली
LIEUTENANT GOVERNOR
DELHI

सत्यमेव जयते

राज निवास
दिल्ली-११००५४
RAJ NIWAS
DELHI-110054

MESSAGE

I am glad to know that Urdu Academy is bringing out a Special Number of its monthly magazine "Aiwan-e-Urdu Delhi" on Maulana Abul Kalam Azad to coincide with his centenary celebrations. Maulana Abdul Kalam Azad as a scholar, writer, thinker and as a guide par excellence for the Indian people strove with exceptional courage and conviction for national integration. He was an avowed enemy of narrow mindedness and was truly an embodiment of communal harmony. He was an inspiring fountain for millions of people to join the freedom struggle of the country.

I send my good wishes to the Academy for bringing out a special number of its monthly magazine.

(ROMESH BHANDARI)

उप - राष्ट्रपति, भारत
नई दिल्ली
VICE-PRESIDENT
INDIA
NEW DELHI

8 نومبر 1988

سندیش

مجھے یہ جان کر مسرت ہوئی کہ اُردو اکادمی دلّی مولانا ابوالکلام آزاد پر ایوانِ اُردو دلّی میگزین کا خصوصی نمبر شائع کرنے جا رہی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا خاکہ صحافی ماہرِ تعلیم، ادیب، مجاہدِ آزادی اور سیاستدان ان سب کا مجموعہ ہے۔ وہ بھارت کے لئے قومی یکجہتی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے ان کے کیے گئے کام یادگار ہیں

مجھے یقین ہے کہ آپ کے رسالے کے ذریعے ایک ایسے قوم پرست نیتا کی شخصیت مکمل طور پر سامنے آسکے گی۔

شنکر دیال شرما

(شنکر دیال شرما)

कार्यकारी पार्षद (शिक्षा)
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली

EXECUTIVE COUNCILLOR (EDU)
DELHI ADMINISTRATION, DELHI

दिल्ली, दिनांक
Delhi, Dated

پیغام

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے دیش کی آزادی کی لڑائی کے ایک جیالے سپاہی تھے - ایسے سپاہی کہ ہمیشہ لڑنے والوں کی پہلی صف میں نظر آئے اور اس وقت تک قدم آگے بڑھاتے رہے جب تک دیش کو غیر ملکیوں کے تسلط سے چھڑا نہیں لیا — آزادی ملنے کے بعد دیش کی تعمیر و ترقی کے کاموں میں بھی مولانا صاحب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا - خاص طور سے اس دیش سے جہالت کی تاریکی دور کرنے کے لیے انہوں نے ہندوستان کے پہلے وزیر تعلیم کی حیثیت سے جو تعلیمی پالیسیاں بنائیں، ان کی روشنی آج بھی اسکولوں اور کالجوں سے لیکر ہماری یونیورسٹیوں تک کی فضا میں دیکھی جاسکتی ہے - انہوں نے تعلیم کے فروغ کے ساتھ ساتھ ہمارے تہذیبی اور ثقافتی ورثوں کو محفوظ کرنے اور انہیں ترقی دینے کے لیے بھی اہم فیصلے کیے اور ان فیصلوں پر عملدرآمد کے لیے ایسے ادارے قائم کیے جن کی افادیت اور اہمیت دن بہ دن بڑھتی جارہی ہے -

خوشی کی بات ہے کہ ملک اور قوم کے اس محسن کی یاد میں اردو اکادمی دہلی اپنے ماہانہ رسالے کا خاص نمبر نکال رہی ہے - میں اس نمبر کی کامیابی کی تمنا کرتا ہوں -

(کلاش بہارتیہ)

بخدمت جناب شریف الحسن نقوی،
سکریٹری، اردو اکادمی، دہلی



जगप्रवेश चन्द्र

जग پرویش چندر

अ० शा० पत्र स०/मु० का० पा०/2595/Admn.
मुख्य कार्यकारी पार्षद
दिल्ली प्रशासन, दिल्ली
CHIEF EXECUTIVE COUNCILLOR
DELHI ADMINISTRATION, DELHI
दिल्ली, दिनाक
Delhi, Dated 8 NOV 1988

پیغام

مجھے یہ جان کر انتہائی مسرت ہوئی ہے کہ دلی اردو اکادمی کا ماہنامہ رسالہ "ایوان اردو دلی" امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد کے یوم پیدائش کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر ایک خصوصی نمبر شایع کر رہا ہے جو مولانا کی حیات اور انکی صحافتی، علمی، ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی خدمات کے مختلف عنوانات کے تحت فکر انگیز مقالات پر مشتمل ہوگا۔ اس سے عوام و خواص دونوں ہی مولانا کی گراں قدر خدمات سے واقف تو ہونگے ہی لیکن خاص طور پر ملک کی نوجوان نسل کو حب الوطنی، سیکولرزم اور قومی اتحاد جیسی قدروں پر عمل پیرا ہونے کی تلقین ملے گی۔

مولانا کی دوسری حیثیتوں میں انکی علمی اور ادبی حیثیت سب سے نمایاں ہے۔ مولانا کئی زبانوں کے ماہر تھے۔ اردو زبان کو انہوں نے کئی ادبی شہ پارے عطا کئے۔ مولانا اعلیٰ پایہ کے سیاسی مدبر اور مفکر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز انشاء پرداز بھی تھے۔ امید کرتا ہوں کہ خصوصی نمبر مولانا کی ذات با برکات کے شایان شان ہوگا۔

میں دلی اردو اکادمی کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جس کے لئے ہمیشہ میری نیک خواہشات رہی ہیں۔

جگ پرویش چندر

(جگ پرویش چندر)

جناب شریف الحسن نقوی
سکریٹری دلی اردو اکادمی
دریا گنج۔ نئی دلی



ہوئے۔

تقابلی مطالعے سے دیکھنا چاہیے کہ جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت کے طریقۂ کار اور مقاصد نے الہلال کی دعوت سے کس حد تک فائدہ اٹھایا۔ مطالعے کے دوران میں انحراف اور ردّ و بدل کے پہلو بھی سامنے آسکتے ہیں۔ لیکن اس سے نہ الہلال کی دعوت کی اہمیت کم ہوتی ہے، نہ ان تحریکوں کے اس سے متاثر ہونے کی تغلیط۔

سیاسی اصلاح

الہلال کی دعوت کا دوسرا محاذ سیاسی تھا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام تحریک کے بعد یہاں کے مسلمانوں پر جو افتاد پڑی، وہ تاریخ کا حصہ ہے۔ اس کا وقتی علاج سر سیّد احمد خاں مرحوم نے، اپنی بصیرت کی روشنی میں، پوری دیانت داری سے پیش کیا۔ ان کی تحریک بہت حد تک کامیاب رہی، جس سے مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار اور اعتماد بحال بھی ہوگیا۔ لیکن ان کے بتائے ہوئے طریقۂ کار میں یک رُخا پن تھا۔ اس میں حالات کی تبدیلی کا کوئی لحاظ نہیں رکھا گیا تھا ظاہر ہے کہ ایسی پالیسی میں استواری اور پایندگی نہیں ہوسکتی۔ لیکن اس میں تبدیلی یا اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی تھی۔ اس کی اصلاح اور علاج کی بنیاد مولانا ابوالکلام آزاد اور الہلال نے مہیا کی۔ بیشک، ان کے خیالات بعض ہمعصر مصری اکابر اور دوسرے مفکرین مثلاً سعید حلیم پاشا، مصطفیٰ کامل پاشا، جمال الدین افغانی، شیخ محمد عبدہ وغیرہ سے بہت متاثر تھے۔ لیکن بنیادی طور پر ان کا ماخذ اور منبع قرآنِ کریم اور حدیث و سنہ تھے۔

افسوس، اس موضوع پر بھی جتنا اور جس انداز سے لکھنے کی ضرورت تھی، نہیں لکھا گیا۔ اس مسئلے کا گہرائی سے مطالعہ کرکے ہمیں الہلال کے اثرات کو متعین اور مرتب کرنا چاہیے۔

ترجمان القرآن

دوسرا موضوع ترجمان القرآن کا ہے۔ افسوس کہ یہ تفسیری ترجمہ مکمل نہ ہوسکا۔ اس وقت ہمیں ان اسباب کی تحقیق و تفتیش کی ضرورت نہیں، جو اس کے نامکمل رہ جانے کے باعث ہوئے۔ مولانا مرحوم کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کام انھوں نے دو مرتبہ کیا۔ دونوں دفعہ پولیس کی خانہ تلاشی کے نتیجے میں یہ مسودے درہم برہم بلکہ تباہ ہوگئے۔ اور انھیں اسے نئے سرے سے تیار کرنا پڑا، جو ہمارے سامنے ہے۔

> ...مولانا نے اردو ادب کو، خاص کر نثر کو، کیا کچھ دیا یا اُن کا اردو نثر پر کوئی اثر پڑا یا نہیں، اس کا کوئی وقیع جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ گذشتہ نصف صدی میں ادبِ اُردو کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بیشتر میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟...

لیکن میں ایک بات پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ جن اصحاب نے لکھا ہے کہ مرحوم نے تیسری جلد بھی مکمل کرلی تھی اور اس کا مسودہ ضرور کہیں نہ کہیں ان کے کاغذات میں موجود ہوگا، وہ غلطی پر ہیں۔ مرحوم سے میری آخری ملاقات ان کی وفات سے دو ہفتے قبل جمعہ، ۸ فروری ۱۹۵۷ء صبح کے وقت ہوئی تھی اور یہ اچھی خاصی طویل اور تفصیلی ملاقات تھی۔ اس دن منجملہ اور باتوں کے میں نے ان سے گذارش کی کہ وہ ترجمان القرآن کی تیسری جلد مکمل کردیں۔ اس پر انھوں نے صراحت سے فرمایا کہ واقعی میری گوناگوں مصروفیتوں کے باعث ترجمان القرآن کی تکمیل کا کام آج تک معرضِ التوا میں پڑا ہوا ہے، اور میں اس طرف توجہ نہیں کرسکا۔ اب انشاءاللہ، جلد ہی میں اسے لکھنا شروع کردوں گا، اور حسبِ معمول (عبدالقیوم) خاں صاحب کاتب کو بلوا کے مسودہ انھیں دیتا جاؤں گا۔ اس کے ہفتہ بھر بعد وہ غسل خانے سے نکلتے ہوئے پھسل کر گرے۔ اور ایک ہفتہ بیمار رہ کر وہاں پہنچ گئے، جو ہم سب کی منزلِ مقصود ہے۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلَیہِ رَاجِعُونَ۔ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔

لیکن جو دو جلدیں شائع ہوچکی ہیں، وہ بھی کچھ کم اہم نہیں۔ ان سے بہت حد تک پورے قرآن کی تفسیر کا اسلوب اور انداز ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ ۱۹۳۲ء میں جب ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی ہے تو جس سرگرمی اور گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا گیا، وہ حیرتناک تھا۔ میں یہاں صرف مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کی رائے پر اکتفا کردوں گا۔ انھوں نے "معارف" میں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اسے وقت کی اہم ضرورت قرار دیا تھا۔ لکھتے ہیں:

"ترجمان القرآن وقت کی اہم چیز ہے ضرورت ہے کہ اس کو گھر گھر پھیلایا جائے اور نوجوانوں کو اس کے مطالعے کی ترغیب دی جائے اور ہر اسلامی دارالمطالعہ میں اس کا ایک نسخہ منگوا کر رکھا جائے۔"

سوال یہ ہے کہ بیسیوں ترجمے اور تفسیر کی کتابیں موجود ہوتے ہوئے ترجمان القرآن کو یہ اہمیت کیوں دی گئی؟ اس پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے محققوں اور مصنفوں کو ترجمان القرآن پر اس پہلو سے غور کرنا چاہیے کہ اس کی زبان، ترجمے کی صحت

ابوالکلام آزاد — کچھ کرنے کے کام

تمام دوسرے لوگوں کی طرح ہم مولانا ابوالکلام آزاد سے متعلق بھی دو پہلوؤں سے لکھ سکتے ہیں۔ اوّل' ان کے سوانح حیات ہیں' جن میں ان کے خاندان کا تذکرہ اور اس ماحول کا ذکر ہوگا جس میں ان کی پیدایش ہوئی اور انھوں نے تعلیم و تربیت کے مراحل طے کیے' انھیں کی روشنی میں ان کے اخلاق و عادات اور کردار کی تشکیل پر گفتگو ہو سکتی ہے۔ دوسرے' ان کے کام اور کارنامے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے کن میدانوں میں کام کیا اور ان میں کس حد تک کامیابی حاصل کی ؟

جہاں تک ان کے سوانح حیات کا تعلق ہے' اس بارے میں جو کچھ اور جتنا کچھ لکھا جا چکا ہے' اور چھپ کر ہمارے سامنے آیا ہے' میرے خیال میں وہ بہت کافی ہے۔ بنیادی طور پر تمام کوائف ہمارے علم میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ممکن ہے کہ تحقیق و تجسس سے ان کی ابتدائی زندگی کی بعض جُزوی تفصیلات سے متعلق کوئی نئی بات منظرِ عام پر آجائے' ورنہ کسی اہم واقعے کے اضافے کے امکانات اب بہت کم ہیں۔ خود مولانا آزاد اپنے بارے میں بہت کم گو تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے حالات تفصیل سے بیان کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جب ایک دوست کی فرمائش پر وہ اپنی سوانح عمری لکھنے پر آمادہ بھی ہوئے تو "تذکرہ" میں اپنے متعلق چند اشارے کر کے رہ گئے' جو اسی زمانے میں شائع ہو گئے تھے۔ ان کی وفات کے بعد عبدالرزّاق ملیح آبادی مرحوم نے ان سے متعلق دو کتابیں شائع کیں: "آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی" اور "ذکرِ آزاد"۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور مولانا امداد صابری نے بھی ان کی سوانح عمریاں قلمبند کی ہیں۔ ابھی پچھلے دنوں ساہتیہ اکادمی نے "سلسلۂ اکابرِ ادب" میں پروفیسر عبدالقوی دسنوی کی لکھی ہوئی مختصر کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد" شائع ہوئی ہے۔ پروفیسر صاحب نے اسی موضوع پر ایک مفصّل کتاب بھی لکھی ہے' جو ابھی تک شائع نہیں ہوئی۔ ایک تفصیلی کتاب انگریزی میں میرے ایک اور دوست لکھ رہے ہیں۔ یہ غالباً اس سال کے اواخر تک شائع ہو جائے گی۔ ایک انگریزی مصنف کا لکھا ہوا انگریزی مقالہ بھی چھپ گیا ہے۔ اس سے میرا مقصود یہ ہے کہ جہاں تک ان کی سوانح عمری کا تعلق ہے' ہم اس مطبوعہ مواد پر بہت کم اضافہ کر سکتے ہیں۔

لیکن میرے نزدیک ایک پہلو ایسا ہے' جس پر بہت کم کام ہوا ہے۔ اور اسی پر توجّہ کرنے کی ضرورت ہے۔

سب تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نابغۂ روزگار شخصیت اور ہمہ گیر صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ان کی سرگرمیوں کے متعدد میدان تھے اور وہ ہر جگہ منفرد مقام کے حامل۔ وہ صحافی تھے' ادیب اور انشا پرداز تھے۔ عالمِ دین تھے' مفسّرِ قرآن تھے' مفکّر تھے' سیاست داں تھے' تحریکِ آزادی کے ممتاز سپاہی تھے' حکومتِ ہند کے وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے انھوں نے آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی کی تشکیل میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اُن کی اِن گوناگوں سرگرمیوں پر بہت کم لکھا گیا ہے' حالاں کہ میرے نزدیک کرنے کا یہی کام تھا۔

مالک رام
C-504' ڈیفنس کالونی' نئی دہلی

دعوت الہلال

مولانا آزاد اپنی خاندانی روایات اور تعلیم کے زیرِ اثر ایک عالمِ دین ہی کی حیثیت میں ملک سے متعارف ہوئے۔ مدتوں ان کی تحریروں کا محور اسلام کی افہام و تفہیم ہی رہا اور لوگوں نے اُنھیں اسی صورت میں جانا اور مانا۔ انھوں نے اسلام کی جو خدمات کیں' اور اسلام کی تعبیر و تفسیر اور "مسلماں را مسلماں باز کردند" کے سلسلے میں جو رول ادا کیا' وہ اتنا اہم ہے کہ ہم اسے کسی طرح نظر انداز نہیں کر سکتے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں' کوئی اسے مانے یا نہ مانے کہ یہ "الہلال کی دعوت" کا اثر تھا' اور الہلال ہی نے وہ زمین تیار کی تھی جس پر بعد کو جماعتِ اسلامی اور تبلیغی جماعت نے اپنی اپنی عمارت کھڑی کی۔

افسوس کہ یہ موضوع آج تک تشنۂ تحقیق ہے الہلال کی دعوت کا عمیق اور وسیع مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ دیکھا جائے کہ اس نے ہر ہفتے کیا پیغام لوگوں تک پہنچایا۔ اور وہ کس طرح کے اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے کوشاں رہا۔ الہلال کی عمر بہت کم رہی' لے دے کے یہی تین برس یا کچھ زیادہ۔ لیکن اس زمانے کے حالات کے پیشِ نظر اس کی اشاعت غیر معمولی تھی۔ یہ ہر ہفتے ۲۰ - ۲۵ ہزار چھپتا تھا۔ گویا اس کے قارئین ایک لاکھ کے قریب ہوں گے۔ اسی لیے اس کے اثرات اور نتائج بہت دور رس اور پائدار ثابت

عکسِ ذات

تصویروں میں ۱۵ تا ۳۱   تحریروں میں ۳۲ تا ۹۴

استدلال کی جدت اور بیان کی شگفتگی نے اسے ایک تخلیقی کارنامے کا درجہ دے دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر اس نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی جائے کہ یہ کِس حد تک مسلمانوں کے سوادِ اعظم کی ضروریات کو، فقہ اور مذہب کی موشگافیوں میں جائے بغیر، پورا کر سکتا ہے؟ میرے خیال میں ترجمان القرآن پر اس پہلو سے ابھی تک کوئی قابلِ ذکر کام نہیں ہوا۔

مولانا آزاد تفسیر میں ابن تیمیہ اور ان کے شاگردِ رشید ابن قیم سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے "سلف" کے طریقے کی حمایت میں اور "تفسیر بالرائے" کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ ابن تیمیہ کا بھی یہی اصول تھا۔ ابن تیمیہ اور ابن قیم کی تحریروں اور ترجمان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے اور واضح کیا جائے کہ کہاں تک مولانا آزاد نے ان کا تتبع کیا۔ اور کس جگہ اور کتنا اس پر اضافہ کیا۔

آزاد بحیثیت ادیب

الہلال کی سب تعریف کرتے ہیں۔ اور بے شک، یہ تعریف کے قابل تھا بھی، اور آج تک ہے۔ اس کی شکل و صورت، اس کا معیارِ طباعت و تصاویر وغیرہ ہماری صحافت میں بالکل نئی اور انوکھی چیز تھی۔ آج تک بھی، اِلّا ماشاءاللہ، کوئی پرچہ اس معیار کو نہیں پہنچ سکا۔ لیکن یہ تو تصویر کا ایک رُخ تھا۔ اس کی اصلی اہمیت اور کشش اس کی معنوی خوبیاں تھیں۔ مولانا آزاد اور ان کے ہمکاروں نے مضامین کا جو نمونہ پیش کیا، اس سے ملک بھر چونک اٹھا۔ خود مولانا آزاد کی تحریریں، ان کا موضوع اور دقیق اندازِ کلام اور اسلوبِ تحریر ایسا بدیہہ تھا کہ الہلال کے قاری مسحور ہو گئے۔

ستم یہ ہے کہ انھوں نے اردو ادب کو، خاص کر نثر کو، کیا کچھ دیا، یا ان کا اُردو نثر پر کوئی اثر پڑا یا نہیں، اس کا کوئی وقیع جائزہ آج تک نہیں لیا گیا۔ اس کی قدر و قیمت کا تعین نہیں ہوا۔ گذشتہ نصف صدی میں ادبِ اُردو کی متعدد تاریخیں لکھی گئیں، لیکن ان میں سے بیشتر میں ان کا نام تک نہیں ملتا۔ آخر کیوں؟

آزاد کا نظریۂ تعلیم

مولانا آزاد ۱۹۴۶ء سے اپنی وفات ۱۹۵۸ء تک بارہ برس ہندوستان کے وزیرِ تعلیم رہے۔ اس دوران میں انھوں نے پارلیمنٹ میں، مختلف کمیٹیوں اور کانفرنسوں میں بیسیوں تقریریں کیں، سیکڑوں فائلوں پر مختلف مسائل کے سلسلے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان کی یہی آرا ملک کی موجودہ تعلیمی پالیسی کی بنیاد ثابت ہوئیں۔ جن اصحاب کو حکومتی دفتروں میں کام کرنے کا موقع ملا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ کسی محکمے کا وزیر کس حد تک پالیسی کے تعین اور تشکیل میں مؤثر اور معاون ہوتا ہے۔ یقیناً مولانا آزاد بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے۔

میں نے "خطباتِ آزاد" میں ان کی اس نوع کی دو تقریریں شامل کی ہیں (ہندوستانی کمیٹی، بہار ۱۹۴۷ء اور عربی نصاب کمیٹی لکھنؤ، فروری ۱۹۴۷ء)۔ افسوس کہ بوجوہ میں آج تک خطبات کی بقیہ جلدیں شائع نہیں کر سکا۔ اور انھوں نے اپنی تقاریر میں اور فائلوں پر جن خیالات کا اظہار فرمایا، اپنی مجبوریوں کے باعث انھیں بھی جمع نہ کر سکا۔ یہ کرنے کا کام ہے اور ضرورت ہے کہ کوئی صاحبِ علم ماہرِ تعلیم ان تمام تحریروں کو جمع کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔ کام دقّت طلب ضرور ہے، لیکن ناممکن نہیں۔ اس سے ہمیں ان کے نظریۂ تعلیم اور طریقِ کار کے بارے میں روشنی ملے گی۔ اور ممکن ہے کہ ہماری کچھ تعلیمی مشکلات کے حل کرنے میں بھی وہ معاون ثابت ہوں۔

کرنے کے بعض اور کام بھی ہیں۔ لیکن اگر بنیادی طور پر اتنا کچھ بھی ہو جائے، تو بہت حد تک ہم مولانا آزاد کی صحیح تصویر اور ان کی خدمات کا صحیح جائزہ پیش کر کے اپنے آپ سے اور دین و مذہب سے سُرخرو ہو جائیں گے۔ انشاءاللہ۔

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق

مذہب کی دُکان

مذہب کے دکانداروں نے جہل و تقلید اور تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے، اور روشن خیال، تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے، نہ محراب مسجد میں اخلاص، اور نہ میکدے میں رندانِ بے ریا۔ اربابِ صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ ان کی راہ دوسری ہے۔

ہم کعبہ و ہم بُت کدہ سنگِ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

(طنزیاتِ آزاد)





عمرِ رواں کے نقشِ قدم





قلمی فوٹو

سرو قد۔ دوہرا بدن۔ گورا رنگ۔ ایرانی وضع کی بڑی بڑی آنکھیں۔ کتابی چہرہ۔ سفید چھوٹی داڑھی، آواز سُریلی اور بلند، مزاج میں تمکنت اور وقار۔ طبیعت میں شوخی اور ظرافت۔ دہلی کے رہنے والے ہیں۔ ایک بڑے پیر کے بیٹے ہیں۔ مگر پیری مریدی کے زیادہ دل دادہ نہیں ہیں۔ قوم سیّد۔ پیشہ آزادی اور بے نیازی۔ حافظہ کی قوت بے مثال۔ تصوّر کی طاقت، چیونٹی کی ناک اور چیل کی آنکھ سے بڑھی ہوئی۔ تقریر و تحریر کے خود مختار بادشاہ۔ نازک مزاجی میں تاناشاہ۔ سیاست دانی میں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان سے سو قدم آگے۔ بیرونِ ہند کے مسلمانوں میں اور امریکنوں اور انگریزوں میں بھی مقبول ہیں۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ مسلمانوں میں مقبول ہیں اور گوروں میں حسرت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اور یورپین مؤرّخ سوچتے رہتے ہیں کہ ان کو یورپین کیوں کر ثابت کیا جائے۔ اگرچہ لیڈروں کے عروج اور ذرائع شہرت کو اچھی طرح سمجھتے ہیں، تاہم ظاہر داری او[illegible] کاری سے بیزار ہیں۔ مسلمانوں میں [illegible] گاندھی جی ہو سکتے، تو ابوالکلام [illegible]فورڈ کرپس کے دل سے کوئی پوچھے [illegible] ہندوستان میں گاندھی جی سیاسی [illegible] ۔ جواہر لال یورپ کی [illegible] عکس ہیں کیوں کہ جو دل میں ہوتا ہے وہی زبان سے کہتے ہیں حالانکہ نئے زمانے کی سیاست میں یہ بات گناہ کبیرہ ہے۔ صرف مولانا ابوالکلام چالیس کروڑ باشندوں میں ایک ایسے ہندوستانی ہیں جو یورپ کی سیاست کو انگریزی نہ جاننے کے باوجود سمجھتے بھی ہیں اور اُس کے وار کو بغیر ڈھال کے روکتے بھی ہیں، اور مُسکرا کر ایک نکیلا سیاسی نشتر حریف کے مارتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں "غالباً کچھ زیادہ تکلیف نہ ہوئی ہوگی۔ یہ انجکشن آپ کی بیماری کے لیے بہت ہی مُفید ہے۔" قرآن مجید پر ایسا عبور ہے اور اُس کے مقاصد کو اتنا زیادہ سمجھتے ہیں کہ مصر و شام کے علمائے جدید بھی شاید اتنا نہ سمجھتے ہوں گے۔ ہوش سنبھالتے ہی مسلم لیگ کو سمجھ لیا تھا۔ ۱۹۰۸ء میں مسٹر زاہد سہروردی کے مکان پر انھوں نے حسن نظامی کے ایک کاغذ پر یہ لکھا تھا: "سب باتیں منظور ہیں باستثنائے شرکت مُسلم لیگ۔" گویا چونتیس برس پہلے بھی وہ مُسلم لیگ سے اتنے ہی بیزار تھے جتنے آجکل ہیں۔ جب وہ امرت سر میں اخبار "وکیل" کے ایڈیٹر تھے تو انھوں نے حسن نظامی سے کہا تھا کہ ایک وقت آئے گا کہ سارا ہندوستان میری مُٹھی میں ہوگا۔ اور آج حسن نظامی یہ اعلان کرتا ہے کہ وہ وقت آگیا۔ اور پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک راز دار دوست سے کہا کہ جب مولانا ابوالکلام اور سر کرپس کی گفتگو کا میں ترجمہ کر رہا تھا تو مجھے حیرت ہوتی تھی کہ مولانا ایسی گرفت سوالات کے ذریعے کرتے تھے کہ سر کرپس کچھ دیر جواب سوچتے رہ جاتے تھے۔

اگر مولانا ابوالکلام کو ہندوستان کا بادشاہ بنا دیا جائے تو وہ اکبر اعظم کی طرح ہر قوم میں مقبول ہوں گے، سوائے اُن کے جو اُن کی بادشاہی کو اپنی ذات کے لیے نقصان رساں سمجھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد بہت عمدہ تجویزیں پیدا کر سکتے ہیں مگر جن لوگوں میں وہ آج کل ہیں اُن میں ان پر عمل کی صلاحیت نہیں پائی جاتی۔ کیوں کہ سارے ہندوستان میں ریاکار اور نمود کار لیڈروں کی کثرت ہے جن میں نہ سمجھ ہے نہ عمل ہے۔

بہرحال مولانا ابوالکلام آزاد موجودہ ہندوستان کے لیے سیاسی سورج ہیں اور سیاسی چاند ہیں۔ اُن کو سیاسی چراغ بھی کہا جا سکتا تھا، اگر دوسرے سیاسی چراغوں کو روشن کر سکتے جس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔ بظاہر سفید ڈاڑھی کے بوڑھے آدمی ہیں مگر مزاج کی شوخی اور بذلہ سنجی کہتی ہے کہ اب تک نوجوان اور زندہ دل ہیں۔

خواجہ حسن نظامی (مرحوم)









مہاتما گاندھی سے مصروف گفتگو



گاندھی سمادھی پر ۔۔۔ ۱۹۴۸ء ۔ جھکے ہوئے پنڈت نہرو









↑

سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں
کے ساتھ — ۱۹۴۷ء

سردار پٹیل کے ساتھ تبادلۂ خیال کرتے ہوئے
→

(اوپر دائیں) بیرسٹر آصف علی اور
ارونا آصف علی کے ہمراہ

پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ











[illegible]



۵ ستمبر ۱۹۵۵ء کو اپنی کوٹھی پر غیر ملکی سفارت کاروں اور ان کی بیگمات کے ساتھ



افغانستان کے شاہ
ظاہر شاہ سے
معانقہ کرتے ہوئے
درمیان میں پنڈت
نہرو — فروری ۱۹۵۸ء



خضر حیات خاں کے ساتھ ←



لارڈ پیتھک کے ساتھ



اِنگلستان اور دوسرے یوروپی ممالک کے خیرسگالی دَورے سے واپسی پر ـــ پالم ائرپورٹ پر محترمہ اندرا گاندھی اور پروفیسر ہمایوں کبیر بھی نظر آرہے ہیں۔



پنڈت نہرو، پروفیسر ہمایوں کبیر اور ایم۔ این بسعود کے ساتھ پارلیمنٹ سے باہر آتے ہوئے۔



شملہ کانفرنس (جون، جولائی ۱۹۴۵ء) کے موقعے پر ماسٹر تارا سنگھ سے گفتگو کرتے ہوئے۔ گووند ولبھ پنت، لیاقت علی خاں، محمد علی جناح، راج گوپال آچاریہ بھی تصویر میں دیکھے جاسکتے ہیں۔



ڈاکٹر رادھا کرشنن کے ساتھ
اگست ۱۹۴۷ء

مارشل شاہ محمود خاں، وزیرِ اعظم افغانستان کے ساتھ بات چیت کرتے ہوئے ↑





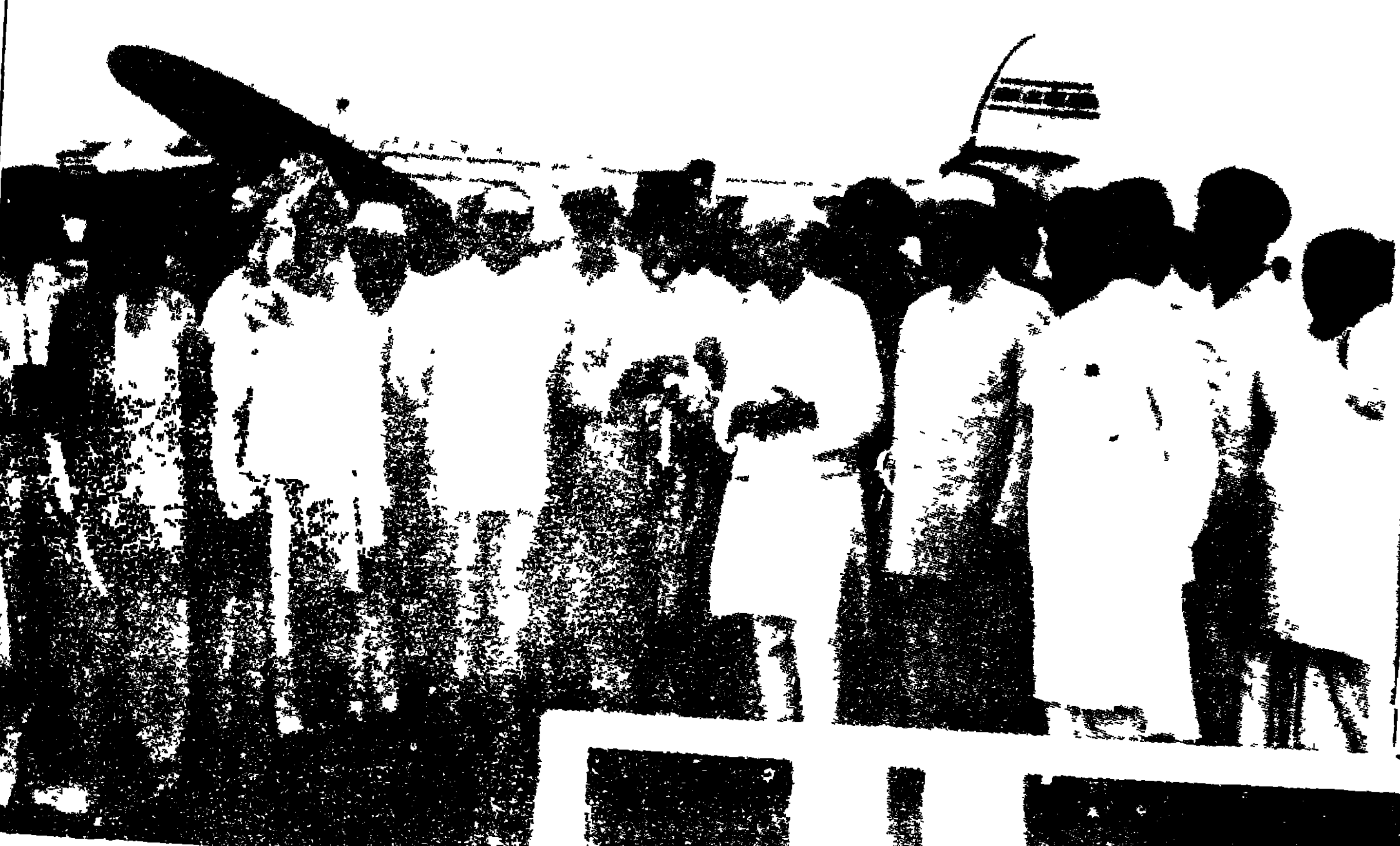
[illegible] ہوٹل میں ←
۲۴؍جون ۱۹۵۵ء



انڈین نیشنل کمیشن فار کوآپریشن وِد یونیسکو
کے افتتاحی اجلاس میں خطبۂ صدارت
فرماتے ہوئے ـــــ اپریل ۱۹۴۹ء

کُل ہند کانگریس کمیٹی کے اجلاس
منعقدہ بمبئی میں مولانا آزاد، ڈاکٹر
راجندر پرشاد اور پنڈت نہرو ـــ ۱۹۴۸ء





بائیں سے دائیں:
مولانا احمد سعید دہلوی
نوری اسفندری ایرانی
سفیر، جواہر لال نہرو،
دیش بندھو گپتا
اور ڈاکٹر تارا چند
کے ہمراہ



دوستوں اور معتقدوں کے
ساتھ — تصویر میں پنڈت
نہرو کے علاوہ اندرا جی کو بھی
دیکھا جا سکتا ہے۔



سعودی عرب کے شاہ
سعود بن عبدالعزیز
کے اعزاز میں منعقدہ
استقبالیہ تقریب میں،
تصویر میں پنڈت نہرو،
ڈاکٹر راجندر پرشاد اور
ملا طاہر سیف الدین
بھی نظر آ رہے ہیں



کولمبیا یونیورسٹی کے صدر ڈاکٹر گریسن کرک کو خوش آمدید کہتے ہوئے ——— دسمبر ۱۹۵۵ء

پروفیسر اوستروویتنوف صدر سوویت اکادمی آف سائنسز سے کتابوں کا تحفہ قبول کرتے ہوئے۔





آل انڈیا ریڈیو میں بچوں کے پروگرام میں شریک



انڈین ہاؤس لندن میں ہندوستانی طلبا سے خطاب کرتے ہوئے

ہندوستان اور دوسرے ایشیائی ممالک کے درمیان ثقافتی تعاون کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے
اگست ۱۹۴۹ء





سفرِ آخرت





انجمن ترقی اردو (ہند) کے زیرِ اہتمام ۱۵، ۱۶ فروری ۱۹۵۷ء کو منعقد ہونے والی کانفرنس کا ایک منظر ـــــ دائیں سے بائیں: کرنل بشیر حسین زیدی، پنڈت جواہر لال نہرو (ڈاکٹر تارا چند کے پیچھے تشریف رکھتے ہیں)، مولانا ابوالکلام آزاد، حاجی صالح، پنڈت سندر لال، مولانا حفظ الرحمٰن۔

انڈین نیشنل کانگریس کے ۵۵ ویں اجلاس منعقدہ جے پور میں (بائیں سے دائیں) شری جے رام داس دولت رام، ڈاکٹر ایس۔ پی۔ مکرجی، سروجنی نائیڈو اور شری ایم۔ ایس۔ اینے کے ہمراہ۔





۱۹۰۸ء — ۱۵ر اگست : والد کا انتقال ؒ

۱۹۰۸ء / ۱۹۰۹ء — مغربی ایشیا اور فرانس کا سفر

۱۹۱۲ء — ۱۳ر جولائی : ہفتہ وار "الہلال" کا اجرا

۱۹۱۳ء — ۱۸ر ستمبر: "الہلال" پریس سے دو ہزار روپے کی ضمانت طلب کی گئی جو ۲۳ر ستمبر کو جمع کر دی گئی۔

۱۹۱۴ء — اکتوبر: ۱۴ر اور ۲۱ر اکتوبر کا مشترکہ شمارہ حکومت بنگال نے ضبط کر لیا۔

۱۹۱۴ء — ۱۶ر نومبر: پچھلی ضمانت ضبط اور ۱۰ ہزار کی نئی ضمانت کا مطالبہ۔ مطالبہ پورا نہ کرنے کی وجہ سے ۱۸ر نومبر کی اشاعت کے بعد خود ہی "الہلال" بند کر دیا۔

۱۹۱۵ء — ۱۵ر نومبر: ہفتہ وار "البلاغ" کا اجرا

۱۹۱۶ء — ۲۸ر مارچ: حکومتِ بنگال نے ڈیفنس ایکٹ کی دفعہ ۳ کے تحت حکم دیا کہ چار روز کے اندر کلکتہ کا قیام ترک کر دیں اور حدودِ بنگال سے نکل جائیں۔ بعد میں یہ مدت بڑھا کر ایک ہفتہ کر دی گئی۔

۱۹۱۶ء — اپریل: صوبہ بدر ہونے کی وجہ سے ۲۴ر اور ۳۱ر مارچ کی اشاعت کے بعد "البلاغ" بند ہو گیا۔

۱۹۱۶ء — ۷ر اپریل: رانچی (بہار) چلے گئے اور شہر سے باہر مور ابادی میں مقیم ہو گئے۔ کچھ دنوں کے بعد مرکزی حکومت نے وہیں قید کر دیا۔

۱۹۱۹ء — تذکرہ اور "جامع الشواہد فی دخول غیر المسلم فی المساجد" کی تصنیف۔

۱۹۲۰ء — یکم جنوری: رانچی کی نظر بندی سے رہائی

۱۹۲۰ء — ۲۸، ۲۹ر فروری: بنگال پیراونشل خلافت کانفرنس کے صدر کی حیثیت میں حکومت سے ترکِ موالات کی دعوت۔

۱۹۲۰ء — "مسئلہ خلافت اور جزیرۃ العرب" کی تصنیف نیز صدارت اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس ناگپور۔

۱۹۲۱ء — ۲۳ر ستمبر: تحریک ترکِ موالات کی دعوت کے لیے اپنی نگرانی میں ہفتہ وار "پیغام" کلکتہ سے جاری کیا۔

۱۹۲۱ء — ۲۵ر اکتوبر: صدارت اجلاس پراونشل خلافت کانفرنس آگرہ۔

۱۹۲۱ء — ۱۸، ۲۰ر نومبر: صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء ہند لاہور۔

۱۹۲۱ء — ۱۰ر دسمبر: گرفتاری، مقدمہ اور ایک سال قید کی سزا۔ اسی مقدمے میں وہ بیان دیا جو "قولِ فیصل" کے نام سے مشہور ہوا۔

۱۹۲۳ء — ۶ر جنوری: قید سے رہائی

۱۹۲۳ء — یکم اپریل: عربی کا رسالہ "الجامعہ" کا اجرا

۱۹۲۳ء — ۱۵ر ستمبر: صدارت اجلاس خاص کانگریس دہلی

۱۹۲۵ء — ۲۹ر دسمبر: صدارت اجلاس آل انڈیا خلافت کانفرنس کانپور

۱۹۲۷ء — ۱۰ر جون: "الہلال" دوبارہ جاری کیا

۱۹۲۷ء — ۹ر دسمبر: اس اشاعت کے بعد "الہلال" مستقل طور پر بند ہو گیا۔

۱۹۲۹ء — ۲۷ر جولائی: صدر مسلم نیشنلسٹ پارٹی

۱۹۳۰ء — قائم مقام صدر آل انڈیا نیشنل کانگریس

۱۹۳۱ء — گرفتاری

۱۹۳۱ء — ستمبر: ترجمان القرآن جلد اوّل کی اشاعت

۱۹۳۲ء — گرفتاری

۱۹۳۶ء — اپریل: ترجمان القرآن جلد دوم کی طباعت

۱۹۳۹ء — قائم مقام صدر آل انڈیا کانگریس

۱۹۴۰ء — کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اور مسلسل ۱۹۴۶ء تک رہے

۱۹۴۰ء — ۱۹ر مارچ: صدارت اجلاس کانگریس بہ مقام رام گڑھ

۱۹۴۰ء — گرفتاری، دو برس کی سزا، نینی جیل میں قید

۱۹۴۱ء — ۴ر دسمبر: رہائی

۱۹۴۲ء — مارچ، اپریل: کرپس مشن سے گفتگو

۱۹۴۲ء — ۹ر اگست: بمبئی میں گرفتاری اور قلعہ احمد نگر میں نظر بندی

۱۹۴۳ء — ۹ر اپریل: کلکتہ میں اہلیہ کا انتقال

۱۹۴۳ء — جون: چھوٹی بہن حنیفہ آبرو بیگم کا بھوپال میں انتقال

۱۹۴۵ء — اپریل: احمد نگر سے بانکوڑا منتقل

۱۹۴۵ء — ۱۵ر جون: رہائی



حیاتِ ابوالکلام — ماہ و سال کے آئینے میں

[مولانا آزاد مرحوم کے کچھ عقیدت مندوں نے مرحوم کی زندگی کی اہم تاریخیں مرتب کی ہیں، مگر ابتدائی زندگی کی تاریخوں میں — از پیدائش تا اجرائے الہلال — اچھا خاصا اختلاف ہے۔ مگر ان تاریخوں کے فاضل مرتب چونکہ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبۂ لائبریری سائنس میں استاد ہیں، اس لیے اُمید ہے کہ انھوں نے پوری تحقیق اور چھان بین کے بعد ان کو مرتب کیا ہوگا۔

اس مضمون میں ایک جگہ — ۱۹۰۳ء کے تحت "ایڈورڈ گزٹ" (شاہجہاں پور) کا ذکر ہے۔ مولانا کی صحافت کے سلسلے میں پہلی مرتبہ یہ نام سامنے آیا، اس لیے اس کے بارے میں مجھے شبہہ تھا، لہٰذا اس کا مآخذ معلوم کرنے کے لیے فاضل مضمون نگار اور ماہر ابوالکلامیات ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری صاحب (کراچی) کو خطوط لکھے۔ قریشی صاحب کا تو جواب نہیں آیا، شاید میرا خط نہیں ملا، البتہ شاہجہاں پوری صاحب نے لکھا کہ خود مولانا آزاد نے "لسان الصدق" کے آخری شمارے — اپریل و مئی ۱۹۰۳ء — میں اس اخبار کا اور اس کی ادارت کا ذکر کیا ہے۔]

مرسل: عبداللطیف اعظمی

۱۸۸۸ء — ۱۷/اگست: پیدائش مکہ معظمہ

۱۸۹۲ء — رسمِ بسم اللہ

۱۸۹۸ء — آمدِ ہندوستان — آغازِ شاعری

۱۸۹۹ء — والدہ کی وفات

۱۸۹۹ء — ماہنامہ "نیرنگِ خیال" کا کلکتہ سے اجرا

۱۹۰۰ء — یا ۱۹۰۱ء — شادی

۱۹۰۱ء — ۲۲/جنوری: ہفتہ وار "المصباح" کا اجرا

۱۹۰۲ء — ۵/جنوری: قدیم ترین دستیاب مطبوعہ تصنیف "اعلان الحق"

۱۹۰۲ء — ہفتہ وار "احسن الاخبار" کلکتہ کی ادارت

۱۹۰۳ء — درسِ نظامی سے فراغت

۱۹۰۳ء — مارچ: ماہنامہ "خدنگِ نظر" لکھنؤ کے معاون مدیر

۱۹۰۳ء — "ایڈورڈ گزٹ" شاہجہاں پور کی ادارت

۱۹۰۳ء — ۲۰/نومبر: ماہنامہ "لسان الصدق" کا اجرا

۱۹۰۴ء — یکم تا ۳/اپریل: انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت

۱۹۰۵ء — ۲۲، ۲۳/اپریل: انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں شرکت اور "اسلام آیندہ زمانے میں" کے عنوان پر تقریر

۱۹۰۵ء — اپریل و مئی: "لسان الصدق" کا آخری شمارہ آگرہ کے مشہور مفیدِ عام پریس سے شائع ہوا۔

۱۹۰۵ء — سفرِ عراق

۱۹۰۵ء — اکتوبر: ماہنامہ "الندوہ" لکھنؤ کے معاون مدیر

۱۹۰۶ء — مارچ: "الندوہ" سے علیحدگی

۱۹۰۶ء — اپریل: سہ روزہ "وکیل" امرتسر کی ادارت

۱۹۰۶ء — بڑے بھائی ابونصر یٰسین آہ کی وفات

۱۹۰۶ء — نومبر: "وکیل" سے علیحدگی اور کلکتہ واپسی

۱۹۰۶ء — دسمبر: مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ کے اجلاس میں شرکت۔ اسی اجلاس میں مسلم لیگ — کی تاسیس بھی عمل میں آئی

۱۹۰۷ء — جنوری: ہفتہ وار "دارالسلطنت" کلکتہ کی ادارت

۱۹۰۷ء — اگست و ستمبر: "وکیل" امرتسر کی ادارت

۱۹۰۸ء — اگست: والد کی شدید علالت کی بنا پر "وکیل" سے مستعفی

قاضی افضل حق قریشی

مولانا آزاد ــ کچھ سچی یادیں

کسی شاعر کا مشہور مصرع ہے:

وہ اپنی ذات سے اک انجمن ہے

یہ مصرع اپنی معنویت کے ساتھ حرف بہ حرف مولانا ابوالکلام آزاد کی مجموعۂ صفات شخصیت پر صادق آتا ہے۔ مولانا جہاں اپنی ذات سے سیاست کا ایک مستقل ادارہ اور علم و ادب کا ایک مستقل دبستان تھے۔ وہاں وہ اپنی دلچسپ اور گوناگوں صلاحیتوں کی بنا پر ایک انجمنِ باغ و بہار بھی تھے۔ جس کے قریب پہنچ کر ایک افسردہ دل انسان بھی شگفتہ ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ باغ و بہار شخصیت اپنے اندر علم کی پہنائیوں کے علاوہ ادب کی دلچسپیاں اور جملہ فنونِ لطیفہ کی دلکشیاں بھی رکھتی تھی۔ ایک انجمن میں کبھی نغمہ و سرور کی صدائیں بلند ہوتی ہیں۔ کبھی شعر و ادب کی گونج اور کبھی علوم و سیاست کی بلند آہنگ اور گمبھیر آوازیں۔

مولانا آزاد کی ذات کو ہم ایک انجمن اسی لیے کہتے ہیں کہ ہم نے بیک وقت ان کی صحبت میں مولانا کے علمی ارشادات بھی سُنے مولانا کی ادبی نکتہ پردازیوں سے بھی مستفیض ہوئے اور مولانا کے سنجیدہ مزاح کے وہ نمونے بھی دیکھے جنھیں ہم مجلسی زندگی کی جان کہہ سکتے ہیں مولانا کا سنجیدہ مزاح لبوں پر تبسّم تو لا سکتا تھا، لیکن یہ تبسّم کبھی قہقہے کی صورت میں نمودار نہیں ہو سکتا تھا۔ اِسے آپ مزاح کی سنجیدگی کہہ لیجیے یا مولانا کی شخصیت کی ادب آموز ہیبت جو بیٹھنے والوں کو ہر حال میں مؤدب رہنے کی تاکید کرتی رہتی تھی۔

مولانا سے میری رسمی ملاقاتیں تو ۱۹۳۴ء سے پہلے بھی ہوئیں لیکن پہلی ملاقات جسے ہم باضابطہ تعارف کہہ سکتے ہیں، وہ اس وقت ہوئی جب کہ میں آل انڈیا اردو لٹریری کانفرنس کلکتہ کی مجلسِ استقبالیہ کے صدر کی حیثیت سے مولانا کو کانفرنس کی شرکت کے لیے دعوت دینے گیا اور رخصت ہوتے ہوئے مولانا سے پھر حاضر ہونے کی اجازت چاہی۔ مولانا نے بڑی شفقت کے ساتھ اجازت دی اور کہا کہ بھئی سنیچر کی شام کو آؤ، روزہ رکھتے ہو یا نہیں رکھتے ہو لیکن میرے ساتھ افطار کرو۔ پھر مسکرا کر کہنے لگے کہ تم اتنے بدذوق تو ہو نہیں کہ اگر روزہ نہ رکھتے ہو تو افطار سے بھی پرہیز کرو۔ میں نے تسلیم کی اور آئندہ حاضر ہونے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔ تیسرے دن حاضر ہوا۔ مولانا کو اطلاع کرائی۔ مولانا نیچے اترے اس حال میں کہ افطار کا خوان اُن کے پیچھے پیچھے ایک ملازم کے ہاتھوں میں تھا۔ افطار کے بعد چائے آئی اور مولانا نے خود اپنے ہاتھوں سے چائے کی ایک پیالی بنا کر میری طرف سرکائی۔ مجھے اُس دن زکام کی شکایت تھی میں نے عذر کیا۔ میرے اس عذر پر مولانا کچھ گھبرا سے گئے اور کہنے لگے آپ چائے بالکل نہیں پیتے ہیں یا اس وقت کسی خاص وجہ سے نہیں پی رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جی نہیں، پیتا تو ہوں، اور شوق سے پیتا ہوں۔ لیکن اس وقت زکام میں مبتلا ہوں۔ یہ سن کر اک ذرا بلند آواز سے فرمایا کہ الحمدللہ۔ میں نے نہایت اَدب سے عرض کیا کہ مولانا خدا کا شکر تو بہرحال کرنا چاہیے۔ مگر اس وقت الحمدللہ کہنے کا کوئی خاص سبب؟ کہنے لگے بھئی معاملہ یہ ہے کہ ایسے لوگ جو چائے پینے سے پرہیز کرنے والے تھے جب جب میری زندگی میں آتے تو میرے لیے خطرناک ثابت ہوئے اور میں ایسے لوگوں سے ڈرنے لگا جو چائے جیسی نعمت سے پرہیز کرتے ہوں۔ یہ معلوم کر کے کہ تم چائے ایک خاص وجہ کر نہیں پی رہے ہو اطمینان سا ہوا اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اس کے بعد کچھ علمی بحثیں چھڑ گئیں جن کو اگر یہاں چھیڑا جائے تو اس مضمون کا سلسلہ اتنا دراز ہو کہ ایک چھوٹی سی کتاب بھی اس کے لیے کافی نہ ہو سکے۔ یہ تو معلوم ہے کہ مولانا علم و فضل کے اتھاہ سمندر تھے اور اس کی ہر موج طوفانی ہوا کرتی تھی، ہم نے چار پانچ سال مولانا کی خدمت میں بیٹھ کر مختلف علوم و فنون پر ان کی بصیرت افروز گفتگو سنی اور اپنی معلومات کی خالی جھولیاں بھرتے رہے لیکن میں اس مقالے میں مولانا کی علمی شخصیت سے گفتگو نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ اس پر مجھ سے بہتر لوگ اپنے خیالات کا اظہار کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ میں صرف اس مضمون میں مولانا کی نجی صحبت کی ایک ہلکی سی تصویر کشی کروں گا اور ان کے سنجیدہ مزاح کے بعض نمونے سنا کر مولانا کی یاد تازہ کروں گا:

جمیل مظہری (مرحوم)



۱۹۴۵ء ـــــ ۲۶؍جون : شملہ کانفرنس میں شرکت

۱۹۴۶ء ـــــ "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال" کی اشاعت

۱۹۴۶ء ـــــ اپریل۔جون : وزارتی مشن سے گفتگو

۱۹۴۷ء ـــــ ۱۵؍جنوری : عبوری حکومت میں وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے شرکت

۱۹۴۷ء ـــــ ۱۵؍اگست : آزاد ہندوستان کی پہلی حکومت میں وزیرِ تعلیم

۱۹۵۱ء ـــــ کانگریس پارلیمانی پارٹی کے ڈپٹی لیڈر

۱۹۵۲ء ـــــ پہلے عام انتخابات میں منتخب ہوئے۔ تعلیم، قدرتی ذرائع اور سائنسی تحقیقات کی وزارت۔

۱۹۵۵ء ـــــ دوبارہ کانگریس پارٹی کے ڈپٹی لیڈر

۱۹۵۶ء ـــــ مئی تا جون : یورپ اور مغربی ایشیا کا خیرسگالی دورہ[۵]

۱۹۵۶ء ـــــ یونسکو کی نویں جنرل کانفرنس دہلی کے صدر

۱۹۵۷ء ـــــ دوسرے عام انتخابات میں پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے۔ دوبارہ تعلیم اور سائنسی تحقیقات کی وزارت۔

۱۹۵۸ء ـــــ ۱۵؍فروری : انجمن ترقی اُردو ہند کے اجلاس دہلی میں آخری تقریر۔

۱۹۵۸ء ـــــ ۲۲؍فروری : وفات، جامع مسجد کے سامنے اُردو پارک میں دفن کیے گئے۔

حواشی

۱۔ مولانا آزاد نے اپنے ایک خط مورخہ ۲۶؍اگست ۱۹۰۸ء میں علّامہ شبلی نعمانی مرحوم کو لکھا کہ: "والد کے انتقال کو آج دسواں روز ہے۔" (مکاتیب ابوالکلام آزاد مرتبہ: ابوسلمان شاہجہاں پوری، صفحہ ۶۷) اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا کے والد کا انتقال ۱۷؍اگست ۱۹۰۸ء کو ہوا ہے۔ (عبداللطیف اعظمی)

۲۔ "الہلال" کا جو مشترک شمارہ ضبط کیا گیا تھا، اس کی تاریخیں ۱۲؍ اور ۱۷؍اکتوبر تھیں اور جو مضامین قابلِ اعتراض قرار دیے گئے تھے، وہ "حدیث الجنود" اور "سقوط اسٹروپ" تھے۔ ایک بلجین تصویر بھی قابلِ اعتراض سمجھی گئی تھی جس کے نیچے قرآن حکیم کی یہ آیت درج تھی: "وما ظلمھم اللہ ولکن کانوا انفسھم یظلمون" (یعنی ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا، بلکہ خود انھوں نے اپنے اُوپر ظلم کیا ہے۔) (عبداللطیف اعظمی)

۳۔ میری تحقیق کے مطابق یہ گرفتاری ۱۹۴۱ء میں ۳؍جنوری کو صبح کے سوا پانچ بجے دہلی سے کلکتہ جاتے ہوئے، الہ آباد ریلوے اسٹیشن پر ہوئی اور ۸؍جنوری کو سٹی مجسٹریٹ الہ آباد نے ڈیفنس آف انڈیا رولز کی دفعہ ۳۸ (۵) کے تحت ڈیڑھ سال قیدِ محض کی سزا دی مگر تقریباً گیارہ ماہ کے بعد رہائی عمل میں آئی۔ (عبداللطیف اعظمی)

۴۔ مولانا آزاد کی کوئی چھوٹی بہن نہیں تھی۔ تین بہنیں تھیں اور تینوں بڑی تھیں۔ (عبداللطیف اعظمی)

۵۔ یہ سنہ غلط ہے۔ یا تو فاضل مرتب سے سہو ہوا ہے یا طباعت کی غلطی ہے، صحیح سنہ ۱۹۵۵ء ہے۔ اس سفر یا دورے کی تفصیل یوں ہے: مولانا آزاد ۲۳؍مئی ۱۹۵۵ء کو نئی دہلی سے بمبئی کو بذریعہ ہوائی جہاز روانہ ہوئے۔ وہاں سے ۲۵؍مئی کو بذریعہ اسٹیمر براہِ کراچی انگلستان کے لیے روانہ ہوئے۔ ۲۶؍مئی کو کراچی پہنچے۔ رات کا وقت جہاز کے اندر ہی گذرا۔ دوسرے روز اسٹیمر انگلستان کے لیے روانہ ہوا، روانگی سے پہلے پاکستان کے وزیرِ اعظم محمد علی نے مولانا سے ملاقات کی۔ ۸؍جولائی کو لندن میں مولانا نے ایک پریس کانفرنس کو خطاب کیا، جس میں یہ امید ظاہر کی کہ انڈیا آفس لائبریری کے مستقبل کا مسئلہ باہمی گفت وشنید سے طے ہو جائے گا۔ یورپ سے واپسی کے بعد ۲۹؍جولائی کو نئی دہلی کی ایک پریس کانفرنس میں اپنے دورۂ یورپ کے متعلق اپنے تاثرات بیان کیے۔ اسی دوران میں ذرا سخت لہجے میں فرمایا کہ برطانوی دولت مشترکہ کے سکریٹری کی یہ دلیل ہندوستان ایک منٹ کے لیے بھی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے کہ انڈیا آفس لائبریری برطانوی حکومت کی ملکیت ہے۔ (عبداللطیف اعظمی)



نئی دنیا سامنے آگئی۔ ۱۹۳۷ء میں جب کانگریسی وزارت بنی اور اس کے ساتھ ہندوستانی کی کانگریسی تحریک کے باوجود اخبارات میں، اسمبلیوں میں، سیاسی جلسوں میں تقریر و تحریر دونوں کے اندر ہندی کے الفاظ کی فراوانی ہونے لگی تو ڈاکٹر اعجاز حسین جعفری نے مولانا سے اس کا شکوہ کیا کہ مولانا یہ کانگریسی لیڈر ہندوستانی زبان کو خالص سنسکرت بنانا چاہتے ہیں۔ مولانا نے یہ سن کر آنکھیں بند کر لیں اور صرف یہ فرمایا 'ہوسکتا ہے۔ لیکن شخصی جذبات کو اور شخصی پسند کو کسی قاعدے اور قانون کا پابند نہیں کیا جاسکتا۔ ڈاکٹر جعفری جب باہر نکلے تو کہنے لگے کہ مولانا نے ایک ایسا فقرہ کہا کہ مجھ پر زبان کے سلسلے کے تمام مباحث روشن ہوگئے۔ ۱۹۴۸ء میں جب مولانا آخری مرتبہ پٹنہ تشریف لائے اور ڈاکٹر محمود صاحب کی کوٹھی پر ٹھہرے تو میں ان سے ملنے کے لیے گیا۔ شہر کے کچھ مسلمان رؤسا بیٹھے ہوئے تھے اور مولانا سے ہندوؤں کی فرقہ پرستی کی شکایت کر رہے تھے۔ مولانا کچھ دیر تک ان کی باتیں سنتے رہے اور اس کے بعد ایک جملہ کہا جو میرے خیال میں ہندوستان کی پچاس سالہ تاریخ سیاست کا نچوڑ ہی نہیں تھا بلکہ ہماری آئندہ سیاست پر ایک ایسا تبصرہ تھا جس پر مستقبل کا مورخ ہمیشہ ماتم کرے گا فرمانے لگے کہ بھئی یہ تو ہوگا ہی اور اس کو ہونا ہی ہے۔ مسلم فرقہ پرستی کو جو کرنا تھا کر چکی۔ اس نے ملک کو دو حصوں میں بٹوا دیا اور ہم باوجود کوشش کے اسے روک نہ سکے۔ اب اس کے ردّعمل میں ہندو فرقہ پرستی کو جو کرنا ہے وہ کرے گی۔ جب ہم اُسے نہ روک سکے تو اِسے کیا روک سکیں گے۔ یہ سن کر وہ مسلمان رؤسا شرمندہ سے ہوگئے۔ اور جب باہر نکلے تو یہ اعتراف کرتے ہوئے نکلے کہ مولانا نے سچ کہا جو کچھ ہو رہا ہے وہ ہماری ہی فرقہ وارانہ سرگرمیوں کا لازمی و منطقی نتیجہ ہے ایک جملے میں حقیقت کا پورا جائزہ لے لینا۔ ایک جملے میں مستقبل کی طرف اشارہ کر دینا۔ ایک جملے میں ماضی و حال کی پوری تاریخ پر تبصرہ کر دینا۔ مولانا کی وہ خطیبانہ خصوصیت تھی جو غالباً ان کے ساتھ ہمیشہ کے لیے قبر میں دفن ہوگئی۔

اب ہم ان خصوصیتوں کو یاد کر کے صرف آنسو ہی بہا سکتے ہیں ایک ٹھنڈی سانس بھر سکتے ہیں۔ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ میں اور میرے دوست احباب سالہا سال تک مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے۔ مولانا نے علاوہ اپنے علمی فیضان کے ہماری نجی زندگی سے دلچسپی لی۔ ہم میں جو بیکار تھے انھیں باکار بنانے کی کوشش کی۔ جو لوگ مولانا پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ مولانا کے پاس دماغ تو تھا، لیکن سینے میں ایک دھڑکتا ہوا دل نہیں تھا میرا تجربہ ان کے اس الزام کی تردید کرتا ہے۔ مولانا کے پاس دماغ بھی تھا اور دل بھی تھا اور دل بھی۔ وہ اپنے دوستوں اور معتقدوں کے حالات سے متاثر بھی ہوتے تھے لیکن ان تاثرات کے اظہار کو سنجیدگی اور متانت کے منافی سمجھتے تھے۔ عقل ہر حال میں ان کے جذبات کی رہنما رہی اور سنجیدگی ہر حال میں ان کے قلبی اضطراب کی پردہ پوش۔ مولانا کے کردار کی اس خصوصیت نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کیں لیکن مولانا نے اپنا یہ مدبرانہ اور عاقلانہ رویہ نہیں بدلا۔

مولانا سے بعض ناواقف کاروں کو یہ بھی شکایت ہے کہ وہ لوگوں سے ملنے جُلنے میں فیاض نہ تھے۔ یہ شکایت مولانا کے کرسیِ وزارت پر آنے کے بعد اور قوی ہوگئی اور لوگوں نے عام طور سے کہنا شروع کیا کہ مولانا کو اقتدار کا نشہ ہوگیا ہے۔ ان کی ڈیوڑھی پر سنگینوں کا پہرہ رہتا ہے۔ کوئی غریب و شریف مسلمان یا ہندوستانی مشکل سے وہاں پھٹک سکتا ہے۔ یہ بات جتنی زیادہ مشہور ہے اتنی ہی زیادہ غلط ہے۔ بلاشبہ مولانا طبعاً مجلسی ہونے کے باوجود کم آمیز تھے ملنے جلنے کے سلسلے میں اُن کا ایک ضابطہ تھا، ایک معیار تھا جسے وہ اس وقت بھی برتتے تھے جب کہ وہ مسندِ اقتدار پر نہ تھے۔ بلکہ ایک درویش کی طرح کلکتہ میں زندگی بسر کرتے تھے۔ اس زمانے میں بھی مولانا کے یہاں حاجب و دربان رہا کرتے تھے اور ہر شخص مولانا سے بآسانی مل سکتا تھا۔ اس میں چھوٹے بڑے امیر غریب کی کوئی قید نہ تھی۔ مولانا کی نیم درویشانہ اور نیم فلسفیانہ طبیعت اپنے وقت کی آپ مالک رہنا چاہتی تھی۔ وہ جب ادبی موڈ میں ہوں تو اس وقت نہ سیاسی گفتگو پسند کرتے تھے، نہ سیاسی لوگوں سے ملنا چاہتے تھے۔ وہ جب علمی موڈ میں ہوں تو اس وقت ادب و مزاح یا اس قسم کے لوگوں کی ان کے یہاں گنجائش نہ تھی۔ اور جب کسی کتاب کے مطالعے میں مصروف ہوں تو پھر ان کا کسی سے ملنا سینے پر پہاڑ رکھنے کے برابر تھا۔ ان کا خلوت کدہ ان کی ایسی محدود دنیا تھی جس میں وہی آسکتا تھا جو مولانا کے معیار پر پورا اُترتا۔ اس کے علاوہ مولانا کا وقت معین تھا۔ جب وہ اپنے خاص دوستوں سے ملتے ہوتے تو اس وقت عام لوگوں کو بالکل باریابی نہ ہوتی وہ کتنے ہی مقتدر اور صاحبِ عزت کیوں نہ ہوں۔ اگر مولانا کسی خاص مشغلے میں منہمک ہیں تو انھیں واپس آنا پڑتا۔ استادِ محترم مولانا رضا علی وحشت مرحوم جو مولانا کے بچپن کے دوستوں میں تھے، ناقل تھے کہ ایک مرتبہ وہ مولانا کی خدمت میں تھے شعر و شاعری کا تذکرہ تھا کہ دفعتہً



تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را
گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را

مولانا سے اس پہلی باضابطہ ملاقات کے بعد میں نے اکثر و بیشتر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہنے کی اجازت چاہی اور یہ بھی پوچھا کہ اگر خاطر اقدس کو ناگوار نہ ہو تو بعض اور خوش ذوق احباب کو بھی ساتھ لاؤں۔ مولانا نے فرمایا کہ بھئی ناگوار خاطر ہونے کی کیا بات ہے میں تو خود چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے نوجوانوں سے باتیں کرنے کا موقع ملے تاکہ یہ اندازہ ہو کہ ہندوستان کی آئندہ نسل کیسی تیار ہو رہی ہے۔ تم آؤ اور ضرور آؤ اپنے دوستوں کو بھی ساتھ لیتے آؤ۔ سنیچر کی شام میری ہمیشہ خالی رہتی ہے۔ اس کے بعد سے ہمارا یہ دستور ہو گیا کہ ہم چند احباب ہر سنیچر کی سہ پہر کو مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتے اور آٹھ بجے رات تک برابر ان کے قدموں کے سامنے بیٹھ کر اپنا دامنِ تہی پھیلاتے اور جب اٹھتے تو اس دامنِ تہی کو مختلف علمی جواہر ریزوں سے لبریز پاتے۔ اس اثنا میں مولانا کے دلچسپ فقرے بھی ہوتے رہتے جن کا زیادہ تر نشانہ میرے مرحوم دوست پروفیسر طاہر رضوی ہوتے۔ مولانا نے ان کی بھولی اور معصوم شخصیت سے دلچسپی لینی شروع کر دی اور اس کا سبب یہ ہے کہ طاہر مرحوم نے ان ہی دنوں میں پارسی مذہب کے متعلق ایک کتاب لکھی تھی جس میں یہ ثابت کیا تھا کہ پارسی، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح اہلِ کتاب ہیں۔ مولانا نے وہ کتاب ملاحظہ کی اور پروفیسر طاہر رضوی کی محنتوں کی بھرپور داد دی۔ ایک دن پوچھنے لگے کہ بھئی طاہر اس کتاب کے لکھنے کا خیال آپ کے ذہن میں کس راستے سے آیا۔ میں مولانا کی خدمت میں ذرا گستاخ ہو چلا تھا۔ طاہر رضوی کو ستانے کے خیال سے بولا کہ مولانا ممکن ہے محبت کے راستے آیا ہو۔ مولانا مسکرا کر طاہر صاحب سے مخاطب ہوئے۔ دیکھو بھئی تمہارے یہ احباب بڑے ناقدر شناس ہیں۔ تمہارے علمی شغف کو ایک جذباتی انہماک کا نتیجہ بتلاتے ہیں یہ صریحی ظلم ہے۔ اس کے بعد یہ ہوا کہ جب جب مجلس کچھ سونی سی ہونے لگتی تو مولانا طاہر صاحب کی طرف مسکرا کر دیکھتے اور پوچھتے کہ ہاں بھئی آپ کے احباب کا وہ شبہ اب تک قائم ہے یا رفع دفع ہوا۔ طاہر صاحب کا جھینپنا، مولانا کا مسکرانا اور جملہ احباب کا کھلکھلانا ابھی تک یاد آتا ہے۔

> ...مولانا باتوں باتوں میں کچھ ایسے جملے بھی کہہ جاتے تھے کہ جن کی اگر شرح کی جائے تو ایک مقالہ ہو جائے مطالب کو سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کرنا، مولانا کے اندازِ تقریر کی خاص صفت تھی میں نے اکثر ان کی زبان سے علی السبیل تذکرہ ایسے جملے سنے کہ جب ان پر غور کیا تو فکر و نظر کی ایک نئی دنیا سامنے آ گئی...

ایک دوسرا لطیفہ بھی سنیے۔ اسی اثنا میں بہار کے محبوب لیڈر پروفیسر عبدالباری بھی کلکتہ تشریف لائے اور ہم ہی لوگوں کے ساتھ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ اتفاق سے ان لوگوں میں تھے جو چائے سے پرہیز ہی نہیں کرتے تھے بلکہ ایک حد تک متنفر بھی تھے۔ میں نے جرأت کر کے مولانا سے پوچھا کہ مولانا آپ نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ جو لوگ چائے نہیں پیتے تھے وہ ہمارے لیے ہمیشہ خطرناک ثابت ہوئے۔ پروفیسر باری بھی اتفاق سے ان ہی لوگوں میں ہیں جو چائے نہیں پیتے۔ ان کے متعلق حضور کی کیا رائے ہے؟ ایک سنجیدہ اور متین تبسم مولانا کے ہونٹوں پر ابھرا اور ارشاد ہوا "نہیں خطرناک تو نہیں لیکن ایک گوشہ ان کے ذہن کا بہرحال خالی ہے سو وہ چائے نہ پینے کا نتیجہ ہے۔" باری صاحب شرمندہ سے ہو گئے اور مولانا نے ان کو شرمندہ دیکھ کر بہار کے سیاسی حالات کی طرف گفتگو کا رُخ پھیر دیا۔

ایک مرتبہ طاہر صاحب کی انگلی میں زخم ہو گیا۔ وہ اپنی انگلی پر کپڑے کی پٹی لپیٹے ہوئے تھے۔ مولانا کی نظر پڑ گئی پوچھا بھئی یہ کیا معاملہ ہے طاہر صاحب؟ طاہر صاحب بولے مولانا، ایک زخم ہے۔ یہ سن کر مولانا گلے کی انگلی کو اپنے سینے کے بائیں طرف لے گئے اور دل کے قریب رکھ کر بولے طاہر صاحب اس کی جگہ یہاں تھی، کیا غلط جگہ چنی ہے آپ کے زخم نے۔

ایک مرتبہ مجھے اختلاجِ قلب کی شکایت ہوئی۔ مولانا نے مزاج کی کیفیت پوچھی تو میں اپنا حال بیان کرنے لگا۔ اور اس سلسلے میں میں نے یہ بھی کہا کہ جب تکیے پر سر رکھتا ہوں تو کان بولنے لگتے ہیں۔ اور کچھ بدبداہٹ کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا ہوں۔ مولانا نے کہا گھبرانے کی کیا بات ہے بھئی یہ تو نبوّت کے آثار ہیں۔

مولانا باتوں باتوں میں کچھ ایسے جملے بھی کہہ جاتے تھے کہ جن کی اگر شرح کی جائے تو ایک مقالہ ہو جائے مطالب کو سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کرنا، مولانا کے اندازِ تقریر کی خاص صفت تھی میں نے اکثر ان کی زبان سے علی السبیل تذکرہ ایسے جملے سنے کہ جب ان پر غور کیا تو فکر و نظر کی ایک

مولانا آزاد — چند ملاقاتیں

مولانا آزاد کا نام زبان پر آتے ہی غالب کا یہ شعر بھی یاد آجاتا ہے:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

دُنیائے فانی میں کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جنھیں تاریخ بناتی ہے اور کچھ ایسے لوگ آتے ہیں جو خود تاریخ بناتے ہیں جنھیں تاریخ ساز کہا جاتا ہے بے شک مولانا آزاد ایک ایسی ہی تاریخ ساز شخصیت کے مالک تھے۔

میری پہلی ملاقات اُن سے تب ہوئی جب مَیں ایک وفد کے ساتھ اُن کے دولت کدے پر گیا۔ جب وفد بات چیت کرکے اُن سے رُخصت ہونے لگا تو مولانا نے مجھے روک لیا۔ سب لوگ چلے گئے تو مجھے اپنے ڈرائنگ روم میں لے گئے خادم کو آواز دی اور مجھے اپنے نزدیک کُرسی پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ مَیں از راہ ادب و احترام ذرا ہٹ کر بیٹھنا چاہتا تھا لیکن اُن کے اصرار پر ان کے ساتھ والی کُرسی پر بیٹھ گیا۔ اتنے میں خادم نے چائے سامنے لاکر رکھ دی۔ مَیں چائے سے نفرت کرتا ہوں اور شاید یہ بات مبالغہ نظر آئے لیکن میں نے اپنی ساری زندگی میں چار یا پانچ دفعہ چائے چکھی ہوگی۔ اب میرے لیے نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن کی سی کیفیت ہوگئی اور مولانا کی عظمت کا اثر تھا کہ مَیں نے چُپکے سے چائے کی پیالی لے لی اور ایک دو گھونٹ احتراماً پی بھی لیے۔ مَیں نے سُن رکھا تھا کہ مولانا چائے کے رسیا ہیں اور خود چائے تیار کرنے میں بھی ماہر ہیں۔ اسی دوران میں مولانا مجھ سے پھر مخاطب ہوئے اور فرمانے لگے کہ بیدی صاحب گو میں آپ سے پہلے مل نہیں پایا لیکن آپ کے بارے میں لوگوں کی زبانی بہت کچھ سُن چکا ہوں مَیں نے گذارش کی کہ خدا کرے کہ آپ کو تصویر کا ایک ہی رُخ نہ دکھایا گیا ہو اس پر مُسکرانے لگے اور فرمایا کہ مجھے آپ کی تصویر کے سب رُخ معلوم ہیں اور وہاں کوئی کالا داغ نہیں ہے۔ مولانا کے مُنہ سے یہ الفاظ سُن کر مجھے بیحد مسرت ہوئی۔ مولانا سب کچھ جانتے ہوئے بھی خاموش رہتے تھے اور ان کی اس فطرت سے سب واقف تھے۔ جب خادم نے چائے بڑھادی تو فرمانے لگے کہ ہمارے ملک میں سب کچھ ہے۔ ہم آزاد بھی ہوگئے لیکن اس آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے اب محنت ایثار رواداری اور امن و آشتی کی ضرورت ہے آزادی ملی ہے تو آزادی کی کچھ ذمّہ داریاں بھی ساتھ لائی ہے جن سے اگر ہم عہدہ برآ نہ ہوسکے تو غلامی سے بدتر حالات رونما ہوجائیں گے پھر فرمانے لگے کہ اس وقت ہمیں ایسے کارکنوں کی اشد ضرورت ہے جو فرقہ وارانہ اور متعصب عناصر کو نہ پنپنے دیں آپ کے بارے میں لوگ اچھی رائے رکھتے ہیں اور مَیں خوش ہوں کہ آپ آج مجھ سے ملے۔ مَیں نے مولانا کا شکریہ ادا کیا اور یقین دلایا کہ اپنی بساط کے مطابق ملک کی خدمت کرنے کی سعی کروں گا۔

یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی۔ وقت گزرتا گیا حالات بھی بدلتے گئے اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ہندو مسلم تفرقات کی وجہ سے ملک کی فضا مکدر ہوگئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ تقسیم وطن کے دوران میں اور فوراً ہی بعد جو قتلِ عام اِدھر اور اُدھر ہوا اُس سے اتنے گہرے زخم لگے تھے کہ ان کے مندمل ہونے کے لیے کافی وقت درکار تھا۔ دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ حکومت چونکہ اپنے ہاتھوں میں آگئی تھی سبھی فرقے اور گروہ چاہتے تھے کہ سارا اقتدار اور اختیار اُنھیں ہی حاصل ہو اور پھر خود غرض لیڈر اور سیاستدان ایسے جذبات کو دیدہ و دانستہ اُبھار رہے تھے۔ ان حالات میں اس رَو میں بہہ جانا تو آسان تھا لیکن اس سے ملک کا مستقبل اور بھی تاریک ہوجاتا۔ اس وقت جو چند ہستیاں مشعلِ راہ بنیں اور جنھوں نے چٹان کی طرح ہر طوفان کا مُنہ موڑ دیا مولانا آزاد اُن میں سے ایک تھے۔ گاندھی جی، نہرو، سردار پٹیل اور دوسرے رہبرانِ قوم نے ہی اس آڑے وقت میں قوم اور ملک کی رہنمائی کی۔

مجھے مولانا سے ملنے کے اَن گنت مواقع ملے۔ مَیں نے کبھی بھی ان کو غصے میں نہیں دیکھا۔ بڑے متحمل مزاج تھے اور ہر مسئلے کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد کچھ فرماتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ گاندھی جی اور نہرو جی ان کی رائے کی قدر کرتے تھے۔

کنور مہندر سنگھ بیدی سحر
57-W- گریٹر کیلاش پارٹ I۔ نئی دہلی۔



موٹر کے ہارن کی آواز آئی۔ خادم خاص نے ایک کارڈ لاکر دیا۔ مولانا نے کارڈ دیکھ کر کہا کہ کہہ دو اس وقت میرے بہت ہی پرانے اور خاص دوست آئے ہوئے ہیں اور اُن سے میں نجی گفتگو کر رہا ہوں۔ یہ کہہ کر مولانا نے جب کارڈ میز پر رکھا تو حضرت وحشتؔ نے دیکھا کہ وہ کارڈ مسٹر سی۔ آر۔ داس کا تھا جو اس وقت بنگال کے بے تاج بادشاہ تھے۔

میرا خود یہ تجربہ ہے کہ ہم چند غریب طالب علم بیٹھے ہیں مولانا کی خدمت میں، کہ ایک مرتبہ سر ناظم الدین اور ایک مرتبہ سر عبدالحلیم غزنوی واپس کردیے گئے۔ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کا بیان ہے کہ وہ بیٹھے ہوئے ہیں اور گاندھی جی تشریف لائے تو مولانا نے یہ کہہ کر لوٹا دیا کہ اس وقت فرصت نہیں ہے۔ شام کو میں خود آپ سے ملوں گا۔ جب مولانا کا یہ عالم اس زمانے میں تھا جسے ہم زمانۂ درویشی کہہ سکتے ہیں تو پھر والیانِ ملک، وزرائے سلطنت، اور حکام ذی وقار زمانۂ وزارت میں اگر واپس کردیے گئے تو کون سی بڑی بات ہوئی۔ لیکن اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ شاید ہی کوئی غریب ان کی ڈیوڑھی سے بغیر ملے ہوئے واپس آیا ہو۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ادھر تین سال کے عرصے میں ہر سال دلی گیا اور بعض ایسے اوقات میں پہنچا کہ مولانا بہت مصروف تھے اور ان کے سکریٹری مولانا اجمل خاں صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ مولانا اتنے مصروف ہیں کہ فلاں مہاراجہ یا فلاں وزیر کو وقت نہ دے سکے میں نے ان سے کہا کہ خیر میرا نام مولانا کی خدمت میں پہنچا دیجیے یہ کافی ہے۔ لیکن جب مولانا کی خدمت میں میرا نام پہنچا تو مجھے بلا لیا گیا۔ اور مجھے وقت دیا گیا۔

میرے ایک عزیز خاص سیّد اختر حسین رئیس اکبرپور کا بیان ہے کہ مولانا سب کچھ برداشت کرسکتے تھے۔ لیکن غریب کے آنسو نہیں برداشت کرسکتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایام وزارت میں ضابطے کے خلاف کوئی کام نہیں کیا۔ لیکن کبھی کبھی غریب کے آنسوؤں کی دھار میں اس ضابطے کا حصار بھی ٹوٹ جایا کرتا تھا۔ مولانا اپنی کوٹھی سے باہر نکلے ہیں۔ موٹر پر سوار ہو رہے ہیں۔ ایک غریب برساتی میں کھڑا ہے۔ مولانا کو دیکھ کر ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھتا ہے اور رونے لگتا ہے۔ مولانا اجمل خاں صاحب کو آواز دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھئی یہ جو چاہتے ہیں کردو۔ غریب بہت پریشان حال معلوم ہوتا ہے۔

یہ تھے ہمارے مولانا ابوالکلام آزاد، جنھیں دنیا نے ان کی زندگی میں ہمیشہ غلط سمجھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب مولانا کی زندگی کی سچی تصویر دنیا کے سامنے آئے گی تو وہ محسوس کرے گی:

توظہوری زفلک آمدہ بودی چو مسیح
باز رفتی و کسے قدر تو نشناخت ولے

(بہ شکریہ "بہار کی خبریں" اگست ۵۸ء بہ توسط جناب شاکر انصاری)

علمائے دنیا پرست

سانپ اور بچھو ایک سوراخ میں جمع ہو جائیں گے لیکن علمائے دنیا پرست کبھی یک جا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ کتوں کا مجمع ویسے تو خاموش رہتا ہے لیکن ادھر قصائی نے ہڈی پھینکی اور ادھر ان کے پنجے تیز اور دانت زہرآلود ہو گئے۔ یہی حال ان سگانِ دنیا کا ہے ساری باتوں میں متفق ہو سکتے ہیں۔ لیکن دنیا کی ہڈی جہاں سڑ رہی ہو، وہاں پہنچ کر اپنے پنجوں اور دانتوں پر قابو نہیں رکھ سکتے۔ ان کا سرمایۂ نازِ علم حق نہیں ہے جو تفرقہ مٹاتا اور اتباع سبل متفرقہ کی جگہ ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلاتا ہے۔ بلکہ یکسر علم جدل وخلاف ہے۔ نفس پرستی اس کی کثافت کو خمیر دیتی اور دنیا طلبی کی آگ اس کی ناپاکی کے بخارات کو اور زیادہ تیز تر کرتی رہتی ہے۔ فساق وفجار خرابات میں بھائیوں کی طرح ایک دوسرے کا جامِ صحت پیتے ہیں اور چور ڈاکو مل جل کر رہزنی کرتے ہیں۔ مگر یہ گروہ خدا کی مسجد اور زہد وعبادت کے صومعہ وخانقاہ میں بیٹھ کر بھی متحد و یک دل نہیں ہو سکتا۔ اور ہمیشہ ایک دوسرے کو درندوں کی طرح چیرتا پھاڑتا اور پنجہ مارتا رہتا ہے۔ میکدوں میں محبت کے ترانے اور پیار و الفت کی باتیں سننے میں آجاتی ہیں۔ مگر ہمیں محراب مسجد کے نیچے پیشوائی وامارت کے لیے ان میں سے ہر ہاتھ دوسرے کی گردن پر بڑھتا اور خونخواری کی ہر آنکھ دوسرے بھائی کے خون پر لگی ہوتی ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے احبار و یہود سے فرمایا "تم نے داؤد کے گھر کو ڈاکوؤں کا بھٹ بنا دیا ہے"۔ ڈاکوؤں کے بھٹ کا حال تو نہیں معلوم، لیکن ہم نے مسجدوں کے صحن میں بھیڑیوں کو ایک دوسرے پر غراتے اور خون آشام دانت مارتے دیکھا ہے۔

(طنزیاتِ آزاد)



چاہتا ہے کہ کبھی کبھار علمی صحبت بھی میسر ہوتی رہے کیا ہی اچھا ہو کہ آپ دو چار دس دن میں کبھی تشریف لے آیا کریں تو کچھ راحت ملے۔ جوش صاحب نے وعدہ فرمالیا۔ میں تو چونکہ جوش صاحب کے ساتھ تھا مولانا نے مجھے بھی یہ دعوت دی حالانکہ ان دونوں حضرت کے سامنے میری حیثیت ایک طفلِ مکتب کی بھی نہیں تھی۔

اسی سلسلے میں ہم ایک شام آٹھ بجے کے قریب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ابھی بیٹھے ہی تھے کہ اجمل خاں آئے اور کہنے لگے کہ "مولانا پنڈت جواہر لال جی کا فون آیا ہے کہ وہ کسی ضروری مشورے کے لیے آپ کے پاس آرہے ہیں" یہ سُن کر مولانا نے اجمل خاں صاحب سے کہا کہ پنڈت جی کو فون کردو کہ میں ابھی فارغ نہیں ہوں۔ میں نے اور جوش صاحب نے لاکھ کہا کہ ہمارا تو کوئی خاص کام تھا ہی نہیں یوں ہی چلے آئے تھے آپ ہماری وجہ سے پنڈت جی کو نہ روکیں لیکن مولانا نہیں مانے۔ اتنے میں پھر اجمل خاں آگئے اور کہنے لگے کہ پنڈت جی تو گھر سے چل پڑے ہیں اور دو چار منٹ میں آتے ہی ہوں گے۔ ہم نے پھر اُٹھنے کی کوشش کی لیکن مولانا نہیں مانے۔ اتنے میں پنڈت جی آگئے تو مولانا نے اجمل خاں صاحب سے کہا کہ پنڈت جی کو ڈرائنگ روم میں بٹھادو۔ اس کے بعد بھی مولانا نے پانچ سات منٹ ہم لوگوں کے ساتھ گذارے لیکن جب انھیں احساس ہوگیا کہ ہمیں سخت کوفت ہو رہی ہے تو فرمانے لگے آپ ابھی جائیے نہیں میں پنڈت جی سے بات کرکے آتا ہوں۔ چنانچہ دس بیس منٹ کے بعد مولانا تشریف لائے اور آدھ پون گھنٹہ ہمارے ساتھ باتیں کرتے رہے۔ اس واقعے کا ذکر کرنے سے مولانا کی عظمت، خودداری، مہمان نوازی اور وقار کا صحیح اندازہ ہوسکتا ہے ورنہ کتنے آدمی ایسے ہوں گے جو پنڈت جی کو آنے سے روک دیتے

جوش صاحب اُردو شاعری کے بادشاہ تھے۔ جتنا ذخیرۂ الفاظ اُن کے پاس تھا شاید کسی اور کو نصیب نہ ہوا ہو لیکن صرف دو ایسی ہستیاں تھیں جن کے سامنے جوش صاحب خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھتے اور وہ مولانا آزاد اور مولانا عبدالسلام نیازی۔ ایک روز میں نے جوش صاحب سے پوچھا کہ جب کبھی آپ مولانا آزاد یا مولانا عبدالسلام نیازی سے ملتے ہیں تو اکثر خاموش ہی رہتے ہیں کیا وجہ ہے تو جوش صاحب کہنے لگے کہ یہ دونوں حضرات اسی قدر پڑھے لکھے اور عالم ہیں کہ ان کے سامنے مُنہ نہ کھولنے ہی میں عافیت ہوتی ہے۔

مولانا کا سگریٹ نوشی کا بھی عجب انداز تھا۔ انگوٹھے اور پہلی اُنگلی کے درمیان سگریٹ کو لے کر آہستہ آہستہ گُھماتے بھی رہتے تھے اور کش بھی لگاتے تھے جس سے انھیں سگریٹ کی ایش گرانے کے لیے جھٹکا دینے کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔

اتنے میں میں دہلی سے ذرا دُور سنگرور ضلع میں ڈپٹی کمشنر ہوکر وہاں چلا گیا۔ وہاں سے بھی ہفتہ عشرہ میں ایک آدھ بار دہلی آنا ہوجاتا تھا۔ ایک بار میں اس دوران میں ان سے ملنے گیا تو مجھ سے پوچھنے لگے کہ ریٹائرڈ ہونے کے بعد آپ کا کیا ارادہ ہے میں نے گذارش کی کہ حالانکہ پینشن کا زمانہ قریب آگیا ہے لیکن میں نے کبھی اس معاملہ پر غور نہیں کیا۔ فرمانے لگے کہ آپ کو سیاست میں آنا چاہیے اور یہ بھی فرمایا کہ جب آپ ریٹائرڈ ہوں گے تو میں آپ کو راجیہ سبھا میں نامزد کراؤں گا یا اگر آپ چاہیں کے تو کانگریس سے ٹکٹ دلوا دوں گا۔ کچھ عرصہ کے بعد مولانا پر فالج کا حملہ ہوا۔ میں تھوڑے تھوڑے وقفہ سے سنگرور سے فون پر ان کی خیریت دریافت کرتا تھا۔ اجمل خاں سے بات ہوتی تھی اور وہ فرماتے تھے کہ اب دوا کی نہیں دُعا کی ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے کیا لاکھوں، کروڑوں لوگوں نے دُعائیں مانگی ہوں گی لیکن وہی ہوتا ہے جو منظورِ خُدا ہوتا ہے۔ دو دن کے بعد مولانا اپنے معبودِ حقیقی سے جاملے جو اِس دُنیا میں آیا ہے اُسے ایک روز جانا بھی ہے لیکن مولانا کی وفات سے ملک کی سیاست میں ایک ایسا خلا پیدا ہوگیا جو اب تک بھی نہیں پُر ہوسکا۔

مرحبا اے ابوالکلام آزاد۔ تا قیامت رہے گی تیری یاد
قید خانوں میں خود رہا ہوں۔ ملک کو قید سے کیا آزاد



تقسیم کے فوراً ہی بعد رفیوجیوں کو بسانے کا مسئلہ سامنے آیا۔ جو مکان مسلمان خالی کر گئے تھے ان پر رفیوجیوں نے قبضہ کر لیا تھا اور کچھ لوکل لوگوں نے قفل لگا رکھے تھے۔ جن میں سے بعض نے رفیوجیوں سے پگڑی لے کر ایسے کچھ مکان ان کے حوالے کر دیے۔ ادھر حکومت کا تقاضہ تھا کہ ایسے سب مکان خالی کرائے جائیں۔ چنانچہ میری اور چند اور حضرات کی ڈیوٹی لگائی گئی کہ یہ مکان خالی کرائے جائیں اور وہ مسجدیں بھی جن پر رفیوجیوں نے قبضہ کر رکھا تھا۔ ہم لوگوں نے کافی محنت اور منت سماجت سے بہت سے مکان اور مسجدیں خالی کروالیں لیکن کچھ لوگوں نے مولانا سے شکایت کی کہ کام کی رفتار سست ہے۔ چنانچہ مولانا کے سامنے میری پیشی ہوئی۔ جب مولانا کے سامنے سارے واقعات رکھے گئے تو انھوں نے شکایت کرنے والوں کو سمجھایا کہ کام ٹھیک ڈھنگ سے ہو رہا ہے اور اس میں جلد بازی کی گئی تو اس کا اثر اُلٹا ہوگا بالآخر جب خدا خدا کر کے یہ کام تمام ہوا تو مولانا نے مجھے یاد فرمایا اور میری پیٹھ ٹھونکی اور گاندھی جی کو یہ تمام رپورٹ دی۔

وقت گزرتا گیا، میں دہلی سے تبدیل ہو کر سونی پت رہتک ہوتا ہوا گوڑگانوں ڈپٹی کمشنر لگ گیا۔ وہاں بھی میووں کو از سر نو آباد کرانے کا مسئلہ تھا لیکن وہ بھی بخوبی حل ہو گیا۔ مولانا کو مجھ پر اعتماد تھا اور میرے لیے یہ بات باعثِ فخر تھی۔ کچھ عرصہ بعد لوک سبھا کا چناؤ تھا۔ مولانا نے مجھے یاد فرمایا اور باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ ان کو کئی اضلاع سے چناؤ لڑنے کی پیش کش کی گئی ہے لیکن ان کا ارادہ گوڑگانوں سے لڑنے کا ہے چنانچہ وہ گوڑگانوں ہی سے لڑے الکشن کے دوران میں مخالف سیاسی جماعتوں نے یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا کہ مولانا ڈنڈے کے زور سے ووٹ لینا چاہتے ہیں ورنہ ان کو چاہیے تھا کہ وہ لوگوں کے پاس ووٹ مانگنے آتے۔ اجمل خاں نے مجھ سے دریافت کیا کہ میری کیا رائے ہے۔ میں نے کہا کہ جہاں تک میں عوام کی نبض دیکھ سکا ہوں وہ مولانا کے حق میں ہیں اور اگر مولانا کو آنا ہی ہے تو الیکشن کے بعد عوام کا شکریہ ادا کرنے کے لیے آئیں۔ چنانچہ الیکشن ہوا۔ مخالف پارٹیوں نے لاکھ کوشش کی لیکن مولانا کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ الیکشن کے ایک ہفتہ بعد مولانا نے گوڑگانوں ضلع کا دورہ کیا اور پلول فرید آباد گوڑگانوں وغیرہ میں بڑے بڑے جلسوں کو خطاب کیا اور شکریہ ادا کیا۔ لوگ عام طور پر الیکشن کے بعد بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے الیکشن کے دوران میں کیا کیا وعدے لوگوں کے ساتھ کیے ہیں لیکن مولانا نے گوڑگانوں کے لوگوں کا پورا پورا خیال رکھا اور ہر مناسب موقع پر امداد بھی فرمائی۔

> ... ایک روز میں اور جوش صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جوش صاحب کو کچھ کام تھا لیکن میں یوں ہی ساتھ ہو لیا۔ مولانا ملاقاتیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جب کچھ دیر رکنے کے بعد بھی ہماری باریابی نہ ہو سکی تو جوش صاحب کہنے لگے بھئی ہم تو اب چلتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے فوراً یہ شعر لکھ کر چپراسی کے حوالے کیا اور چل پڑے:
>
> نامناسب ہے خون کھولانا
> پھر کسی اور وقت مولانا

میں نے مولانا کے 'الہلال' کے کئی شمارے پڑھ رکھے تھے اور "غبار خاطر" بھی نظر سے گذر چکی تھی۔ نثر لکھنے میں وہ یقیناً صاحب طرز تھے مرصع مگر صاف زبان میں بڑے مؤثر انداز سے سب بات کہہ جاتے تھے۔ تقریر بھی اُن کی انھیں خوبیوں کی حامل تھی۔ فارسی کے اشعار ان کو ہزاروں یاد تھے اور اپنی تحریروں میں انھیں کثرت سے استعمال بھی فرماتے تھے۔ مولانا کے حافظے کے بارے میں یہ مشہور تھا کہ کسی کو ایک بار دیکھ لیتے تو وہ ان کے ذہن پر اس طرح نقش ہو جاتا تھا جیسے کیمرے میں تصویر۔

ایک روز میں اور جوش صاحب مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ جوش صاحب کو کچھ کام تھا لیکن میں یوں ہی ساتھ ہو لیا۔ مولانا ملاقاتیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ جب کچھ دیر رُکنے کے بعد بھی ہماری باریابی نہ ہو سکی تو جوش صاحب کہنے لگے بھئی ہم تو اب چلتے ہیں۔ میں نے انھیں لاکھ سمجھایا کہ مولانا نے تو آپ کو نہیں وقت دیا آپ خود ہی تشریف لائے ہیں ذرا اور انتظار کیجیے۔ جوش صاحب ان معاملات میں ضرورت سے زیادہ حساس تھے چنانچہ انھوں نے فوراً ہی یہ شعر لکھ کر چپراسی کے حوالے کیا اور چل پڑے:

نامناسب ہے خون کھولانا
پھر کسی اور وقت مولانا

ابھی ہم دس بیس قدم ہی گئے ہوں گے کہ اجمل خاں ہانپتے ہانپتے ہمارے پاس آئے اور کہا کہ مولانا کو تو آپ کے آنے کا علم ہی اب ہوا ہے آپ آئیے مولانا یاد فرما رہے ہیں چنانچہ ہم لوٹ آئے اور مولانا نے ہمیں بلا لیا اور معذرت کی کہ ہمیں انتظار کرنا پڑا۔ فرمانے لگے کہ تمام وقت سیاسی لوگوں کی صحبت میں گذر جاتا ہے جی بہت

۶۔ گرفتاری : ۹ اگست ۱۹۴۲ء
رہائی : ۱۵ جون ۱۹۴۵ء] ۳ سال ۲۴ دن
کل مدّت : ۹ سال ۷ ماہ ۲۴ دن
یعنی : ۳,۵۱۹ دن تقریباً
عمر کی کل مدّت : ۶۸ سال ۷ ماہ ۹ یا ۱۰ دن
یعنی : ۲۵۰۴۰ دن تقریباً

اس نئے حساب سے بھی نتیجہ وہی نکلتا ہے جو مولانا آزاد کے حساب سے نکلا تھا، یعنی کل زندگی کا ساتواں حصہ جیل میں گزرا' گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانے کے اندر گزرا۔" اس طرح مولانا کو جو افسوس تھا کہ : "وہ ساتویں حصے کی مناسبت کی بات مختل ہو گئی اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا" وہ ازسرِ نو درست ہو گیا۔

اُردو

نہ تو صرف بول چال کی زبان ہے
نہ محض ایک ادبی اسلوب

اُردو

ایک تہذیب اور ایک طرزِ زندگی کا بھی نام ہے

ایوانِ اُردو دہلی

اس عالمی زبان کی ہمہ جہت صلاحیتوں کی ترجمانی کا خواہاں ہے
ہم چاہتے ہیں کہ

ایوانِ اُردو دہلی

کے صفحات پر صرف ادبی تحریروں ہی کو نہیں، علمی مضامین کو بھی زیادہ سے زیادہ جگہ دی جائے

ایوانِ اُردو دہلی

کے لیے ہمیں ایسے مضامین بھجوائیے جو سائنسی، تاریخی، سماجی، معاشرتی، طبّی اور نفسیاتی علوم کے ساتھ ساتھ موسیقی، مصوری اور رقص جیسے فنونِ لطیفہ کے بارے میں نئی آگاہی بہم پہنچانے والے ہوں۔ ہم ایسے مضامین کا پرتپاک خیر مقدم کریں گے۔

—— اِدارہ



مولانا آزاد کی گرفتاریاں اور سزائیں

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی مشہور اور مقبول ترین کتاب "غبار خاطر" کے ایک خط ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء میں اپنی گرفتاریوں اور سزاؤں کے بارے میں لکھا ہے: "قید و بند کی زندگی کا یہ چھٹا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ ۱۹۱۶ء میں پیش آیا تھا، جب مسلسل چار برس تک قید و بند میں رہا۔ پھر ۱۹۲۱ء، ۱۹۳۱ء، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۴۰ء میں یکے بعد دیگرے یہی منزل پیش آتی رہی اور اب پھر اُسی منزل سے قافلۂ بادپیمائے عمر گزر رہا ہے:

بازمی خواہم زسر گیرم رہ بیہودہ را

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہیں ہوگی۔ عمر کے ۵۳ برس جو گزر چکے ہیں ان سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب پڑتی ہے، گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانے کے اندر گزرا۔ تورات کے احکام عشرہ میں ایک حکم سبت کے لیے بھی تھا، یعنی ہفتے کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحیت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی، سو ہمارے حصے میں بھی سبت کا دن آیا، مگر ہماری تعطیلیں اس طرح بسر ہوئیں گویا خواجہ شیراز کے دستور العمل پر کاربند رہے:

نہ گویمت کہ ہمہ سال مے پرستی کن
سہ ماہ مے خور و نہ ماہ پارسامی باش

وقت کے حالات پیش نظر رکھتے ہوئے اس تناسب پر غور کرتا ہوں تو تعجب ہوتا ہے، اس پر نہیں کہ سات برس آٹھ مہینے قید و بند میں کیوں کٹے؟ اس پر کہ صرف سات برس آٹھ مہینے ہی کیوں کٹے؟

نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود"

مولانا نے حاشیے میں مزید لکھا ہے: "یہ مکتوب ۱۱ر اگست ۱۹۴۲ء کو لکھا تھا، اس کے بعد قید کے دو برس گیارہ مہینے اور گزر گئے اور مجموعی مدت سات برس آٹھ مہینے کی جگہ دس برس سات ماہ ہوگئی۔ اس اضافے کے خلاف کوئی شکوہ کرنا نہیں چاہتا، البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ ساتویں حصے کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی اور سبت کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔"[1]

مولانا آزاد نے اپنے اس خط میں اپنی گرفتاریوں اور سزاؤں کی جو مجموعی مدت لکھی ہے، وہ محض تخمینی ہے، مگر چونکہ لوگوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی اور تفصیل نہیں ہے، اس لیے مجبوراً اسی کا حوالہ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے غلطیوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا اخبارات سے تحقیق کرنے کے بعد ذیل میں جملہ گرفتاریوں اور سزاؤں کی صحیح مدت تاریخ وار پیش کرتا ہوں:

۱۔	رانچی کی نظربندی	اواخر مارچ ۱۹۱۶ء	تقریباً ۳ سال ۹ ماہ
	رہائی	یکم جنوری ۱۹۲۰ء	
۲۔	گرفتاری	۱۰ر دسمبر ۱۹۲۱ء	مقدمے کی مدت شامل کرکے تقریباً ایک سال ایک ماہ
	سزا	۹ر فروری ۱۹۲۲ء	
	رہائی	۶ر جنوری ۱۹۲۳ء	
۳۔	گرفتاری	۲۱ر اگست ۱۹۳۰ء	تقریباً ۶ ماہ
	رہائی	۲۷ر جنوری ۱۹۳۱ء	
۴۔	گرفتاری	۱۲ر مارچ ۱۹۳۲ء	۲ ماہ
	رہائی	۱۱ر مئی ۱۹۳۲ء	
۵۔	گرفتاری	۳ر جنوری ۱۹۴۱ء	تقریباً گیارہ ماہ
	سزا	۸ر جنوری ۱۹۴۱ء	
	رہائی	۴ر دسمبر ۱۹۴۱ء	

عبداللطیف اعظمی

۳۴۹، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

[1] ابوالکلام آزاد: غبار خاطر (تیسرا ایڈیشن) صفحات ۵۵-۵۶۔



نویسی" (مئی ۱۹۰۲ء) اور حکیم خاقانی شروانی (اگست ۱۹۰۲ء) شائع ہوئی تھیں۔ اس کم عمری میں ان تحریروں نے اہلِ نظر کو مولانا آزاد کی طرف متوجہ کر دیا تھا۔

"فنِ اخبار نویسی" مولانا آزاد کا پہلا مضمون تھا جس سے ان کی صحافت سے گہری دلچسپی اور باخبری کا پتا چلتا ہے۔ اس عمر میں ان کی یہ باتیں حیرت میں ڈالتی ہیں:

"یورپ اور امریکہ نے جو آج کل حیرت انگیز ترقی کی ہے اور علوم وفنون تہذیب و شائستگی میں جو ان کا آج طوطی بول رہا ہے ان میں منجملہ اور اسباب ترقی کے ایک بڑا سبب اخبار دیکھنا ہے جسے اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک اور بچے سے لے کر بوڑھے تک روزانہ ہر ایک دیکھا کرتا ہے اور علمی عملی فیوضات حاصل کرتا ہے۔"

انھوں نے یہ بھی تحریر کیا ہے:

"اخبار دراصل زندہ ہادی ہے جو ہر قسم کی باتوں میں ہدایت کرتا ہے۔"

۱۹۰۲ء ہی میں مولانا آزاد کی مندرجۂ ذیل تحریریں ہفتہ وار 'الپنچ' پٹنہ میں چھپی تھیں۔

۱۔ جشنِ تاجپوشی کا کلکتہ میں دلچسپ مشاعرہ ۵ر جولائی ۱۹۰۲ء۔

۲۔ اک بتِ سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد ۴ر اکتوبر ۱۹۰۲ء۔

پہلی تحریر مشاعرے کی روداد ہے جس کے مطالعے سے اس وقت کے مولانا آزاد میں انگریزوں سے کسی نفرت کے احساس کے بجائے "انگریز بہادر" کی حکومت سے "وفادار رہنے" کے جذبے کا احساس ہوتا ہے۔ مولانا آزاد کے ذہنی سفر کو سمجھنے اور اس کی ارتقائی منازل سے آگاہی کے لیے اس مضمون کی بڑی اہمیت ہے۔ اس سلسلے میں دوسری تحریر بھی بڑی معاون ہے اور ان کے قومی شعور پر روشنی ڈالتی ہے۔

'ایڈورڈ گزٹ' شاہجہانپور پہلا ہفتہ وار تھا جس کے مولانا آزاد باضابطہ وقتی اڈیٹر تھے۔ لیکن ابھی اس کی ایڈیٹری کے زمانے کا صحیح تعین نہیں ہو سکا ہے نہ اس کے شمارے اب تک دستیاب ہو سکے ہیں جن کے مطالعے سے صحیح صورتِ حال سے واقفیت ہو۔

'احسن الاخبار' بند ہو جانے کے بعد سید احمد حسن صاحب کو ایک بار پھر "تحفۂ احمدیہ" جاری کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اس بات کا علم جیسے ہی مولانا کو ہوا انھوں نے احمد حسن صاحب کو اس خیال کو عملی جامہ پہنانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ احمد حسن تیار ہو گئے۔ مگر اس شرط پر کہ آزاد اس کی ترتیب کی ذمہ داری سنبھالیں۔ آزاد تو خواہشمند تھے ہی ان کی شرط مان لی۔ اس طرح یہ رسالہ بظاہر احمد حسن کی ادارت میں نکلتا رہا۔ لیکن ترتیب کی ذمہ داری آزاد ہی سنبھالے رہے۔

...اس سفر کے ابتدائی سرے کی اگر تلاش کی جائے تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا سرا' ان کی ابتدائی شعر وشاعری سے جا ملتا ہے۔ اسی زمانے میں انہیں احساس ہوا تھا کہ شعر و شاعری کا لطف گلدستوں میں کلام کی اشاعت سے...

اسی زمانے میں ایک نہایت صاف ستھرا اور معیاری رسالہ "خدنگ نظر" منشی نوبت رائے نظر کی ادارت میں لکھنؤ سے نکل رہا تھا۔ مولانا آزاد کی اس رسالے سے دلچسپی لینے کی وجہ سے منشی نوبت رائے نظر نے اس کے حصۂ نثر کی ذمہ داری انھیں سونپ دی۔ چنانچہ آزاد نے مارچ ۱۹۰۳ء کے بعد بحیثیت اسسٹنٹ اڈیٹر اس رسالے کے لیے کام کرنا شروع کیا۔ اس عہدے کو سنبھالنے سے پہلے ان کے حسبِ ذیل مضامین اس رسالے میں شائع ہو چکے تھے۔

۱۔ زمانۂ قدیم میں کبوتروں کی ڈاک (دو قسط) مئی، جون۔ ۱۹۰۲ء۔

۲۔ پینچوئیشن۔ غالباً اکتوبر ۱۹۰۲ء

۳۔ مبادلۂ سنین جنوری ۱۹۰۳ء

۴۔ آثارِ قدیمہ فروری ۱۹۰۳ء

۵۔ منار خسروگرد (بسلسلۂ آثارِ قدیمہ) مارچ۔ ۱۹۰۳ء

اور "خدنگ نظر" کے حصۂ نثر کی ادارت سنبھالنے کے بعد مولانا آزاد کی یہ تحریریں منظرِ عام پر آئیں۔

۶۔ افغانستان اپریل ۱۹۰۳ء

۷۔ ضوغیر مرئی (دو قسط) مئی۔ جولائی۔ ۱۹۰۳ء۔

ان تحریروں کے مطالعے سے مولانا آزاد کی اس عمر میں مختلف موضوعات "تاریخ" جغرافیہ، سائنس اور دوسرے علوم سے لگاؤ ہی کا پتا نہیں چلتا اس وقت ان کی توقعات اردو رسائل سے کیا تھیں ان سے بھی آگاہی ہوتی ہے۔

یہی وہ زمانہ ہے جب وہ ایک طرف تعلیم سے فارغ ہو رہے تھے تو دوسری طرف کلکتہ کی شعری فضا میں دھوم مچا کر اس سے علیحدگی اختیار کرنے کی فکر میں تھے اور نثری میدان میں ایک خاص اندازِ فکر کے ساتھ قدم جمائے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے اور اُردو صحافت میں اپنی پہچان

آزاد وادیِ صحافت میں

(۱۹۰۸ء تک)

مولانا ابوالکلام آزاد کی زندگی کا مطالعہ اور ان کی صحافتی خدمات کا جائزہ لینے سے یہ بات بہت واضح طور سے سامنے آتی ہے کہ ان کی دیگر خصوصیات اور خوبیاں جو کچھ بھی ہوں، وہ علم و عرفان کی جس بلندی پر پہنچ گئے ہوں، فکر و عمل کی جن منزلوں کو انھوں نے پالیا ہو، وہ ایک صحافی کا دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے، اسی وجہ سے ابھی وہ نثر کی ابتدائی منزل میں ہی تھے کہ "المصباح" جاری کر کے صحافت کی راہ پر چلنے کا اعلان کر دیا تھا اور پھر اس راہ پر تقریباً اٹھائیس سال تک چلتے رہے۔

اس سفر کے ابتدائی سرے کی اگر تلاش کی جائے تو یہ بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس کا سرا، ان کی ابتدائی شعر و شاعری سے جا ملتا ہے۔ اسی زمانے میں انھیں احساس ہوا تھا کہ شعر و شاعری کا لطف گلدستوں میں کلام کی اشاعت سے ہے۔ چنانچہ جب پہلی بار ان کا کلام "ارمغان فرخ" بمبئی میں شائع ہوا تو وہ بے حد خوش ہوئے اور بہت دنوں تک ایک عجیب سرشاری کی کیفیت سے آشنا رہے۔

گلدستوں کی شعر و شاعری میں اہمیت اور ابتدائی زمانے کے کلام کے اُن میں چھپنے کی پوشیدہ لذت نے مولانا آزاد کے دل میں گلدستہ نکالنے کی خواہش پیدا کر دی، جس کی تکمیل شاید ۱۸۹۹ء میں "نیرنگ عالم" نامی گلدستہ نکال کر انھوں نے کی۔ لیکن اس نے مختصر عمر غالباً اس لیے پائی کہ مولانا آزاد نے جلد ہی ایک ادبی رسالہ "المصباح" نکالنے کا نہ صرف فیصلہ کر لیا۔ بلکہ جنوری ۱۹۰۱ء میں اسے نکالنے میں کامیابی حاصل کی، جسے انھوں نے علمی، تاریخی اور سوانحی مضامین کے لیے مخصوص کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس کے شمارے دستیاب نہیں ہیں نہ ہی اس کا علم ہو سکا کہ اس کے کتنے شمارے منظر عام پر آئے اور کب، اور کن حالات میں یہ رسالہ بند ہو گیا۔ قیاس یہی ہے کہ اس کے تین چار شمارے ہی شائع ہو سکے تھے۔ مولانا آزاد کی ادارت میں یہ پہلا ادبی ماہنامہ تھا۔ جس نے بحیثیت نثر نگار آزاد کو ایک محدود حلقے سے روشناس کرایا تھا۔ یہ رسالہ چونکہ عید کے موقعے پر نکلا تھا اس لیے مولانا آزاد نے "عید"[1] سے متعلق ایک مضمون پہلے ہی شمارے کے لیے قلمبند کیا تھا، جو بعد میں دوسرے اخباروں میں بھی نقل کیا گیا تھا۔

"المصباح" کے بند ہو جانے کے بعد مولانا آزاد ہفتہ وار "احسن الاخبار" سے منسلک ہو گئے۔ یہ ہفتہ وار احمد حسن صاحب کی ادارت میں ۱۹۰۰۰ء یا ۱۹۰۱ء سے نکلنا شروع ہوا تھا۔ مولوی احمد حسن کو مولانا آزاد کی صلاحیتوں پر بڑا اعتماد تھا اس لیے اخبار کا تقریباً تمام کام ان کے سپرد کر دیا تھا، اسی اعتماد کی وجہ سے مولانا آزاد کا لکھا ہوا براہِ راست کاتب تک پہنچ جاتا تھا مولوی احمد حسن دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

یہیں مولانا آزاد کو غیر ملکی عربی اخبارات اور رسائل دیکھنے کا موقع مل جاتا تھا جن کے مطالعے سے انھیں دنیائے اسلام سے گہری دلچسپی پیدا ہونے لگی تھی "احسن الاخبار" کے لیے مولانا آزاد بعض اہم تحریروں کے ترجمے بھی کرتے تھے۔ اسی اخبار میں مولانا آزاد کا ایک مضمون "اسلام اور محرم" کے موضوع پر شائع ہوا تھا جس نے بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔

اسی زمانے میں حکیم محمد علی کی ادارت میں "مرقع عالم" ہردوئی سے نکلتا تھا جس میں آزاد کی تحریریں بھی شائع ہوتی تھیں۔ جون ۱۹۰۲ء میں حکیم محمد علی کے نام مولانا آزاد کا ایک مکتوب شائع ہوا تھا جس سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے "علوم جدیدہ اور اسلام" کے عنوان سے ایک مضمون "مرقع عالم" میں اشاعت کے لیے بھیجا تھا۔ اس خط میں مولانا آزاد نے اڈیٹر کو اس بات پر توجہ دلائی تھی کہ "مرقع عالم" میں سائنس سے متعلق جو مضامین شائع ہو رہے ہیں۔ ان سے جو خرابیاں پیدا ہوں گی ان کی روک تھام کی فکر بھی کرنی چاہیے۔

یہ آزاد کی پہلی تحریر ہے جس سے ان کی صحافت سے باخبری کا پتا چلتا ہے۔ ماہنامہ "مخزن" لاہور جو اپنے زمانے کا نہایت معیاری رسالہ تھا مولانا آزاد کی دو نثری تحریریں "فن اخبار

عبدالقوی دسنوی
ریٹائرڈ پرنسپل سیفیہ کالج بھوپال (ایم۔پی)

[1] : ارمغانِ آزاد : ابوسلمان شاہجہانپوری۔ ص۔ ۱۰۸



اور ذہنی سکون کا سامان تھا چنانچہ اس کے ادارے میں بحیثیت اسسٹنٹ اڈیٹر مولانا آزاد کا نام شامل ہوا۔ لیکن یہاں بھی وہ زیادہ مدت تک کام نہ کرسکے کل چھ ماہ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک وہ الندوہ کی ادارت میں شامل رہے۔ اس دوران میں ان کی حسب ذیل تحریریں اس رسالے میں شائع ہوئیں:

مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ۔
اکتوبر ۱۹۰۵ء۔

المراۃ المسلم۔ نومبر ۱۹۰۵ء، دسمبر ۱۹۰۵ء
فروری ۱۹۰۶ء۔

علمی خبریں۔ دسمبر ۱۹۰۵ء، جنوری ۱۹۰۶ء
مارچ ۱۹۰۶ء۔

ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانے کی ضرورت۔ فروری ۱۹۰۶ء

القضا فی الاسلام۔ فروری ۱۹۰۶ء

یورپ میں گونگوں کی تعلیم۔ مارچ ۱۹۰۶ء

ندوہ سے اس چھ سات مہینے کے تعلق اور الندوہ کی ادارت نے مولانا آزاد کو علامہ شبلی سے قربت اور تربیت حاصل کرنے کا زبردست موقع فراہم کردیا اور انھوں نے اس موقعے سے پوری طرح فائدہ اٹھایا، وہ اپنے آپ کو زیادہ باصلاحیت بنانے اور ایک وسیع حلقے میں روشناس کرانے میں کامیاب ہوئے لیکن یہ زمانہ بہت مختصر تھا۔ مارچ ۱۹۰۶ء کے بعد وہ کسی سبب سے الندوہ سے الگ ہوگئے جس کی اطلاع ملتے ہی شیخ غلام محمد (مالک "وکیل" امرتسر) کو ہوئی انھوں نے "وکیل" کی ادارت قبول کرنے کے لیے مولانا آزاد سے خواہش کی۔ آزاد راضی ہوگئے اور امرتسر پہنچ گئے۔ اس اخبار سے وہ پہلی بار اپریل ۱۹۰۶ء سے نومبر ۱۹۰۶ء تک منسلک رہے اگرچہ عمر کے لحاظ سے "وکیل" جیسے اخبار کی ادارت آزاد کے لیے آسان نہ تھی۔ لیکن انھوں نے ہمت کی اور کامیاب ہوئے۔ لیکن ابھی اس اخبار میں آئے چھ مہینے ہی ہوئے تھے کہ ستمبر میں آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر آہ کا انتقال ہوگیا۔ جس کی وجہ سے ان کے والد مولانا خیرالدین نے انھیں کلکتہ واپس بلالیا، اور کوشش کی کہ وہ اُن کے ساتھ کلکتہ ہی میں رہیں اور ان کے کام کو سنبھالیں۔ اسی غرض سے ان کی شادی بھی کردی اور "دارالسلطنت" کلکتہ جو کچھ عرصہ پہلے بند ہوگیا تھا دوبارہ آزاد کی ادارت میں جاری کرانے کی کوشش کی۔ اس مقصد میں مولانا آزاد کے والد اور احباب کامیاب ہوئے۔ یہ بات غالباً دسمبر ۱۹۰۶ء کی ہے۔ ۱۹۰۷ء کے ابتدائی مہینوں میں "دارالسلطنت" مولانا آزاد کی ادارت میں نکلنا شروع ہوا، البتہ یہ بات اب بھی تحقیق طلب ہے کہ مولانا آزاد کب تک اس سے متعلق رہے۔ اس لیے کہ اس کی جلدیں دستیاب نہیں ہیں۔ مولانا آزاد کی اس سے علیحدگی کی وجہ شاید اخبار کے مالک اور مولانا آزاد کے انداز فکر کا فرق تھا، اس کے مالک ہر معاملے میں مداخلت کرتے تھے جو آزاد پسند نہیں کرتے تھے۔

"دارالسلطنت" سے بے تعلقی کے بعد "وکیل" امرتسر کے مالک کی ایک بار پھر کوشش ہوئی کہ آزاد ایک بار پھر "وکیل" کی ادارت میں شامل ہوجائیں اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے مولانا آزاد اگست یا ستمبر ۱۹۰۷ء میں اس کی ادارت میں شامل ہوگئے۔ اور اس بار ان کا تعلق اس اخبار سے تقریباً ایک سال رہا۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں وہ اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ البتہ یہ بات آج تک سمجھ میں نہیں آئی کہ وہ کیوں اسے چھوڑ کر چلے گئے۔ شاید اس کی وجہ وہی ہو جو کہ "دارالسلطنت" سے علیحدگی کی تھی۔ یعنی اس کے مالک شیخ غلام محمد اور مولانا آزاد کے خیالات میں اتفاق نہ ہوسکا ہو۔ مولانا آزاد اپنے اصول اور انداز فکر کبھی بھی بدلنا پسند نہیں کرتے تھے۔

اس طرح مولانا آزاد کا وہ صحافتی سفر جو ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۱ء میں المصباح سے شروع ہوا تھا اس کا پہلا مرحلہ جولائی ۱۹۰۸ء میں وکیل امرتسر کی ادارت پر ختم ہوا۔ یہ زمانہ جو تقریباً آٹھ سال پر محیط ہے آزاد کی صحافتی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے اسی میں اُنھوں نے صحافتی تجربے حاصل کیے۔ مضامین لکھنے کے سلیقے سے انھیں آگاہی ہوئی، مدیر کی ذمہ داریوں سے واقفیت ہوئی۔ بیتھو کی خامیوں اور خرابیوں کے تجربے سے وہ گذرے۔ اسی دوران میں اُنھیں ایک اچھے مدیر کی اہمیت اور قدر و قیمت کو سمجھنے میں مدد ملی اور وہ ایک معیاری اور معتبر ہفتہ وار نکالنے کی ہمت کرنے لگے اور آخر وہ کامیاب ہوئے۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو ان کا آٹھ سالہ تجربہ ہفتہ وار "الہلال" کی صورت میں طلوع ہوا جس نے مولانا آزاد کے نام کو گھر گھر پہنچایا اور مقبول بنایا۔

کرانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے اور اس حد تک وہ کامیاب ہو چکے تھے کہ اہلِ علم اور اصحابِ فکر کی آنکھیں ان کی طرف اٹھنے لگی تھیں اور وہ انھیں یہ باور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ وہ پندرہ سال کے نوعمر لڑکے نہیں ہیں بلکہ کوئی سن رسیدہ تجربہ کار صحافی اور باصلاحیت شخص ہیں۔

طالب علمی کے زمانے کی نثر نگاری اور صحافتی تجربوں نے ہمت بندھائی اور اب آزاد اپنا ایک بامقصد ماہنامہ نکالنے کی فکر کرنے لگے۔ دھن کے پکے تھے، حوصلہ مند تھے، بلند ہمت تھے۔ خواہشات کو عملی جامہ پہنانا جانتے تھے۔ اس لیے اس خواہش کی تکمیل میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ اختتام تعلیم کے چند ماہ بعد ہی ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء کو کلکتہ سے ایک سو صفحات کا ماہنامہ "لسان الصدق" کے نام سے نکالنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ ماہنامہ ہادی پریس ہریسن روڈ دارالسلطنت کلکتہ سے شائع ہوا، جس میں "عام علمی، اخلاقی، تاریخی، سائنٹفک" موضوعات کے علاوہ حسب ذیل چار مقاصد سے متعلق تحریریں شائع کرنے کا اعلان ہوا:

۱۔ سوشل ریفارم ۲۔ ترقی اردو ۳۔ تنقید ۴۔ علمی مذاق کی اشاعت خصوصاً بنگالہ میں اور اس کے پہلے شمارے کے پہلے نصف صفحے پر یہ عبارت تھی:

"الصدق ینجی والکذب یہلک" لسان الصدق کا دستور العمل ہے اس کا فرض ہے کہ یہ قوم کو کذب سے بچائے اور راستی پر لائے جب اس کا فرض منصبی صرف حق گوئی قرار دیا گیا تو اس کی امید قوم کو اس سے نہیں رکھنی چاہیے کہ یہ انھیں ایسے ترانے سنائے گا جو نہایت شیریں معلوم ہوں گے۔ سچی بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے پھر "سچائی کی زبان" کیوں کر شیریں معلوم ہوگی؟ یہ ہمیشہ تم کو کڑوی کسیلی باتیں سنائے گا جو اگرچہ تمھیں ناگوار معلوم ہوں گی لیکن اس زمانے کو دور نہ سمجھو جبکہ صدق کا منجی ہونا اور کذب کا مہلک ہونا تم پر ظاہر ہو جائے گا۔"

نومبر ۱۹۰۳ء سے مئی ۱۹۰۵ء تک

اس رسالے کے کل تیرہ شمارے نکلے جن میں جون جولائی ۱۹۰۴ء، اگست ستمبر ۱۹۰۴ء اور اپریل مئی ۱۹۰۵ء کے شمارے مشترک تھے۔ آزاد کے علاوہ اس کے مضمون نگاروں میں محمد یوسف رنجور عظیم آبادی، ابوالنصر آہ دہلوی، شمس العلما مولانا شبلی نعمانی، رضا علی وحشت، سید محمد سعید بلگرامی، محسن الملک اور سید شاہ حسین انیم امروہوی کے نام اہم ہیں۔

بلاشبہ اس رسالے نے اپنے جن چار مقاصد کا ابتدا میں اعلان کیا تھا اُن پر سختی سے کاربند رہا، اس کے ذریعے مسلمانوں کی معاشرتی برائیوں اور مذموم رسوم کی اصلاح کی برابر کوشش کی گئی۔ اس نے ترقی اُردو کے لیے احساس دلایا، اور فکر مند بنایا اور اپنے قارئین میں علمی مذاق پیدا کرنے کے لیے فضا تیار کی۔ اور مفید و بے لاگ تبصروں کے ذریعے اردو ادب کی خدمت کی۔ تبصروں میں سب سے طویل اور اہم تبصرہ "حیات جاوید" پر مولانا آزاد کے قلم سے لسان الصدق کے صفحات پر محفوظ ہے۔ لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود یہ رسالہ بھی زیادہ دنوں تک نہ نکل سکا۔ اس کے لیے یہ کہنا درست ہے:

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

بلاشبہ اس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اپنی کم عمری کے باوجود مولانا آزاد اچھے مدیر کی بہت سی خوبیاں رکھتے تھے اور صحافتی ذمہ داریوں سے آگاہ تھے جن سے وہ اس رسالے کی ادارت کے دوران غافل نہ رہے۔ اس ماہنامے کے مطالعے کے دوران، ان کے سیاسی شعور کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ اور معاشرتی زندگی سے ان کی دلچسپی اور اردو کے لیے فکرمندی کا احساس ہوتا ہے۔

اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ وہ مضبوط ارادے، بلند عزائم اور بے پناہ ہمت اور حوصلے کے مالک تھے انھوں نے اسی زمانے میں اپنے راستے اور اپنی منزل کا تعین کر لیا تھا اور اپنی منزل کو پانے کے لیے اس راہ پر مستقل مزاجی سے چل نکلے تھے۔

اس دوران میں مولانا آزاد نے مولانا شبلی، حالی اور دوسرے اہلِ علم کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں بڑی کامیابی حاصل کی تھی۔ حالی اور شبلی کو خود انھوں نے بھی جاننے پہچاننے کی کوشش کی تھی۔ اور ذہنی طور پر ان دونوں حضرات کے بہت قریب آ گئے تھے۔ انھوں نے ان کے مخالفوں کی نہ صرف سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی بلکہ ان کی خوبیوں اور صلاحیتوں سے اردو والوں کو آگاہ کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔

"حیاتِ جاوید" پر شیخ عبدالقادر اور حبیب الرحمٰن خاں شروانی نے سخت تبصرے کیے تھے جن کا تفصیلی اور مدلل جواب لسان الصدق کے صفحات پر مولانا آزاد نے دیا اور مولانا شبلی کی مخالفتوں کا بھی انھوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ حضرات بھی مولانا آزاد کے قریب آئے اور ان کی قدر افزائی کی۔

علامہ شبلی تو ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انھیں ندوہ آنے کی دعوت دی اور الندوہ کی ادارت میں شمولیت کے لیے اُن کو آمادہ کیا ——— آزاد راضی کیوں نہ ہوتے۔ وہ شبلی کی بہت عزت کرتے تھے۔ الندوہ کی ادارت میں شمولیت میں ان کے قلبی

لانا چاہتے تھے، قومی اور ملّی بیداری پیدا کرنے کے متمنی تھے اور ایثار و قربانی کے جذبے کے ساتھ غفلتوں کو نابود اور مایوسیوں میں حیات پرور حوصلوں کو بیدار کرنا چاہتے تھے۔ "الہلال" کے پہلے ہی شمارے کے ذریعے ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء کو ہندوستانی معاشرے میں یہ آواز گونج اُٹھی۔

"آہ کاش مجھے وہ صور قیامت ملتا جس کو میں لے کر پہاڑوں کی بلند چوٹیوں پر چڑھ جاتا۔ اسی ایک صدائے رعدآسائے غفلت شکن سے سرگشتگانِ خواب ذلت و رسوائی کو بیدار کرتا اور چیخ چیخ کر پکارتا کہ اُٹھو! کیوں کہ بہت سو چکے اور بیدار ہو کیونکہ تمھارا خدا تمھیں بیدار کرنا چاہتا ہے اور تمھیں موت کی جگہ حیات زوال کی جگہ عروج اور ذلت کی جگہ عزت بخشنا چاہتا ہے۔"

اسی شمارے میں اپنے ایثار پسندانہ اور مجاہدانہ نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے صدا لگائی تھی:

"ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاشِ زیان و نقصان میں آئے ہیں صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں۔"

ایک رئیس کی طرف سے ایک خطیر رقم کا چیک بطور اعانت بھیجے جانے پر مولانا نے یہ چیک واپس کرتے ہوئے لکھا تھا:

"ہمارے عقیدے میں تو جو اخبار اپنی قیمت کے سوا کسی انسان یا جماعت سے کوئی اور رقم لینا جائز رکھتا ہو، وہ اخبار نہیں بلکہ اس فن کے لیے ایک دھبہ اور سرتاسر عار ہے ہم اخبار نویسوں کی سطح کو بہت بلندی پر دیکھتے ہیں اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض الٰہی ادا کرنے والی جماعت سمجھتے ہیں۔ بس اخبار نویس کے قلم کو ہر طرح کے دباؤ سے آزاد ہونا چاہیے اور چاندی سونے کا سایہ بھی اس کے لیے سم قاتل ہے۔ جو اخبار نویس رئیسوں کی فیاضیوں اور امیروں کے عطیوں کو قومی عطیہ اور اسی طرح کے فرضی ناموں سے قبول کر لیتے ہیں وہ بہ نسبت اس کے کہ اپنے ضمیر اور نور ایمان کو بیچیں بہتر ہے کہ دریوزہ گری کی جھولی گلے میں ڈال کر اور قلندروں کی کشتی کی جگہ قلم دان لے کر رئیسوں کی ڈیوڑھیوں پر گشت لگائیں اور ہر گلی کوچہ "کام ایڈیٹر کا" کی صدا لگا کر خود اپنے تئیں فروخت کرتے رہیں۔"

مولانا سمجھتے تھے کہ صحافت رائے عامہ میں

"... ہم اس بازار میں سودائے نفع کے لیے نہیں بلکہ تلاشِ زیان و نقصان میں آئے ہیں صلہ و تحسین کے لیے نہیں بلکہ نفرت و دشنام کے طلب گار ہیں۔ عیش کے پھول نہیں بلکہ خلش و اضطراب کے کانٹے ڈھونڈتے ہیں ..."

انقلاب برپا کرنے کا ایک موثر اور طاقتور وسیلہ ہے اور اس کے ذریعے قومی اور ملّی زندگی میں ایک نئے عزم حیات کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔ اس کی صراحت انھوں نے ۷ جولائی ۱۹۱۲ء کے "الہلال" میں ان لفظوں میں کی:

"نہ صرف علم و ادب کی ترقی کے لیے بلکہ قومی اور اجتماعی زندگی کی نشو و نما کے لیے ان کا (مطبوعات) کا وجود ناگزیر ہے۔ علم و ادب کی صحیح ترقی بجائے خود قوم کے اجتماعی ذہن و فکر کی ترقی ہے۔ جیسی جیسی اس کی سطح بلند ہو گی اتنی ہی قومی زندگی کی سطح بھی بلند ہوتی جائے گی جہاں تک پریس اور صحافت کا تعلق ہے دنیا اس قدر آگے نکل چکی ہے کہ اب دس برس پیشتر کی صحافت صدیوں کی پرانی چیز معلوم ہوتی ہے۔ قومی زندگی کی تعمیر کے لیے ایک بنیادی اینٹ زبان ہے۔ زبان کی ترقی کے لیے پہلی چیز اس کی ادبیات ہیں۔ ادبیات کی نشو و نما اعلیٰ درجے کے رسائل و مطبوعات کے بغیر ممکن نہیں۔"

سیاسی بیداری، حب الوطنی اور قوم دوستی کے احساسات کو چھیڑ کر مولانا نے حریت پسندوں کے جوش و خروش کو آگے بڑھایا اور آزادی کی طلب کو قوم کی ایک فطری طلب بنا دیا۔ دسمبر ۱۹۱۲ء کے "الہلال" کے یہ جملے آج بھی مولانا کے حریت پسندانہ محکم عزائم کی یاد دلاتے ہیں:

"ہندوؤں کے لیے ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنا داخلِ حب الوطنی ہے۔ لیکن مسلمانوں کے لیے ایک فرض دینی ہے اور داخلِ جہاد فی سبیل اللہ۔ اللہ نے ان کو اپنی راہ میں مجاہد بنایا ہے اور جہاد کے معنی میں ہر وہ کوشش داخل ہے جو حق اور صداقت اور انسانی بند و استبداد و غلامی توڑنے کے لیے کی جائے۔"

یہی وہ دعوت فکر و عمل تھی جسے پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک "نئی دعوت" قرار دیتے ہوئے ——— "THE DISCOVERY OF INDIA" میں لکھا تھا:

"مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار "الہلال" سے مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا۔ یہ ایک ایسا اندازِ خطاب تھا جس سے ہندوستانی مسلمان آشنا نہ تھے۔ وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجے سے واقف تھے۔ سر سید، محسن الملک، نذیر احمد اور حالی کے اندازِ بیان کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا ان تک پہنچا ہی نہ تھا "الہلال" مسلمانوں کے کسی بھی مکتب خیال

آزاد — وادیٔ صحافت میں

(۱۹۰۸ء کے بعد)

مولانا ابوالکلام آزاد کی ولادت ۱۸۸۸ء میں یعنی پہلی ناکام جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے کم و بیش تیس برس بعد ہوئی۔ یہ تاریخی صداقت ہمارے پیشِ نظر ہے کہ ۱۸۵۷ء سے انیسویں صدی عیسوی کے آخری برسوں میں اصلاحی سرگرمیوں نے قومی شعور، قومی احساس اور قوم پرستانہ آرزومندی کے چراغ کی لو کو تیز کرنا شروع کیا۔ حتیٰ کہ بیسویں صدی کے اوائل ہی میں قومی اور سیاسی سطح پر ہندوستانیوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے باضابطہ جدّوجہد کا آغاز ہوگیا۔ انگریزوں نے اپنے اقتدار کی حفاظت کے لیے ہندوستانیوں کے بڑھتے ہوئے حوصلوں اور عزائم کے خلاف اپنے اقدامات میں جیسے جیسے اضافہ کیا، ہندوستان کے عوام میں اضطراب و استعجاب کی رو اتنی ہی تیز تر ہوتی گئی۔ یہی زمانہ ابوالکلام آزاد کی ذہنی نشو و نما کا تاریخی پس منظر فراہم کرتا ہے۔ اپنے عہد کے نامساعد حالات سے انھوں نے جو اثرات قبول کیے، ان کے لازمی ردِّ عمل کے طور پر ان کے باطن میں ایک انقلابی روح نے انگڑائی لی۔ اپنی تحریر و تقریر اور دانشورانہ قیادت کے ذریعے مولانا نے ایک خوابیدہ معاشرے میں زندگی کی تڑپ پیدا کردی، اور ان کی علمی اور عملی، صحافتی اور سیاسی جدوجہد نے ہندوستانی قوم کو ایک نئی شاہراہ پر لا کھڑا کیا۔ نیاز فتحپوری ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

• وہ اگر عربی شاعری کی طرف توجہ کرتے تو متنبّی و بدیع الزماں ہوتے۔ اگر وہ محض دینی و مذہبی اصلاح کو اپنا شعار بنا لیتے تو اس عہد کے ابن تیمیہ ہوتے اگر علوم حکمیہ کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیتے تو ابن رشد اور ابن طفیل سے کم درجے کے متکلم فیلسوف نہ ہوتے اگر وہ فارسی شعر و ادب کی طرف متوجہ ہوتے تو عرفی و نظیری کی صف میں انھیں جگہ ملتی۔ اگر وہ تصوف و اصلاح کی طرف مائل ہوتے تو غزالی اور رومی سے کم نہ ہوتے۔ اور اگر وہ مسلک اعتزال اختیار کرتے تو دوسرے واصل بن عطا ہوتے۔"[۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت کا بالاستیعاب مطالعہ اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں انسانی آزادی کے اس بنیادی حق کی وکالت اور غیر مصلحت پسندانہ حمایت پر اپنی توجہ مرکوز رکھی، جسے آج انسانی معاشرے کا بنیادی تقاضا تصور کیا جا رہا ہے۔ اس کے لیے ریاضتوں کے ساتھ ساتھ رواداری، صبر و ضبط اور مذہبی حق پسندی کا جو تصور ان کے پیشِ نظر رہا ہے اس کی نشاندہی اروناآصف علی نے درجِ ذیل سطروں میں کی ہے۔

"Tolerance to him did not mean religious tolerance. He believed in absolute right of individual to differ and hold whatever opinion be believed to be correct."[۳]

محمد حامد علی خاں
معرفت پروفیسر محمد امجد علی خاں، جیل روڈ، چندوارہ،
مظفر پور ۸۴۲۰۰۱ (بہار)

جس کی تائید خود مولانا کی زبانی ملاحظہ فرمائیں :

"I have never tried to find the footpath of another, but have sought out a path for myself and left my foot prints for those who come."[۲]

اصلاحی تحریک کے آغاز و فروغ کے بعد، اردو صحافت کی روایات کی توسیع و ترقّی کے سلسلے میں مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت بے حد اہم اور ممتاز ہے جنھوں نے ایک ایسی حیات آفریں نثر قلم بند کی جس کے پیشِ نظر سجاد انصاری نے انھیں "فوق البشر" قرار دیتے ہوئے تحریر کیا کہ "اگر قرآن نہ نازل ہو چکا ہوتا تو مولانا ابوالکلام کی نثر اس کے لیے منتخب کی جاتی یا اقبال کی نظم"۔ موت و حیات کے تین مراحل سے گذرنے والے اخبار "الہلال" کا پہلا اجرا ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو ہوا۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء تک یہ نکلتا رہا۔ پھر بند ہوگیا۔ دوبارہ یہ ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو "البلاغ" کی صورت میں سامنے آیا۔ "البلاغ" ۳۱ر مارچ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا۔ گیارہ سال کے وقفے کے بعد ۱۰ر جون ۱۹۲۷ء کو پھر "الہلال" کی تجدید ہوئی اور اسی سال ۹ر دسمبر ۱۹۲۷ء کو یہ بند ہوگیا

مولانا آزاد نے اپنی صحافت کو ملک و ملّت کی فلاح و بہبود کے لیے وقف رکھا۔ صحافت کی راہ انھوں نے تجارت اور منفعت کی نیّت سے اختیار نہیں کی تھی۔ بلکہ اس کے ذریعے وہ باطل اوہام کی تاریکیوں کو دُور کر کے ایک نئی اور روشن صبح کا اُجالا

ناخوشی کی پروا کیے بغیر اپنے مصلحانہ تصور کو دردمندانہ اور مخلصانہ جذبے کے ساتھ یوں پیش کیا:

"ہم نے اپنی تمام خوبیاں گنوادی اور دنیا کی مغضوب قوموں کی تمام برائیاں سیکھ لیں۔ ہم اپنوں کے آگے سرکش ہو گئے اور غیروں کے سامنے ذلت سے جھکنے لگے۔ ہم نے اپنے پروردگار کے آگے دستِ سوال نہیں بڑھایا لیکن بندوں کے دسترخوان کے گرے ہوئے ٹکڑے چننے لگے۔ ہم نے شہنشاہِ ارض وسماں کی خداوندی سے نافرمانی کی مگر زمین کے چند جزیروں کے مالکوں کو اپنا خداوند سمجھ لیا۔ ہم پورے دن میں ایک بار بھی خدا کا نام ہیبت اور خوف کے ساتھ نہیں لیتے پر سینکڑوں مرتبہ اپنے غیر مسلم حاکموں کے تصور سے لرزتے اور کانپتے رہتے ہیں۔"

ابوالکلام آزاد کی صحافت نے ملک وملت کو جو پیغام دیا، اس پر آج بھی عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام، حامد علی صدیقی، عبدالواحد کانپوری اور مولانا عبداللہ عمادی جیسی ممتاز شخصیتوں نے مولانا ابوالکلام کی معیت اور رفاقت میں "الہلال" اور "البلاغ" کی صحافت کو ہندوستان کی قومی اور ملی زندگی کے لیے چراغِ راہ بنانے میں اہم حصہ لیا ہے۔ مولانا کی صحافیانہ قیادت میں ان حضرات نے قلم سے تلوار کا کام لیا اور باطل اوہام اور فرسودہ تصورات کا قلع قمع کر کے آزادی کی تحریک کو منزلِ مراد تک پہنچانے کے لیے کامیاب مجاہدے کیے۔



سے اتفاق نہیں رکھتا تھا بلکہ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہم وطنوں کو دے رہا تھا۔"

واقعہ یہ ہے کہ "الہلال" اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگِ میل بن گیا تھا۔ مولانا نے "الہلال" کے ذریعے اس کی تلقین و تاکید کی کہ مسلمانوں کے سر صرف خدائے واحد کے سامنے جھکتے ہیں وہی عظمت و جبروت کا حامل اور پرستش کے لائق ہے۔ خدا کی زمین پر حق و صداقت کی شہادت اور حمایت مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے۔ مولانا نے اپنے ان خیالات کو جرأت و استقلال اور ایمان و ایقان کے ساتھ اس طرح پیش کیا کہ ہندوستان کے مسلم معاشرے میں جمود اور تعطل کی جو فضا تھی تیزی کے ساتھ ختم ہونے لگی اور ایک نیا عوامی ماحول، برطانوی استبداد سے متصادم ہونے کے لیے تیار ہونے لگا۔ "الہلال" کے اسی حریت مندانہ کردار پر روشنی ڈالتے ہوئے خود مولانا نے لکھا ہے:

"الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی و سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ ان کی مخالفت کے لیے بیورو کریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ اندازانہ پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر "الہلال" نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ خلافت و سوراج ہے۔" —

اور یہ ایک تاریخی صداقت ہے کہ "الہلال" کی یہ صدائے حق جتنی مقبول ہوتی گئی، ایوانِ اقتدار اتنا ہی متزلزل ہوتا گیا۔ کئی مرتبہ زرِ ضمانت کی طلبی اور ضبطی ہوئی۔ ہندوستانی صحافت پر برطانوی اقتدار کے اس حملے کا مولانا نے جس جرأت کے ساتھ مقابلہ کیا، وہ بھی ہماری صحافتی تاریخ کا ایک کارنامہ ہے۔

"الہلال" سے ۱۹۱۳ء میں دو ہزار کی ضمانت مانگی گئی تو مولانا نے پہلے یہ خبر شائع کرنے میں تامل کیا لیکن جب اطراف ملک سے پے در پے خطوط ان کی خدمت میں پہنچنے لگے تو ۲۴ ستمبر ۱۹۱۳ء کی اشاعت میں یہ خبر شائع کی اور اس کا عنوان رکھا "ابتدائے عشق"۔

"انسان صرف کام کے لیے بنایا گیا پس اس کو چاہیے کہ اپنے کام میں مصروف رہے۔ یہ بہت ہی ادنیٰ درجے کی اور چھوٹی باتیں ہیں کہ لوگوں کا اس کے متعلق کیا خیال ہے اور حکام وقت اسے کیا سمجھتے ہیں۔"

اس ضمن میں یہ اصول پیش کیا کہ حق و صداقت کی راہ میں کامیابی کے لیے کانٹوں سے الجھنا لازم ہے۔ باطل کے پاس خواہ ساز و سامان کچھ بھی ہو اور وقتی کامیابی اسے خواہ کتنا ہی مغرور کر دے لیکن بالآخر وہ خاسر و نامراد رہے گا۔

آخر میں وضاحت کی کہ ۱۸ ستمبر کو دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی تھی جسے ۲۰ تک داخل کرنے کی مہلت تھی لیکن ۲۳ ہی کو یہ رقم داخل کر دی گئی:

"ضمانت کا روپیہ تو اس تاریخ سے بطور ایک سرکاری امانت کے علیحدہ رکھ دیا گیا تھا جس دن "الہلال" پریس کا ابتدائی سامان خریدنے کے لیے روپیہ نکالا تھا۔ سچ یہ ہے کہ اس امانت کی حفاظت کرتے کرتے ہم اکتا گئے تھے اور اب تو وقت آ گیا تھا۔ اگر کوئی مانگنے کے لیے نہ آتا تو ہم خود ہی پیش کرنے کے لیے آگے بڑھتے۔ . . . بڑی فکر یہ تھی کہ جب محرومیِ قسمت سے ضمانت کی پہلی منزل ہی طے نہیں ہوئی تو آئندہ کی فکر کے لیے ہمیں وقت کیسے ملے گا؟"

اس اقدام کے علاوہ یہ بھی ہوا کہ مولانا کی عملی سرگرمیوں پر پابندی عاید کرنے کے لیے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دیا گیا اور نظر بندیاں بھی ہوئیں۔ مولانا نے تمام سختیوں اور آزمائشوں کو جس خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کیا، اس کی تاریخ ساز مثال ہمارے سامنے ہے۔ مولانا کی صحافت نے عوامی ذہن کی تربیت میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل کی، اس کا اصل سبب ان کا شفاف نقطۂ نظر اور صالح نصب العین ہی تھا۔ انھوں نے کالی گھٹاؤں کے پیچھے چمکتے ہوئے سورج کو گویا دیکھ لیا تھا۔ اس لیے ان کے افکار و خیالات میں کہیں کوئی تشکیک نہیں ملتی۔ یکم جولائی ۱۹۱۳ء کے "الہلال" کی یہ عبارت ملاحظہ فرمائیں۔

"پس سفر سے پہلے زادِ راہ کی فکر کر لو اور طوفان سے پہلے کشتی بنا لو کیونکہ سفر نزدیک ہے اور طوفان کے آثار ظاہر ہو گئے ہیں۔ جن کے پاس زادِ راہ نہ ہوگا وہ بھوکے مریں گے اور جن کے پاس کشتی نہ ہوگی وہ سیلاب میں غرق ہو جائیں گے۔ جب تم دیکھتے ہو کہ مطلع غبار آلود ہے اور دن کی روشنی بدلیوں میں چھپ گئی تو تم سمجھتے ہو کہ برق و باراں کا وقت آ گیا، پھر تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ دنیائے امن و سلامتی کا مطلع غبار آلود ہو رہا ہے۔ دینِ الٰہی کی روشنی ظلمتِ کفر و طغیاں میں چھپ رہی ہے۔ مگر تم یقین نہیں کرتے کہ موسم بدلنے والا ہے اور تیار نہیں ہوتے کہ انسانی بادشاہتوں سے کٹ کر خدا کے سخت جلال کی منادی پھر بلند ہو اور اس کی زمین صرف اسی کے لیے ہو جائے۔"

یہ انداز تحریر اس کی وضاحت کرتا ہے کہ مولانا کی صحافت سیاسی سرگرمی سے زیادہ ایمان کی گرمی پھیلا رہی تھی۔ انھوں نے اندازِ فکر اور طرزِ عمل کا سخت احتساب کرتے ہوئے معاشرتی گمراہیوں کی اصلاح کی کاوش بھی کی اور اس سلسلے میں عوام و خواص کی خوشی اور

میں بسلسلۂ ادارت الندوہ لکھنؤ میں قیام کے زمانے میں میسر آئی تھیں، اپنی زندگی کا حاصل سمجھتے تھے۔"[۴]

یہاں شاہجہانپوری صاحب سے کسی قدر تسامح ہوگیا ہے۔ ۱۸۹۹ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں نہیں، بلکہ کلکتہ میں ہوا تھا۔ یہ کانفرنس کا تیرھواں اجلاس تھا۔ اس کی صدارت کا شرف آنریبل جسٹس امیر علی کو حاصل ہوا تھا۔ کانفرنس کے ان اجلاسوں کی تفصیلی روئدادیں شائع ہوتی رہی ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ تمام مطبوعہ رپورٹیں مولانا آزاد لائبریری، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں محفوظ ہیں۔ راقم الحروف نے سنہ مذکور کی روئداد بالتفصیل دیکھی ہے۔ اس میں شرکا کی محفل میں مولانا آزاد کہیں نظر نہیں آتے۔ دوسرے یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ مذکورہ اجلاس میں علامہ شبلی بھی شریک نہیں ہوسکے تھے۔ اس زمانے میں وہ علیل تھے اور اپنے وطن اعظم گڑھ میں صاحبِ فراش تھے۔ اسی سبب سے وہ باوجود خواہش اور کوشش کے نہ تو بیرونِ ہند سیاحت کو جاسکے اور نہ ہی ندوۃ العلوم لکھنؤ کے اجلاسوں میں شرکت کرسکے تھے۔ اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی رقم طراز ہیں:

"ندوہ کا چھٹا اجلاس ذیقعدہ ۱۳۱۶ھ مطابق مارچ ۱۸۹۹ء میں کلکتہ میں اور ساتواں اجلاس رجب ۱۳۱۸ھ مطابق ۱۹۰۰ء پٹنہ میں ہوا۔ ان دونوں اجلاسوں میں مولانا شریک نہ تھے، کیونکہ جیسا کہ معلوم ہوچکا ہے، یہ ان کی زندگی کے نہایت سخت سال گذرے۔ ۱۸۹۹ء میں وہ اکثر بیمار اور ۱۹۰۰ء میں وہ اپنے خانگی معاملات میں نہایت سرگرداں و پریشان رہے۔"[۵]

اسی ضمن میں علامہ کی بیرونِ ہند کی سیاحت کے پروگرام کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

"صحت کے بعد تفریح خاطر کے لیے کسی بیرونی ملک کی سیر و سیاحت کا خیال پھر آیا۔ اٹلی کا موقع نکل چکا تھا۔ ایران کا خیال آیا۔ ان دنوں مولوی حمید الدین صاحب مدرسۃ الاسلام کراچی میں تھے۔ ۱۰ دسمبر ۱۸۹۹ء کو انھیں لکھا کہ بوشہر اور بصرہ جانے والے جہازات کون سے دن جایا کرتے ہیں۔ سیکنڈ کلاس کا کرایہ بندر عباس تک کیا ہے، قرنطینہ کہاں ہوتا ہے۔ جواب کیا آیا، معلوم نہیں، مگر سفر نہ ہوسکا اور ہندوستان کے باہر نہ جاسکے،

> ... علامہ شبلی قوم پرور خیالات کے حامل تھے۔ اور حیرت انگیز بات یہ کہ سرسید کے رفیق خاص ہوتے ہوئے بھی کانگریس کے حامی تھے اور اس مسئلے پر ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کی طرح وہ بھی مسلم لیگ کے نظریات اور اس کی حکمتِ عملی سے اختلاف کرتے تھے...

بلکہ اپنے وطن ہی میں رہنے پر مجبور ہوئے۔"[۶]

اور ابھی وہ پوری طرح صحت یاب بھی نہ ہو پائے تھے کہ خانگی حالات یکایک نامساعد ہوگئے اور ان میں وہ ایسے الجھے کہ تقریباً ایک سال تک اعظم گڑھ سے باہر نہ جاسکے۔ ان حالات میں یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ کلکتہ جاکر کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت کرتے۔ ادھر اس اجلاس کی مطبوعہ رپورٹ بھی ان کی شرکت کا ثبوت فراہم نہیں کرتی۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ کس طرح باور کیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں نادر روزگار شخصیات کی پہلی ملاقات ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ یہ ملاقات ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔ البتہ اتنا ضرور ہے کہ غائبانہ طور پر دونوں کئی سال قبل ایک دوسرے سے واقف ہوچکے تھے اور دونوں میں مراسلت کا سلسلہ بھی قائم ہوچکا تھا۔

جناب علی جواد زیدی نے اپنے ایک مضمون 'مولانا آزاد کا صحافتی سفر' میں حاشیہ پر تحریر فرمایا ہے:

"قاضی افضل حق قریشی کی تحقیق کے مطابق مولانا آزاد نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں شرکت کی تھی۔"[۷]

قاضی صاحب کی اس تحقیق کا منبع سمجھ میں نہیں آیا۔ مذکورہ کانفرنس میں مولانا آزاد کی شرکت کا ثبوت کہیں نہیں ملتا۔ البتہ ۱۹۰۵ء میں کانفرنس کا جو اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا تھا، اس میں مولانا نے شرکت فرمائی تھی۔ اور اس میں ایک مختصر سی تقریر بھی کی تھی۔ اس کا سلسلہ یہ تھا کہ ۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنے مختلف ذیلی شعبوں کے ساتھ 'شعبۂ ترقی اردو' قائم کیا تو حسبِ ذیل حضرات اس کے عہدیدار مقرر ہوئے:

پروفیسر آرنلڈ ..... صدر

ڈپٹی نذیر احمد ..... نائب صدر

مولوی ذکاء اللہ ..... نائب صدر

مولانا حالی ..... نائب صدر

علامہ شبلی ..... سکریٹری

علامہ شبلی نے تقریباً دو سال تک انتہائی محنت اور تن دہی سے کام کیا اور اردو کی ترقی اور اس کے فروغ کے لیے متعدد منصوبے بنائے لیکن ۱۹۰۵ء میں اپنی مصروفیات اور علالت

علامہ شبلی اور مولانا آزاد کے تعلقات پر ایک نظر

علامہ شبلی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے باہمی تعلقات پر اگرچہ بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، تاہم ان دونوں بزرگوں کے تعلقات کے بہت سے گوشے اب بھی تشنۂ تحقیق ہیں۔ سید سلیمان ندوی نے اپنے استادِ محترم علامہ شبلی کی سوانح عمری 'حیاتِ شبلی' میں اکثر مقامات پر مولانا آزاد کا تذکرہ بھی کیا ہے لیکن تفصیلی نہیں، صرف ضمنی طور پر۔ البتہ اگر ان منتشر کڑیوں کو یکجا کر کے ایک مربوط سلسلے میں پرو لیا جائے تو خاصا مواد جمع ہو جائے گا۔ سید صاحب کے علاوہ ابوسلمان شاہجہانپوری نے اپنی تالیف 'ابوالکلام۔ تعمیر افکار' میں باقاعدہ ایک باب 'کیا مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد تھے' کے عنوان سے قائم کر کے اس مسئلے سے سیر حاصل بحث کی ہے۔ اسی ضمن میں تعلقات کے مختلف پہلوؤں کا بھی تذکرہ آگیا ہے۔ اس کے علاوہ جناب ابوعلی اعظمی کا ایک دلچسپ مضمون 'مولانا ابوالکلام آزاد مولانا شبلی کے خطوط کی روشنی میں' 'اردو ادب' کے آزاد نمبر (۱۹۵۹ء) میں شائع ہوا۔ لیکن جیسا کہ عنوان سے ہی ظاہر ہے اس کا دائرہ صرف ان ہی معاملات تک محدود ہے جن پر ان خطوط سے روشنی پڑتی ہے۔ البتہ اس سے زیادہ تفصیلی مضمون جناب مسعود الحسن عثمانی کا 'شبلی اور ابوالکلام' کے عنوان سے ان کی مرتب کردہ کتاب 'ابوالکلام ۔ احوال و آثار' (۱۹۷۰ء) میں شائع ہوا ہے۔ اس سے بہت سے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

ان دونوں بزرگوں کے تعلقات کے سلسلے میں دو باتیں آج تک تنازعے کا باعث بنی ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے تعلقات کی ابتدا کب ہوئی اور دوسرے یہ کہ کیا مولانا آزاد علامہ شبلی کے شاگرد تھے؟ یہ دونوں مسئلے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ اور تعجب ہے کہ اب تک یہ مسائل حتمی طور پر طے نہیں پائے ہیں۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ مولانا آزاد کو پہلی بار علامہ سے ۱۹۰۴ء یا ۱۹۰۵ء میں نیاز حاصل ہوا۔ اور یہی وہ نقطۂ آغاز ہے جہاں سے ان دونوں نادرِ روزگار شخصیات کے روابط قائم ہوئے۔ اس سلسلے میں 'حیاتِ شبلی' میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"... ۱۹۰۵ء میں وہ (مولانا آزاد) شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا"۔[۱]

ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد نے، جنھوں نے مولانا آزاد پر تحقیقی مقالہ لکھ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی، اس سلسلے میں بڑی حد تک سید صاحب کے مذکورہ بیان کو ہی بنیاد بنایا ہے البتہ ۱۹۰۵ء کے بجائے وہ ۱۹۰۴ء مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

محمد ضیاء الدین انصاری
معظم منزل، سول لائنز۔ علی گڑھ۔ ۲۰۲۰۰۱

"شبلی ۱۹۰۴ء میں ملے بمبئی کی یہ ملاقات دونوں کے درمیان استوار رفاقت کا سنگ بنیاد بن گئی۔ اس وقت شبلی حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون تھے اور پانچ سال قبل سے دونوں کے درمیان خط و کتابت جاری تھی"۔[۲]

اسی سلسلے میں ایک اور جگہ وہ لکھتے ہیں:

"شبلی سے مولانا آزاد کی پہلی ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۴ء میں ہوئی جب وہ عالم اسلام کی نامکمل سیاحت کے بعد بغداد میں بیمار پڑنے کی وجہ سے واپس لوٹ آئے۔ مولانا شبلی آرنلڈ کو ہندوستان چھوڑ کر ولایت جانے پر الوداع کہنے آئے تھے"۔[۳]

ابوسلمان شاہجہانپوری نے مذکورہ بالا دونوں آرا سے اختلاف کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ان دونوں بزرگوں کی ملاقات ۱۸۹۹ء میں ہوئی۔ ان کے الفاظ میں:

"مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کی پہلی ملاقات دسمبر ۱۸۹۹ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس ڈھاکہ میں ہوئی تھی اور اس کے بعد ہی خط و کتابت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔ دوسری ملاقات ۱۹۰۵ء میں بمبئی میں ہوئی۔ اس ملاقات کے بعد علامہ شبلی کی گرویدگی اور مولانا آزاد کی عقیدت میں بہت اضافہ ہو گیا۔ علامہ شبلی مولانا آزاد کے دماغ اور حافظے کو عجائب روزگار میں سے تصور کرتے تھے اور مولانا آزاد علامہ شبلی کی ان صحبتوں کو جو ۱۹۰۵-۶ء

درمیان خردی اور بزرگی کا رشتہ تھا بلکہ یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دونوں میں مخلصانہ اور دوستانہ مراسم تھے۔ فرماتے ہیں:

"حال ہی میں عباس حلیمی خدیو مصر نے جو ۱۹۰۱ء میں ٹرکی اور یورپ کی سیاحت کی تھی، ان کی ہمرہی میں شیخ موصوف بھی تھے۔ ہمارے مخدوم دوست مولانا شبلی نے زمانۂ سیاحت میں ان سے ملاقات کی تھی اور ان کی روشن خیالی کا اعتراف کیا تھا۔"

ان حقائق کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا کو علامہ شبلی سے تلمذ نہیں تھا۔

دراصل دونوں ایک دوسرے کی غیر معمولی ذہانت، علمی فضیلت، وسعتِ مطالعہ اور اعلیٰ ادبی و علمی ذوق سے بے حد متاثر تھے۔ اسی لیے دونوں ایک دوسرے کا ادب و احترام کرتے تھے۔ علامہ شبلی مولانا سے عمر میں تقریباً ۳۱ سال بڑے تھے اور جس وقت دونوں میں روابط قائم ہوئے اس وقت مولانا کا سن مشکل سے پندرہ، سولہ سال رہا ہوگا۔ لیکن اس کم سنی کے باوجود وہ اپنے وقت کے پختہ کار لوگوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ علامہ کی عمر اس وقت چالیس سال سے متجاوز تھی لیکن علامہ کی یہ خوبی تھی کہ انھوں نے عمر کے تفاوت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اور مساوی سطح پر ان سے تعلقات قائم کیے۔ علامہ شبلی مولانا کی طباعی اور وسعتِ مطالعہ سے تو متاثر تھے ہی، اس سے بڑھ کر وہ مولانا کو اپنا مخلص اور بہی خواہ تصور کرتے تھے اور پریشانی و مصائب میں اپنے دیگر مخلصین کے ساتھ مولانا سے بھی مدد کے خواہاں رہتے تھے۔ وہ پہلی ہی ملاقات میں مولانا سے متاثر ہو گئے تھے اور ان کا یہ تاثر زندگی بھر قائم رہا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا علامہ شبلی ۱۹۰۴ء میں پروفیسر آرنلڈ کو الوداع کہنے بمبئی آئے تھے۔ یہیں مولانا سے ان کی ملاقات ہوئی۔ اس دفعہ علامہ شبلی یہاں کافی دن ٹھہرے۔ اس عرصہ میں مولانا کی ملاقاتیں اکثر علامہ سے رہتیں۔ اس دوران جوہر شناس شبلی نے نوجوان ابوالکلام کو ہر طرح آزمایا اور پرکھا اور علم و فضل، علوئے فکر، وسعتِ مطالعہ، نفاستِ ذوق، حسنِ ظاہری و حسنِ باطنی، غرض ہر کسوٹی پر کھرا پایا۔ اس سلسلے میں مولانا فرماتے ہیں:

"سب سے زیادہ مولانا شبلی پر میرے شوقِ مطالعہ اور وسعتِ مطالعہ کا اثر پڑا۔ اس وقت تک میرا مطالعہ اتنا وسیع ہو چکا تھا کہ عربی کی تمام نئی مطبوعات اور تصنیفات تقریباً میری نظر سے گزر چکی تھیں اور بہتیری کتابیں ایسی بھی تھیں کہ مولانا اُن کے شائق تھے اور انھیں معلوم نہ تھا کہ چھپ گئی ہیں۔ ۔ ۔"[۱۴]

یہیں مردم شناس شبلی نے آزاد کو پہچانا۔ یہیں انھوں نے ابوالکلام کے شاندار مستقبل کا اندازہ لگایا۔ یہیں ان پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ "مولانا کا ذہن و دماغ عجائب روزگار میں سے ہے، انھیں تو کسی علمی نمائش گاہ میں بطور ایک اعجوبے کے پیش کرنا چاہیے"۔ اور یہیں انھوں نے یہ نظریہ قائم کیا کہ یہ نوجوان ان کی علمی اور ادبی سرگرمیوں میں بہترین معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ یہیں علامہ نے مولانا سے 'الندوہ' سے وابستہ ہو جانے کی درخواست کی۔ 'الندوہ' دارالعلوم ندوہ لکھنؤ کا ترجمان تھا جس کی ادارت کے فرائض علامہ شبلی انجام دے رہے تھے۔ لیکن قیام حیدرآباد میں تھا۔ چنانچہ انھوں نے مولانا آزاد سے فرمایا کہ وہ حیدرآباد چلے آئیں اور الندوہ کو اپنی تحویل میں لے لیں۔ اس کی تفصیل خود مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

"۱۹۰۴ء میں ایسے حالات پیش آئے کہ میں عراق چلا گیا اور پھر کوئی نمبر لسان الصدق کا نہیں نکلا۔ وہاں سے جب واپس آیا تو بمبئی میں مولانا شبلی مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ یہ پہلی ملاقات تھی۔ اس وقت مولانا مرحوم حیدرآباد میں ناظم علوم و فنون تھے اور تقریباً پانچ سال سے میری خط و کتابت ان سے جاری تھی۔ میں ان کی ملاقات کا حال پہلے کہہ چکا ہوں۔ میں چونکہ ان کی تصنیفات کا مطالعہ کر چکا تھا، اس لیے اُن کی اپنے دل میں بڑی عزت و وقعت رکھتا تھا، اور طبیعت میں شوق تھا کہ ایسے لوگوں کی معیت و صحبت کا موقع حاصل ہو۔

مولانا مرحوم تقریباً دو تین ہفتہ رہے اور اکثر اوقات میں ان کے ساتھ رہا۔ اسی زمانے میں مولانا مرحوم نے الندوہ کو جاری کیا تھا۔ شاید ایک یا دو نمبر نکل چکے تھے۔ جب چند دنوں میں گفتگو و صحبت سے انھیں میرے علمی شوق کا خوب اندازہ ہو گیا تو وہ بڑی محبت کرنے لگے۔ بارہا کہتے کہ مجھے ایک ایسے ہی آدمی کی ضرورت ہے۔ تم اگر کسی طرح حیدرآباد آسکو تو 'الندوہ' اپنے متعلق کر لو اور وہاں مزید مطالعہ و ترقی کا بھی موقع ملے گا۔"[۱۵]

لیکن مولانا آزاد نے علامہ شبلی کا یہ مشورہ قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد شبلی نے اصرار کیا کہ وہ الندوہ کے لیے کم از کم مضامین ہی لکھ دیا کریں:

"ایک دن میرے یہاں بیٹھے تھے اور کتابوں کی الماریوں سے کتابیں نکال کے دیکھ رہے

کے باعث انھوں نے اس عہدے سے استعفیٰ پیش کر دیا جو کانفرنس کے مذکورہ اجلاس میں پیش ہوا۔ علاّمہ شبلی اس اجلاس میں علالت کے باعث شرکت نہ کر سکے۔ آپ کا استعفیٰ پیش ہوا جسے اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا گیا۔ اور آپ کی جگہ نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کو سکریٹری منتخب کیا گیا۔ اس موقع پر خواجہ غلام الثقلین نے تجویز پیش کی کہ:

"مَیں یہ بھی ضروری سمجھتا ہوں کہ چند خاص معاون مولوی حبیب الرحمٰن خاں صاحب کے ہوں۔ مَیں ابوالکلام محی الدین صاحب آزاد، خواجہ غلام الحسنین صاحب اور سیّد امجد علی صاحب اشہری کے نام پیش کرتا ہوں۔ یہ ایسے ذی لیاقت اصحاب ہیں جو ہمارے حبیب الرحمٰن خاں صاحب کا ہاتھ اس مفید کام میں بٹا سکتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ وہ حتی الوسع اس میں دریغ نہ کریں گے۔"[8]

اس کے بعد مولانا آزاد نے حسبِ ذیل تقریر فرمائی:

"حضرات! غالباً آپ کو معلوم ہوگا کہ شمس العلما جناب مولانا شبلی نعمانی اس شاخ کے سکریٹری قرار دیے گئے تھے۔ افسوس ہے کہ وہ مسلسل تین ماہ سے بیمار رہیں اور باوجود حتمی ارادے کے شریکِ کانفرنس نہ ہو سکے۔ مجھ کو خوشی ہے کہ میرے مخدوم مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب شیروانی اب اس سیکشن کے سکریٹری مقرر کیے گئے ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مَیں بھی اپنی خدمات سے اس شاخ کو کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہوں۔ اگر یہ خیال صرف حسنِ ظن ہی نہیں ہے بلکہ صحیح ہے، تو مَیں حاضر ہوں۔"[9]

خود مولانا آزاد نے علاّمہ سے اپنی پہلی ملاقات ۱۹۰۴ء ہی میں بمبئی میں بتائی ہے۔ فرماتے ہیں:

"مولانا شبلی نعمانی سے مَیں ۱۹۰۴ء میں سب سے پہلے بمبئی میں ملا۔ جب مَیں نے اپنا نام ظاہر کیا، تو اس کے بعد آدھ گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں اور چلتے وقت انھوں نے مجھ سے کہا، تو ابوالکلام آپ کے والد ہیں۔ مَیں نے کہا کہ نہیں، مَیں خود ہوں۔"[10]

اس کے علاوہ ایک اور سلسلہ میں مولانا علاّمہ شبلی سے اپنی اس ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس کے چند ماہ بعد جب مولانا شبلی مرحوم سے بمبئی میں پہلی ملاقات ہوئی اور مَیں نے 'محصّل' کا ذِکر کیا تو ان کو بہت ہی استعجاب ہوا اس وقت تک مولانا کی نظر سے وہ نہیں گذری تھی اور اس کے انطباع کی انھیں خبر نہ تھی۔"[11]

مندرجہ بالا تمام شہادتیں، میرے خیال میں، یہ ثابت کرنے کو کافی ہیں کہ مولانا آزاد کی علاّمہ شبلی سے پہلی بار ملاقات ۱۹۰۴ء میں ہوئی البتہ اتنا ضرور ہے کہ غائبانہ طور پر دونوں ایک دوسرے سے کئی سال قبل واقف ہو چکے تھے اور دونوں کے درمیان سلسلۂ مراسلت بھی قائم ہو چکا تھا۔

دوسرا مسئلہ جس پر محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ کیا مولانا آزاد علاّمہ شبلی کے شاگرد تھے؟ ایک عام خیال یہ ہے کہ مولانا ان کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے۔ لیکن معتبر ذریعوں سے اس خیال کی تردید ہو چکی ہے۔ جناب ابو سلمان شاہجہاںپوری نے اپنی تالیف 'امام الہند تعمیرِ افکار' میں تفصیلی بحث کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ مولانا آزاد علاّمہ شبلی کے شاگرد نہیں تھے۔ اسی ضمن میں آپ نے اخبار مدینہ بجنور مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۶۰ء اور ہفت روزہ ایشیا لاہور مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۶۰ء کے حوالے سے مشہور نیشنلسٹ لیڈر اور سابق ممبر پارلیمنٹ (لوک سبھا) عبداللطیف بجنوری کا حسبِ ذیل بیان نقل کیا ہے:

"ایک دن مَیں نے دورانِ گفتگو میں حضرت مولانا سے دریافت کیا: حضرت کیا مولانا شبلی مرحوم آپ کے اُستاد تھے؟

مولانا نے جواب میں فرمایا: نہیں بھائی وہ میرے دوست تھے، اُستاد نہیں تھے۔"[12]

دراصل مولانا کی تمام تر تعلیم گھر پر ہی ہوئی اور درسیات کے لیے انھیں کہیں باہر جانا نہیں پڑا۔ چنانچہ خود مولانا آزاد نے 'غبارِ خاطر' میں ایک جگہ فرمایا ہے:

"جہاں تک تعلیمی زمانے کا تعلق ہے گھر کی چار دیواری سے باہر قدم نکالنے کا موقع ہی نہیں ملا۔"

اس کی تصدیق سیّد سلیمان ندوی کے خط بنام عبداللہ بٹ مورخہ ۱۰ مارچ ۱۹۴۲ء سے بھی ہوتی ہے۔ اس میں سیّد صاحب فرماتے ہیں:

"ان کی تعلیم جو کچھ ہوئی اور جس قدر ہوئی وہ کلکتہ میں ہوئی۔"[13]

اس کے علاوہ 'لسان الصدق' (نومبر ۱۹۰۳ء) کی اشاعت میں شیخ محمد عبدہٗ پر مولانا آزاد کا مضمون شائع ہوا ہے۔ اس میں علاّمہ شبلی کی عبدہٗ سے ملاقات کا تذکرہ بھی ہے۔ اس سے کسی طرح بھی یہ مترشح نہیں ہوتا کہ دونوں کے

کے مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے۔ ان میں سے ہر ایک مضمون کو قبولِ عام نصیب ہوا۔ لیکن مختلف وجوہ سے مولانا زیادہ عرصہ یہاں نہ رہ سکے اور چھ ماہ تک اس سے وابستہ رہ کر مستعفی ہوگئے۔ مولانا کے اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبدِ مینا پُر شور ہے ___ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی الندوہ کے سب اڈیٹر رہے۔ اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں وہ مولانا شبلی سے بمبئی میں ملے اور یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا۔ مولانا شبلی مرحوم اُن کو اپنے ساتھ ندوہ لائے اور ایک زمانے تک ان کو اپنے پاس ندوہ میں رکھا۔ وہ ان کی خلوت و جلوت کی علمی صحبتوں میں شریک رہتے اور اپنی مستثنیٰ فطری صلاحیتوں کی بدولت ہر روز آگے بڑھتے جاتے تھے۔ یہیں انھوں نے مولانا حمید الدین صاحب کے ساتھ کچھ دن بسر کیے جن کو قرآن پاک کے ساتھ عشق کامل تھا اور اس عشق کا اثر صحبت کی تاثیر سے مولانا ابوالکلام میں بھی سرایت کر گیا اور یہی رنگ تھا جو نکھر کر الہلال میں نظر آیا۔"[۱۱]

سید صاحب نے بڑے واضح انداز میں مولانا آزاد کی الندوہ سے وابستگی اور علامہ شبلی سے مراسم پر روشنی ڈالی ہے۔ لیکن محولہ بالا اقتباس میں کئی باتیں محلِ نظر ہیں جن پر دوسرے محققین اور ناقدین نے بھی اشکال کیا ہے۔ ان میں سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ سید صاحب کا یہ فرمانا کہ مولانا کی علامہ شبلی سے ملاقات ۱۹۰۵ء میں ہوئی، درست نہیں۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ یہ ملاقات ۱۹۰۴ء میں ہوئی۔ اسی سلسلے میں سید صاحب فرماتے ہیں: "الندوہ کو یہ بھی فخر حاصل ہے کہ اس نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کیا جو آگے چل کر علم و فن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جن کے کارناموں سے آج بھی یہ گنبدِ مینا پُر شور ہے۔" اس کے بعد انھوں نے مولانا عبداللہ العمادی، مولانا عبدالسلام ندوی اور خود اپنا تذکرہ کیا ہے۔ اسی زمرے میں مولانا آزاد کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اور فرماتے ہیں: "اس وقت تک وہ علمی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے۔" نہ معلوم کیوں کر سید صاحب نے یہ رائے قائم کر لی۔ ان کے سامنے تو مولانا آزاد کی زندگی کے تمام پہلو روشن تھے۔

جس زمانے میں مولانا کی ملاقات علامہ شبلی سے ہوئی ہے اور اُن کے اصرار پر وہ الندوہ سے وابستہ ہوئے، اس وقت تک مولانا ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں معروف ہو چکے تھے اور ان کو سن رسیدہ اور پختہ کار شخصیات کے برابر مقام دیا جاتا تھا۔ خود علامہ شبلی بھی غائبانہ طور پر مولانا سے واقف ہو چکے تھے اور وہ انھیں عمر رسیدہ اور پختہ کار شخصیت متصوّر کیے ہوئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۰۳ء میں جب وہ انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مقرر ہوئے تو انھوں نے مولانا کو اس کا رکن بنا لیا حالانکہ اس وقت تک مولانا اور علامہ شبلی کی بالمشافہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں خود مولانا فرماتے ہیں:

"اسی زمانے میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی شاخ انجمن ترقی اُردو قائم ہو چکی تھی اور مرحوم مولانا شبلی اس کے ناظم تھے۔ انجمن ہی کے سلسلے میں مَیں نے خط و کتابت کی تھی اور انھوں نے خط و کتابت کے بعد مجھے بڑا اشتیاق اور کارکن سمجھ کر انجمن کے ارکان انتظامیہ میں چن لیا تھا۔ دوسری شاخ خواجہ غلام الثقلین مرحوم نے اصلاحِ رسوم کی قائم کی تھی اور 'عصرِ جدید' نکالا تھا۔ اس میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ 'لسان الصدق' کے خاص خاص مقاصد میں یہ دو مقصد بھی داخل کیے گئے۔ یعنی ترقی اُردو اور اصلاحِ رسوم۔ اس کے علاوہ عام طور پر علمی و ادبی مضامین کا وہ مجموعہ تھا۔ انجمن ترقی اردو نے اس کی دلچسپی دیکھ کر اُسے اپنا آرگن قرار دے دیا تھا۔ اور مولانا مرحوم انجمن کے متعلق جس قدر مفید و دلچسپ باتیں ہوتی تھیں انھیں سب سے پہلے اسی میں اندراج کے لیے بھیج دیتے تھے اور تمام ممبرانِ انجمن کے نام ایک اطلاع شائع کر دی تھی کہ اس پرچہ کو ضرور منگوائیں۔ اس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد متعلقین انجمن کی اس کی خریدار ہو گئی تھی۔ دو تین نمبروں کے بعد ہی چھ سات سو خریدار ہو گئے تھے۔"[۱۲]

الندوہ سے وابستہ ہونے سے قبل مولانا کو صحافت کا بھی خاصا تجربہ ہو چکا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں جب ان کی عمر مشکل سے گیارہ برس کی ہوگی، انھوں نے 'نیرنگِ عالم' کے نام سے ایک ماہانہ گلدستہ جاری کیا تھا۔ جو تقریباً آٹھ ماہ تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد بند ہو گیا۔ پھر انھوں نے ہفت روزہ المصباح کو اڈیٹ کیا۔ اس میں مولانا کے جو مضامین شائع ہوتے تھے۔ انھیں دوسرے اخبار اپنے کالموں میں نقل کرتے تھے۔ یہ چار ماہ تک پابندی سے نکلا، پھر بند ہو گیا۔ اس کے بعد مولانا 'خدنگِ نظر' سے متعلق ہو گئے۔ جسے لکھنؤ کے منشی نوبت رائے نظر نکال رہے تھے۔ یہاں بھی مولانا نے بڑی محنت اور جانفشانی سے کام کیا جس کے نتیجے میں رسالہ کو استحکام نصیب ہوا۔ لیکن مولانا دوسروں کا پابند ہو کر کام کرنا گوارا نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ جلد ہی انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اور نومبر ۱۹۰۳ء میں اپنا ذاتی پرچہ 'لسان الصدق' جاری کیا۔ اس کے بارے میں ضروری معلومات اُوپر دی جا چکی ہیں۔ ان رسائل کے علاوہ 'مخزن' جیسے اعلیٰ معیار کے جرائد میں بھی مولانا

تھے۔ اس میں 'خدنگِ نظر' کا ایک مجموعہ نکل آیا۔ اس میں میرے مضامین بھی تھے۔ پڑھ کر انھوں نے بہت زیادہ اصرار کیا۔ اس میں ایک مضمون ایکس ریز کی ایجاد و حقیقت پر تھا۔ انھوں نے کہا 'جب تم ایسے مضامین لکھ سکتے ہو تو کیوں اس طرح بلا کسی مشغلے کے ہو۔ کم سے کم ایک مضمون الندوہ کے ہر نمبر کے لیے لکھ دیا کرو۔'[۱۲]

لیکن مولانا نے نہ تو حیدرآباد جانا پسند کیا اور نہ الندوہ سے وابستہ ہونے پر رضامند ہوئے۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد علامہ شبلی نے حیدرآباد کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور مستقل قیام کی غرض سے لکھنؤ تشریف لے آئے... دارالعلوم ندوہ میں اپریل ۱۹۰۵ء میں معتمد تعلیمات کی حیثیت سے آپ کا باقاعدہ انتخاب عمل میں آیا۔ اس کے بعد علامہ کی تمام تر توجہ ندوہ کی اصلاح و ترقی اور اس کے ترجمان الندوہ کی اشاعت پر مرکوز ہوگئی۔ یہاں پھر انھیں ابوالکلام کی یاد آئی۔ چنانچہ انھوں نے مولانا سے پھر اصرار کیا کہ وہ الندوہ سے وابستگی قبول کرلیں۔ اس دفعہ مولانا انکار نہ کرسکے اور الندوہ کا نائب مدیر ہونا منظور کرلیا۔ اس کی تفصیل خود مولانا نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے:

"اس اثنا میں مولانا مرحوم نے استعفاء دے دیا اور مجھے لکھا کہ اب میں بقیہ عمر ندوہ کے لیے وقف کردینا چاہتا ہوں اور اعظم گڑھ ہوکر لکھنؤ جاؤں گا۔ یہ ٹھیک اس وقت کی بات ہے کہ دسمبر کا آخری ہفتہ تھا اور لکھنؤ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس تھا۔ میں اور بھائی مرحوم اس کی شرکت کی غرض سے لکھنؤ پہنچے تھے اور وہیں مولانا کا خط مجھے ملا تھا۔ اعظم گڑھ سے انھوں نے پھر خط لکھا اور اصرار کیا کہ اب زیادہ اچھا موقع ہے لکھنؤ میں آکر رہو۔ تو حیدرآباد سے بڑھ کر یہ بہتر ہوگا۔ اس مرتبہ میں نے قطعی فیصلہ کرلیا اور لکھنؤ پہنچ گیا۔ لیکن لکھنؤ میں مولوی حفیظ اللہ سے معلوم ہوا کہ وہ اپنے گھر کی علالت کی خبر سن کر پھر اعظم گڑھ چلے گئے ہیں اور اُن کا تار آچکا ہے کہ اگر ہوسکے تو اعظم گڑھ آجاؤ۔ چنانچہ میں اعظم گڑھ گیا۔ عجیب اتفاق، جس دن پہنچا اُسی دن اُن کی بیوی کا انتقال ہوا۔ وہاں سے ہم ایک ساتھ لکھنؤ واپس آئے اور میں ندوے ہی میں ٹھہر گیا اور الندوہ کی ایڈیٹری میرے متعلق کردی۔ تقریباً سات آٹھ مہینے وہاں قیام رہا۔"[۱۳]

اس طرح مولانا اکتوبر ۱۹۰۵ء میں باقاعدہ الندوہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں شامل ہوگئے۔ قیام مستقلاً ندوہ ہی میں رہا۔ اب دونوں کی ملاقات کے مواقع بہت زیادہ تھے۔ چنانچہ دونوں حضرات نے ان سے بھرپور فائدہ اٹھایا۔ شبلی کو آزاد جیسے وسیع المطالعہ، صاحب اسلوب انشاء پرداز، ذہین اور ہونہار نوجوان کی ضرورت تھی۔ جس سے تبادلہ خیال کرکے وہ اپنے علمی اور ادبی ذوق کی تسکین کرسکیں اور جو علمی و ادبی مصروفیات میں ان کی معاونت کرسکے؛ اُدھر خود ابوالکلام کو بھی ایسے عالم فاضل کثیر المطالعہ شخص اور نظم و نثر کے شہنشاہ کی ضرورت تھی جس کے تجربے اور تبحر علمی سے وہ مستفیض ہوسکیں اور اپنی بے پناہ صلاحیتوں کو صحیح سمت دے سکیں۔ اس طرح دونوں نے ایک دوسرے سے بقدر ضرورت اور بقدر ذوق استفادہ کیا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عمل میں مولانا زیادہ فائدے میں رہے۔ ان کی عمر اور تجربے کا مقتضیٰ بھی یہی تھا۔ اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ مولانا کی تحریروں میں جو فصاحت اور شگفتگی ہے وہ بڑی حد تک شبلی کے ہی خوانِ تکلّم کی ریزہ چینی کے طفیل ہے۔ ندوہ میں علامہ شبلی سے جو صحبتیں رہیں ان کا تذکرہ کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"ہر وقت مولانا مرحوم سے یکجائی رہتی تھی۔ وہ بھی صبح سویرے سے اٹھنے کے عادی تھے اور میں بھی بچپن سے اس کا خوگر۔ جاڑے کا موسم تھا۔ صبح چار بجے میں ان کے کمرے میں چلا جاتا۔ اسی وقت چائے کا دور چلتا۔ طرح طرح کے علمی تذکرے رہتے۔ اکثر فارسی اشعار کا اپنے خاص لَون میں ترنم کرتے۔ ان اشعار کے متعلق تذکرے رہتے۔ شام کو کبھی قیصر باغ یا اور کہیں دور کا چکر لگانے نکل جاتے اور یہ تمام وقت بھی علمی و ادبی تذکروں میں بسر ہوتا۔ حقیقتاً وہ ایسی صحبتیں تھیں جن کا لطف و کیفیت عمر بھر فراموش نہ ہوگی۔ مجھے ان صحبتوں سے بہت فائدہ ہوا۔ مولانا مرحوم کے انتقال سے جہاں کتنی ہی خوبیاں اور کمالات ان کے ساتھ مدفون ہوگئے۔ وہاں ایک سب سے بڑی چیز یہ پُرلطف صحبت تھی؛ جو ان کے بعد ایک مرتبہ بھی مجھے کہیں کسی گوشے اور کسی حلقے میں میسر نہ آئی۔ اُن کا علمی ذوق، جو وسیع اور ہر وادی میں تھا' ایک ساتھ ہی مدفون ہوچکا ہے۔"[۱۴]

جب تک مولانا آزاد الندوہ سے متعلق رہے۔ اس کی ترتیب و اشاعت کا زیادہ تر کام مولانا ہی انجام دیتے رہے۔ علامہ شبلی مولانا کے طرزِ تحریر کو بہت زیادہ پسند فرماتے تھے۔ اس کے علاوہ مطالعہ کی جو وسعت اور گہرائی مولانا کے پاس تھی، دوسروں کے یہاں ملتی نہیں۔ پھر جو یگانگت اور اخلاص دونوں میں قائم ہوگیا تھا' اس کی بھی دوسری مثال ملنی مشکل ہے۔ اسی لیے علامہ شبلی مولانا پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ الندوہ کا سارا کام مولانا کے سپرد کردیا تھا۔ مولانا نے بھی حق دوستی ادا کیا۔ انھوں نے انتہائی محنت اور جانفشانی سے کام کیا۔ ان کے زمانے میں الندوہ کی وقعت بڑھی اور اس کی شہرت و مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ خود مولانا کا الندوہ میں پہلا مضمون 'مسلمانوں کا ذخیرۂ علوم اور یورپ' کے عنوان سے اکتوبر ۱۹۰۵ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ بہت معیاری اور پُرازمعلومات تھا۔ اور یہ کسی طرح بھی باور نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ سترہ سال کے ایک نوجوان کا مضمون ہے۔ اس کے بعد مولانا



بلکہ بقول مولانا کے ہر وقت یک جائی رہتی تھی۔ اور ہر موضوع پر مفصل گفتگو ہوتی تھی۔ ان صحبتوں کی یاد مولانا کے دل میں ہمیشہ تازہ رہی۔ مولانا کو ان سے بہت فائدہ پہنچا۔ لیکن ان صحبتوں کا اثر یکطرفہ نہیں تھا۔ مولانا کے مطالعے کی وسعت، ان کے اسلوبِ نگارش اور فہم و تدبر نے علامہ کو بھی متاثر کیا۔ شیخ محمد اکرم نے دونوں کے تعلقات کا تجزیہ کرتے ہوئے درست لکھا ہے:

"شبلی اور ابوالکلام کی عمروں میں جو فرق تھا اس کا لحاظ رکھ کے شبلی کا ایک سترہ سالہ نوجوان کے خیالات سے متاثر ہوجانا بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے۔ لیکن آزاد نہایت ابتدائی عمر میں پرلے درجے کے [کذا پختہ] کار تھے اور شبلی کی دماغی ساخت اس طرح کی تھی کہ وہ قدیم کے ترجمان ہونے کے باوجود ہر سمت سے نئے اثرات قبول کرلیتے تھے۔ اس کے علاوہ جس طرف آزاد کے اثر صحبت نے شبلی کو کھینچا اس سمت کے لیے ہر طرح کے طبعی ذہنی علمی اور سیاسی رجحانات تو پہلے سے موجود تھے، فقط اس صحبت میں ان رجحانات نے ایک واضح صورت اختیار کرلی۔"

ظاہر ہے کہ جب تک کوئی 'عالمِ اسرار' اس راز سے پردہ نہ اٹھائے، قطعی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ آزاد کے قیام ندوہ کے دوران میں شبلی کا آزاد پر زیادہ اثر پڑا یا شبلی اس ذہین اور تیز و طرار نوجوان سے زیادہ متاثر ہوئے۔ لیکن کم از کم یہ امر تو قرینِ قیاس ہے کہ اس دوران میں دونوں کے درمیان جو گفتگوئیں ہوئیں اُن سے دونوں کا طرزِ عمل زیادہ واضح اور منضبط ہوگیا۔ حتیٰ کہ جب اربابِ علی گڑھ کے خلاف اعلانِ جنگ کا وقت آیا تو شبلی اور آزاد دونوں پہلو بہ پہلو صف آرا تھے۔ اور دونوں کے درمیان اس زمانے میں اس درجہ 'اتحادِ خیال اور اتحادِ عمل' تھا کہ اس جنگ میں علی گڑھ کے خلاف جو اسلحے استعمال کیے گئے ان کی نسبت یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آزاد کے دماغ کی اختراع تھے یا شبلی کا عطیہ۔[۲۶]

علامہ شبلی مولانا آزاد سے کس حد تک متاثر تھے اُس کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بھی لگایا جاسکتا ہے ۱۹۱۲ء میں مصر کے مشہور عالم علامہ رشید رضا ہندوستان تشریف لائے۔ یہ دورہ دراصل دارالعلوم ندوہ کی دعوت پر ہی کیا گیا تھا۔ چنانچہ آپ ندوہ تشریف لے گئے اور ۱۶ اپریل ۱۹۱۲ء کو ندوہ کا وہ تاریخ ساز اجلاس ہوا جس کی صدارت آپ نے فرمائی۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے خاص طور پر مولانا آزاد کو مدعو کیا کہ وہ علامہ رشید رضا کی عربی تقریر کا اردو ترجمہ کریں۔ یہ بہت بڑی بات تھی مولانا آزاد اس وقت کلکتہ میں تھے۔ اُنھیں خصوصی طور پر اتنے دور دراز کے علاقے سے ترجمہ کرنے کے لیے بلایا جاتا ہے، جب کہ سید سلیمان ندوی اور دیگر تلامذہ کی خاصی بڑی تعداد خود ندوہ میں موجود تھی۔ مولانا نے جس حسن و خوبصورتی سے ترجمہ کرنے کی خدمت انجام دی۔ اس سے حاضرینِ جلسہ بے حد متاثر ہوئے۔ غالباً خود شبلی کو بھی اپنے انتخاب پر فخر محسوس ہوا ہوگا۔ اس جلسے کی تفصیلات بتاتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اس اجلاس میں مولانا ابوالکلام کی قادر الکلامی کے خوب خوب مناظر سامنے آئے۔ وہ سید رشید رضا کی عربی تقریر کا خلاصہ اردو میں سنانے کھڑے ہوتے تو بجائے خود اپنی سحر بیانی سے دلوں میں تلاطم برپا کر دیتے تھے۔"[۲۷]

مارچ ۱۹۰۶ء کے بعد مولانا نے الندوہ سے علیحدگی اختیار کرلی اور الوکیل امرتسر سے وابستہ ہوگئے۔ جہاں دو سال تک انھوں نے کام کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ الندوہ مولانا کے مذہبی افکار اور علمی مزاج سے میل کھاتا تھا، اسی لیے انھوں نے بڑی لگن اور دلجمعی سے کام کیا۔ تاہم اس کا کینوس محدود تھا۔ جو مولانا کے بیان کی وسعت کے لیے ناکافی تھا۔ ان کا میدان خالص مذہبی نہیں تھا۔ وہ ادب اور سیاست میں بھی اتنی ہی دلچسپی رکھتے تھے۔ پھر مسلمانوں کے معاشرتی مسائل بھی کبھی مولانا کی نظر سے اوجھل نہیں رہے۔ ظاہر ہے ان تمام موضوعات کے لیے الندوہ میں گنجائش نہیں تھی۔ پھر یہ بہت ہی سنجیدہ پرچہ تھا۔ جس میں جوش اور جذبات کو بہت کم دخل تھا۔ اس کے برخلاف مولانا جس طرزِ تحریر کے موجد تھے اس میں خطیبانہ انداز اور جوش و ولولہ کی بالادستی تھی۔ لہٰذا علامہ شبلی کی پُرلطف صحبتوں کے باوجود انھوں نے الندوہ کو خیرباد کہہ دیا۔ لیکن اس جدائی کے باوجود دونوں میں تعلقات آخر وقت تک انتہائی مخلصانہ اور دوستانہ رہے۔ علامہ شبلی ہر مشکل مرحلے پر مولانا سے مشورہ کرتے اور ان کی امداد کے خواہاں ہوتے جس کی تصدیق مولانا کے نام ان کے خطوط سے بھی ہو جاتی ہے۔ یہ خطوط 'مکاتیبِ شبلی' حصہ اوّل میں شامل ہیں۔ ان کی مجموعی تعداد ۳۹ ہے۔ ان کے علاوہ ایک ٹیلیگرام بھی ہے۔ جو انھوں نے اپنے انتقال سے صرف چار دن قبل بھیجا تھا۔ ان خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شبلی نے کبھی خُردی اور بزرگی کا رشتہ قائم نہیں کیا۔ بلکہ برابر کی سطح پر آکر مراسم قایم کیے اسی لیے ان خطوط میں تخاطب کبھی برادرم کبھی برادرم عزیز اور کبھی بھائی" سے کیا ہے۔ اس اندازِ تخاطب سے دونوں میں اخلاص اور یگانگت کا احساس ہوتا ہے۔ ان خطوط کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔ ان سے دونوں کے تعلقات کے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

۱۔ بھائی! تم نے دانستہ خط کتابت ترک کردی ہے کہ الیاس احدی الرحمتین۔ لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکا لگا دیتے ہو۔ خیر، جو مرضی۔ یہ بھی منظور کلکتہ گیا۔ ایک خاص کام تھا۔ مولوی شرف الدین کے یہاں ٹھہرا



کی شعری اور نثری تخلیقات شائع ہوتی تھیں اس طرح ۱۹۰۵ء تک مولانا کافی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ لہٰذا سید سلیمان ندوی کا یہ فرمانا کہ اس وقت تک وہ علمی اور ادبی حلقوں میں روشناس نہیں ہوئے تھے، خلافِ واقعہ ہے۔

سید صاحب کا یہ فرمانا بھی تعجب خیز ہے کہ "یہ ملاقات ایسی تاریخی ثابت ہوئی جس نے ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا" مولانا آزاد کبھی 'مسٹر آزاد' نہیں رہے ان کی تعلیم خالصتہً مذہبی طور پر ہوئی اور ماحول بھی شدید قسم کا مذہبی تھا۔ مولانا کے والد، جیساکہ سب کو معلوم ہے، عالم دین اور پیرِ طریقت تھے، مریدوں کی بہت بڑی تعداد تھی۔ مذہب کے معاملے میں وہ بہت سخت گیر تھے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی اولاد کو خالص مذہبی تعلیم دی تھی۔ مولانا آزاد کے بڑے بھائی غلام یٰسین آہ بھی مذہبی آدمی تھے۔ مولانا کے تین بہنیں تھیں۔ زینت بیگم، فاطمہ بیگم آرزو اور حنیفہ بیگم آبرو۔ ان میں زینت بیگم کا تو کم سنی میں ہی انتقال ہو گیا تھا، البتہ بقیہ دونوں بہنوں نے طبعی عمر پائی۔ یہ دونوں عمر میں مولانا آزاد سے بڑی تھیں۔ ان میں سے آرزو بیگم کا بھوپال میں ۱۳ اپریل ۱۹۶۶ء کو اور آبرو بیگم کا جون ۱۹۴۳ء کو انتقال ہوا۔ ان دونوں ہمشیرگان کی تعلیم بھی خالص مذہبی انداز پر ہوئی تھی۔ ان کے معیارِ تعلیم کا اندازہ مولانا آزاد کے اس بیان سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

"______ منجھلی بہن (آرزو بیگم) کو چوں کہ ہم لوگوں کے ساتھ پڑھنے کے بعد بھی ڈیڑھ سال تک مزید درس کا موقع ملا، اس لیے انھوں نے حدیث و فقہ کی کتابیں بھی بہت حد تک ختم کر لی تھیں۔ ان سے چھوٹی بہن چوں کہ اس کے بعد بہت بیمار ہو گئی تھیں اور عرصہ تک رہیں، اس لیے وہ اس حصۂ تعلیم میں شریک نہ ہو سکیں۔"[۲۲]

اس طرح مولانا اور ان کے دوسرے بھائی بہنوں کی ساخت و پرداخت اور تعلیم و تربیت سخت قسم کے مذہبی طرز پر ہوئی۔ پورا گھریلو ماحول شدید مذہبی رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ سید صاحب ان تمام حالات سے بخوبی واقف تھے۔ اس کے باوجود ان کا یہ کہنا کہ شبلی کی صحبت نے 'ابوالکلام کو مولانا ابوالکلام بنا دیا'، کچھ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ ابوالکلام علامہ شبلی کی ملاقات سے پہلے ہی مولانا ابوالکلام بن چکے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید صاحب علامہ شبلی کے ارشد تلامذہ میں تھے۔ انھیں شبلی سے استفادے کے بہت موقع ملے اور انھوں نے ان سے حتی المقدور فائدہ بھی اٹھایا۔ لیکن یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ سید صاحب کے مقابلے میں وہ مولانا آزاد کی صلاحیتوں کے زیادہ معترف تھے اور جب تک ان دونوں کا تعلق علامہ شبلی سے رہا، وہ سید صاحب پر مولانا آزاد کو ترجیح دیتے رہے۔ جس کی تصدیق متعدد واقعات سے ہو جاتی ہے۔ ان میں سے چند کے خود سید صاحب بھی راوی ہیں۔ ایک واقعہ شاہ معین الدین صاحب ندوی نے 'حیاتِ سلیمان' میں خود سید صاحب کے حوالے سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

"سید صاحب مولانا ابوالکلام کی ذہانت، طباعی اور علم و وسعتِ نظر کے پورے معترف تھے۔ راقم نے بارہا ان کی زبان سے اس کا اعتراف سنا ہے۔ ایک واقعہ اب تک یاد ہے۔ فرماتے تھے کہ الندوہ کی سب ایڈیٹری کے زمانے میں ایک مرتبہ مولانا شبلی نے مجھ کو امام بخاری پر مضمون لکھنے کا حکم دیا۔ میں بڑی محنت سے لکھ کر لے گیا۔ لیکن مولانا کو پسند نہیں آیا۔ اس درمیان میں مولانا ابوالکلام آ گئے۔ مولانا نے ان کو ہدایت فرمائی، انھوں نے اس کے لیے کوئی تیاری نہیں کی۔ میرا مضمون لے کر اس کو ایک نظر دیکھ لیا اور دوسرے دن مضمون لکھ کر مولانا کی خدمت میں پیش کر دیا۔ مولانا نے پسند کیا اور فرمایا: اسے مضمون کہتے ہیں۔"[۲۳]

اسی بات کو مولانا علی میاں صاحب نے تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے:

"بارہا ایسا ہوا ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے ارشد تلامذہ سے کسی موضوع پر لکھنے کی فرمائش کی اور انھوں نے مواد و معلومات کا ایک ذخیرہ رکھ دیا۔ ان کے بعض لائق ترین تلامذہ نے مضامین لکھ کر پیش کیے لیکن وہ مطمئن نہیں ہوئے بعض مرتبہ کئی بار یہ کوشش کی گئی اور ناکام رہی۔ مولانا آزاد کسی گوشے میں بیٹھے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے۔ قریب آئے اور پوچھا کہ آپ کیا چاہتے ہیں۔ علامہ شبلی نے مختصر تقریر کی۔ وہ اسی وقت بیٹھ گئے۔ اور مضمون لکھ کر پیش کیا۔ مولانا نے فرمایا: بس میں یہی چاہتا تھا۔

یہ مضامین بعض اوقات بڑے نازک اور دقیق کلامی و فلسفیانہ مباحث پر ہوتے تھے۔ حاضرینِ مجلس کو یقین ہوتا تھا کہ اس موقعے پر نوجوان انشاپرداز کا، جس نے اپنی طلاقتِ لسانی سے سب پر اپنے علم و مطالعہ کا سکہ بٹھا رکھا ہے۔ بھرم جاتا رہے گا اور اس کی علمی کم مائیگی کا راز فاش ہو جائے گا، لیکن معاملہ الٹا ہوا۔ اور وہ ہر مرتبہ اس امتحان میں کامیاب ہوئے۔"[۲۴]

مولانا آزاد نے الندوہ میں جو مضامین لکھے[۲۵] ان سے ان کی شہرت اور ناموری میں یقیناً اضافہ ہوا۔ تمام علمی حلقوں نے انھیں پسند کیا اور ہر طرف سے ان کے بارے میں استفسار ہونے لگے۔ اس سلسلے میں اردو کے مشہور اہلِ قلم اور صاحبِ طرز انشاپرداز مہدی افادی کو ایک خط میں علامہ شبلی لکھتے ہیں: "آزاد کو تو آپ نے مخزن وغیرہ میں دیکھا ہوگا، 'قلم وہی ہے'، معلومات میں یہاں رہنے سے ترقی کر گئے ہیں۔"[۲۶]

مولانا زیادہ عرصہ تک الندوہ سے وابستہ نہ رہ سکے۔ صرف چھ ماہ بعد انھوں نے اسے خیرباد کہہ دیا۔ گویا اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک وابستگی رہی اس دوران مولانا آزاد اور علامہ شبلی کی خوب ملاقاتیں رہیں۔

شاہجہانپوری، پھلواروی، کاکوروی، سب یک جا ہیں۔
ـــــ فردِ جرم بہت بڑی ہے۔ خورد بُرد کا الزام ہے۔
بہاولپور کے عطیے کا اشتہار بھی جرائم میں شامل ہے ـــــ
ہاں! انھیں جرائم میں ابوالکلام کی محبت بھی ہے۔ بھائی
حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا ظلم حد سے بڑھ گیا۔ کہاں
تک صبر کروں"۔

(لکھنؤ۔ ۱۷ر نومبر۔ ۱۹۱۰ء)

اس موقع پر علامہ شبلی مولانا آزاد کو لکھنؤ بلانا چاہتے تھے تاکہ اُس جلسے میں شریک ہوں اور علامہ کے موقف کی وکالت کریں۔ لیکن کلکتہ جیسے دور دراز شہر سے لکھنؤ آنا کچھ آسان نہ تھا۔ لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے معذرت کا خط لکھا۔ لیکن علامہ کی بارگاہ میں یہ عذر قبول نہ ہوا اور انھوں نے سخت خط لکھ کر مولانا سے شرکت کے لیے اصرار کیا۔ علامہ تحریر فرماتے ہیں:

"ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔ اگر آپ اس موقع پر نہ آئے تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا، بلکہ قیامت کے بعد بھی۔ میرے برابر کا کمرہ بالکل خالی اور آپ کے لیے محفوظ ہے۔ اکثر احباب آرہے ہیں اور آچکے ہیں:

دیر ویراں سہی کعبہ مرا آباد رہے
یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا میں یاد رہے

(۲۱ر دسمبر۔ ۱۹۱۰ء)

بعد کے حالات سے پتا چلتا ہے کہ اس مرحلے پر مولانا نے علامہ کا بھرپور ساتھ دیا اور مسائل کو سلجھانے میں پیش پیش رہے۔ انھوں نے نہ صرف ندوہ میں، بلکہ اس کے باہر بھی شبلی کی حمایت کی اور ان کے حق میں رائے عامہ کو ہموار کرنے کی مخلصانہ کوششیں کیں۔ انھوں نے الہلال کے اوراق اس کے لیے وقف کر دیے۔ اور نہ صرف یہ کہ خود طول طویل مضامین لکھ کر علامہ شبلی کے موقف کی وکالت کی بلکہ ان کی حمایت میں دوسرے حضرات کے مضامین اور خطوط بھی شائع کیے۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کا ایک طویل مضمون 'شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اور مسئلۂ الندوہ'۔

(الہلال۔ جلد ۲۔ شمارہ۔ ۱۷۔ ۳۰ر اپریل۔ ۱۹۱۳ء)

خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے مخصوص پُرزور اور مدلّل انداز میں علامہ کی وکالت کی ہے۔ اس کے علاوہ 'شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی اور مسئلہ الندوہ' از سید علی متقی امروہوی (الہلال۔ جلد۔۲۔ شمارہ ۱۷۔ ۳۰ر اپریل۔۱۹۱۳ء) اور 'علامہ شبلی نعمانی پر بے جا الزامات کی حقیقت' از خواجہ رئیس الدین رئیس لکھنوی (الہلال۔ جلد ۲۔ شمارہ ۱۸، ۷ر مئی ۱۹۱۳ء) بھی علامہ شبلی کی حمایت میں شائع ہونے والی اہم تحریریں ہیں۔ شبلی کو الہلال میں شائع ہونے والے ان مضامین کی اہمیت کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ ان تحریروں سے ان کے موافق رائے عامہ کو ہموار کرنے میں بہت مدد ملے گی۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ الہلال کے ذریعہ ان کے مخالفین کے رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوتی رہنی چاہیے چنانچہ حیدرآباد سے ۲۷ر اکتوبر ۱۹۱۳ء کو مولانا آزاد کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں:

" ندوہ کا قصہ اب ٹالنے کی چیز نہیں۔ میرا کلکتہ آنا موقوف علیہ نہیں ہے۔ میرے سر میں اس وقت سخت درد ہے ـــــ الہلال وغیرہ نے احساس عام پیدا کر دیا ہے۔ یعنی تمام اسلامی کاموں پر لوگوں کو مداخلت کا دعویٰ پیدا ہو گیا ہے۔ اسی اصول پر الہلال میں یہ صدا بلند ہونی چاہیے اور قطعاً ملک متوجہ ہو گا۔ کم از کم ایک پرزور کمیشن تحقیقات اور درستی طریقِ عمل کے لیے قائم ہونی چاہیے اور اس میں پانچ ممبر ہوں مسٹر مظہر الحق اور مولوی عبدالباری بھی ہوں (گو موخر الذکر میرے مخالف ہی سہی)۔"

علامہ شبلی اور ان کے حامیوں کی تمام تر مساعی کے باوجود حالات بگڑتے چلے گئے تا آں کہ مجبور ہو کر جولائی۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ نے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ اس سے ندوہ کی صورتِ حال اور زیادہ بگڑ گئی۔ اب طلبا میں بھی بے چینی پھیل گئی اور انھوں نے علامہ کے حق میں ہڑتال کر دی۔ جس سے حالات بہت ہی سنگین ہو گئے۔ ہر طرف سے استعفیٰ کی واپسی کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ علامہ نے طلبا سے پُرامن رہنے اور اسٹرائک واپس لینے کی اپیل کی۔ لیکن بے سود اس موقع پر ملک کے مقتدر اخباروں نے شبلی کی حمایت میں مضامین لکھے اور اس کو ایک ملک گیر تحریک کی شکل دے دی۔ اس کی تفصیلات بتاتے ہوئے سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"آخر ۷ر مارچ ۱۹۱۴ء کو مولانا کی ہر قسم کی فہمایش کے باوجود طلبہ نے اسٹرائک کا عام اعلان کر دیا اور چوں کہ طرابلس و بلقان کی لڑائیوں اور کانپور کے ہنگاموں اور مسلم یونیورسٹی کے پُرجوش مطالبوں کے باعث طبایع میں عام طور سے بے چینی تھی، اس لیے اسٹرائک کے ساتھ ملک کی ہمدردی ایک ملکی مسئلے کی طرح پھیل گئی۔ زمیندار لاہور، ہمدرد دہلی، مسلم گزٹ لکھنؤ اور الہلال کلکتہ اس زمانے کے مشہور آزاد اخبار تھے، جو طلبہ کی حمایت میں پُرزور مضامین لکھ رہے تھے۔ وقت کی سیاسی بے چینی نے قوم کے افراد کو دو حصوں میں صاف صاف منقسم کر دیا تھا۔ ایک آزاد جن کا نام آہستہ آہستہ احرار پڑ رہا تھا، جس کے سربراہ مولانا ابوالکلام، محمد علی مرحوم، سید حسرت موہانی، مولوی ظفر علی خاں اور ان کے شیخ طریقت مولانا شبلی تھے۔ دوسرا حصہ قدامت پسندوں کا تھا جن میں اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، نواب حاجی اسحاق خاں اور دوسرے حکام رس اشخاص تھے۔ احرار کا طبقہ ہر طرح

دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں۔

(لکھنؤ۔ ۱۵ر جون۔ ۱۹۰۹ء)

۲۔ برادرم! جس قدر آپ کی عنایت و محبت کا یقین زیادہ ہوتا جاتا ہے، اسی قدر آپ کی نکتہ سنجی اور نقادی کی طرف سے بے اعتباری بڑھتی جاتی ہے کہ آپ میری صحبت کو لطف انگیز اور نسبتاً دوسروں کے مقابلے میں قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔

(۵ر دسمبر۔ ۱۹۰۹ء)

۳۔ کیا آپ حیدرآباد چلتے ہیں تو میں افریقہ ہو کر کعبہ کو جا سکتا ہوں۔ ترکستان واپسی میں آجائے گا۔ جزیرہ کو ہرگز جانے کا ارادہ نہیں، البتہ چمنستانِ بمبئی کو چھوڑنا فردوس کو چھوڑنا ہے، جو ایک زاہد سے ممکن نہیں۔

(۱۸ر اکتوبر۔ ۱۹۱۰ء)

۴۔ یہ تو بڑی مشکل ہے کہ آپ ہنسی مذاق کی باتوں کو اصلی بات سمجھ جاتے ہیں اور اس پر ایک طومار باندھتے ہیں۔ یہ کس پاجی کا خیال ہو سکتا ہے کہ بغداد آپ کی پیری مریدی کو ترقی دے گا اور اس کے لیے آپ چلنے پر مائل ہوں گے۔ اگر یہی بدگمانی رہی تو جینا مشکل ہو جائے گا۔ . . .“

(۲۵ر مارچ۔ ۱۹۱۱ء)

۵۔ ۲۰ر نومبر کو الٰہ آباد میں اردو نصاب یونیورسٹی کی کمیٹی ہے۔ اردو کو مٹائے جانے کے سامان ہیں۔ میں بھی ممبر ہوں، اس لیے جانا پڑے گا۔ اس کے بعد خالی ہوں اور ممکن ہے کہ زیارت نصیب ہو۔

(لکھنؤ۔ ۲۶ر اگست۔ ۱۹۱۱ء)

۶۔ کلکتہ آنے کو سو سو بار جی چاہتا ہے لیکن کیا کروں ’سیرۃ‘ کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں۔

(۲۰ اگست۔ ۱۹۱۳ء)

ان اقتباسات سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی مولانا آزاد کو کتنا عزیز رکھتے تھے اور کس حد تک بے تکلفی اور برابر کی سطح پر آکر تخاطب کرتے تھے۔ اسی سے ان کی بزرگانہ شان مستحکم رہی۔ ادھر مولانا آزاد بھی اپنے معاملات میں شبلی سے مشورہ کرتے اور ان کی رہنمائی کے خواہاں ہوتے۔ علامہ شبلی کے ہی ایک خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۱۰ء میں مولانا آزاد کوئی اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ اس کا نام انھوں نے ’ملک و ملت‘ یا ’وقت‘ تجویز کیا تھا۔ اس سلسلے میں انھوں نے علامہ شبلی سے مشورہ کیا جس کے جواب میں علامہ نے انھیں حسب ذیل مشورے سے نوازا۔

”اخبار کا نام نہ ’ملک و ملت‘ موزوں ہے نہ ’وقت‘، ایک مطول، اور ایک زائد از ضرورت مختصر ہے۔ صرف ’آزاد‘ نام ہونا چاہیے۔ میں اس سے زیادہ کوئی نام حسب حال اور حسب ضرورت اور آئیڈیل نہیں سمجھتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ لوگ توافق اسمی کی وجہ سے خود نمائی کا شبہ کریں۔“

(لکھنؤ۔ ۱۲ر جون۔ ۱۹۱۰ء)

علامہ شبلی ۱۹۰۵ء میں دارالعلوم ندوہ کے تعلیمی امور کے معتمد مقرر ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھ ہی حکیم سید عبدالحئی (حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد بزرگوار) معتمد مراسلات اور مولانا محمد احتشام علی کاکوروی معتمد صیغۂ مال مقرر ہوئے۔ ان حضرات کی رہنمائی میں دارالعلوم کے معاملات بڑی خوش اسلوبی سے چل رہے تھے۔ اس عرصہ میں اس نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور ملک کے گوشہ گوشہ میں اس کی شہرت عام ہوئی۔ اور بقول سید سلیمان ندوی:

”جیسے جیسے ندوہ کی شہرت پھیلتی جاتی اور اس کا کام آگے بڑھتا جاتا تھا۔ اس کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا (شبلی) کی شہرت اور مقبولیت کا ایک ورق بن جاتا تھا۔ یعنی ندوہ کی کثرت میں مولانا کی وحدت نمایاں سے نمایاں تر ہوتی جاتی تھی۔ یہ گو واقعہ تھا مگر اس واقعہ کو واقعہ سمجھ کر برداشت کر لے جانا ہر انسان کا کام نہیں اس لیے رشک و حسد نے بے اعتمادی، اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کیا۔“[۲۸]

اس رشک و حسد اور بے اعتمادی نے ندوہ کی فضا کو مکدر کرنا شروع کر دیا اور یہ اندرونی سیاست اور باہمی اختلافات کا شکار ہو گیا۔ یہ سازشیں علامہ شبلی کے خلاف کی جا رہی تھیں۔ ۱۹۱۰ء تک حالات بہت بگڑ گئے۔ علامہ پر طرح طرح کے الزامات لگائے جانے لگے۔ حتیٰ کہ ان کی تصانیف الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کو بنیاد بنا کر ان پر کفر کے فتوے بھی لگا دیے گئے۔ ظاہر ہے یہ حالات علامہ کے لیے انتہائی پریشانی کا باعث تھے۔ ایک طرف تو خود ان کی دیانت اور ناموری معرضِ خطر میں تھی، بلکہ ان کے مخالفین نے ان کے اسلام پر بھی حملہ کر دیا تھا، دوسری طرف ندوہ پر سیاہ بادل منڈلانے لگے تھے۔ اس کی ساکھ روز بروز گرتی جا رہی تھی۔ یہ تصور بھی علامہ کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ ان پریشان کن اور روح فرسا حالات میں اُن حضرات سے مدد چاہنا جو اُن کے اپنے تھے اور جو ان سے اخلاص رکھتے تھے، ایک فطری عمل تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے تمام معتمدین سے اس سخت مرحلے پر بیش از بیش حمایت کی فرمائش کی۔ ان مخلصین میں مولانا ابوالکلام بھی شامل تھے۔ چناں چہ انھوں نے مولانا کو بھی ان حالات سے باخبر رکھا اور ان سے ندوہ کے ان اجلاسوں میں شرکت کی بالاصرار درخواست کی جن میں یہ معاملات زیر بحث آنے تھے۔ اس سلسلے میں ۷ر نومبر ۱۹۱۰ء کو ایک خط میں مولانا کو لکھتے ہیں۔

”برادرم! آج کل سخت نرغہ ہے۔ سہارنپوری،

سے طرزِ تصنیف و ترتیب اور مشکلات موضوع کے خاص مقامات سامنے آجائیں، شایع کر دینے چاہئیں تاکہ اربابِ فن و رائے کو اس کی نسبت بحث کرنے اور مشورہ دینے کا موقع مل سکے۔

آج کی اشاعت میں ہم دیباچۂ کتاب کا ایک ٹکڑا شائع کر رہے ہیں۔ جس کے مطالعہ سے موضوعِ کتاب کے متعلق ناظرین کو نہایت مفید بصیرت حاصل ہوگی۔ اس کے بعد اصل کتاب کے بعض اہم حصے بھی شائع کیے جائیں گے۔ ان علمائے کرام سے جن کو فن سیر و حدیث سے دلچسپی ہے، خاص طور پر اُمید کی جاتی ہے کہ وہ بہ تعمق نظر ملاحظہ فرمائیں گے اور کوئی امر قابلِ بحث و مذاکرہ یا مشورۂ ضروری ان کے خیال میں آئے گا تو اُسے دفتر سیرۃ النبی یا صفحات الہلال تک پہنچانے میں دریغ نہ فرمائیں گے۔ یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ ابھی کتاب کے تمام ٹکڑے محض مسودے کی حالت میں ہیں۔ ممکن ہے کہ جو ٹکڑے شائع کیے جائیں ان میں عندالاشاعت بہت سی تبدیلیاں ہو جائیں۔ سر دست مقصود صرف بغرضِ مشورہ و مبادلۂ آرا و بحث و مذاکرہ ان کی اشاعت ہے۔

جو حضرات آج کل کے جدید فن سوانح نویسی و واقعہ نگاری سے ذوق و واقفیت رکھتے ہیں وہ کتاب کی ترتیب و تنظیم مطالب کی نسبت اگر چاہیں تو مفید مشورے دے سکتے ہیں۔"[۱۴]

اس طویل تمہیدی نوٹ کے بعد سیرۃ النبی کے دیباچے کو نقل کیا گیا ہے جو پانچ صفحات پر مشتمل ہے اس کے بعد مزید تین قسطوں میں اس کے بقیہ حصے شائع کیے گئے ہیں (الہلال ۲۹ جنوری ۱۹۱۳ء، ۵ فروری ۱۹۱۳ء، ۱۲ فروری ۱۹۱۳ء) اس پر اہلِ علم حضرات کی طرف سے سخت ردِ عمل ہوا۔ یوں تو حمایت اور تعریف میں بھی چند خطوط آئے جو الہلال میں شائع ہوئے۔ لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن میں بعض امور سے اختلاف کیا گیا تھا۔ مگر علما کا بڑا طبقہ علامہ کے بہت سے خیالات سے متفق نہیں تھا اسی لیے ان کے خلاف سخت محاذ آرائی شروع ہو گئی۔ ان لوگوں نے یہ کوشش کی کہ یہ کتابی شکل میں شائع نہ ہو اور یہ بھی کوشش کی گئی کہ ریاست بھوپال جو اس کے اخراجات کی کفالت کرتی ہے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا جائے۔ کافی دنوں تک یہ ہنگامہ رہا۔ لیکن آخر میں حالات علامہ کے حق میں سازگار ہو گئے۔ ریاست بھوپال سے امداد بھی جاری ہوئی۔ اور سیرۃ النبی شائع بھی ہوئی لیکن افسوس ہے کہ اس جامع منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا علامہ شبلی کو نصیب نہ ہو سکا اور ابھی صرف دو جلدیں ہی مکمل کر پائے تھے کہ وقتِ موعود آپہنچا
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

آخری زمانے میں جب علامہ اپنی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے، اس وقت بھی انھیں سیرۃ النبی کی تکمیل کی ہی فکر لاحق تھی چنانچہ انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمیدالدین فراہی اور سید سلیمان ندوی کو تار دے کر بلایا۔ مولانا آزاد کو جو تار بھیجا تھا اُس کا مضمون یہ تھا۔

" اگر آپ اس اثنا میں مل جاتے تو سیرت نبوی کی اسکیم کا کچھ انتظام ہو جاتا۔ ورنہ سب کارروائی بے کار ہو جائے گی۔ سید سلیمان ندوی اگر موجود ہوتے تو ان کو پورا پلان سمجھا دیتا۔"

یہ ٹیلیگرام ۱۵ نومبر ۱۹۱۴ء، یعنی علامہ کی وفات سے صرف چار دن قبل کا ہے۔ بد قسمتی سے یہ تار مولانا آزاد کو وقت پر نہ مل سکا البتہ سید سلیمان ندوی عین وقت پر پہنچ گئے تھے۔ علامہ نے اُن سے سیرت کو مکمل کرنے کی وصیت کی جس کو انھوں نے پورا کیا۔ اس آخری ملاقات کا نقشہ سید صاحب نے ان الفاظ میں کھینچا ہے:

" مولانا ابوالکلام کا کچھ پتہ نہ چلا معلوم نہیں انھیں تار ملا یا نہیں۔ میں اس وقت بانکی پور میں تھا۔ مجھے بھی ان میں سے کوئی تار نہیں ملا۔ لیکن بلا اطلاع دل نے خود زیارت کی کشش ظاہر کی اور میں صبح سویرے کسی کو کہے بغیر چل کھڑا ہوا۔

لیکن آہ! جب ۱۵ نومبر کی شام کو میں پہنچا تو طاقت جواب دے چکی تھی۔ میں سرہانے کھڑا تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ مولانا نے آنکھیں کھول کر حسرت سے میری طرف دیکھا اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ 'اب کیا رہا' پھر زبان سے دو بار فرمایا۔ 'اب کیا! اب کیا'۔ لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلا دیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی۔ تو معاہدے کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: 'سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کر دو'۔ میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ضرور! ضرور!"[۱۵]

سید صاحب نے اپنا عہد پورا کیا اور اُسی معیار پر سیرۃ النبی کی تکمیل کی جو معیار علامہ شبلی نے قائم کر دیا تھا۔

علامہ شبلی مولانا آزاد بہت سے ملکی اور ملی مسائل میں بھی ہم خیال، سیاسی میدان میں بھی دونوں ہم قدم نظر آتے ہیں: کے بارے میں تو سب کو معلوم ہی ہے کہ وہ کٹر قسم کے مٹ خیالات کے انسان تھے۔ کانگریس کے صف اول رہنماؤں میں شمار کیے جاتے تھے۔ اسی لیے قدم قدم پر مسلم لیگ سے اُن کا ٹکراؤ ہوا۔

علامہ شبلی بھی بنیادی طور پر قوم پرور خیالات کے حامل تھے۔ اور حیرت انگیز بات یہ کہ سرسید کے رفیقِ خاص ہوتے ہوئے بھی کانگریس کے حامی تھے اور اس مسئلے پر ان سے اختلاف رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کی طرح وہ

کی ہمدردی وحوصلہ افزائی کر رہا تھا اور دوسرا طبقہ ندوہ کے موجودہ کارکنوں کی حمایت میں تھا۔ مدارس کی عام ڈسپلن اور کارکنان مدارس کی ہمدردی کے نام سے علی گڑھ کالج کے ارباب اقتدار اور مدرسہ دیوبند کے علما بھی ندوہ کے مدعیوں کے ساتھ تھے۔ اور یہ تصادم ملک کے طول وعرض میں پورے ڈھائی مہینے قائم رہا۔"[۳۳]

ندوہ کی اس صورت حال سے اس کے بہی خواہ بہت پریشان تھے۔ وہ ہر قیمت پر ندوہ کو بچانا چاہتے تھے اُن کے نزدیک ندوہ کی بربادی ایک عظیم الشان اسلامی تحریک کی ناکامی تھی جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک زبردست المیہ تھا۔ اس لیے اصلاحِ ندوہ کے لیے ملک میں جگہ جگہ جلسے منعقد کیے گئے۔ اور اصلاح کی کوششوں کو تیز تر کیا گیا۔ اس مرحلے میں بھی مولانا آزاد پیش پیش تھے۔ انھوں نے ایک طرف تو ان جلسوں میں تقریریں کر کے اس تحریک کو تقویت بخشی اور دوسری طرف 'الہلال' میں مضامین شائع کر کے عوام کو بیدار کیا۔ اس سلسلہ میں ان کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اور حق یہ ہے کہ اس وقت اس بلند آہنگی سے ملک میں ندوہ کے انقلاب اور اصلاحِ کار کا صور پھونکا کے وہ مولانا ابوالکلام کا آتش ریز قلم تھا۔ انھوں نے الہلال میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور وشور سے ماتم کیا کہ ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک آگ سی لگ گئی۔ اور ہر طرف 'ندوہ' ندوہ کا شور برپا ہوگیا۔"[۳۴]

اسی دوران ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اس حادثۂ عظیم سے حالات ایک دم پلٹ گئے۔ دونوں متحارب گروپ کچھ نرم پڑے۔ مخلصین کی کوششیں کچھ بارآور ہوتی نظر آئیں۔ مگر خلیج اس قدر وسیع ہوگئی تھی کہ اس کو پاٹنا نہایت ہی مشکل کام تھا۔ لیکن حکیم اجمل خاں جیسے بزرگوں کی مسیحا نفسی، مولانا ابوالکلام، مولانا سید عبدالحیؒ اور نواب ناظر یار جنگ (جج ہائی کورٹ۔ حیدرآباد) جیسے محبانِ قوم اور عمائد ملت کی پُر درد اور پُرخلوص مساعی بالآخر کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار ہوئیں اور اپریل ۱۹۱۵ء میں دو گروپوں میں مصالحت ہوگئی۔ اس تصفیہ کی خوبی یہ تھی کہ اس سے دونوں فریق مطمئن تھے اور کسی کو بھی احساسِ شکست نہیں ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا آزاد کی کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ ہر طبقۂ فکر کے لوگوں نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا۔ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھی ان کی خدمات کا اعتراف بڑے شاندار الفاظ میں کیا ہے۔ چنانچہ اس معاہدہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے حیات شبلی میں وہ لکھتے ہیں:

"اس تصفیہ کے بعد مولانا ابوالکلام صاحب مسلم یونیورسٹی ایسوسی ایشن' کے ضروری اجلاس میں شرکت کے لیے پہلی اپریل کو علی گڑھ چلے گئے جہاں سے وہ ۵ر اپریل کو واپس آکر ندوہ کے آخری اجلاس میں شریک ہوئے اور مجلسِ اصلاح کی طرف سے کھُلے جلسے میں تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا' اور دونوں فریق نے اتحاد واتفاق کے اس پُرمسرت منظر پر خوشی ظاہر کی لیکن اس خوشی وشادمانی کے رنگین مناظر میں جو بات کانٹے کی طرح چبھتی تھی وہ یہ تھی کہ افسوس اس منظر کو دیکھنے کے لیے ہم میں وہ موجود نہ تھا جس کو اس کے دیکھنے کی سب سے زیادہ آرزو تھی۔ مگر اس کی روح اُمید ہے کہ شاد' ہوگی۔"[۳۵]

شبلی کو رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی سے گہری عقیدت تھی۔ انھیں آپ کی سیرتِ مبارکہ سے خصوصی شغف تھا۔ اسی لیے انھوں نے اس عظیم ترین ہستی کی ایک مستند اور جامع سیرت لکھنے کا منصوبہ بنایا تھا اور اپنی زندگی میں اس کی دو جلدیں مکمل بھی کرلیں۔ ۱۹۱۳ء میں اس کی پہلی جلد مکمل ہوئی اور الہلال کو یہ شرف حاصل ہے کہ کتابی شکل میں شائع ہونے سے قبل اس کے کچھ حصّے اس کے اوراق کی زینت بنے۔ مولانا آزاد نے ایک طویل تعارفی نوٹ کے ساتھ اس کے ابتدائی حصّے شائع کیے۔ اس نوٹ کے ضروری اقتباسات حسبِ ذیل ہیں:

"ناظرینِ کو معلوم ہے کہ کچھ عرصہ سے شمس العلما مولانا شبلی نعمانی ایک عظیم الشان دینی وعلمی خدمت میں مصروف ہیں۔ یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک جامع ومکمل سیرۃ کی تدوین وتصنیف میں، جو نہ صرف یہ کہ اُردو زبان میں آج تک نہ لکھی گئی تھی۔ بلکہ افسوس ہے کہ عربی و ترکی زبانوں میں بھی، جن پر اردو سے بہتر تصنیف وتالیف کا دور گذر رہا ہے۔ لیکن شاید بہت کم لوگوں کو اس کام کی مشکلات کا صحیح اندازہ ہوگا۔ درحقیقت یہ کام ایک شخص کے بس کا نہ تھا۔ گو وہ اپنے اندر قابلیتوں اور فضیلتوں کا کیسا ہی مجمع رکھتا ہو۔ کیوں کہ قابلیت اور دماغ نہیں بلکہ وقت اور محنت بھی مطلوب تھی ضرورت تھی کہ ایک منتخب ترین اربابِ علم کی مجلس قائم ہوتی اور یورپ کے مجامع علمیہ کے اصول پر اس کام کو انجام دیا جاتا لیکن افسوس کہ ہم میں دماغ اور دل دونوں کا قحط ہے۔ اور آدمی کسی مشین میں ڈھال کر پیدا نہیں کیے جا سکتے۔

اس وقت سیرۃ النبی کا کام جس رفتار سے ہو رہا ہے اس کے لحاظ سے امید کی جاسکتی ہے کہ غالباً چند ماہ کے اندر کتاب کا پہلا حصّہ پریس جانے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ اس وقت مسودے کی صورت میں اس کا بڑا حصّہ مرتب ہو چکا ہے اور بدر تک کے حالات کی پہلی تبئیض بھی ہو چکی ہے۔ ہم نے مولانا سے عرض کیا کہ کتاب کی اشاعت سے پہلے اس کے بعض اہم اجزا جن



زیارت ہونے کی اُمید نہیں۔

کیف الوصول الی سعاد ودونہا
قلل الجبال ودونہن خیوف

اکتوبر میں رنگون بھی چلیے۔ والد کے عقیدتمند وہاں کم نہیں۔"

علامہ کی مولانا کے دل میں کتنی وقعت تھی اور ادبی فضیلت کا ان کے دل میں کیا مقام تھا، اس کا کسی قدر اندازہ مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کے نام مولانا کے اس خط سے لگایا جاسکتا ہے:

"آپ کی غزل پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی تحسین بڑی سے بڑی سند ہے جو اس عہد میں مل سکتی تھی ــــــ فی الحقیقت مولانا مرحوم کی ذات بنوع وکمال کے رنگارنگ مظاہر کا ایک عجیب مجموعہ تھی۔ بہ مشکل کوئی مہینہ ایسا گذرتا ہے کہ دو، تین مرتبہ ان کی یاد ناخن بردل نہ ہوتی ہو۔ وہ کیا گئے' علم وفن کی صحبتوں کا سر رشتہ ہی ختم ہو گیا۔ مولانا مرحوم سحر خیزی کے عادی تھے۔ والد مرحوم کی سحر خیزی نے مجھے بھی بچپن سے اس کا عادی بنا دیا ہے۔ اس اشتراک عادت نے ایک خاص رشتہ انس پیدا کر دیا تھا۔ جب کبھی یکجائی ہوتی تو صبح چار بجے کا وقت عجیب لطف وکیفیت کا ہوتا۔ چائے کا دور چلتا اور علم وفن اور شعر وادب کے چرچے رہتے۔ ہر وادی میں وہ اپنے ذوق وفکر کی ایک خاص اور بلند جگہ رکھتے تھے اور کتنی بڑی خوبی تھی کہ باوجود ملایانہ طلب علم کے' ملائیت کی پرچھائیں بھی ان پر نہیں پڑی تھی خشکی طبع جو اس راہ کے مہالک وآفات میں سے ہے' انھیں چھو بھی نہیں گئی تھی۔ شاعری کے ذوق وفہم کا جو اعلیٰ مرتبہ اُن کے حصے میں آیا تھا۔ اس کی نظیر تو ملنی دشوار ہے ہندستان میں فارسی شاعری غالب پر نہیں' اُن پر ختم ہوئی۔ کئی مرتبہ مجھے خیال ہوا کہ اگر وہ شاعری پر پوری طرح متوجہ ہوتے تو ان کا وزن شعر فارسی میں غالب سے کسی طرح کم نہ ہوتا۔ پھر غالب جو کچھ ہے تغزل و مدح کے محدود میدان میں ہے' لیکن مولانا نے فارسیت کے ذوقِ اعلیٰ کے تحفظ کے ساتھ فکر وتخیل کے نئے نئے میدان پیدا کیے جن پر ان کی قومی نظمیں گواہ ہیں خصوصاً حیدر آباد والی نظم۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ مولانا تنہا شاعر ہیں جنھوں نے فارسی شاعری کو اس کے اسلوب شعریت کے تحفظ کے ساتھ نئے میدانوں سے آشنا کیا۔ اس معاملے کی حقیقت اس وقت منکشف ہوتی ہے جب ایران کے نئے قومی شاعروں کے مہملات پڑھے جائیں۔ جن کی ترتیب واشاعت میں غریب 'براؤن' نے اس قدر زحمتیں برداشت کی تھیں۔ آج کل ایران کے ملک الشعراء بہار ہیں۔ خدا ان کے کلام کے مطالعے کی بدمزگی سے محفوظ رکھے۔"

یہ خط ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۰ء کا مکتوبہ ہے۔ گویا علامہ شبلی کے انتقال سے تقریباً ربع صدی بعد کا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ کی یاد ان کے دل میں اس وقت پر بھی تازہ تھی۔ اور اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی انھیں تڑپا رہی تھی۔ اسی کے ساتھ اس خط سے ان کے فارسی ادب کے مطالعے کی وسعت اور گہرائی کا اندازہ بھی ہوتا ہے کہ کلاسیکی فارسی ادب بالخصوص فارسی شاعری کے ساتھ جدید شاعری پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔

اور آخر میں ایک بہت ہی دلچسپ بات مولانا آزاد کا یہ قاعدہ تھا کہ وہ جس کتاب کا بھی مطالعہ کرتے اس پر حواشی ضرور تحریر فرماتے۔ یہ عادت انھیں بچپن ہی سے پڑ گئی تھی۔ یہ دراصل ان کے والد کی نصیحت کا اثر تھا۔ انھوں نے مولانا آزاد کو ہدایت کی تھی کہ جو کتاب بھی پڑھو اس کے متعلق یادداشتیں ضرور قلم بند کرو یہ علیحدہ بیاض پر ہونی چاہئیں اور اگر یہ دستیاب نہ ہو تو زیر مطالعہ کتاب پر ہی لکھ لینی چاہئیں۔ خود مولانا خیرالدین کا بھی یہی طریقہ تھا کہ وہ جس کتاب کا مطالعہ کرتے اس پر نوٹس ضرور لکھتے۔ یہی طریقہ مولانا آزاد نے بھی اپنایا۔ چنانچہ سیکڑوں کتابوں پر ان کے حواشی ملتے ہیں۔ یہ کتابیں مولانا آزاد کے ذاتی کتب خانے کی زینت بنیں۔ یہ کتب خانہ اب 'انجمن روابط فرہنگی ہند' (انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز) 'آزاد بھون' نئی دہلی میں محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں جناب سید مسیح الحسن نے بڑا مفید اور اہم کام انجام دیا ہے۔ انھوں نے اردو کتابوں پر مولانا آزاد کے تمام حواشی کو سیاق وسباق کے ساتھ مضمون کی شکل میں یکجا کر دیا ہے۔ یہ سلسلہ "مضامین" مولانا ابوالکلام آزاد کے حواشی (زیر مطالعہ کتابوں پر)" کے عنوان سے "اسلام اور عصر جدید" کی کئی اشاعتوں میں شائع ہوا۔ اس کی پہلی قسط جولائی ۱۹۷۴ء (جلد ۶۔ شمارہ ۳) میں شائع ہوئی۔ اسی سلسلے کی ایک اہم قسط اکتوبر ۱۹۸۱ء کی ہے جس میں علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تالیف وتصنیفات پر مولانا کے حواشی شامل کیے گئے ہیں بعض حیثیتوں سے یہ حواشی بہت اہم ہیں۔ ان سے جہاں مولانا کے مطالعے کی وسعت اور معلومات کی ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے وہیں علامہ سے مولانا کے گہرے لگاؤ اور قریبی تعلق کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے چند حواشی پیش کیے جاتے ہیں یہ اقتباسات مسیح الحسن صاحب کے مذکورہ مضمون کی جولائی ۱۹۷۴ء کی قسط سے ماخوذ ہیں:

۱۔ رسائل شبلی۔ علی گڑھ مطبع العلوم ۱۸۹۸ء:

"ص ۲۶۳ سنسکرت سے عربی میں ترجمہ شدہ کتابوں کی ایک فہرست درج ہے۔ ان میں سندباد بھی شامل ہے۔

حاشیہ آزاد: یہ سندباد دوسری چیز ہے جو فارسی میں ترجمہ ہوئی تھی۔ خدا یاد کا ترجمہ اب چھپ گیا ہے۔" (ص ۶۶)

بھی مسلم لیگ کے نظریات اور اس کی حکمت عملی سے اختلاف کرتے تھے۔ اس سلسلے میں ان کی سیاسی نظمیں آج بھی ہمارے دلوں کو گرماتی اور روح کو تڑپاتی ہیں۔ خصوصیت سے ان کی وہ نظمیں جو مسلم لیگ کی ہجو میں کہی گئی ہیں۔ بہت دلچسپ اور لائق مطالعہ ہیں۔ مولانا طفیل احمد منگلوری کا تو یہ کہنا ہے کہ مسلم قوم میں سیاسی بیداری لانے کا کام شبلی نے انجام دیا اور اس راہ میں ان کی ہمرکابی ابوالکلام نے کی۔ اپنی کتاب "مسلمانوں کا روشن مستقبل" میں "سیاسی بیداری میں مولانا شبلی کا حصہ" کے تحت وہ لکھتے ہیں:

مسلمانوں کو سیاست کی طرف لانے میں مولانا ابوالکلام، مولانا شبلی نعمانی کے شریک کار رہے۔ انھوں نے رسالہ جات موسوم بہ الہلال اور البلاغ کے ذریعے مسلمانوں میں مذہبی اور سیاسی روح پھونکی . . . ."

(ص ۔ ۳۹۱)

اسی طرح مسلم یونیورسٹی تحریک میں بھی دونوں حیرت انگیز طور پر ہم مسلک و ہم خیال نظر آتے ہیں۔ یوں تو علی گڑھ یونیورسٹی قائم کرنے کی تجویز خود سرسید احمد خاں کی ہی تھی۔ اور اس کی خشت اوّل کے طور پر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج قائم کر لیا تھا لیکن یونیورسٹی کی طرف کوئی خاص پیش رفت نہیں ہو سکی تھی۔ سرسید کے بعد ان کے جانشینوں نے وقتاً فوقتاً اس سلسلے میں کوششیں کیں لیکن کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔ بالآخر ۱۹۱۰ء میں سر آغا خاں کی رہنمائی میں تحریک کا باقاعدہ احیا ہوا اور یونیورسٹی کے حصول کی خاطر منظم طور پر جدوجہد کی گئی۔ اس کے لیے لکھنؤ اور علی گڑھ میں جلسے منعقد کیے گیے اور وائسرائے وغیرہ کی خدمت میں وفود بھیجے گئے۔ اس تحریک سے علامہ شبلی بھی وابستہ تھے اور مولانا آزاد بھی۔ ابتدا میں دونوں کے خیالات میں کسی حد تک اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے حسب معمول، عام لوگوں سے مختلف موقف اختیار کیا۔ اور ایک وقت وہ آیا کہ جب وہ اپنے نظریات میں یکہ و تنہا رہ گئے۔ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ مولانا کا ہی موقف درست تھا۔ علامہ شبلی مولانا آزاد کو تمام حالات سے باخبر رکھتے تھے۔ چنانچہ ۲۵ر مارچ ۱۹۱۱ء کے ایک خط میں وہ مولانا کو لکھتے ہیں:

"یونیورسٹی کا چارٹر تو ضرور مل جائے گا، یہ قطعی ہے۔ باقی یہ کہ وہ کیا ہوگی، اس کو وہ لوگ خوب جانتے ہیں، لیکن بہر حال نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے۔"

اس کے بعد ۱۸ر اگست ۱۹۱۱ء کو تحریر فرماتے ہیں:

"یونیورسٹی کے اجلاس یہاں ہو رہے ہیں۔ بڑے بڑے معزز لوگوں کا مجمع ہے۔ میں بھی ممبر ہوں اس لیے شریک ہوتا ہوں۔ اس کے بعد شملہ ڈپوٹیشن میں جانا ہے۔ غرض ان اسباب سے تاخیر ہو رہی ہے ورنہ آپ بچ کر کہاں جا سکتے ہیں۔ ان سب باتوں کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں اور ندامت سے منفعل ہو جاتا ہوں کہ جرم سخت ہے، بلکہ سخت سے سخت تر۔ لیکن جس سے معاملہ ہے اس کا دل بھی اسی قدر نرم بلکہ نرم تر ہے۔ اس لیے جرأت معذرت قائم ہے اور رہے گی۔"

زعمائے ملک کی مساعی کے نتیجے میں حکومت یونیورسٹی کا چارٹر دینے کو راضی تو ہو گئی۔ لیکن اس شرط پر کہ یونیورسٹی کا نام علی گڑھ یونیورسٹی ہوگا۔ اس کا دائرہ اختیار صرف علی گڑھ تک محدود ہوگا یعنی اس کو ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں کے الحاق کا حق حاصل نہ ہوگا، اور یونیورسٹی سے متعلق جملہ امور کے حتمی فیصلے کا حق چانسلر کو حاصل ہوگا۔ ظاہر ہے ان شرائط پر یونیورسٹی قبول کرنے کو مسلمان تیار نہیں تھے۔ لیکن علی گڑھ سے متعلق چند حضرات اس حق میں تھے کہ ہمیں ہر قیمت پر یونیورسٹی کا چارٹر لے لینا چاہیے۔ علامہ شبلی بھی ابتدا میں اسی خیال کے حامی تھے۔ جیسا کہ مذکورہ بالا خط سے بھی ظاہر ہے۔ لیکن مولانا آزاد اس خیال سے متفق نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اس قسم کی یونیورسٹی قبول کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جس پر بالادستی حکومت کی ہو اور اس کو اندرونی خود مختاری حاصل نہ ہو۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسوں میں بھی کیا اور الہلال میں بھی مضامین شائع کر کے اپنے موقف کی وضاحت کی اور اپنے مخالفین پر طعن و تشنیع کے تیر و نشتر برسائے۔ رفتہ رفتہ علامہ شبلی بھی مولانا آزاد کے ہم خیال ہو گئے۔ انھوں نے 'کشاف' اور 'وصاف' کے فرضی نام سے چند نظمیں بھی لکھیں جو کہ الہلال میں شائع ہوئیں۔ ان میں انھوں نے یونیورسٹی کے مسئلے پر 'علی گڑھ گروپ' کے رویے پر طنز کیا ہے۔ ان نظموں سے مولانا آزاد کے موقف کی حمایت بھی ہوتی ہے۔

جس طرح علامہ شبلی مولانا آزاد کی ذہانت و طباعی اور وسعت مطالعہ و تبحر علمی سے متاثر تھے، اسی طرح مولانا آزاد بھی ان کے علم و فضل کے بڑے مداح تھے اور عمر کے تفاوت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کا ادب و احترام کرتے تھے۔ اور باوجود ندوہ میں کئی ماہ ایک ساتھ رہنے اور بے تکلفانہ مراسم استوار ہونے کے مولانا ہمیشہ علامہ کا بزرگوں کا سا ہی احترام کرتے رہے۔ علامہ کے نام مولانا کا ایک خط ملاحظہ ہو جو ۱۶ر اکتوبر ۱۹۰۹ء کو لکھا گیا تھا۔ دیکھیے القاب سے لے کر آخری لفظ تک کس قدر ادب اور احترام ملحوظ رکھا گیا ہے:

"یا مولی الجلیل! تعلیقہ مبارک پہنچا۔ پچھلے خط میں آپ نے لکھا تھا کہ غضب ہے تم ضروری باتوں کا جواب بھی نہیں دیتے۔ سوچ رہا ہوں کہ آپ کے خط میں غیر ضروری بات کون سی ہوتی ہے۔

______ کاش آپ سے ملاقات ہوتی تو بہت باتیں کرتا۔ میری قلبی حالت عجیب و غریب ہو رہی ہے۔ لیکن افسوس کہ بظاہر حالات جلد شرف یاب

مولانا آزاد اور انجمن ترقی اردو ہند

مولانا ابوالکلام آزاد کے بزرگوں کا آبائی وطن دلّی تھا۔ اکبر بادشاہ کے زمانے میں مغلوں کا دارالسلطنت آگرہ تھا مگر دلّی کو علمی مرکزیت حاصل تھی اور بڑے بڑے علما دلّی ہی میں جمع ہو گئے تھے۔ ان ہی علما میں ایک شیخ جمال الدین نام کے بزرگ تھے۔ جن کی حق گوئی اور علمیت کا چرچا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ علم حدیث پر انھیں بڑا عبور تھا۔ اکبر نے ان ہی کے زمانے میں دین الٰہی کی بنیاد رکھی، اور اس کے بعض درباری علمانے اکبر کے روحانی پیشوا ہونے کا فتویٰ صادر کیا۔ اس فتوے پر مہر تصدیق ثبت کرنے کے لیے اکبر نے مغل دربار کے نمائندوں کو شیخ جمال الدین کی خدمت میں بھیجا مگر اس مردِ قلندر نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ یہی شیخ جمال الدین عرف بہلول دہلوی مولانا ابوالکلام آزاد کے مورث اعلیٰ تھے۔ دلّی کے قیام کے زمانے میں ان کو کئی درباری اعزاز پیش کیے گئے مگر انھوں نے قبول نہیں کیے۔ فرماتے کہ "گھر بناتے ہوئے ڈرتا ہوں کہیں دل نہ ویران ہو جائے"۔ دلّی ہی میں اس عالم دین کا انتقال ہوا۔

قیام دہلی کے زمانے میں مولانا منورالدین نے اپنی بڑی لڑکی کی شادی شیخ محمد ہادی سے کر دی۔ شیخ محمد ہادی، شیخ محمد احسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے اور ان کا تعلق مولانا شیخ جمال الدین کے خاندان سے تھا۔ شیخ محمد ہادی مولانا ابوالکلام کے دادا تھے ان کا انتقال دہلی میں ۲۵ سال کی عمر میں ہوا۔ مولانا آزاد کے والد کی عمر اس وقت تین یا چار برس کی تھی۔ یہ زمانہ مغلیہ دور کے خاتمے کا تھا۔ انگریزی حکومت کا تسلط تقریباً ہندوستان کے چاروں طرف ہو چکا تھا۔ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت ان کے نانا مولانا منورالدین کے یہاں ہوئی۔ نانا کی آمد و رفت قلعے میں زیادہ تھی اور بقول مولانا آزاد قلعے کی زندگی کے جو حالات وہ بیان کرتے تھے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ باوجود حد درجے تنزل و غفلت کے بے شمار خوبیاں تمدن اور عمدہ سوسائٹی کی قلعے میں موجود تھیں۔ انیسویں صدی کے علما میں مولانا آزاد کے والد مولانا خیرالدین کی نمایاں حیثیت تھی۔ وہ دلّی ہی کے رہنے والے تھے لیکن یہاں کے ماحول سے وہ مطمئن نہ تھے اس لیے دلّی سے ہجرت کر کے حجاز چلے گئے۔ اور مکۂ معظمہ میں سکونت اختیار کی۔ یہیں انھوں نے ایک عرب خاتون سے شادی کی۔ یہ عرب خاتون شیخ محمد بن ظاہر وتری کی بھانجی تھیں جو اس وقت مدینہ منورہ کے مفتی تھے اور شیخ عبداللہ سراج کے بعد مکۂ معظمہ کے محدث بنے۔ پانچ بچے ہوئے جن میں تین لڑکیاں اور دو لڑکے تھے۔ مولانا آزاد ان پانچوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ مکۂ معظمہ میں ستمبر ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے ان کی تعلیم و تربیت والد ہی کی نگرانی میں ہوئی۔ مولانا آزاد کی والدہ کی مادری زبان عربی تھی اور وہ اپنے بچوں سے عربی زبان میں بات چیت کرتی تھیں۔ اردو زبان نہیں جانتی تھیں۔ البتہ اتنی اردو سیکھ لی تھی کہ بات چیت کر سکیں۔

مولانا کے والد ۱۸۹۸ء میں مکۂ معظمہ میں سخت بیمار پڑے وہاں کے علاج سے کوئی فائدہ نہ ہوا تو عزیزوں اور مریدوں کے مشورے سے انھیں علاج کے لیے بمبئی لایا گیا۔ یہاں کچھ دن قیام کے بعد انھیں کلکتہ لے گئے۔ مولانا خیرالدین کے مریدوں کی تعداد بہت بڑی تھی اور وہ سب مولانا سے بے حد انسیت اور محبت کرتے تھے اس لیے علاج کے بعد ان مریدوں نے ان کو واپس نہیں جانے دیا اور مولانا مع اپنے خاندان کے کلکتہ میں رہنے لگے اور اب یہی ان کا وطن ہو گیا۔ مولانا آزاد بھی اپنے والد کے ساتھ کلکتہ ہی میں بس گئے۔ ۱۹۰۶ء میں مولانا آزاد کے بڑے بھائی ابوالنصر غلام یٰسین آہ کا انتقال ہو گیا۔ اور ۱۹۰۸ء میں مولانا خیرالدین مولانا آزاد کو تنہا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مولانا خیرالدین کی وفات کے بعد ان کے مرید مولانا آزاد کو ان کا جانشین بنانا چاہتے تھے۔ مگر مولانا نے انکار کر دیا۔

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز گیارہ بارہ سال کی عمر سے ہوا۔ پہلے شاعری اور بعد میں نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ شاعری کا شوق مولوی عبدالواحد خاں سہسرامی نے پیدا کیا۔ یہ مولوی محمد فاروق چریاکوٹی کے شاگرد تھے۔ ان کی بہن مولانا کے یہاں گھر کے کام کاج کے لیے ملازم تھیں۔ اس تعلق سے مولوی عبدالواحد خاں کی آمد و رفت ہوئی۔

مولوی عبدالواحد خاں نے ان کا تخلص "آزاد" رکھا مولانا کا شعری ذوق بڑھتا گیا اور کسی اچھے استاد کے متلاشی ہوئے۔ چنانچہ پہلے منشی امیر احمد کو دو غزلیں اصلاح کے لیے بھیجیں جو انھوں نے اصلاح کے بعد واپس بھیج دیں لیکن باقاعدہ شاگرد مولوی ظفر احسن شوق نیموی کے ہوئے بقول مولانا آزاد وہ بہت جی لگا

ایم رحبیب خاں
ناظم کتب خانہ، انجمن ترقی اردو ہند، اردو گھر، راؤز ایونیو، نئی دہلی ۲

۲۔ "ص ۲۹۷: اسپین میں علمی مدارس کے فقدان پر اظہار افسوس کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ زیب و زینت سے معمور عمارتیں اور قصر و محلات تھے لیکن ان تمام میں کسی کالج یا اسکول کا نام و نشان نہیں ملتا۔

حاشیۂ آزاد: تمام مساجد جوامع علوم تھیں۔ کذلک فی الہند۔" (ص ۶۶)

۳۔ "ص ۲۰۲ پہلی سطر میں 'لوازمات' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

حاشیۂ آزاد: "لوازم" (ص ۶۷)

۴۔ مقالاتِ شبلی۔ جلد اول (مذہبی)

"ص ۵۵: کلام پاک میں خدا کی مشیت یا حکم اور ارادے کے ذکر میں شبلی نے دو قسمیں لکھی ہیں: فطری اور شرعی۔

حاشیۂ آزاد: فطری اور شرعی کی جگہ تکوینی و تشریعی کہنا تھا۔ سلف سے بھی مروی ہے اور مفہوم کو بہتر ادا کرتا ہے۔ ابن قیم اور ابن تیمیہ نے جا بجا یہ مصطلحات استعمال کی ہیں۔" (ص ۶۹)

۵۔ مقالاتِ شبلی۔ جلد دوم (ادبی)

"ص ۸۱: شبلی نے اپنے مضمون 'بھاشا اور مسلمان' میں ملک محمد جائسی کے کمال کا ذکر کیا ہے نیز لکھا ہے کہ ہندوؤں میں سب سے بڑا شاعر آخری زمانے میں 'کالیداس' گذرا ہے جس نے رامائن کا بھاکا میں ترجمہ کیا ہے۔

حاشیۂ آزاد: مقصود تلسی داس ہے۔ غلطی سے کالیداس لکھ دیا ہے۔" (ص ۶۹)

۶۔ حیاتِ شبلی، مولفہ سید سلیمان ندوی۔

ص ۹۷: سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: معقولات میں مولانا فاروقی کے فیض سے خود علامہ مرحوم کی بصیرت اتنی کافی ہو چکی تھی کہ جس پر کسی مزید اضافے کی توقع مشکل امید ہو سکتی تھی اس لیے صرف مولانا ارشاد حسین کے شرف تلمذ پر اکتفا کی۔ علامہ مرحوم کو حضرت مولانا ارشاد حسین صاحب کی وسعت نظر، اصابت رائے اور مجتہدانہ ژرف نگاہی کا اعتراف ہمیشہ رہا اور اکثر بہ سبیل تذکرہ ان کے کمال فہم و ادراک اور قوت تفقہ کے واقعات بیان فرماتے۔ مولانا ارشاد حسین نہایت متشدد حنفی تھے۔ مولوی نذیر حسین صاحب کی ایثار الحق کے جواب میں انتصار الحق انہی نے لکھی ہے۔"

حاشیۂ آزاد: اگر اس زمانے میں مولوی شبلی کو مجتہدانہ نظر و فکر کی جستجو ہوتی تو مولوی عبدالحیٔ کو ترجیح دیتے جو حنفیت کے مقلدانہ جمود سے باہر آ چکے تھے لیکن انھوں نے مولوی ارشاد حسین کو انتخاب کیا جو مقلد اعمیٰ تھے۔ مولوی نذیر حسین کی کتاب ایثار الحق نہیں ہے، معیار الحق ہے۔ مولوی ارشاد حسین کی معلومات کا یہ حال تھا کہ انتصار الحق میں بلوغ المرام کو شاہ ولی اللہ کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ ان کی تعریف میں مجتہدانہ ژرف نگاہی لکھنا کس قدر بے معنی ہے۔" (ص ۹۴، ۹۵)

۷۔ ص ۳۴۸: شبلی کے عقد ثانی کی صورت اس طرح ہوئی کہ ان کے معالج مصطفیٰ خان نے ان کو دوسرے نکاح کا مشورہ دیا چنانچہ مولوی محمد سمیع صاحب کی ماموں زاد بہن سے نسبت ٹھہری۔ عقد ثانی کا یہ ارادہ مولانا کے اکلوتے بیٹے حامد حسن صاحب کو ناگوار گذرا اور وہ چپکے سے لاپتہ ہو گئے۔

حاشیۂ آزاد: اس لیے کہ پہلے یہ رشتہ خود حامد کے لیے تجویز ہوا تھا۔" (ص ۹۷)

حواشی

۱۔ حیاتِ شبلی، ص ۴۴۴۔
۲۔ مولانا ابوالکلام، فکر و فن، ص ۴۴ - ۴۵۔
۳۔ مولانا ابوالکلام، فکر و فن، ص ۹۵۔
۴۔ مکاتیب ابوالکلام، مرتبہ ابوسلمان شاہجہاں پوری، ص ۴۳۳۔
۵۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۵۰ - ۳۵۱۔
۶۔ حیاتِ شبلی، ص ۳۴۷ - ۳۴۸۔
۷۔ مولانا ابوالکلام آزاد، شخصیت اور کارنامے، مرتبہ خلیق انجم، ص ۴۰۶۔
۸۔ رپورٹ متعلق اجلاس نوزدہم محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۵ء، ص ۳۰۳-۳۰۴۔
۹۔ رپورٹ متعلق اجلاس نوزدہم محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس ۱۹۰۵ء، ص ۳۰۴۔
۱۰۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۱۲۔
۱۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۲۸۔
۱۲۔ امام الہند، تعمیر افکار، ص ۲۷۹۔
۱۳۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۲۔
۱۴۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۱۔
۱۵۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۲
۱۶۔ مہتمم دارالعلوم ندوہ۔
۱۷۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۴۔
۱۸۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۱۴، ۳۱۵۔
۱۹۔ حیاتِ شبلی، ص ۴۴۳ - ۴۴۴۔
۲۰۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۳۰۴-۳۰۵
۲۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۰۲۔
۲۲۔ حیاتِ سلیمان، ص ۴۴۷ - ۴۴۸۔
۲۳۔ نئے پرانے چراغ، حصہ دوم، ص ۴۵۔
۲۴۔ مکاتیب شبلی، حصہ دوم، ص ۲۳۴۔
۲۵۔ شبلی نامہ، ص ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۶ حیاتِ شبلی، ص ۵۰۱۔
۲۷۔ حیاتِ شبلی، ص ۴۳۷ - ۴۳۸۔
۲۸۔ حیاتِ شبلی، ص ۴۵۳، ۲۹ حیاتِ شبلی، ص ۴۵۶۔
۳۰۔ حیاتِ شبلی، ص ۴۶۷۔
۳۱۔ الہلال، جلد ۲، شمارہ ۳ (۲۲ جنوری ۱۹۱۳ء)، ص ۸۔
۳۲۔ حیاتِ شبلی، ص ۲۲۷۔
۳۳۔ کاروانِ خیال، ص ۹۲-۹۳۔



ہر کام میں بہت سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں"۔

مولانا آزاد نے نومبر ۱۹۰۳ء میں "لسان الصدق" کلکتے سے جاری کیا۔ اس میں انجمن کے جلسوں کی روداد یں وہ برابر شائع کرتے رہے۔ اس کے علاوہ وہ انجمن کے فروغ کے سلسلے میں خود بھی نوٹ لکھتے۔ نومبر ۱۹۰۳ء کے شمارے میں مولانا انجمن ترقی اردو کے بارے میں لکھتے ہیں:

"انجمن ترقی اُردو نے اردو زبان کے علمی دائرے کو وسیع کرنے کی یہ صورت تجویز کی ہے کہ انگریزی، عربی فارسی کی علمی اور فنی کتابیں شگفتہ اردو میں ترجمہ کر کے شائع کی جائیں جن کی اشاعت سے قوم میں لغو اور بے نتیجہ ناولوں کے بجائے علمی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو۔ چنانچہ انگریزی، عربی، فارسی کی جو کتابیں انجمن نے انتخاب کی تھیں ان کے ترجمے اور طبع کا انتظام نہایت معقول طریقے سے ہو رہا ہے اور اُمید ہے کہ بہت جلد کتابیں طبع ہو کر ملک میں روشنی پھیلائیں گی۔ ان کتابوں کی فروخت کی نہایت آسان اور موزوں صورت یہ تجویز کی گئی ہے کہ جو شخص انجمن کی چھپی ہوئی کتابوں کو لینا چاہے وہ ایک سال میں پانچ روپے جیسی ایک قلیل رقم کی کتابوں کے لینے کا باضابطہ انجمن سے وعدہ کرے۔ ایسی حالت میں وہ مجبور نہیں کیا جائے گا کہ ایک مشت پانچ روپے کی کتابیں خریدے بلکہ چار مرتبہ یا تین مرتبہ متفرق کتابوں کو منگوانے کا مجاز ہے۔ ہماری رائے میں اس سے بہتر اور آسان طریقہ کتابوں کے لینے کا جس میں لینے والے کو کسی قسم کے بار کا احساس نہ ہو نہیں مل سکتا۔ ایک سال کے عرصے میں پانچ روپوں کی کتابوں کا لینا کس قدر غیر محسوس صرف ہے؟ ہماری گذارش بالخصوص اہل بنگال سے ہے جن کے کان انجمن کی آواز سے ابھی بہت کم آشنا ہوئے ہیں کہ وہ اپنی علمی زبان کی ترقی سے غافل نہ ہوں اور نہیں تو کم از کم انجمن کی کتابوں کی مستقل خریداری ہی سے اس اہم کام کی مدد کریں۔ باقاعدہ کارروائی ہونے کے خیال سے درخواست خریداری کے چھپے ہوئے فارم ہر شخص انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی ناظم صیغۂ علوم و فنون حیدرآباد سے یا دفتر لسان الصدق سے منگوا سکتا ہے"۔
(ابوالکلام آزاد دہلوی ایڈیٹر لسان الصدق و رُکن انتظامی انجمن ترقی اُردو ہند)

مولانا آزاد کے اس اقتباس سے انجمن ترقی اُردو سے ان کی والہانہ محبت اور اس کے فروغ میں ان کی خصوصی دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے۔ اس کے مطالعے سے اس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ نومبر ۱۹۰۳ء میں مولانا آزاد انجمن کی مجلس انتظامیہ کے ممبر مقرر ہو چکے تھے۔ انجمن کے فروغ کے لیے مولانا کی کوششیں برابر جاری رہیں۔ انھوں نے فروری ۱۹۰۴ء میں کلکتے میں انجمن ترقی اُردو کی شاخ قائم کرنے کی کوشش کی۔ مولانا اس شاخ کے قائم کرنے کی اطلاع دیتے ہوئے اپنے اخبار میں لکھتے ہیں کہ:

"انجمن ترقی اُردو کے لیے کلکتے میں ایک کوشش۔

"جناب مرزا شجاعت علی خاں بہادر (جو کلکتے کے مشہور رئیس ہیں) کچھ عرصے سے ایک ماہوار مشاعرے کی بنا ڈالی ہے جس کا ہر مہینے میں ایک جلسہ ہوتا ہے اور کلکتے کے موجودہ شعرا طرحی کلام سناتے ہیں۔ جنوری میں حسن اتفاق سے جناب سعیدالدین احمد خاں صاحب طالب رئیس دہلی اور جناب مرزا آغا شاعر صاحب ایڈیٹر آصف الاخبار بھی کلکتے تشریف لائے ہوئے تھے۔ اس لیے جنوری کا مشاعرہ خاص اہتمام سے ہوا۔ اسی مشاعرے میں ایک کام کی بات یہ ہوئی کہ جناب مرزا شجاعت علی خاں بہادر کی تحریک اور جناب مولوی اشرف الدین صاحب متولی امام باڑہ ہگلی اور جناب مرزا آسمان جاہ بہادر کی تائید سے ایک کمیٹی انجمن ترقی اُردو کی تائید کے لیے کلکتے میں قائم ہو گئی۔ جس کے غالباً بارہ اشخاص خاص رکن انتظامی قرار پائے۔ یہاں تک تو بالکل معمولی کارروائی ہے جس پر کسی قسم کی رائے قائم نہیں کی جا سکتی جب تک باضابطہ عملی کارروائی نہ شروع ہو جائے اُس وقت تک یہ سرگرمی قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ ہمارے سامنے کلکتے کی بہت سی نظیریں موجود ہیں جن میں باوجود اکثر سرگرم حضرات کے شریک ہونے کے آج تک کوئی مفید نتیجہ نہیں نکلا۔ ہمیں امید ہے کہ جناب مرزا صاحب خان بہادر نے جس طرح اس ضروری کام کی تحریک کی ہے ویسے ہی اسے انجام تک بھی پہنچائیں گے۔ کسی کام کا شروع نہ کرنا اس سے بہتر ہے کہ کسی کام کو شروع کر کے انجام تک نہ پہنچایا جائے۔ اس کارروائی کو آج ایک عرصہ ہو گیا۔ ابھی تک معلوم نہیں کہ اس کمیٹی کا کوئی اجلاس ہوا بھی یا نہیں اور اگر جلاس ہوا تو کیا کارروائی کی گئی۔ ہم اس ضرورت کو کہ کلکتے میں ایک شاخ انجمن ترقی اردو قائم ہو کس قدر ضروری ہے آئندہ نمبر میں دکھلائیں گے لیکن خوشی کی بات ہے کہ جن لوگوں نے اس شاخ کے قائم ہونے کا خیال کیا ہے وہ ہمارے بیان کرنے کے محتاج نہیں ہیں۔ اس کی ضرورت ہم اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ اس لیے ہم کو اُمید ہے کہ جناب مرزا صاحب ہمیں ان کارروائیوں کی اطلاع دیں گے جو اس وقت تک کی گئی ہیں اور قواعد انجمن اور فہرست ممبران انتظامی بھی ہمارے پاس بھیجنی چاہیے تاکہ باقاعدہ "لسان الصدق" میں شائع کی جائے اور ابھی تک کوئی کارروائی نہیں ہوئی ہے اور صرف ممبروں کی ایک فہرست نہایت خوشخط لکھ کر رکھ لی گئی ہے تو بے شک ہم مثل ان سیکڑوں غزلوں کے جو اس مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں اس تحریک کو بھی شاعرانہ تخیلات کا



کر اصلاح دیتے تھے۔

مولانا کو صحافت سے دلی رغبت تھی ۱۸۹۹ء میں انھوں نے "نیرنگ عالم" جاری کیا۔ یہ ۸ ماہ تک نکلتا رہا۔ ۱۹۰۰ء میں "المصباح" نکالا۔ ۲۰ر نومبر ۱۹۰۳ء کو کلکتے سے "لسان الصدق" جاری کیا۔ چند مہینوں میں یہ ایسا چمکا کہ ادبی حلقوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔

اسی زمانے میں مولانا آزاد کو تقریر کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے پہلی تقریر ۱۹۰۳ء میں کی۔ اُس وقت حالی، شبلی اور نذیر احمد زندہ تھے۔ علامہ شبلی کا تعلق مولانا آزاد سے "لسان الصدق" کی وجہ سے ہوا۔ شبلی اس زمانے میں انجمن ترقی اُردو کے آنریری سکریٹری تھے۔ اور انجمن کی خبریں اور جلسوں کی رپورٹیں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے علاوہ "لسان الصدق" میں بھی شائع ہوتی تھیں۔ بعض محققین کا خیال ہے مولانا آزاد کی شبلی سے ملاقات بمبئی میں ۱۹۰۵ء میں ہوئی لیکن خود مولانا آزاد، آصف علی، عبداللہ بٹ اور شیخ محمد اکرام نے مولانا شبلی سے ملاقات کا سنہ ۱۹۰۴ء لکھا ہے جو کہ قرین قیاس ہے۔ علامہ شبلی کو مولانا آزاد سے بہت محبت تھی مولانا بھی ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ اس کا اندازہ ہمیں "حیاتِ شبلی" اور شبلی کے خطوط سے بھی ہوتا ہے۔

۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی سر سید نے اس کی قدرے مخالفت کی اس لیے مسلمانوں کا ایک خاص طبقہ عرصے تک کانگریس سے الگ رہا۔ مولانا آزاد پہلے ممتاز مسلمان تھے جنھوں نے کانگریس کے حق میں آواز اٹھائی۔ یہ کام انھوں نے "الہلال" سے لیا۔ مولانا آزاد نے "الہلال" ۱۳ر جولائی ۱۹۱۲ء کو کلکتے سے نکالا۔ یہ اردو کا پہلا سیاسی اور مذہبی جریدہ تھا جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ اس دور کے تمام ادبی اور غیر ادبی جریدوں میں اس کا رنگ سب سے الگ تھا۔ یہ ایک دعوت تھی مسلمانوں کو سیاست کی طرف رجوع کرنے کی۔ اس کے ہیجان انگیز سیاسی اور دینی مضامین نے ملک میں ہلچل پیدا کر دی۔ "الہلال" کے بعد مولانا نے ۱۲ر نومبر ۱۹۱۵ء کو کلکتے ہی سے "البلاغ" نام کا دوسرا اخبار نکالا یہ الہلال کی طرز پر تھا لیکن یہ بھی ۳ر اپریل ۱۹۱۶ء کو بند ہو گیا۔ الہلال اور البلاغ کے صفحات اس دور کے ہندوستان کے علمی، ادبی، سیاسی اور دینی رجحانات کے ایسے خزینے ہیں جو کہیں اور نہ ملیں گے۔

> مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی، سیاسی ادبی، علمی اور صحافتی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مولانا کے تعلق کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے جو ابتدائی زمانے سے آخر تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا...

مولانا ابوالکلام آزاد کی دینی، سیاسی، ادبی، علمی اور صحافتی زندگی کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انجمن ترقی اُردو کے ساتھ مولانا کے تعلق کے بارے میں تفصیل سے لکھا جائے۔ جو ابتدائی زمانے سے آخر تک کسی نہ کسی شکل میں قائم رہا۔ سر سید کی تحریک پر علی گڑھ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم ہوئی۔ ۴ر جنوری ۱۹۰۳ء کو اس کانفرنس کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا جس میں اس کو تین شعبوں میں تقسیم کیا گیا۔ ان میں سے ایک شعبے کا نام انجمن ترقی اردو رکھا گیا۔ اس شعبے کے مقاصد میں اردو زبان کی ترقی اور اس کے علمی سرمائے میں اضافہ کرنا تھا۔ انجمن شروع ہی سے ایک سیکولر ادارہ رہی ہے۔ مسلم اور غیر مسلم فرقوں کے لوگوں نے اُردو کی ترقی اور فروغ میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ انجمن کے قیام کے موقع پر علامہ شبلی اس کے پہلے اعزازی سکریٹری بنائے گئے تھے۔ اور صدر پروفیسر ٹامس آرنلڈ کو بنایا گیا تھا۔ نائب صدور کے لیے مولوی نذیر احمد، مولوی ذکاءاللہ اور مولانا الطاف حسین حالی کا انتخاب ہوا۔ مولوی حامد علی صدیقی اسسٹنٹ سکریٹری بنائے گئے یہ سہارنپور کے رہنے والے تھے۔ یہ علمی شعبہ اُس وقت قائم تو ہو گیا مگر اس کا دستور العمل بننے تک اور ارکان کی تشکیل ہونے میں تین ماہ لگ گئے۔ اس لیے انجمن ترقی اُردو کی سرگرمیوں کا آغاز اپریل ۱۹۰۳ء سے ہوا۔ مولانا شبلی نے بڑے انہماک اور جوش کے ساتھ انجمن کے کام انجام دیے۔ انھوں نے اپنے زمانے میں انجمن کی بڑی اہم کتابیں شائع کیں ان کتابوں میں دوسری زبانوں کے علاوہ انگریزی فارسی اور عربی سے اردو میں ترجمے بھی شامل تھے۔ انجمن کی کارگذاری کی رپورٹیں سر سید کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شامل ہوتی تھیں۔

انجمن کی رپورٹوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا تعلق انجمن سے مئی ۱۹۰۳ء میں ہوا۔ مئی ۱۹۰۳ء کے شروع میں انجمن کا جو جلسہ ہوا اس میں ممبروں کی تعداد ۲۹ تھی۔ مئی ۱۹۰۳ء کے آخر میں علامہ شبلی کی رپورٹ کے مطابق جن ۱۵ ممبروں کا اضافہ ہوا ان میں مولانا آزاد کا نام شامل ہے۔ اب انجمن کے کل ممبروں کی تعداد ۴۴ تک پہنچ گئی۔ "باقیاتِ شبلی" میں مشتاق حسین مرحوم لکھتے ہیں:

"مولوی ابوالکلام صاحب کی شرکت سے بنگال میں انجمن کی اشاعت کی قوی امید ہے کیوں کہ آپ نہایت ہمدردی سے انجمن کی اعانت فرما رہے ہیں اور

۳۔ نواب علی یاور جنگ۔ حیدرآباد

۴۔ افضل العلما ڈاکٹر عبدالحق۔ پرنسپل پریسی ڈینسی کالج۔ مدراس۔

تقسیم کے بعد مولانا آزاد نے دو اہم کام یہ انجام دیے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو برباد ہونے سے بچایا اگر مولانا اس قومی ادارے کی طرف توجہ نہ کرتے تو سرسید کی اس درس گاہ کو برباد ہونے سے کوئی نہیں بچا سکتا تھا انھوں نے نہایت نازک حالات میں اس کی شیرازہ بندی کر کے ڈاکٹر ذاکر حسین کو وائس چانسلر مقرر کرایا۔ لیکن اس کے برخلاف علی گڑھ نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا اس کا حال کسی سے پوشیدہ نہیں۔ دوسرا کام جو انھوں نے انجام دیا وہ انجمن ترقی اُردو کی حفاظت اور از سرِ نو اس کی تنظیم ہے۔ مولانا نے انجمن کا دفتر دلّی سے علی گڑھ منتقل کرا دیا اور اس کا سکریٹری قاضی عبدالغفار کو مقرر کیا اور ڈاکٹر ذاکر حسین کو اس کا صدر۔ ان دونوں حضرات نے اس وقت کے نازک حالات کا ہمت سے مقابلہ کیا۔ جنوری ۱۹۵۶ء میں قاضی عبدالغفار کا انتقال ہو گیا مولانا کو ان کی موت کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور ان کے مشورے سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے پروفیسر آل احمد سرور کو انجمن کا اعزازی سکریٹری مقرر کیا۔ جب ڈاکٹر ذاکر حسین اپنی مدت ختم کر کے بہار کے گورنر مقرر ہو گئے تو مولانا آزاد پنڈت ہردے ناتھ کنزرو کو انجمن کا صدر بنانا چاہتے تھے مگر پنڈت جی اردو سے ہمدردی کے باوجود اپنی صحت کی خرابی کی وجہ سے اس عہدے کو قبول نہ کر سکے اس لیے کرنل بشیر حسین زیدی صدر بنائے گئے۔ پھر زیدی صاحب کے بعد پنڈت جی انجمن کے ۵ سال سے زائد صدر رہے۔

سرور صاحب کے زمانے میں مولانا آزاد کے مشورے سے دلّی میں انجمن ترقی اُردو ہند کی آل انڈیا اردو کانفرنس منعقد ہوئی۔ کانفرنس کا افتتاح پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا اور صدارت کے فرائض مولانا ابوالکلام آزاد نے انجام دیے تھے۔ اس موقعے پر پنڈت نہرو، مولانا حفظ الرحمٰن، پنڈت سندر لال اور مولانا آزاد نے تقریریں کیں۔ کانفرنس کا پنڈال عین جامع مسجد کی سیڑھیوں کے سامنے بنایا گیا تھا۔ پنڈال سے ذرا ہٹ کر اردو بازار کے سامنے اردو کتابوں کے اسٹال لگائے گئے جو ہندوستان کے مختلف مقامات سے اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے۔ مولانا آزاد نے اس موقع پر اپنی تقریر میں کہا:

"اُردو ایک ایسی زبان ہے جو ملک میں عام طور پر بولی جاتی ہے نہ صرف شمال بلکہ جنوب میں بھی اس کے بولنے والے خاصی تعداد میں ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ حیدرآباد اور تلنگانہ کے علاقے میں اُردو بولی جاتی ہے۔ میسور میں لاکھوں آدمی اردو بولتے ہیں۔ اسی طرح آندھرا اور مدراس میں متعدد جگہ اُردو بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یو۔ پی۔ بہار، دلّی اور پنجاب میں تو کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ یہاں لاکھوں ہزاروں آدمی اردو بولتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ جس مقصد کے لیے یہ کانفرنس بلائی گئی ہے اس میں اسے کامیابی ہوگی اور اب جب وزیرِ اعظم نے اس کا افتتاح کیا ہے تو یقیناً وہ اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہے گی۔"[۷]

مولانا آزاد کی تقریر کا یہ اقتباس نہایت مختصر مگر جامع ہے۔ اس تقریر میں مولانا نے حکومت سے اُردو کے ساتھ انصاف کا پُر زور مطالبہ کیا ہے اور اُردو والوں کی طرف سے خود ہی وکالت بھی کی ہے کہ وہ ہندی کے مخالف نہیں ہیں۔ لیکن اردو بھی اس ملک کی زبان ہے۔ اس کو بھی ہندی کے برابر حق ملنا چاہیے۔ مولانا آزاد کی یہ آخری تقریر تھی کسے معلوم تھا کہ ٹھیک اس کانفرنس کے ایک ہفتے بعد یعنی ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو وہ اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ انجمن سے ان کا تعلق مئی ۱۹۰۳ء میں قائم ہوا۔ اور یہ تعلق کسی نہ کسی شکل میں انجمن سے مرتے دم تک قائم رہا۔

حواشی

۱۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۶۵۔

۲۔ ابوالکلام آزاد، عبداللہ بٹ، مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء، ص ۱۲۱، ۱۲۲۔

۳۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، ص ۲۴۱، ۲۴۲۔

۴۔ باقیاتِ شبلی، ص ۸۱۔

۵۔ لسان الصدق، ص ۱۴۔

۶۔ لسان الصدق، فروری ۱۹۰۴ء۔

۷۔ ہماری زبان، ۱۵ مارچ ۱۹۵۸ء۔



ایک کرشمہ خیال کرتے ہیں۔"

۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی نے انجمن ترقی اُردو کی سکریٹری شپ سے استعفادے دیا اور ان کی جگہ نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی انجمن کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ جیسا کہ اس سے پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مولانا آزاد کی شبلی سے ملاقات ۱۹۰۴ء میں بمبئی میں ہوئی اور ۱۹۰۵ء میں علامہ شبلی انجمن چھوڑ کر ندوہ چلے گئے۔ اور 'الندوہ' کی ادارت کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔ یہیں مولانا آزاد علامہ شبلی کے علمی کاموں کی معاونت کرنے لگے اور الندوہ کے نائب مدیر کی حیثیت سے علمی اور ادبی کام انجام دیتے رہے۔ تاہم انجمن ترقی اُردو سے ان کا تعلق برابر قائم رہا۔ اور اس کی ترقی میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔

۱۹۱۲ء میں بابائے اردو مولوی عبدالحق انجمن ترقی اُردو کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اب تک انجمن کو قائم ہوئے دس سال کے قریب ہو چکے تھے لیکن نامور ادیبوں کی سرپرستی کے باوجود کوئی نمایاں کام نہیں ہوا تھا۔ بقول مولوی عبدالحق جب انھیں انجمن کا چارج دیا گیا تو انجمن کا کل اثاثہ ایک پرانا صندوق جو بوسیدگی کی وجہ سے رسّی سے بندھا ہوا تھا' کچھ رجسٹر' کچھ غیر مرتب شدہ مسودات' ایک قلم اور ایک ٹوٹی ہوئی پرانی دوات تھی۔ یہ تھا انجمن کا کل اثاثہ جو مولوی صاحب کو اپنے پیش رو کی طرف سے ملا۔ مولوی عبدالحق کو اردو سے والہانہ عشق تھا۔ اس لیے اس اثاثے نے انھیں بددل نہیں کیا۔ اب تک انجمن کا دفتر علی گڑھ میں تھا۔ مولوی صاحب اُسے اورنگ آباد لے گئے اور وہاں رہ کر انجمن کے کام اور اُردو کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ انجمن کے لیے ایک کثیر رقم جمع کی اور اس رقم کو علمی اور تحقیقی کتابوں کی اشاعت پر صرف کیا۔

نومبر ۱۹۳۸ء میں بابائے اُردو نے انجمن ترقی اردو کا صدر دفتر دلّی منتقل کر دیا۔ اور دلّی میں ڈاکٹر مختار الدین انصاری کی کوٹھی واقع دریا گنج میں انجمن کا دفتر قائم کیا۔ جب ۱۹۱۲ء میں انجمن علی گڑھ سے اورنگ آباد منتقل ہوئی تو اس کا کل اثاثہ ایک پُرانا صندوق اور کچھ غیر مرتب مسودات تھے لیکن جب دلّی لائی گئی تو اس کی شائع شدہ کتابیں اور دوسرا سامان ریل گاڑی کے کئی ڈبوں میں لاد کر دلّی لایا گیا۔

اگست ۱۹۴۷ء میں ہندوستان آزاد ہو گیا۔ چاروں طرف بلوے، قتل وغارت اور لوٹ مار ہونے لگی۔ پاکستان بنا لوگوں نے ہجرت شروع کر دی۔ چاروں طرف قیامت کا منظر تھا۔ انجمن کا صدر دفتر بھی اس کی لپیٹ میں آگیا اور بلوائیوں نے انجمن کے دفتر کو آگ لگا دی۔ اس کا قیمتی کتب خانہ برباد کر دیا بظاہر کوئی امید باقی نہیں رہی تھی کہ انجمن کا وجود باقی رہے گا۔ مولانا آزاد کو جب اس بربادی کا علم ہوا تو انھوں نے حفاظتی اقدامات کرائے اور دفتر کو مقفل کرا دیا۔ دفتر پر پولیس کا پہرا بٹھادیا تاکہ اس کے باقی اثاثے کو بچایا جا سکے۔ بابائے اُردو اس اثاثے کو نئے حالات کے تحت کراچی منتقل کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ بھی چاہتے تھے کہ دونوں ملکوں میں رہ کر اردو کی خدمت کریں۔ لیکن مولانا آزاد اس پر آمادہ نہ ہوئے۔ ۱۰ ِاکتوبر ۴۸ء کو بابائے اُردو نے مولانا آزاد کو جو خط لکھا اس کا جواب مولانا نے ان کو دیا۔ یہ خط انجمن کی تاریخ پنجاہ سالہ میں بابائے اردو نے نقل کیا اس کے بعد قومی زبان اور اُردو کے بابائے اردو نمبر میں شائع ہوا۔ اس کا کچھ حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد اپنے ۲۰ ِاکتوبر ۴۸ء کے خط میں لکھتے ہیں:

" آپ اپنے خط مورخہ ۱۰ ِاکتوبر ۴۸ء میں لکھتے ہیں کہ آپ نے انجمن کے متعلق جو مشورہ دیا تھا اس سے مجھے اتفاق ہے۔ مشورے سے مقصود غالباً یہ معاملہ ہے کہ اب انجمن ترقی اردو کو پاکستان منتقل کر دیا جائے؟ اگر میرا یہ قیاس صحیح ہے تو مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آپ نے صورت حال کی جو تعبیر کی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ براہ عنایت اپنے فیصلے کو میرے مشورے کا جامہ نہ پہنائیں ——— آپ نے ایک قدم پاکستان میں جمایا ہے دوسرا یہاں رکھنا چاہتے ہیں۔ یہ طرز عمل انجمن کے لیے سودمند نہ ہوگا ——— جہاں تک میری رائے کا تعلق ہے میں بار بار یہ خیال ظاہر کر چکا ہوں کہ انجمن ہندوستان میں قائم ہوئی تھی اور کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ کیوں وہ اپنا کام یہاں جاری نہ رکھے؟ جہاں تک گورنمنٹ آف انڈیا کا تعلق ہے وہ ایک لمحے کے لیے بھی اس کی خواہش مند نہیں کہ انجمن اپنے کاموں کو یہاں بند کر دے۔ آپ کو معلوم ہے کہ اسی سال ایجوکیشن منسٹری نے انجمن کے لیے ایک گرانٹ منظور کی ہے اور اسے کام میں لانے کی پوری ذمہ داری ارکانِ انجمن کے سر ہے۔"

مولانا آزاد کسی طرح نہیں چاہتے تھے کہ انجمن کا دفتر کراچی منتقل کر دیا جائے۔ تقسیم کے بعد انجمن ترقی اُردو کی مجلس نظما کا ایک جلسہ ۱۸ ِاپریل ۴۹ء کو حبیب منزل میں منعقد ہوا۔ جلسے کی صدارت نواب صدر یار جنگ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے کی۔ مطبوعہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ جلسے میں نواب احمد سعید خاں' ڈاکٹر ذاکر حسین' پنڈت کیفی' ڈاکٹر عبدالستار صدیقی اور مولوی عبدالحق موجود تھے۔ اس وقت انجمن کی مجلس عام میں ۱۸ جگہیں خالی تھیں۔ ان میں چار جگہوں پر بہ اتفاق رائے حسب ذیل حضرات کا انتخاب ہوا:

۱۔ آنریبل مولانا ابوالکلام آزاد
۲۔ کرنل سر کیلاش نرائن ہاکسر



دیتا ـــــ میرے بھائی قانون کیا چیز ہے؟ تم قانون سمجھتے بھی ہو؟ تمھاری مرضی کا نام قانون نہیں ہے۔ ـــ آزادی کی راہ میں قربانی و جاں فروشی مسلمانوں کا قدیم ورثہ ہے۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی اور پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دِلائیں گے۔ سرکاری وکیل صاحب نوٹ کرلیجیے!

ـــ گذشتہ دو سال کے اندر کوئی صبح کوئی شام مجھ پر ایسی نہیں گزری ہے جس میں، مَیں نے گورنمنٹ کے مظالم کا اعلان نہ کیا ہو، میری عُمر ۱۸ برس کی تھی جب میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی تھی۔ مَیں نے زندگی کا بہترین حصّہ یعنی عہدِ شباب، صرف اس مقصد کے عشق میں قربان کر دیا ہے، یہ تو میری زندگی کا دائمی مقصد ہے، مَیں صرف اسی کام کے لیے جی سکتا ہوں ـــ میری تقریروں کی جو نقل پیش کی گئی ہے وہ نہایت ناقص، غلط اور بعض مقامات پر بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے۔ میرا ادبی ذوق بے جوڑ جملوں سے مجروح ہوا ہے۔ مثلاً مَیں نے اپنی تقریر میں مشہور فرانسیسی ادیب وِکٹر ہیوگو کا ایک قول نقل کیا تھا کہ 'آزادی کا بیج کبھی بارآور نہیں ہوسکتا جب تک کہ ظلم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو'۔ ـــ مگر اس قول کی شاید یہ اصلاح کی گئی ہے، یعنی 'جب تک دھرم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو' ـــ یہ دھرم کا پانی کیا چیز ہے؟ ایک اور جگہ رپورٹ میں درج ہے کہ 'انھوں نے جیل خانے کی مصیبت کو برباد کیا ہے' ـــ کیا مہمل بات ہے! غالباً جملہ اس طرح ہوگا۔ -- 'انھوں نے جیل خانے کی مصیبت کو برداشت کیا ہے!' ـــ مشکل یہ ہے کہ انگریزی افسران ابواللیث اور محمد اسمٰعیل جیسے لوگوں کو اہلِ زبان سمجھتے ہیں! ان کے نزدیک ہر وہ آدمی جو انگریزی زبان سے کسی مختلف لہجے میں آواز نکالے، اُردو کا اسکالر ہوتا ہے اور عدالتوں میں سَند کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

قبل اس سے کہ مَیں اپنا بیان ختم کروں اپنے ہم وطن بھائیوں کی نسبت جو اس مقدمے میں میرے خلاف کام کر رہے ہیں، مَیں وہی دُعا مانگوں گا جو پیغمبرِ اسلام نے ایک موقعے پر مانگی تھی:

'خدایا ان پر راہ کھول دے کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ یہ کیا کر رہے ہیں! ـــ اور آپ ـــ'

مجسٹریٹ صاحب، زیادہ سے زیادہ سزا جو آپ کے اختیار میں ہے بِلا تامل مجھے دیجیے۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا! میرا معاملہ پوری مشنری سے ہے۔ کسی ایک پُرزے سے نہیں ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی پُرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔

مسٹر مجسٹریٹ، اب میں کورٹ کا زیادہ وقت نہیں لینا چاہتا ـــ یہ تاریخ کا ایک دِلچسپ اور عبرتناک باب ہے جس کی ترتیب میں، مَیں اور آپ دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں، ہمارے حِصّے میں یہ مجرموں کا کٹہرا آیا ہے اور تمھارے حِصّے میں وہ مجسٹریٹ کی کُرسی! ـــ مَیں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے آپ کی وہ کُرسی بھی اتنی ہی ضروری ہے جس قدر یہ کٹہرا! آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں! مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے! ہمیں جلد سے جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلے لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام یونہی جاری رہے گا اور ـــ اور پھر مسٹر مجسٹریٹ، وہ وقت آئے گا جب ہم میں اور آپ میں جگہوں کا تبادلہ ہوگا۔ یعنی تم یہاں اس کٹہرے میں ہوگے اور ہم وہاں اس عدالت کی کُرسی پر، اور تمھارے چہروں پر تمھارے اعمال کی پھٹکار ہوگی [1]

سفر

"گذشتہ ۲۵ برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں لیکن مَیں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ مَیں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا۔ لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ شاید اسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خُدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ مَیں سفر کر رہا تھا، وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی [2]

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی

"ایوانِ اردو" کے آزاد نمبر کے لیے ایک تحریر بعنوان 'فسانۂ ابوالکلام آزاد' ارسالِ خدمت ہے۔

اس میں بیشتر اقتباسات، عبارات، جملے، مختلف ادیبوں کے مضامین سے مستعار لیے گئے ہیں۔ میری تحریر آٹے میں نمک کے برابر ہے! میں نے ان اقتباسات، عبارات، جملے، تراشے ضمنی سرخیوں کی مناسبت سے ربط و تسلسل قائم کرنے کے لیے ترتیب دیے ہیں اور ایک تاثر پیدا کرنے کی سعی کی ہے۔ تحریر کی یہ روش شاید مقبول نہ ہو لیکن دلچسپ معلوم ہوگی۔

سید حسین



فسانۂ ابوالکلام آزاد

منزل:

تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۲۴ (الف) کے تحت مولانا کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا۔

یہ مقدمہ مولانا کی دو تقریروں کی بنا پر تھا جو مرزاپور پارک کلکتہ میں کی گئیں تھیں۔ پہلے جلسے کی تقریر کا مقصد تین اشخاص کی گرفتاری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا تھا اور دوسری تقریر میں مولانا نے خلافت کے بارے میں عوام کو ان کا فرض یاد دلایا تھا۔ یہ دونوں تقریریں اُردو شارٹ ہینڈ میں سرکاری رپورٹر ابواللیث کی لکھی ہوئی تھیں۔ ڈپٹی کمشنر مسٹر گولڈی نے ابواللیث رپورٹر اور انسپکٹر اسپیشل برانچ محمد اسمٰعیل، گورنمنٹ آف بنگال کو اس وقت ڈیوٹی سونپ دی تھی اور ضروری کارروائی کے لیے حکومت بنگال سے مقدمے کو پیش کرنے کا اختیار حاصل کیا تھا۔

عدالت نے مولانا سے پوچھا کہ مولانا کیا آپ کچھ کہنا چاہتے ہیں؟ کیا آپ اپنا بیان لائے ہیں؟

مولانا نے نہایت بے باکی سے اپنا بیان دیا:

'میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان پیش کروں! یہ ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے، نہ کسی طرح کی امید ہے نہ طلب ہے نہ شکایت ہے! یہ ایک موڑ ہے جس سے گزرے بغیر ہم منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ ہم گورنمنٹ کے انصاف اور حق پسندی سے مایوس ہو چکے ہیں! تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمراں طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اُٹھائے ہیں تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی طولانی ہے اور تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہو سکی ہے۔ ہم اس میں حضرت مسیحؑ جیسے پاک انسانوں کو چوروں کے ساتھ کھڑا دیکھتے ہیں! ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا، اور آج، جب اس جگہ کھڑے ہونے کی عزت میرے حصے میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کی حمد و ثنا میں ڈوب جاتی ہے! میں مجرموں کے اس کٹھرے میں وہ فخر محسوس کرتا ہوں جو بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہے!

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے حکومتِ وقت کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے، بلکہ میں ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے! میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۷ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا! ۔ ۔ ۔ ۔

یوور آنر (Your Honour) ملزم نے اپنے جن کارناموں کا ذکر کیا ہے وہ قانون کی نظر میں جرائم ہیں!

یہ تو اپنی اپنی نظر کی بات ہے! میں تسلیم کرتا ہوں کہ سرکاری رپورٹر کی اطلاع کے مطابق، میں نے اپنی تقریروں میں یہ کہا ہے کہ 'ایسی گورنمنٹ جو ناانصافی کے ساتھ قائم ہو، اسے یا تو انصاف کے آگے جھکنا چاہیے یا اسے دُنیا سے مٹا دینا چاہیے! اور یہ بھی کہا ہے کہ اگر تمھارے دلوں میں اپنے گرفتار بھائیوں کا درد ہے تو تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آج سوچ لے کہ کیا وہ اس بات کے لیے راضی ہے کہ جس جابرانہ قوت نے انھیں گرفتار کیا ہے وہ اس برِّاعظم میں اس طرح قائم رہے جس طرح ان کی گرفتاری کے وقت تھی'۔ اگر یہ جملے قابلِ اعتراض ہیں تو ہوا کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر میں یہ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ میں سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں! جو چیز بُری ہے یا تو اسے دُرست ہو جانا چاہیے۔ یا مٹ جانا چاہیے۔ اس کے علاوہ، جب میں اس موجودہ گورنمنٹ کی بُرائیوں پر یقین رکھتا ہوں تو یقیناً یہ دُعا نہیں مانگ سکتا کہ گورنمنٹ دُرست نہ بھی ہو اور اس کی عمر دراز ہو! ___ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ سیاسی مقاصد حاصل کرنے کے لیے آپ اسلامی شریعت کا ناجائز استعمال کر رہے ہیں؟ ___ تم مجھے اسلامی شریعت کی تعلیم دینے آئے ہو؟ میں مسلمان ہوں اور مسلمان ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو، یا جو خود غرض مذہبی پیشواؤں کا ہو یا جو چند تنخواہ دار حاکموں کی بیوروکریسی ہو! اس حقیقت کے ہوتے پھر ایک سچا مسلمان انگریزی راج کو کیسے برداشت کر سکتا ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ میں سمجھتا ہوں کہ دُنیا کا کوئی مذہب رائج الوقت قوانین کو توڑنے کا مشورہ نہیں

سید حسین
۲۱۹، ساؤتھ صدر بازار، نزد پلٹن مسجد، کیمپ اسکول،
شولاپور ۴۱۳۰۰۳ (مہاراشٹر)



ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلی گرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ مجھے یہ خبر پہنچا دینی چاہیے۔[11]

جونہی خطرناک صورتِ حال کی خبر ملی میں نے اپنے دل کو ٹٹولنا شروع کر دیا۔ انسان کے نفس کا بھی کچھ عجیب حال ہے۔ ساری عمر اس کی دیکھ بھال میں بسر کر دیتے ہیں پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتدا سے ایسے حالات میں گزری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقع پیش آتے رہے اور جہاں تک ممکن تھا اسے کام میں لینے میں کوتاہی نہیں کی:

تا دست رسم بود زدم چاک گریباں
شرمندگی از خرقۂ پشمینہ ندارم

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لیے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد دماغ کو نہیں مگر جسم کو تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔[12]

اس زمانے میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا، میں اسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورتِ حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کروں۔ اس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن شاید باطن نہ ہو سکا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات کے ہر گوشے میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو باطن کی طرح نہیں بننے دیتے۔[13]

یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جسے دماغ کا مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا رہتا تھا کہ کہیں اس کے دامن صبر و وقار پر بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔[14]

"ان دنوں برٹش گورنمنٹ کا رویہ سخت ہو رہا تھا اور صورت حال بہت تشویشناک ہو رہی تھی کسی کو معلوم نہ تھا کہ ان لوگوں کو کہاں رکھا گیا ہے۔ تمام ہندوستان میں سیاسی نظربندوں کے متعلق متضاد افواہیں مشہور ہو رہی تھیں اور یہ بھانت بھانت کی بولیاں ستم رسیدہ فرقت کی ماری بیگم آزاد کے دل پر تیر و نشتر کا کام کرتی تھیں۔

اپنے چہیتے شوہر کے متعلق ہر نئی خبر سن کر وہ تڑپ کر رہ جاتیں! ان کو بس دن رات مولانا کی سلامتی کی دعائیں مانگنے اور رونے کے سوا کچھ یاد نہ رہا تھا۔ دوا انھوں نے بالکل چھوڑ دی تھی۔ غذا بھی برائے نام تھی، دق کا نامراد مرض دو سال سے پیچھا کیے ہوئے تھا۔ اب کمزور جسم پر اس نے بالکل تسلط جما لیا۔ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے اور کلکتہ کے مشہور ڈاکٹروں نے ان کو دیکھا مگر مرض کو افاقہ کیسے ہوتا جب کہ نہ دوا تھی نہ غذا۔ وہ ہر معالج سے یہی کہتی تھیں "بس خدا کے لیے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھا دو!" ان کی حالت دیکھ کر اور التجا سن کر آنکھوں میں آنسو بھرے ہر ڈاکٹر چارپائی سے اٹھتا تھا۔"[15]

"میں فوراً پہنچ گیا۔

گھر کے اداس نظارے ہی نے سب کچھ بتا دیا۔ مجھ سے کہا گیا، بیگم صاحبہ کے کمرے میں چلو۔ مجھے تامل ہوا مدتوں ایک ہی گھر میں رہتا تھا اور پردے کا بھی سوال نہ تھا مگر کبھی اچٹتی نگاہوں سے بھی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میرا پس و پیش دیکھ کر کہا گیا۔ بیگم صاحبہ مصر ہیں کہ تم پہنچو، وقت آخری ہے دیر نہ کرو! مجبوراً جانا پڑا۔ واقعی بیمار کا آخری وقت تھا۔ مگر نہ جانے کہاں سے قوت آ گئی تھی۔ میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ کہنے لگیں۔ آپ میرے بھائی ہیں۔ آپ کی ہمیشہ شکر گزار رہی ہوں۔ مولانا کا دیدار ممکن نہیں۔ ان سے کہنا کہ تمھارے ہی نام پر مر رہی ہوں، مگر میرے چلے جانے کا غم نہ کرنا! ــــ ہاتھ بری طرح لرز رہا تھا۔ کہنے لگیں ــــ مولانا کے لیے میرے پاس تو کچھ بھی نہیں! ــــ ہچکی آئی، اب وہاں کچھ نہ تھا۔ پلنگ پر صرف ایک لاش باقی تھی۔"[16]

"گذشتہ جمعرات کے دن ۸/ اپریل ڈاکٹر مجمدار طبی صلاح کار نہایت ہی مایوسی کے عالم میں ان کے کمرے سے باہر آئے۔ کہا کہ اگر مولانا کسی طرح آ سکیں تو مریضہ میں کچھ حوصلہ پیدا ہونے کا امکان ہے۔ قریب رات کے ۱۱ بجے اچانک وہ ہوش میں آئیں کہا کہ انھیں اٹھا کر بٹھایا جائے۔ انھیں بٹھایا گیا۔ گھر کے ہر فرد سے وہ باتیں کرنے لگیں۔ نوکروں اور خدمت گذاروں سے معافی کی طلب گار ہوئیں۔ کہا کہ میری بیماری کی وجہ سے آپ لوگوں کو بہت زحمتیں اٹھانی پڑیں ــــ تمام حاضرین ان کی اس سنبھلی ہوئی حالت سے خوش نظر آتے تھے۔

انھوں نے دروازے پر نظر ڈالی اور پوچھا کہ کیا مولانا آ گئے ہیں؟ نفی میں جواب پا کر انھوں نے آنکھیں بند کر لیں اور خاموش بیٹھ گئیں۔ پھر اپنے خادموں کو کچھ تحفے عنایت کرنے کے وعدے انھوں نے کیے اور تلاوت قرآن کرنے کی التجا کی۔ قرآن کی تلاوت ہوتی رہی تا آنکہ جمعہ کی صبح ۶ بجے ان کی روح پرواز کر گئی۔"[17]

"بالآخر ۹/ اپریل کو زہر غم کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔

فَاِنَّ ما تعذّر بہٖ اِن قَلّ وقع

دو بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالے کیا جس میں حادثے کی خبر دی گئی تھی، بعد کو

طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گزرے گا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔[3]

۱۹۱۶ میں جب پہلی بار گرفتاری پیش آئی تھی وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔

اس واقعے نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا ڈھنگ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت اور استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار پھر کیا بات تھی کہ وہ اپنی طبیعت کے اضطراب پر غالب نہ آسکی ہ غالباً یہی بات تھی کہ اس کے اندرونی احساسات پر مستقبل کی پرچھائیں پڑنا شروع ہوگئی تھی۔"[4]

"مقدمے کا فیصلہ آج سنوایا گیا، انھیں صرف ایک سال قیدِ بامشقت کی سزا دی گئی! یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سُننے کے لیے ہم تیار تھے۔ اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ سخت ناانصافی برتی گئی۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے جس کے وہ مستحق تھے۔ میں آپ کو اطلاع دینے کی جرأت کرتی ہوں کہ بنگال میں جو جگہ ان کی خدمات کی خالی ہوئی ہے ان کے لیے میں نے اپنی ناچیز خدمات پیش کر دی ہیں اور وہ تمام کام بدستور جاری رہیں گے جو اُن کی موجودگی میں انجام پاتے تھے —— میرے لیے یہ ایک بہت بڑا بوجھ ہے لیکن خُدا سے مدد کی پوری امید رکھتی ہوں۔ البتہ ان کی جگہ صرف بنگال ہی میں خالی نہیں ہے بلکہ تمام ملک میں اس کے لیے سعی کرنا میری دسترس سے باہر ہے۔[5]

میں پہلے چار سال تک ان کی نظربندی کے زمانے میں اپنی ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اُتروں گی۔

گذشتہ پانچ سال سے میری صحت نہایت کمزور ہوگئی ہے۔ دماغی محنت سے بالکل مجبور ہوں۔ اس لیے باوجود میری خواہش کے، مولانا ہمیشہ اس سے مانع رہے کہ میں کسی طرح کی محنت اور مشغولیت کے کام میں حصّہ لوں۔ لیکن میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ ان کی سزایابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ میں آج سے بنگال پراونشیل خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔"[6]

"میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی، ۱۹۴۱ء میں جب میں 'نینی جیل' میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویشِ خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گزرا تھا۔

مجھے قید خانے میں اس کے خطوط مِلتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔[7]

اس نے وقت کی صورتِ حال کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ ان چار دنوں کے اندر جو میں نے دو سفروں کے درمیان بسر کیے۔ میں اس قدر کاموں میں مشغول رہا کہ ہمیں آپس میں بات چیت کرنے کا موقع بہت کم مِلا وہ میری طبیعت کی افتاد سے واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ خاموشی میں خلل پڑے۔ اس لیے وہ بھی خاموش تھی، لیکن ہم دونوں کی خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی! ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے اور ان کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔

۳ راگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازے تک خُدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ راگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اس نے خُدا حافظ کے سوا کچھ نہیں کہا۔ لیکن وہ اگر کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔[8]

۹ راگست کو میری گرفتاری کی خبر سے یقیناً ان کو سخت صدمہ پہنچا ہوگا اور ان کی صحت نے جو پہلے سے نازک تھی ایک اور پلٹا کھایا۔[9]

۱۹۴۳ء کے شروع میں گھر سے اطلاع مِلی کہ وہ پھر بہت بیمار ہیں۔ اس کے بعد اور بھی وحشتناک خبر مِلی۔ ان کے ڈاکٹر مایوس ہوگئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے خود ہی حکومت کو لکھا کہ مجھے بیوی سے مِلنے کا موقع دیا جائے۔ اس لیے کہ ان کے بچنے کی امید بہت کم ہے۔ ڈاکٹروں کے اس خط کو حکومت نے بالکل نظرانداز کیا۔ میں نے بھی وائسرائے کو لکھا مگر ہماری خط و کتابت بے نتیجہ رہی۔[10]

۲۳ رمارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی مِلی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلی گرام کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلی گرام اسے کلکتہ سے مِلا



"زلیخا بیگم آفتاب الدین صاحب کی سب سے چھوٹی صاحبزادی تھیں اور ابوالکلام غلام محی الدین آزاد دہلوی کی رفیقۂ حیات تھیں۔ غالباً ۱۹۰۶ء یا ۱۹۰۷ء میں شادی ہوئی تھی۔ اس وقت مولانا آزاد کی عمر ۱۹ یا ۲۰ سال کی ہوگی۔"[23]

"آفتاب الدین جن کا سلسلۂ نسب صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے کلکتہ کے سروے آفس میں ملازم تھے اور مولوی خیر الدین کے بہت عزیز مریدوں میں سے تھے۔ ان کی پانچ صاحبزادیاں تھیں۔ سب سے چھوٹی زلیخا بیگم تھیں۔ ان سے بڑی کی شادی مولانا کے بڑے بھائی ابوالنصر آہؔ سے ہوئی تھی۔"[24]

"وہ (زلیخا بیگم) سلیقہ شعار بھی تھیں اور خانہ داری کے امور سے بھی بخوبی واقف۔ مہمان نواز بھی تھیں اور ہنس مکھ، شیریں زبان بھی، سسرال والوں پر بھی جان چھڑکتی تھیں اور شوہر پر بھی فدا تھیں۔

"مولانا کو قدرت نے ایک نہایت خوبصورت بچہ 'حسین' دیا تھا لیکن زندگی نے ساتھ نہیں دیا اور وہ کم عمری میں ہی فوت ہوگیا۔ اس کے بعد مولانا کو پھر کوئی اولاد نہیں ہوئی۔"[25]

"شاید ہی ہندوستان کی کسی زبان میں ابوالکلام محی الدین احمد آزاد دہلوی جیسا کم عمر صحافی پیدا ہوا ہو جس نے اس راہ کی پہلی منزل میں قدم رکھتے ہی اپنی فکری بلندی، اپنی ادبی صلاحیت، اپنے مذہبی رجحان، اپنے قومی خیالات، اپنے تعلیمی نظریات، اپنے اصلاحی پروگرام، اپنے اُردو زبان کی خدمات کے جذبے، اپنے تنقیدی شعور، اپنے روشن خیال اور صالح جذبات سے سارے ہندوستانی مسلمانوں کے اہلِ نظر، اہلِ خبر، اہلِ کمال، اہلِ ادب اور قومی خدمت گذاروں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا تھا۔"[26]

"تقریباً نصف صدی تک مولانا ابوالکلام آزاد کے افکار و خیالات، تحریروں اور تقریروں کے ذریعے ہندوستان کی فضا میں گونجتے رہے۔ اس گونج میں سمندر کا سا طوفانی زور بھی تھا اور پربت سے اترتی ہوئی ندی کا تیز دھارا بھی۔ اس گونج کی لہروں میں ایسا جوار بھاٹا بھی تھا جس نے انگریزوں کے قدم ڈگمگا دیے، ان کے جذبۂ حکمرانی میں تھرتھراہٹ پیدا کر دی اور ایسی تیزی اور ولولہ انگیزی بھی تھی جس نے ہندوستانیوں کو پل پل میں کئی منزلیں مارنے کے لیے تیار کر دیا۔

ان کی تحریروں نے اگر ایک طرف ہندوستانیوں کے بجھے ہوئے دلوں کو روشن کرنے کا سامان مہیا کر دیا تھا تو ان کی تقریروں نے دوسری طرف دِلوں کو برمایا۔ ان میں ایسی حرارت بھر دی جس کی گرمی سے غلامی کی زنجیریں پگھلتی نظر آنے لگیں اور آج جب ہم آزاد ہندوستانی کی حیثیت سے پچھلے غلامی کے طویل دَور کو دیکھتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ جنگِ آزادی کا سب سے بڑا سپاہی، ہندوؤں اور مسلمانوں کے پریم مندر کا سب سے انوکھا پجاری، وطن کا دیوانہ، شمعِ اُردو کا پروانہ، مسجدوں میں بیٹھ کر خدا سے لَو لگانے والا اور میدانوں میں اُتر کر اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش انگریزوں کے ساتھ تیغ آزمانے والا آزادؔ تھا۔ آزادؔ صرف ایک شخص نہیں تھا۔ اس کے اندر کئی شخصیتیں پرورش پا رہی تھیں اور ان کی خصوصیتوں نے مل کر آزاد کو جنم دیا تھا۔"[27]

"اُن کا آبائی وطن دہلی تھا، بمقام مکہ معظمہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے، حجاز و مصر میں تعلیم پاکر ۱۵ سال کی عمر میں جید عالم ہوئے۔ آپ کے والد بھی زبردست عالم تھے۔

ہندوستان آنے کے بعد آزادؔ نے کلکتہ میں بود و باش اختیار کی اور اپنا مشہور اخبار 'الہلال' نکالا جس نے اُردو ادب میں حیرت انگیز انقلاب برپا کر دیا۔ حکومت نے اس اخبار کو فوراً بند کر دیا۔ اور انھوں نے بھی فوراً دوسرا اخبار 'البلاغ' کے نام سے جاری کیا۔

آزاد ہندوستان کی قومی تحریک کے ایک اہم جزو تھے۔ اسی وجہ سے ۱۹۱۶ء سے جو نظر بندی اور جیل کا سلسلہ شروع ہوا وہ ۱۹۴۵ء تک جاری رہا۔

آزاد خلافت اور کانگریسی تحریک کے بھی رُوحِ رواں تھے۔ چنانچہ کئی مرتبہ وہ کانگریس کے صدر رہے۔ آزادی کے بعد آپ مرکزی حکومت میں وزیرِ تعلیم کے عہدے پر فائز تھے۔ آپ کی وفات ۱۹۵۸ء میں ہوئی۔

آزاد نے کسی اسکول یا کالج میں تعلیم نہیں پائی تھی بلکہ ساری تعلیم گھر پر ہی ان کے والد کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی۔ اساتذہ کا انتخاب اچھا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے جلد ہی عربی، فارسی اور اُردو تینوں زبانوں میں بڑی حیرت انگیز استعداد پیدا کرلی تھی۔ عربی زبان میں تو انھوں نے لوریاں سُنی تھیں اور ماں کا پیار اسی زبان کے ذریعے مِلا تھا۔ اس کا پوچھنا کیا ہے اور اُردو فارسی والد سے وراثتاً ملی تھی۔ چنانچہ ان تینوں زبانوں میں کم عمری ہی میں بڑی دسترس حاصل کرلی تھی ــــ انگریزی اور فرانسیسی اپنی خداداد اکتسابی صلاحیت سے سیکھ لی تھی۔...

معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعے صبح ہی معلوم ہوگئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقا سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی .....

اس طرح ہماری ۳۶ برس کی ازدواجی زندگی ختم ہوگئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہوگئی۔ ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے! مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی ہے۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہوگئے ہیں۔"[18]

"ہوڑا اسٹیشن اور پلیٹ فارم پر انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں بڑی ہی مشکلوں سے اپنے ڈبے سے باہر نکلا اور کار میں سوار ہوا بنگال کانگریس کمیٹی کی صدر مسز لبانیا پربھا دتا اور متعدد دوسرے مقامی لیڈر میرے ساتھ کار میں تھے۔

ہم روانہ ہونے والے ہی تھے کہ میری نگاہ بینڈ بجانے والوں پر پڑی جو میری کار کے سامنے کھڑے تھے۔ میں نے مسز دتا سے پوچھا کہ وہ بینڈ باجا کس لیے آیا ہے؟

انھوں نے جواب دیا کہ میری رہائی کی خوشی منانے کے لیے۔ مجھے یہ بات پسند نہیں آئی میں نے ان سے کہا کہ یہ خوشی منانے کا وقت نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ میں آزاد ہوگیا ہوں مگر ہزاروں میرے دوست اور ساتھی اب بھی جیل میں ہیں۔

میری درخواست پر بینڈ بجنا بند ہوگیا اور وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ جس وقت کار پُل پر سے گزر رہی تھی مجھے گزرا ہوا زمانہ یاد آنے لگا۔ تین سال پیچھے کا وہ دن یاد آیا جب میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شرکت کرنے کی غرض سے بمبئی کے لیے روانہ ہو رہا تھا۔ میری بیوی گھر کے دروازے تک مجھے رخصت کرنے آئی تھی اب میں تین سال کے بعد واپس آرہا تھا مگر وہ قبر کی آغوش میں تھیں اور میرا گھر خالی تھا۔

مجھے ورڈس ورتھ کا یہ شعر یاد آیا:

مگر اب وہ اپنی قبر میں ہے اور ہائے
میری دُنیا کیسی بدل گئی ہے!

میں نے اپنے ساتھیوں سے کار واپس کرنے کے لیے کہا کیونکہ گھر جانے سے پہلے میں ان کی قبر پر جانا چاہتا تھا۔

میری کار ہاروں سے لدی ہوئی تھی۔ میں نے ان میں سے ایک ہار لے کر قبر پر چڑھایا اور خاموشی کے ساتھ فاتحہ پڑھا۔[19]

رہرو:

"وہ میری دادی کے حقیقی بھائی تھے۔ چونکہ وہ لاولد تھے اس لیے اپنی بہن کے بچوں کو ہی اپنی حقیقی اولاد سمجھتے تھے۔ ان کی تین بہنیں تھیں جن میں سے ایک کا انتقال بہت عرصہ پہلے ہوگیا تھا۔ باقی دو آبرو بیگم اور آرزو بیگم ہیں۔ یہ فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ مولانا کی بڑی بہن میری دادی ہیں جو عرصۂ دراز سے بھوپال میں سکونت پذیر ہیں۔ بھوپال کی بیگمات ان کی بڑی قدرداں رہی ہیں۔ وہ بھوپال لیڈیز کلب کی سرگرم رُکن رہ چکی ہیں۔ اس کلب کے ذریعے بیگمات بھوپال کی سرپرستی میں بڑی سوشل سرگرمیاں ہوتی رہتی تھیں۔ عورتوں کے لیے خصوصاً نمائش منعقد کی جاتی تھی جس کی وہ رُوحِ رواں تھیں۔

ڈاکٹر نجمہ ہبت اللہ کو ہندوستان کے سیاسی، ادبی اور سماجی حلقوں میں کون نہیں جانتا؟ وہ مولانا آزاد مرحوم کے بھانجے سید یوسف علی کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ مرحوم بھوپال کے صرف خاص میں شاہی باغات کے افسر اعلیٰ تھے۔ ان کی والدہ فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ مدظلہا کا مولانا کی حقیقی ہمشیرہ ہیں جن کا عوام و خواص سب ہی احترام کرتے ہیں۔

ڈاکٹر نجمہ ۱۳ اپریل ۱۹۴۰ء کو بھوپال میں پیدا ہوئیں جو کبھی ریاست بھوپال کا دارالحکومت اور اب مدھیہ پردیش کی راجدھانی ہے۔ وہ جس گھر میں پیدا ہوئیں وہاں بڑے بڑے مرکزی وزرا مولانا کی ہمشیرہ فاطمہ آرزو بیگم صاحبہ کو سلام کرنے جاتے رہے ہیں۔"[20]

"کہا جاتا ہے کہ ابوالنصر آہ کی وفات کے بعد غالباً ۱۹۰۶ء میں مولانا خیرالدین نے اپنے چھوٹے صاحبزادے مولانا ابوالکلام آزاد کو وکیل امرتسر سے بے تعلق ہو کر کلکتہ بلایا اور اپنا جانشین بنایا اور اس خیال سے کہ وہ کلکتہ چھوڑ کر باہر نہ جائیں، پہلا کام یہ کیا کہ ان کی شادی کر دی۔"[21]

"نرگسی آنکھیں، دراز پلکیں، جٹی بھنوئیں، پگھلے ہوئے سونے کا سا رنگ، بیضوی چہرہ یاقوتی لب، ساون کی گھٹاؤں کے مانند کالے لانبے بال، بوٹا سا قد، مشرقی حیا آمیز اداؤں کا قافلہ اپنے جلو میں لیے ___ میں نے اسی دُنیا کی حُور کو دیکھا ہے۔ یہ پاکیزہ ہستی حضرت یوسف والی زُلیخا نہیں، یوسف ہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کی رفیقۂ حیات زُلیخا بیگم تھیں۔"[22]



مولانا آزاد نے انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) لکھ کر وصیت فرمائی تھی کہ اس کے بقیہ اور مخصوص تیس اوراق، ان کی وفات کے ۳۰ سال بعد شائع کیے جائیں اور منظرِ عام پر لائے جائیں!

پچھلے چھ سات ماہ سے ان ۳۰ اوراق کا چرچا رہا ہے۔ اب عدالت نے فیصلہ صادر کیا ہے اور اجازت دی ہے کہ ان اوراق کی اشاعت کی جائے۔

ایک دُنیا کو عموماً اور ہندوستانیوں کو خصوصاً ان اوراق کے دیکھنے اور ان باتوں کو معلوم کرنے کا بے تابی سے انتظار اور اشتیاق ہے جو ان اوراق میں تحریر ہیں۔

ان پُراسرار اوراق میں غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کی گمشدگی یا بازیابی کے نشانات ملنے کی سب کو جستجو ہے۔

حواشی

۱ نوڈرامے احسان الحق

۲ ۳ ۴ غبار خاطر

۵ ۶ قول فیصل

۷ ۸ غبار خاطر

۹ ۱۰ ہماری آزادی

۱۱ ۱۲ ۱۳ ۱۴ غبار خاطر

۱۵ زلیخا بیگم۔ حمیدہ سلطان

۱۶ ذکر آزاد ملیح آبادی

۱۷ تاریخ کانگریس، حصہ دوم، ص ۴۷

۱۸ غبار خاطر

۱۹ ہماری آزادی

۲۰ نجمہ ہبت اللہ سے ملاقات۔ غزالہ صدیقی

۲۱ زلیخا کی کہانی۔ عبدالقوی دسنوی

۲۲ زلیخا بیگم۔ حمیدہ سلطان

۲۳ ۲۴ غبار خاطر

۲۵ زلیخا بیگم۔ حمیدہ سلطان

۲۶ ۲۷ ۲۸ نوعمر صحافی اور لسان الصدق از عبدالقوی دسنوی

۲۹ ۳۰ ۳۱ ۳۲ ۳۳ ۳۴ ۳۵ ۳۶ ۳۷ ۳۸ نوعمر صحافی اور لسان الصدق از عبدالقوی دسنوی۔



بہت سے ادیبوں کی طرح انھوں نے بھی پہلا قدم شعر و سخن کی وادی میں رکھا تھا۔ اس وقت آزاد کی عمر تقریباً ۱۳ سال کی تھی۔ عمر کی ناپختگی کے باوجود ان کی اشعار کی پختگی اور کلام میں موزونیت بڑی حیرت کا باعث تھی۔ لوگوں کو یقین نہیں آتا تھا کہ اس صغر سنی کے باوجود آزاد ایسے اشعار کا خالق ہو سکتا ہے۔ ان متحیر لوگوں میں مرزا غالب کے ایک شاگرد نادر شاہ خاں شوخی رام پوری بھی تھے جنھوں نے اپنے شک و شبہ کو دُور کرنے کے لیے ایک موقع آزاد کا امتحان بھی لیا اور آزاد امتحان میں کامیاب اُترے تو وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے۔ 'صورت سے تو دس بارہ سال کے صاحبزادے معلوم ہوتے ہو لیکن خُدا کی قسم عقل باور نہیں کرتی! شعر و سخن کو آزاد زیادہ عرصے تک نہ اپنا سکے' انھیں بیان کے لیے کچھ اور وسعت چاہیے تھی۔ ایسی بیکراں وسعت جس میں وہ اپنے عظیم خیالات کا اظہار کر سکتے چنانچہ جلد ہی شعر و نغمہ کو خیرباد کہا اور نثر کے میدان میں اُتر آئے۔[28]

نشانات:

"۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو جب مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہوا تو سارے ملک میں غم اور افسوس کی لہر دوڑ گئی۔ عام طور سے یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ ایک عظیم شخصیت سے ہندوستان محروم ہو گیا ہے۔ اظہارِ عقیدت کے لیے مختلف اخبارات، رسائل، ہفتہ وار اور ماہناموں کی جانب سے آزاد نمبر بطور یادگار شائع کرنے کا ارادہ ظاہر کیا گیا۔ (آج بھی یہ سلسلہ تواتر سے جاری ہے۔[29]

مولانا ابوالکلام آزاد ایک سچے محب وطن نڈر اور بے باک لیڈر ہونے کے علاوہ ایک زبردست عالم، مفکر، شعلہ بیان خطیب، صحافی اور انشا پرداز تھے۔

اُردو کے منفرد اہل قلم اور بے باک صحافی اور انشا پرداز کی حیثیت سے آزاد بہت مقبول و مشہور ہوئے۔ ان کے مضامین، خطبات، مقالات اور مکاتیب کے مجموعے کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ روانی، رنگینی، عالمانہ شکوہ اور پُر وقار اظہار خیال کے باعث ان کے مضامین بڑی قدر کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

قول فیصل، تذکرہ، مقالات آزاد، ترجمان القرآن اور غبار خاطر ان کی شاہکار تصانیف ہیں۔ غبار خاطر ان خطوط کا مجموعہ ہے جو مولانا نے حبیب الرحمن شیروانی کے نام احمد نگر جیل سے لکھے تھے مگر جیل کی پابندیوں کے باعث ڈاک سے نہ بھیجے جا سکے تھے۔ رہائی کے بعد یہ کتابی شکل میں شائع کیے گئے۔

۱۹۱۶ء میں مولانا کو پہلی بار گرفتاری پیش آئی۔ انھیں پہلی بار بنگال چھوڑنے کا حکم ہوا چنانچہ ۱۹۱۶ء میں مولانا کو رانچی کے لیے روانہ ہونا پڑا۔

۱۰ دسمبر ۱۹۲۱ء کو مولانا کو پہلی بار سیاسی الزامات کے تحت کلکتہ جیل میں ڈال دیا گیا اور بعد میں ایک سال کی سزا سُنائی گئی تھی۔

۱۹۴۱ء میں مولانا 'نینی جیل' میں بند تھے۔ دسمبر ۱۹۴۱ء میں رہا ہوئے۔

۹ اگست ۱۹۴۲ء کو مولانا کو گرفتار کیا گیا اور احمد نگر قلعے میں بند کر دیا گیا۔

۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو مولانا بانکوڑا (بنگال) کے جیل سے رہا کیے گئے۔

محی الدین احمد آزاد نے کم عمری کے زمانے سے ہی ابوالکلام ہونے کا ثبوت دیا تھا۔[30]

"۱۹۰۱ء میں ہفتہ وار 'المصباح' اپنی ادارت میں منظرِ عام پر لا چکے تھے۔[31]

"۱۹۰۲ء میں احسن الاخبار کی ترتیب و اشاعت میں معاونت کرنے لگے تھے۔[32]

"مرقع عالم، ہردوئی میں چھپنے لگے تھے 'مخزن' کے مضمون نگاروں میں شمار کیے جانے لگے تھے۔[33]

"ایڈورڈ گزٹ' شاہجہانپور کے وقتی ایڈیٹر ہوگئے تھے[34] ہفتہ وار تحفۂ احمدیہ کی ترتیب کا کام سنبھال لیا تھا۔[35] ماہنامہ خدنگ نظر لکھنؤ کے حصّۂ نثر کے اسسٹینٹ ایڈیٹر ہوگئے تھے۔[36]

"کامیابی اور فتوحات کی یہ ساری منزلیں وہ گیارہ بارہ سال کی عمر سے تقریباً پندرہ سال کی عمر تک طے کر چکے تھے۔ ادبی اور صحافتی مشغولیات اور تجربات کی بدولت ۲۰ نومبر ۱۹۰۳ء میں انھوں نے اپنا بامقصد ماہنامہ 'لسان الصدق' دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دیا تھا۔[37] یہ ماہنامہ کلکتہ سے شائع ہوا تھا۔ بعد ازاں 'الہلال' اور 'البلاغ' کے ذریعے انھوں نے ملک و قوم اور اُردو کی خدمات انجام دیں۔

"آج بلا شبہ یہ بات نہایت یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد صحافی پیدا ہوئے اور ہندوستانی سیاست داں کی بلند اور محترم جگہ حاصل کر کے سفر زندگی کو اختتام تک پہنچایا۔"

انھوں نے شاعری کا جادو جگایا نثر کی ساحری کی، مذہبی میدان میں اپنی شناخت کرائی اور بلند مرتبہ پایا۔

لیکن ان کی یہ تمام فتوحات صحافت سے سیاست کے سفر میں گم ہوگئیں۔[38]



مسلم عہد کے بھارت پر ان کی دسترس گہری ہے۔ افلاطون اور ارسطو ان کی نوکِ زبان پر ہیں۔ لیکن اس کا افسوس ہے کہ اس قدر وسیع علم، غیر معمولی ذہن اور پُرتاثیر اسلوب کے باوجود وہ اتنا کم لکھ پائے۔"

(جامعہ فروری ۱۹۸۸ء ص ۱۱۶)

مولانا کی اسی عبقریت، معاملہ فہمی اور سیاسی تدبر کی بنا پر صرف پینتیس سال کی عمر میں انھیں ۱۹۲۳ء میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا صدر چُنا گیا۔ اس کم عمری میں کانگریس ایسی موقر تنظیم کی صدارت ایک ایسا ریکارڈ تھا جو آج تک قائم ہے۔ آزاد نے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی۔ ان کے والد کے ہزاروں مُرید تھے جن سے محبت اور عقیدت کے ساتھ کثیر تعداد میں نذرانہ بھی ملتا تھا۔ مادی دولت کے ساتھ خدا نے آزاد کو حُسن کی دولت سے بھی نوازا تھا مولانا عبدالماجد جنھوں نے ۱۹۰۹ء میں پہلی بار انھیں دیکھا تھا۔ لکھتے ہیں:" وہ صورت شکل اور پُرتکلف رکھ رکھاؤ کی وجہ سے ایرانی شہزادے معلوم ہوتے تھے"۔ بعض انسانوں میں انانیت فطری ہوتی ہے۔ حالات اس میں اور اضافہ کر دیتے ہیں۔ مولانا کے پاس دولت تھی، وجاہت تھی۔ دینی دنیاوی علم تھا۔ والد کے ارادت مندوں کا حلقہ ہر وقت ان کی پرستش کے لیے مستعد رہتا تھا۔ ان حالات میں آزاد کے اندر احساسِ برتری اور انانیت کا پیدا ہو جانا فطری تھا۔ اس کے علاوہ مولانا مزاجاً کم آمیز تھے اور وقت کی پابندی کے معاملے میں کسی انگریز سے کم نہیں تھے۔ بغیر اجازت یا پیشگی تعینِ وقت کے ان سے ملاقات ناممکن تھی۔ طرزِ معاشرت اور طرزِ گفتگو سے ایک مولوی کے بجائے ایک اشرافی (ARISTOCRAT) کی شان ٹپکتی تھی۔ ایسی صورت میں اگر ان کے حاسد پیدا ہو گئے اور بہک کر وہ کچھ دن کے لیے اس راہ پر پڑ گئے جو امرا یا رئیس زادوں سے مخصوص ہے تو اس میں کونسی انہونی بات ہوئی؟ ممکن ہے انھوں نے شراب بھی پی ہو۔ مہ رُخوں اور زہرہ جبینوں نے بھی انھیں اپنی طرف ملتفت کیا ہو۔ مسلسل سگریٹ پینے کے تو وہ سدا سے عادی تھے حتیٰ کہ گاندھی جی کے سامنے بھی اپنے اس شغل کے جاری رکھنے میں انھیں کوئی تامّل نہ تھا۔ ایسی صورت میں مولویوں اور عالموں کا وہ طبقہ جو سادہ زندگی گزارنے کو تقویٰ کا جزو لاینفک سمجھتا ہے خصوصاً سید سلیمان ندوی اور ان کے ہمخیال صحافی اور دانشور جن کے پندار میں مولانا آزاد

> ... مولانا عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی کے بارے میں عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا کے خلاف محاذ قائم کرنے والے ان حضرات پر مولانا کے وزیر تعلیم بننے کے بعد جب افتاد پڑی اور وہ مولانا سے امداد اور پشت پناہی کے طالب ہوئے تو مولانا نے ان کی اس طرح دستگیری کی جیسے وہ مولانا کے ہمیشہ غمگسار اور مداح رہے ہوں۔

اور الہلال کی مقبولیت اور گرم بازاری ان کے دم قدم سے تھی وہ مولانا کی روز افزوں مقبولیت کو کیسے برداشت کر لیتے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں آزاد کے قریب رہنے والے لوگوں نے آزاد کو زیادہ بدنام کیا۔ خصوصاً عبدالماجد دریابادی اور سید سلیمان ندوی نے ان کے خلاف ایک محاذ بنالیا۔ سید صاحب نے آزاد سے علیحدہ ہو جانے اور پونہ میں فارسی کا ٹیچر ہو جانے پر اطمینان کا سانس لیا۔ اپنے ان تاثرات کا اظہار عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط میں کرتے ہیں۔

"بہت سے پھول صرف دیکھنے کے ہوتے ہیں سونگھنے کے نہیں۔ مولانا آزاد وہی پھول ہیں۔ افسوس ہے کہ میں بھی دور سے دیکھ کر اس کو سونگھنے کے قابل سمجھا۔"

(مکتوبات سلیمانی ص ۱۳)

یہ خط سید صاحب نے مولانا عبدالماجد صاحب کو ۲۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو کلکتہ سے لکھا تھا جہاں وہ مئی ۱۹۱۳ء سے الہلال کے اسٹاف میں کام کر رہے تھے۔ الہلال کے بارے میں ان کی جو رائے تھی وہ ذیل کے خط سے ظاہر ہوتی ہے۔ لکھتے ہیں: "البصائر (مجوزہ رسالہ کا نام) کو آپ کیوں پوچھتے ہیں۔ اس کو کون نکالے۔ وہ الہلال نہیں کہ الفاظ کا طلسم اس کے لیے کافی ہو"۔ سید صاحب کا دوسرا خط جو مکتوباتِ سلیمانی میں شامل ہے اس پر ۳۱ جنوری ۱۹۱۴ء کی تاریخ درج ہے اور پونہ سے لکھا گیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تین مہینے میں ہی انھوں نے الہلال سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور مولانا آزاد اور الہلال کے خلاف زہر اگلنا شروع کر دیا تھا۔ عبدالرزاق ملیح آبادی نے ذکرِ آزاد میں بطورِ خاص اس کا نوٹس لیا ہے فرماتے ہیں: "خدا ان صاحب کی مغفرت کرے دورِ اوّل الہلال میں ملازم تھے پھر اتفاقِ زمانہ اور اپنی ذاتی قابلیت کی بدولت بڑا نام پیدا کیا۔ نام آوری نے مولانا سے حسد کی آگ دل میں لگا دی اور حسد نے بڑھتے بڑھتے جنون کی شکل اختیار کر لی اور مرحوم ہر کس و ناکس حتیٰ کہ ان پڑھوں سے بھی مولانا کی برائی کرنے لگے۔" (ذکرِ آزاد ص ۳۶۴)

ظاہر ہے کہ سطور بالا میں ملیح آبادی کے مشار الیہ سلیمان ندوی ہیں۔ اس ضمن میں آگے چل کر مولانا ماجد دریابادی کے بارے میں رقمطراز ہیں "کس کس کا رونا رویا جائے۔ ایک صاحب خود معترف ہیں کہ پہلے پکے ملحد تھے پھر خیالات بدلے اور بفضلِ الٰہی نعمتِ اسلام و ایمان سے مالا مال ہوئے۔ کچھ مدت وہابیت کا غلبہ رہا پھر صوفی باصفا بن کر حال و قال

مولانا آزاد کا اخلاق و کردار

مولانا آزاد کا سرسری مطالعہ کیا جائے یا بالاستیعاب! ان کی سب سے نمایاں خصوصیت جو ہمارے قلب و نظر کو کھینچتی ہے ان کی غیر معمولی ذہانت و فطانت ہے۔ اپنے غیر معمولی حافظے اور درّاکی کا انھیں بچپن ہی سے احساس تھا۔ خواجہ احمد فاروق کو ان کی منجھلی بہن فاطمہ بیگم آرزو (پیدائش ۱۸۸۴ء) نے ایک انٹرویو میں بتایا۔ ”ان کے کھیل سات آٹھ سال کی عمر میں عجیب انداز کے ہوا کرتے تھے۔ مثلاً وہ کبھی گھر کے تمام صندوقچوں اور بکسوں کو ایک لائن میں رکھ کر کہتے کہ یہ ریل گاڑی ہے۔ پھر والد کی پگڑی سر پر باندھ کر بیٹھ جاتے تھے اور ہم بہنوں سے کہتے تھے کہ تم چلّا چلّا کر کہو ہٹو ہٹو راستہ دو دلّی کے مولانا آرہے ہیں... کبھی وہ گھر میں اونچی چیز پر کھڑے ہو جاتے اور سب بہنوں کو آس پاس کھڑا کر کے کہتے تھے کہ تم لوگ تالیاں بجاؤ اور سمجھو کہ ہزاروں آدمی میرے چاروں طرف کھڑے ہیں اور میں تقریر کر رہا ہوں اور لوگ میری تقریر سُن کر تالیاں بجا رہے ہیں۔ میں کہتی تھی بھائی سوائے ہم دو چار کے یہاں اور کوئی نہیں ہے ہم کیسے سمجھیں کہ ہزاروں آدمی یہاں کھڑے ہیں۔ اس پر وہ کہتے تھے کہ یہ تو کھیل ہے۔“ (مولانا ابوالکلام آزاد مرتبہ خلیق انجم ص ۳۷)

مولانا کی ذہنی تیز رفتاری . . . . کا یہ عالم تھا کہ دورانِ تعلیم میں ان کے ہم جماعت طلبا ان کا ساتھ نہیں دے پاتے تھے۔ لہٰذا انھیں ترقی دے کر طلبا کی اگلی جماعت میں شامل کر لیا جاتا اور قلیل عرصے میں اگلی جماعت کے یہ طلبا بھی اُن کے آگے ہم رہانِ سست گام ثابت ہوتے تھے۔ اس تیز رفتاری کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف چودہ برس کی عمر میں وہ درسِ نظامی کی تعلیم سے فارغ ہو گئے اور ادبیات، منطق، فقہ اور حدیث کے مضامین پر انھیں عبور حاصل ہو گیا۔ اس زمانے میں عام طور پر یہ خیال رائج تھا کہ جب تک فارغ التحصیل طالب علم دوسرے طلبا کو نہ پڑھائے اپنے مضمون میں اسے پختگی حاصل نہیں ہوتی اس لیے کچھ طلبا کے پڑھانے کا کام ان کے سپرد کر دیا گیا جنھیں وہ مطوّل و ہدایہ وغیرہ کا درس دینے لگے۔ ۱۹۰۴ء میں جب ان کی ملاقات مولانا حالی سے ہوئی تو انھیں یہ باور کرنا دشوار ہو گیا کہ یہ نوجوان واقعی لسان الصدق کا ایڈیٹر ہے۔ اسی طرح اسی سال یا ۱۹۰۵ء میں جب بمبئی میں انھیں شبلی سے شرفِ نیاز حاصل ہوا تو علامہ شبلی نے مولانا آزاد کے مضامین کی اس طرح تعریف کی گویا وہ مولانا سے نہیں اُن کے صاحبزادے سے ہمکلام ہوں۔ جن حضرات نے مولانا آزاد کو دیکھا نہیں تھا صرف ان کے مضامین پڑھے تھے مولانا شبلی کی طرح اکثر ان سے یہ غلطی سرزد ہو جاتی تھی کہ وہ آزاد کو ایک عمر رسیدہ بزرگ سمجھنے لگتے۔ انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے کارکنان نے ۱۹۰۴ء میں انھیں مولانا نذیر احمد، مولانا حالی، نواب محسن الملک اور مولانا شبلی کی طرح عمر رسیدہ سمجھ کر اسلامی اور قومی

میر شفقت علی وفا
محلہ حسینی، فیروز آباد، آگرہ (یو.پی)

مسائل پر لیکچر دینے کے لیے مدعو کیا تھا لیکن انھیں یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ آزاد جسے وہ ایک معمّر بزرگ سمجھے ہوئے تھے ایک نوجوان ہے جس کے لب و رخسار بھی پوری طرح ریش و بروت سے آشنا نہیں ہوتے ہیں۔ سروجنی نائیڈو نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں مولانا آزاد کی عبقری قدآوری کو نمایاں کیا ہے۔ لکھتی ہیں ”آزاد کی عمر پیدائش کے وقت پچاس برس تھی۔“

جے۔ پی۔ کرپلانی نے ہمایوں کبیر کی مرتبہ کتاب ”مولانا آزاد“ میں لکھا ہے — ”ان کی آواز حقیقت میں عقل کی آواز تھی جو مترادف ہے اعتدال اور سلامتی کے۔“ ہندوستان کی آزادی کی انقلابی جنگ میں بھی ان کے یہی امتیازی اوصاف رہے۔ ان کی وفات پر عوام کا یہ محسوس کرنا فطری تھا کہ اب ملک کی سیاسی زندگی سے دانش و خرد کا وہ عنصر غائب ہو گیا جو کسی چیز کو اپنی حد سے متجاوز نہیں ہونے دیتا تھا۔“ (جامعہ فروری ۱۹۸۸ء ص ۷۵-۷۴)

پنڈت نہرو اور مولانا آزاد نے اکیس سال تک دوش بدوش کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ ان میں تین سال تک تو احمد نگر کی جیل میں شب و روز کی رفاقت رہی۔ وہ اپنی اس دیرینہ رفاقت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ان کی یادداشت حیرت انگیز ہے اور مختلف مضامین پر ان کی معلومات قاموسی ہے۔ وہ جدید خیالات کے بہت سے رجحانات سے خاصے واقف ہیں۔ ڈھیروں کتابیں پڑھتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ بالخصوص عالمِ عرب، مغربی ایشیا اور



مکان کے حالات سے بھی بے خبر رہتے ہوگے اس کو میں نہیں سمجھ سکا۔ خدا کے لیے اشارات وابہام سے کام نہ لیجیے۔ آپ اگر الہلال بالکل لے لیجیے اسے ایڈٹ کیجیے مجھے سوا اس کے اصول و پالیسی کے اور کسی بات سے تعلق نہیں۔ میں بالکل آپ پر چھوڑے دیتا ہوں اور خود اپنے کام میں مصروف ہوجاتا ہوں۔" (مکتوبات سلیمانی ص ۲۳-۲۲)

خط ہٰذا میں مولانا نے جتنی صفائی سے اپنی نفسیاتی کیفیات اور اخلاق و کردار کو الم نشرح کیا ہے۔ میرا خیال ہے ان کی کوئی دوسری تحریر اس ضمن میں مقابلتاً پیش نہیں کی جاسکتی۔ تذکرہ میں اور کسی قدر غبارِ خاطر میں انھوں نے اپنی لغزشوں پر نظر ڈالی ہے لیکن اس کی حیثیت ڈاکٹر اقبال کے اس شعر سے زیادہ نہیں ہے

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم
بر چراغِ عافیت داماں زدم

جس طرح اس شعر سے اقبال کے میخوار اور رندِ شاہد باز ہونے پر استدلال نہیں کیا جاسکتا اسی طرح مولانا کے دوسرے بیانات اور تحریروں کو ان کی لغزشوں اور کوتاہیوں کے ثبوت میں پیش نہیں کیا جاسکتا۔ سید صاحب کے علاوہ دوسرے حضرات نے بھی مولانا کی میخواری پر انگشت نمائی کی ہے۔ "گنجے فرشتے" میں منٹو نے لکھا ہے کہ جب عیسائیوں سے مولانا اور آغا حشر کاشمیری مناظرے کے دوران تھکن اور اعصاب شکنی کا احساس کرتے تھے تو اپنے اضمحلال اور بے کیفی کو دور کرنے کے لیے شراب کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ مولانا کی وفات کے بعد متھائی نے مولانا کی میخواری ثابت کرنے کے لیے پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے اور متھائی کا سہارا لے کر پاکستان میں مولانا کے کئی حریفوں نے اپنے دل کا غبار نکالا ہے۔ ہم اس سلسلے میں مولانا کی کوئی صفائی پیش نہیں کرنا چاہتے لیکن جیسا کہ اس خط سے ظاہر ہوتا ہے شراب ہی نہیں دوسرے فسق و فجور کی دلدل سے مولانا جلد باہر نکل آئے۔ مولانا کو متقی اور پرہیزگار ہونے میں کتنا عرصہ لگا اس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ دریابادی صاحب کے اندازے کے مطابق مولانا نے یہ خط سید صاحب کو شروع فروری ۱۹۱۴ء میں لکھا ہوگا۔ اس خط میں مولانا ہمیں بتاتے ہیں کہ ۱۹۰۵ء میں وہ بمبئی میں کچھ ایسے حالات سے گزرے کہ ان پر توبہ و انابت کا دروازہ کھل گیا۔ ۱۹۰۵ء میں مولانا کی عمر ۱۷ سال تھی۔ غبارِ خاطر سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی طالب علمی کے دوران یا درسِ نظامی کی تکمیل کے وقت وہ الحاد اور دوسری گمراہیوں میں مبتلا ہوگئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ۲-۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۰۵ء تک یعنی تین چار سال تک فسق و فجور کا دور چلا۔ راج موہن گاندھی نے اپنی کتاب (آٹھ زندگیاں) میں اس کی مدت سترہ مہینے بتائی ہے۔ بہرحال یہ دور چار پانچ سال یا کچھ کم و بیش عرصے پر ممتد رہا اور جب خود مولانا نے اعتراف کیا ہے تو ہم انکار کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ اگر مولانا اس کردہ و گذاشتہ کی منزل سے نہ گزرے ہوتے تو آگے چل کر ان میں جو صفائیِ قلب، انسانی ہمدردی اور عفو و درگذر کا مادہ ابھرا اس سے کبھی بہرہ ور نہ ہوتے۔

ماجد صاحب اور سید سلیمان ندوی کے بارے میں

عبدالرزاق ملیح آبادی نے لکھا ہے کہ مولانا کے خلاف محاذ قائم کرنے والے ان حضرات پر مولانا کے وزیرِ تعلیم بننے کے بعد جب افتاد پڑی اور وہ مولانا سے امداد اور پشت پناہی کے طالب ہوئے تو مولانا نے ان کی اس طرح دستگیری کی جیسے وہ مولانا کے ہمیشہ غمگسار اور مداح رہے ہوں۔ ملیح آبادی کی روایت کے بموجب جب دریابادی اور سید صاحب کا حیدرآباد سے وظیفہ بند ہوگیا اور انھوں نے مولانا سے رجوع کیا تو اس ضمن میں مولانا نے بہت آسانی سے ان کا وظیفہ بحال کرادیا۔ اسی طرح پاکستان روپیہ بھیجنے پر جب سید صاحب کے خلاف انکوائری قائم ہوگئی، اگر مولانا اپنے رسوخ سے کام نہ لیتے تو نہ معلوم سید صاحب پر کیا بیتتی۔ یہی نہیں پاکستان جانے پر سید صاحب کی حسبِ دل خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ انھیں ہندوستان کی یاد ستانے لگی تو مولانا نے ان کے واپس آنے کے سب انتظام کر دیے تھے کہ ان کا انتقال ہوگیا۔ یہ اور اس قسم کے کتنے واقعات ہیں جو مولانا کی اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی پر دلالت کرتے ہیں۔

قائدِ اعظم جناح نے مولانا کو کانگریس کا شو بوائے کہا لیکن مولانا نے کبھی اس کا لوٹ کر جواب نہیں دیا بلکہ ان کی تنظیمی صلاحیت اور اعلیٰ کارکردگی کو ہمیشہ سراہا۔ ترجمان القرآن کی اشاعت پر ایمان بالرسل کے مسئلے پر مولانا کے خلاف ایک ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ بعض علما خصوصاً اہلِ حدیث نے مولانا کی شان میں بڑے نازیبا الفاظ استعمال کیے۔ مولانا نے اس ہنگامہ آرائی سے اس طرح اعراض کیا گویا اس سے انھیں کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ مولانا کے نیازمندوں میں سے مولوی غلام رسول مہر نے جواب دینے کی اجازت طلب کی تو مولانا نے لکھا۔

"اگر میری طبیعت کا وہ انداز ہوتا جو اُس وقت تھا جب الہلال نکالتا تھا تو یہ ایسا صریح کذب تھا کہ نہیں معلوم کس درجہ سخت الفاظ اس شخص کی نسبت نکل جاتے لیکن اب میرا یہ حال ہے کہ کوئی شخص کتنے ہی قبیح فعل کا مرتکب ہو میں یقین کے ساتھ اسے برا کہنا پسند نہیں کرتا ہمیشہ ایسے موقعوں پر خود اپنا نفس سامنے آجاتا ہے۔ میں چونک اٹھتا ہوں کہ اگر برا ہی کہنا ہے تو خود اپنے نفس کو برا کیوں نہ کہوں۔"

انتقاماً دوسروں کو برا کہنے سے قبل خود اپنے نفس کا جائزہ لینا مولانا کے اخلاق و کردار کا ایسا پہلو ہے جس کی مثال عصرِ حاضر میں تو کیا اسلاف میں بھی مشکل سے ملے گی۔

میں ڈوب گئے۔ سب تبدیلیاں ہوتی چلی گئیں مگر ایک تبدیلی نہ ہونا تھی نہ ہوئی۔ مولانا آزاد سے بغض للّٰہی کا تنور سینے میں جلتا رہا۔" (ذکرِ آزاد ص ۳۶۷)

الہلال کے گورنمنٹ کے خلاف باغیانہ مضامین اور خود مولانا کی سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مولانا کو اندیشہ تھا کہ حکومت کسی وقت بھی ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرسکتی ہے اور ایسا ہوا بھی۔ ۱۸ ستمبر ۱۹۱۳ء کو الہلال سے دو ہزار کی ضمانت طلب کی گئی جو جمع ہونے پر ضبط ہوگئی۔ اس کے بعد حکومت نے مزید دس ہزار کی ضمانت مانگی جس کا انتظام نہ ہونے یا حکومت کا رویہ معاندانہ ہونے کی بنا پر ضبط ہوجانے کے اندیشے سے جمع نہیں کی گئی اور الہلال کو بند کردینا پڑا۔ حکومت نے الہلال پریس ضبط کرلیا۔ لیکن مولانا کے ارادوں میں تزلزل پیدا نہیں ہوا اور وہ البلاغ نکالنے کے منصوبے بنانے لگے۔ ان سارے واقعات پر سید سلیمان کی نظر تھی۔ ہوسکتا ہے انھیں یہ اندیشہ ہوا ہو کہ آئندہ مولانا کے ساتھ یا بعد میں انھیں بھی گرفتار کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا انھوں نے مولانا سے اس اندیشے کا صفائی سے اقرار کرنے کی بجائے الہلال سے علیحدہ ہونے کا فیصلہ کرلیا۔ اور عذر یہ پیش کیا کہ وہ مولانا کی غیر محتاط روشِ زندگی کو پسند نہیں کرتے اس لیے ان کے ساتھ کام نہیں کرسکتے۔ مولانا کو اس وقت سید صاحب کی رفاقت کی بہت ضرورت تھی۔ وہ ہر قیمت پر سید صاحب کا تعاون چاہتے تھے۔ جب سید صاحب کسی طرح راضی نہ ہوتے تو انھوں نے سید صاحب کی ناراضگی یا کبیدہ خاطری کی وجہ پوچھی۔ سید صاحب کو منانے اور الہلال کی ادارت سنبھالنے کے لیے مولانا نے جو خط لکھا تھا دارالمصنفین کے دفتر میں دوسرے خطوط کے انبار میں دبا ہوا تھا۔ اسے وہاں سے نکالنے اور مکتوبات سلیمانی میں شامل کرنے کے ذمہ دار مولانا عبدالماجد ہیں۔ اس خط میں مولانا کے اس وقت کے دردوکرب اور عارضی اخلاقی لغزشوں اور آلودگیوں پر ندامت کا اظہار ملتا ہے اور مولانا کے اخلاق کے ایک خاص پہلو پر خود ان کی زبانی شہادت مہیا ہوجاتی ہے۔ ذیل میں تلخیص پیش کی جاتی ہے۔ مولانا نے اعتراف کیا ہے "برادرِ جلیل واعز۔ سب سے پہلے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے سچائی اور راست بازی کے ساتھ حسب وعدہ اپنے خیالات ظاہر کردیے اور اس کے بعد احسان مند ہوں اُس احسانِ عظیم کے لیے کہ آپ کے اس اظہارِ خیال سے مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ آپ یقین فرمائیں کہ آپ کے اس خط کو میں نے تین بار پڑھا اور اُس کے اثر سے بہت دیر تک روتا رہا۔ نہ اس لیے کہ آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ سچ ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں سچ بھی تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتدا سے کچھ عجیب طرح کی ہے۔ میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی لیکن ایسے اسباب جمع ہوئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا۔ پھر میں اس طرح کی بداعمالیوں میں پڑ گیا اور شاید فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا۔ یہ حالت عرصے تک رہی لیکن اتنا ضرور تھا کہ اس عالم میں بھی کبھی کبھی انفعال و انابت کا قوی دورہ پڑ جاتا تھا۔ لیکن پھر قائم نہ رہتا۔ تقریباً پانچ برس ہوئے جبکہ میں بمبئی میں تھا کہ بعض حالات غم آلودہ ایسے پیش آئے کہ میری حالت میں انقلابِ عظیم ہوگیا اور خدا تعالیٰ نے توبہ و انابت کی توفیق دی۔ میں نے عہدِ واثق کیا ہے کہ جمیع منہیات سے محترز رہوں گا اور اوامر پر عمل کروں گا۔ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ عملاً فسق و فجور ترک ہوگئے اور پھر ان کی طرف قدم نہیں بڑھا لیکن جس چیز کو دل اور جذبات کا تقویٰ کہتے ہیں وہ حاصل نہیں ہوا اور دل میں گناہ کی خواہش ہوتی رہی۔ یہ تو آپ نے صحیح نہیں لکھا کہ میں صوم و صلوٰۃ کا پابند نہیں لیکن میرے خیال میں یہ ایک لحاظ سے بالکل صحیح ہے کیونکہ جو چاہتا ہوں وہ میسر نہیں ہے۔ ہاں اب ایک شخص کا خط آیا ہے جو جناب کے حوالے سے کہتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے۔ میں نے جی میں کہا یہ تو سچ نہیں ہے۔ معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ ہے یا غلط۔ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر ہی کیا موقوف ہے، میں نے ہر طرح کی سیاہ کاریاں کی ہیں لیکن الحمدللّٰہ کہ خدا نے مجھے توفیق دی اور اب نہیں کرتا ——— آپ نے لکھا ہے کہ "تم" "میں" لکھتے ہو اور اس سے استدلال کیا ہے۔ میں نے بہت غور کیا اور سمجھ نہ سکا کہ اس سے کیا ہوتا ہے۔ میں "تو" "میں" اور "ہم" دونوں لکھتا ہوں۔ بعض موقعوں پر تحریر میں "ہم" اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ بربنائے حُسن انشا و بیان دلیل اس کے لیے نہیں دی جاسکتی تاہم اسے چھوڑوں گا اور کیا کروں۔ ایک دفعہ آپ نے چندے کے متعلق لکھی ہے اور اس کی بنا وہی ہے جو میں سمجھتا تھا (اس ضمن میں مولانا نے مسجد کانپور کے سلسلے میں جو چندہ آیا تھا اس کے متعلق اپنی صفائی پیش کی ہے) بے شک آپ کے اس بیان سے دل بہت زخمی اور غمگین ہوا کہ آپ کے نزدیک میں ایسا حرام خور اور اخبث ہوگیا ہوں لیکن پھر تسکین ہوئی کہ یہ بھی تو آپ اپنی ایمانی قوت اور راست بازی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میں نے خود بھی کچھ روپیہ اپنی حالت کے مطابق طرابلس اور بلقان میں دیا۔ آخر میں آپ نے ایک اور مبہم بات لکھی ہے "تم بہت مشغول و مصروف آدمی ہو اپنے

کانگریس کے صدر رہتے) آپ لوگ جس شخص کو جاہل بتا رہے ہیں وہ آپ کو ۲۵ برس سبق پڑھائے گا۔

اس جملے پر مولوی ابراہیم پھر گویا ہوئے کہ حضرت ان لوگوں نے میرے خلاف راجستھان میں یہ پروپیگنڈہ کر کے کہ میں مقامی باشندوں کو پاکستان بھیجنے میں مدد کر رہا ہوں اس طرح سے ایک جاسوس ہوں، میرا اسمبلی کا ٹکٹ کاٹ دیا، حالاں کہ آپ خود واقف ہیں کہ میں نے کئی بار ملک کی آزادی کے لیے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کی ہیں۔ اور آج جب کہ یہ معاملہ کانگریس کے مرکزی پارلیمنٹری بورڈ کے سامنے پیش ہے تو یہ سمجھ کر کہ راجستھان والا پروپیگنڈا آپ کے سامنے نہیں چل پائے گا میری فائل پر یہ لکھ دیا کہ میں جاہل ہوں۔!

مولانا آزاد نے مولوی محمد ابراہیم کی زبانی گفتگو سن کر فوراً فائل مانگی اور اس پر اپنا ٹک لگا کر اجمل خاں صاحب سے مخاطب ہوئے کہ اسے ڈھیبر بھائی (جو اس زمانے میں صدر کانگریس تھے) کے پاس بھیج دیجیے اور پھر اپنی چھڑی اٹھائی اور برآمدے سے کمرے میں داخل ہونے لگے جو بھیڑ مولانا کی کوٹھی پر موجود تھی اس کی طرف دیکھے بغیر!

میں نے لپک کر مولانا کو سلام کیا اور کہا کہ حضور ۱۹۴۶ء سے میں اپنے خط کے جواب کے لیے ترس رہا ہوں ایک سیاسی ضرورت سے جناب والا کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا تو خیال آیا کہ اسی بہانے مذکورہ خط کا تذکرہ بھی آجائے گا مولانا نے ایک سرسری نظر میری طرف ڈالی اور فوراً اپنی کرسی پر بیٹھ گئے اور آواز دی کہ عبداللہ چائے لے آؤ۔!

تھوڑی دیر میں مولانا کی مخصوص چینی چائے آئی اور پھر وہ فنجانوں میں انڈیلی گئی ایک فنجان میرے حصے میں بھی آیا اور میں نے نہایت اشتیاق بھرے انداز میں اس خوددار چائے کا ایک گھونٹ اپنے حلق میں اتارا جس نے شکر اور دودھ کا کوئی لگاؤ بھی گوارا نہ کیا تھا لیکن مجھے اس چائے کا کوئی لطف پہلے اور دوسرے گھونٹ میں نہیں ملا خاموش رہا جب چائے کے دوچار گھونٹ اور حلق سے اترے تو عجیب و غریب کیف و سرور حاصل ہوتا گیا۔

ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ ایک صاحب مولانا آزاد کی خدمت میں آئے یہ صاحب تھے مولانا کے باورچی سرور صاحب پختہ رنگ کے مالک، کاکل دراز، میری صورت دیکھتے ہی کہا کہ میاں آداب!

بات دراصل یہ تھی کہ سرور صاحب شاہی رکاب دار تھے اور نواب صاحب رامپور کے یہاں ملازم تھے کسی بات پر تنگ گئے تو بقول شخصے (مرزا یگانہ چنگیزی):

"ہارے تو چلے نان پارے صاحب"

راجہ صاحب نان پارہ کے مطبخ میں داخل ہوئے وہاں میرے عزیزوں میں جناب محمود احمد خاں سکون راجہ صاحب کے پرائیوٹ سیکریٹری اور پیشکار کے عہدے پر تھے اُن کی بدولت مجھ سے بھی سرور صاحب کی ملاقات ہوگئی۔ پہلی ہی ملاقات کے بعد احساس ہوا کہ سرور صاحب نہ صرف بے پناہ حافظے کے مالک ہیں بلکہ انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں کے ساتھ اُردو زبان کی شیرینی کے بھی جیتے جاگتے نمونے ہیں اور انھیں ہر موضوع پر اُردو کے متقدمین سے لے کر متاخرین تک شعرا کے سینکڑوں شعر یاد تھے۔

انھیں دیکھتے ہی میری زبان سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا کہ سرور صاحب آپ یہاں کیسے۔

میرے اس انداز پر مولانا نے دریافت کیا کہ آپ انھیں کیسے جانتے ہیں۔ تو میں نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ خیر بات آئی گئی ہوگئی اور مولانا کی محفل بھی برخاست ہوگئی۔

تھوڑے دنوں کے بعد میرا انجمن ترقی اُردو (ہند) کی سالانہ کانفرنس (۱۵، ۱۶، اور ۱۷ فروری ۱۹۵۸ء) کے موقعے پر دہلی جانا ہوا تو اتفاقیہ جامع مسجد کی سیڑھیوں پر سرور صاحب سے میری دوبارہ ملاقات ہوگئی وہ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے کہ میاں آپ نے مولانا کو میری دلچسپی سے آگاہ کر کے میرے لیے مصیبت کر دی۔ کہنے لگے کہ ایک دن میں باورچی خانے میں کوئی چیز پکا رہا تھا کہ مولانا دندناتے ہوئے آگئے اور کہنے لگے بھئی سرور صاحب آپ بھی بڑے ہی بدذوق معلوم ہوتے ہیں۔ ترشح ہو رہا ہے اور آپ موسم کا ساتھ نہیں دیتے۔ میرے بھائی اس موقعے پر جلال لکھنوی نے کیا کہا ذرا یاد دلائیے۔ غرض یہ کہ مولانا اکثر و بیشتر مجھے چھیڑتے رہتے ہیں۔

میں نے سرور صاحب سے تعجب کے ساتھ ایک بات دریافت کی بھئی آپ میٹھی چیز پکانے کے اُستاد ہیں جب کہ مولانا چائے میں بھی شکر کا استعمال برائے بیت کرتے ہیں تو آپ کو کس مقصد سے اپنے اسٹاف میں شامل کر رکھا ہے۔ سرور صاحب نے کہا کہ مجھے دوسرے مہمانوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے جو آئے دن بڑی تعداد میں آتے رہتے ہیں ورنہ مولانا کی مرغوب غذا تو دوہری روٹی اور آلو پالک ---- کی بھجیا ہے۔



مولانا آزاد کی چینی چائے

غالباً ۱۹۴۶ء کی بات ہے میں نان پارہ (سابق ریاست) کے سعادت انٹر کالج کے نویں درجہ میں پڑھتا تھا اخبار بینی کا شوق بچپن سے تھا اور اُردو زبان و ادب سے دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ مقامی مکتب انجمن اسلامیہ نان پارہ میں درجہ چار کا طالب علم تھا لیکن مولانا صادق حسین سردھنوی اور مولانا عبدالحلیم شررؔ کی زیادہ تر ناولیں پڑھ چکا تھا اور طلسم ہوش ربا کے مطالعے میں مشغول تھا۔

اسی اخبار بینی کے شوق اور اُردو زبان سے والہانہ لگاؤ کے باعث اس زمانے کے صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کے مضامین سے بھی لطف اندوز ہونے کا موقع ملا اور مولانا کی مرغوب چینی چائے (وہاٹ جیمن) مولانا کے لفظوں میں "گوری چنبیلی" کا تذکرہ بھی پڑھنے کو ملا۔ میں نے بلا تکلف مولانا کی خدمت میں ایک خط روانہ کیا کہ آپ کی پسند سے مجھے اتفاق ہو کہ نہ ہو لیکن اس کا غائبانہ عشق ضرور ہو گیا ہے مولانا نے جواباً تحریر فرمایا:

"عزیزی! مجھے خوشی ہوئی کہ میری اس ہیچوں، ڈھیچوں چائے کا کوئی قدردان تو ملا افسوس کہ میرے پاس اس کا تلچھٹ بھی نہیں۔ بہرحال جب بھی نیا ڈبہ آیا میں آپ کو ضرور بھیجوں گا۔"

۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۷ء تک کا زمانہ بیت گیا اس دوران نہ تو مولانا کو چائے بھیجنے کا خیال آیا اور نہ میں نے ہی یاد دہانی کا کوئی خط بھیجا لیکن اسمبلی کے کانگریسی اُمیدواروں کے سلسلے میں اپنے حلقے کی نمائندگی اور مُسلم امیدوار کی نامزدگی کے سوال پر مولانا آزاد کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا کی کوٹھی پر اس وقت مسلم اقلیت کے زیادہ تر امیدوار موجود تھے ان میں گونڈہ گاؤں پارلیمانی حلقۂ اسمبلی کے ایک امیدوار اور مجاہد آزادی مولوی محمد ابراہیم بھی موجود تھے۔ مولانا اس وقت اپنی کوٹھی پر موجود نہ تھے اور مجمع مولانا کے انتظار میں بے قرار تھا۔ مولانا کے پرائیوٹ سیکریٹری مولوی اجمل خاں اپنی ممتاز خوش مزاجی کے ساتھ حاضرین سے نپٹ رہے تھے کہ مولوی محمد ابراہیم نے مولانا آزاد کی بابت دریافت کیا اور کہا کہ اجمل صاحب مولانا کہاں ہیں انھوں نے حسب عادت مولوی صاحب کو جھڑکتے ہوئے کہا کہ آئیے میری جیب میں ہیں اس پر مولوی ابراہیم صاحب خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

ابھی تھوڑا ہی وقفہ گزرا تھا کہ ایک کالے رنگ کی کار پھاٹک سے دَراتی ہوئی برآمدے میں آ کر ٹھہری کار کا دروازہ کھلا اور سُرخ و سفید رنگ کی ایک پہلو دار شخصیت اس کار سے برآمد ہوئی۔ (وہ مولانا آزاد تھے) اُن کے ہمراہ دو صاحبان اور بھی کار سے نکلے۔ اور پھر یہ حضرات بھی برانڈے ہی میں دو کرسیوں پر مولانا آزاد کے سامنے بیٹھ گئے۔ مولانا ایک آرام کُرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اچانک مولانا کی نظر مولوی محمد ابراہیم پر پڑ گئی اور برجستہ فرمایا کہ میرے بھائی مولوی صاحب آپ کہاں تھے دہلی کے کنوؤں میں بانس ڈالا گیا لیکن آپ کا پتہ نہ چل سکا۔

مولوی ابراہیم تو اجمل خاں صاحب سے جلے بُھنے بیٹھے موقع کی تاک میں تھے فوراً بے باکی سے گویا ہوئے کہ حضرت میں تو بڑی دیر سے یہاں حاضری دے رہا ہوں لیکن آپ نے ایسے گستاخ دربان پال رکھے ہیں (اجمل خاں کی طرف اشارہ) کہ آپ کو صحیح اطلاع نہیں دیتے۔

مولانا نے سُنی ان سُنی کرتے ہوئے فرمایا کہ خیر میرے بھائی یہ بتائیے کہ آپ کی تعلیم کہاں تک ہے۔ مولوی ابراہیم نے کہا مولانا میں تو صرف "درس نظامیہ" کا فاضل ہوں۔ مولانا آزاد پھر مخاطب ہوئے اور دریافت کیا کہ میرے بھائی کس مدرسے سے سند حاصل کی ہے مولوی صاحب نے جواب دیا کہ مدرسۂ امینیہ حسینیہ دہلی سے! مولانا اس وقت آرام کرسی پر ٹیک لگائے ہوئے تھے فوراً سیدھے ہو گئے اور فرمایا کہ میرے بھائی حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب کے مدرسے سے!

مولوی ابراہیم نے کہا کہ جی ہاں!

اب مولانا اپنے سامنے کرسیوں پر بیٹھے ہوئے دو حضرات کی طرف مخاطب ہوئے اور کہا کہ مسٹر مانک لال (جو غالباً اس وقت راجستھان صوبہ

راحت علی خاں
کاشانۂ راحت، قلعہ، نان پارہ (بہرائچ) اودھ (یوپی)

سفرِ آخرت

زندگی کی آخری تقریب ۵؍فروری ۱۹۵۸ء کو پریڈ گراؤنڈ دہلی میں منعقدہ کُل ہند اُردو کانفرنس جس کا افتتاح وزیرِ اعظم ہند پنڈت جواہر لال نہرو نے کیا تھا، ہوئی جس میں اُردو زبان کا یہ مجدّدِ وقت بھی شریک ہوا اور اپنی جرأتِ حق و کمالِ خطابت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان الفاظ میں اپنا آخری پیغام سُنا گیا۔

"اُردو کو ہندوستان کے آئین میں جو پوزیشن دی گئی ہے اسے گورنمنٹ تسلیم کرے اور ملک بھی مانے۔"

۱۹؍فروری ۱۹۵۸ء کی صبح تھی کہ عالمِ قدس میں اس علم بردارِ وراثتِ انبیا و مصلحین امت کی آمد آمد کے غلغلے بلند ہونا شروع ہوئے اور ان کی صدائیں رُوحِ آزاد تک پہنچنے لگیں حضرت مولانا آزاد حسبِ معمول صبح سویرے اُٹھے اور غُسل خانے میں گئے اسی وقت سفرِ آخرت کی تیاریاں شروع ہوئیں۔ بہ ظاہر آپ کے جسم پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور آناً فاناً اس خبر نے پورے ملک کے دل و دماغ کو مفلوج کر دیا۔ مسلسل تین دن مرض کی شدّت نے حضرت مولانا آزاد کو بے ہوش رکھا درمیان میں ایک دو بار حواس میں کچھ لہر سی آئی کسی قریب بیٹھے ہوئے کو پہچانا اسی اثنا میں پنڈت جواہر لال نہرو قریب آئے تو ان کو "خدا حافظ" کہا یعنی شعور ذہنی سفرِ آخرت کے لیے مستعد ہو چکا تھا ایک موقعے پر معالجین کے آکسیجن گیس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔ "مجھے پنجرے میں کیوں بند کر رکھا ہے بس اللہ پر چھوڑیے۔"

دُنیا کی رسم و رواج کے مطابق علاج و معالجے کی تمام کوششیں کی گئیں حضرت مولانا آزاد کے معالجِ خصوصی ڈاکٹر بی۔ سی رائے کلکتہ سے دہلی پہنچے دہلی کے بھی بہترین طبّی دماغ انسانی تدبیر و چارہ جوئی میں مصروف رہے مگر مشیتِ الٰہی ان کی تدبیروں پر غالب آئی حکومت کے اعلیٰ ترین ارکان سے لے کر آخری طبقے تک صدرِ جمہوریہ، وزیرِ اعظم، وزرا، عمائدین، عوام و خواص سب کے دماغ ایک ہی فکر کا شکار تھے اور سب کے چہرے اُداس' ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی ایسا عزیز ترین سرمایہ ان کے ہاتھوں سے چھنا جا رہا ہے کہ پھر کسی قیمت پر اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔

وہ ساعت جو مقرّر تھی تیزی کے ساتھ قریب آ رہی تھی۔ یہاں تک کہ سحر خیزی کے عادی امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کو سوا دو بجے شب کو سرمایۂ حیات مستعار اس کے مالک حقیقی کے سپرد کر دیا۔ وہ قیادت و سیاست کی وہ شمع فروزاں جس نے ۱۹۱۲ء سے لے کر ۱۹۵۸ء تک مسلسل ہندوستان کی وسعتوں کو نورِ عرفان سے منور اور نغمہ ہائے صداقت و صدا ہائے دعوت و تذکیر سے معمور کیا تھا بالآخر گُل ہو گئی۔

۲۲ فروری ۱۹۵۸ء کا سورج افقِ ہند پر طلوع ہوا تو اس کی آنکھوں میں غم و اندوہ کے وہ آنسو تھے جن کو تاریخ نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ پورا ملک ماتم کدہ بنا ہوا تھا زندگی کے تمام کاروبار معطل نظر آتے تھے تجہیز و تکفین اور پریڈ گراؤنڈ میں تدفین کے تمام انتظامات پنڈت جواہر لال نہرو، مولانا احمد سعید، مولانا حفظ الرحمٰن اور بخشی غلام محمد نے خود مکمل کرائے۔ اعلان نہیں انتظام نہیں مگر پھر بھی حضرت مولانا آزاد کی میّت میں لاکھوں کی بھیڑ تھی، پانچ لاکھ کا اندازہ اخباروں میں آیا ہے مگر اس سے زیادہ پبلک تھی، دہلی دروازہ سے جامع مسجد تک کی سڑک کے دونوں طرف اور چھتوں پر لوگ گھنٹوں بیٹھے کھڑے حضرت مولانا آزاد کے آخری دیدار کا انتظار کر رہے تھے فٹ پاتھ پر لوگ جس خاموشی سے کھڑے تھے ایسا لگتا تھا گویا آج پورا ہندوستان سوگوار ہے بھیڑ میں مائیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لے کر بیٹھی تھیں ان کو ذرا بھی فکر نہ تھی کہ ان کا بچّہ کہیں بھیڑ میں کچل نہ دیا جائے۔ ایک بجے دوپہر میت اُٹھائی گئی جو لاکھوں مسلم و غیر مسلم مرد و زن، بوڑھوں اور جوانوں کے سروں سے گذرتی ہوئی تین بجے پریڈ گراؤنڈ میں پہنچی۔ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور حضرت امام الہند کا جسدِ خاکی آغوشِ رحمت کے سپرد کر دیا گیا۔ ایک طرف جامع مسجد شاہجہانی کے سربلند منارے اور دوسری جانب قلعۂ معلّٰی کی

امداد صابری (مرحوم)

مولانا آزاد کے آخری لمحات

(۱)

فیروز بخت کی آخری گھڑیاں

معاصر الجمعیۃ کے کالموں سے "حضرت مولانا لقاء اللہ صاحب عثمانی پانی پتی نے مشرقی پنجاب کے اوقاف کے سلسلے میں ایک یادداشت پیش کرنے کے لیے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد سے جن کو آج مدظلہ العالی کے بجائے رحمۃ اللہ علیہ کہنا پڑ رہا ہے، وقت لیا تھا۔ اور اسی غرض سے مولانا دہلی تشریف لائے ہوئے تھے ملاقات ہوئی مگر اس حالت میں کہ حضرت مولانا آزاد سکرات میں تھے، اور مولانا عثمانی یٰسین شریف پڑھ رہے تھے۔"

مولانا لقاء اللہ پانی پتی جیسے متقی و دیندار کا عین نزع کے وقت آ پہنچنا، ایسی خبر نہیں کہ اسے محض اتفاقاتِ زمانہ کے تحت درج کیا جائے، مرحوم کی یہ عین فیروز بختی تھی اور بالفرض مرحوم کی مغفوریت کی کوئی اور دلیل نہ ہوتی، تو انشاء اللہ یہی ایک دلیل کافی ہو جاتی۔ مولانا عثمانی کے ایمانی درجہ و مرتبہ کے لوگ اُمت میں بس ڈھونڈھنے ہی سے مل سکتے ہیں — مولانا مرحوم کا تاریخی نام یاد کر لیجیے کہ "فیروز بخت" تھا۔

صدق جدید، ۷ ر مارچ ۱۹۵۸ء

(۲)

[مولانا دریا بادی نے اپنے "سفرِ دکن" (۶) میں ڈاکٹر عبداللطیف سے اپنی ملاقات کی روداد کے ضمن میں حضرت مولانا آزاد کے آخری لمحاتِ حیات کے بارے میں تحریر فرمایا ہے۔]:

ڈاکٹر عبداللطیف کے تعلقات مولانا ابوالکلام سے خصوصی تھے۔ ان کی ایک آدھ کتاب کو انگریزی کے قالب میں یہ لاتے ہیں۔ ان کے زمانۂ علالتِ وفات میں، یہ وہیں، انھیں کی کوٹھی پر مقیم تھے، انھیں کے بیان سے معلوم ہوا کہ مرحوم جب سے غش کھا کر گرے، پھر ہوش نہ آیا اور نہ کچھ بول ہی سکے۔ صرف ایک بار وقتِ وفات سے چند گھنٹے قبل، ذرا سے آثارِ ہوش آنے کے معلوم ہوتے، ڈاکٹری تدبیروں سے سخت کرب و اذیت میں تھے، ہونٹ ہلے اور آواز صرف اتنی سنائی دی، کہ:

چھوڑ دو، بس خدا پر چھوڑ دو!

اور بس پھر کوئی آواز اس عالم آب و گل میں نہ نکل سکی۔ مبارک اور خوش قسمت ہے وہ مسلمان جس کی زبان کا آخری کلمہ خدا کا نام ہو۔ مضطرب کی آخری پکار چارۂ سازِ حقیقی کے نام کی۔

سفرِ دکن (۶) صدق جدید، لکھنؤ
۷ ر فروری ۱۹۶۴ء

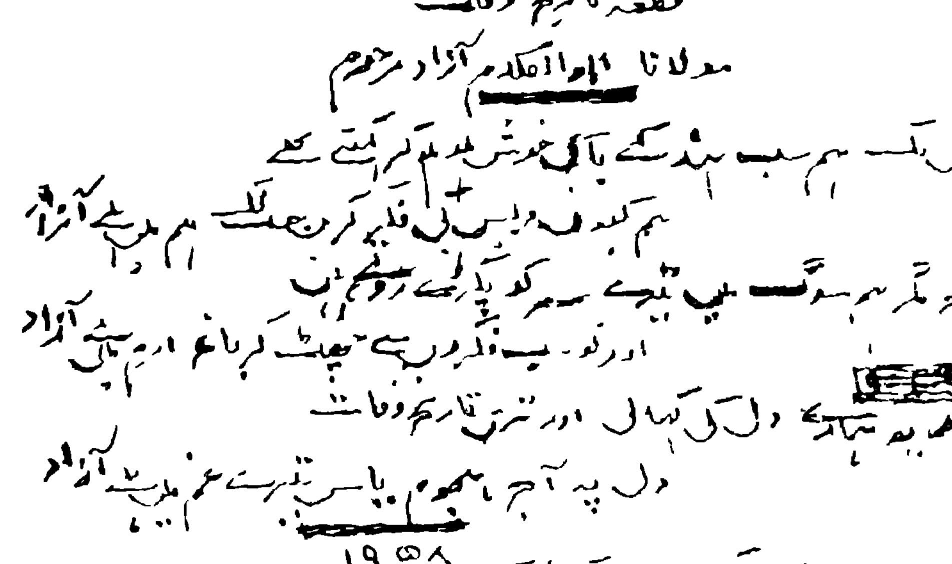
قطعۂ تاریخ وفات مولانا آزاد

ڈاکٹر سید عابد حسین مرحوم ممتاز دانشور، بہترین نثر نگار اور بے مثل مترجم تھے۔ لیکن یہ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ شعر بھی کہتے تھے اور ان کی شاعری میں بھی بہت سی خوبیاں تھیں، خاص طور پر مشاہیر کی تاریخ وفات پر انھوں نے جو قطعات کہے ہیں ان کی معنویت بالخصوص بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی وفات پر بھی انھوں نے ایک قطعہ کہا تھا، جس میں مرحوم کی صفات اور خدمات پر ایک مخصوص انداز سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ عابد صاحب مرحوم اور ان کی اہلیہ محترمہ صالحہ عابد حسین مرحومہ کے مولانا سے گہرے اور دیرینہ تعلقات تھے۔ جب مولانا کا انتقال ہوا تو اس زمانے میں عابد صاحب مرحوم علی گڑھ میں تھے۔ جب ریڈیو پر اچانک انھوں نے اس حادثے کی خبر سُنی تو بذریعہ کار میاں بیوی دہلی کے لیے روانہ ہوئے۔ مرحومہ کے الفاظ میں: "میں روتی رہی اور عابد صاحب کے آنسو الفاظ میں ڈھل جایا کرتے تھے، وہ فکرِ تاریخ میں گم ہوگئے اور جب ہم لوگ مولانا کو آخری آرام گاہ پہنچانے کے بعد رات کو جامعہ نگر واپس آئے تو عابد صاحب تاریخ کہہ چکے تھے۔ اگلے یا اس سے دوسرے دن مصرعے لگائے اور تاریخ تیار تھی۔"[1]

اس وقت ڈاکٹر عابد صاحب کے تین قطعات میرے سامنے ہیں: ایک غیر مطبوعہ، خود عابد صاحب کے قلم سے لکھا ہوا، اس کی کاٹ پیٹ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا یہ پہلا مسودہ ہے، دوسرا وہ قطعہ جو ہفتہ وار "ہماری زبان" بابت یکم و ۸ اپریل ۱۹۵۸ء میں صفحہ ۸ پر شائع ہوا ہے، تیسرا وہ قطعہ جسے مرحومہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے "آج کل"۔۔۔ عابد حسین نمبر کے اپنے مضمون میں نقل کیا ہے جو عابد صاحب کی شاعری پر ہے۔ ان تینوں قطعات میں کچھ نہ کچھ فرق ہے۔ سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ "ہماری زبان" کے قطعے میں سال وفات ہجری سنہ میں ہے اور بقیہ دو میں عیسوی سنہ ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ جس مصرعے سے تاریخ وفات نکالی گئی ہے وہ تینوں میں یکساں ہے۔ اب اس فن کے ماہرین بتلائیں گے کہ کیا واقعی ایک ہی مصرعے سے دونوں سنوں میں تاریخ نکلتی ہے یا نہیں؟ سب سے پہلے غیر مطبوعہ قطعۂ وفات پیش کرتا ہوں، جو میرے ذاتی کاغذات میں محفوظ تھا۔ تاریخ نکالتے وقت اس کو ملحوظ رکھا جائے کہ اس قطعے میں عنوان کا "ابوالکلام" بھی زیر خط ہے اور متعلقہ مصرعے کا "ہجوم یاس" بھی۔

اب مرحوم کے قطعے کا مسودہ ملاحظہ ہو:


قطعہ تاریخ وفات
مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم

اس کے بعد "ہماری زبان" کا قطعہ ملاحظہ ہو:

عبداللطیف اعظمی

۳۴۹، ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

[1] صالحہ عابد حسین: ماہنامہ آج کل ۔۔۔ عابد حسین نمبر، بابت جون ۱۹۸۰ء، صفحہ ۲۸۔



برچھیاں پکار رہی تھیں: "

لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے
عِلم و فضل و کمال کی صُورت

حضرت مولانا اپنے مزاج وطبیعت کی افتاد کی بنا پر ایک سیاسی لیڈر ہوتے ہوئے بھی زندگی بھر عوام سے گریزاں رہے۔ خواص بھی ان کی مجلس میں مشکل ہی سے بار پاتے تھے۔ ان کے احبابِ خاص کا حلقہ بہت محدود تھا۔ ان کی زندگی معمولات کے خاص سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھی۔ جیساکہ شورش کاشمیری نے لکھا ہے "خیال ہوتا تھا کہ ان کے ماتم گساروں اور جلوسِ میت میں مخصوص و محدود افراد ہوں گے۔ لیکن لوگ ان کے ماتم گساروں کا مجمع اور میت کا جلوس دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئے۔ ملک کے اطراف وجوانب اور دور دراز شہروں سے ہزارہا افراد انتقال کی خبر پاتے ہی دہلی پہنچ گئے جن کے لیے ملک کی ائیر لائنز کو خصوصی پروازوں کا اہتمام کرنا پڑا۔ پاکستان بشمول موجودہ بنگلہ دیش سے سینکڑوں افراد حضرت مولاناؒ کی میت کے جلوس اور نمازِ جنازہ میں شرکت کے لیے دہلی پہنچے اور یہ سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔

("امام الہند مولانا آزاد"، مطبوعہ کراچی)

دہلی اور اس کے اطراف

"دہلی اور اس کے اطراف" جس کا اصل نام "ارمغانِ احباب" تھا مولانا حکیم سید عبدالحئی کے سفر کا روزنامچہ ہے۔ یہ سفر انھوں نے ۱۸۹۴ء میں دہلی اور اس کے نواحی علاقوں میں کیا تھا۔ حکیم سید عبدالحئی صاحب 'نزہۃ الخواطر' کے مصنف اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے والد بزرگوار تھے۔

اس سفرنامے کو لکھے ہوئے تقریباً سو سال ہو رہے ہیں لیکن گزشتہ تہذیب سے دلچسپی رکھنے والا قاری اسے آج بھی لطف و بصیرت سے خالی نہ پائے گا اس لیے کہ جو کہانی اس میں بیان ہوئی ہے وہ بہت پرانی نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک صدی کا فاصلہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا۔ اس سفرنامے میں لطف و بصیرت کا پہلو اس لیے بھی ہے کہ سفر کرنے والا جویائے حق ہے اسے علم کی سچی لگن ہے، اپنی تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے، بزرگوں کے کارناموں کے لیے دل میں احترام اور ہمعصروں کی قدرشناسی کا جذبہ ہے۔ اسلامی تاریخ اور ہندوستان میں مسلم حکمرانوں، عالموں اور صوفیوں کی فیض رسانیوں سے مکمل آگاہی نے اس کے تاثرات کو وقیع سے وقیع تر کر دیا ہے اور اس سفرنامے کو ایک تاریخی، تہذیبی اور علمی دستاویز کی حیثیت دے دی ہے۔

مصنف کا اندازِ بیاں ہر قسم کے مبالغے سے بری ہے اور بے تکلف گفتگو کا رنگ لیے ہوئے ہے۔

مصنف : مولانا حکیم سید عبدالحئی
مرتبہ : ڈاکٹر صادقہ ذکی
صفحات : ۱۲۴
قیمت : ۲۵ روپے

انتخابِ کلامِ داغ

علامہ اقبال نے داغ کے مرثیے میں کہا ہے :

تھی زبانِ داغ پر، جو آرزو ہر دل میں ہے
یعنی یہ لیلیٰ وہاں بے پردہ، یاں محمل میں ہے

داغ کی شاعری پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ ان کے معتقدوں اور مداحوں نے بھی لکھا ہے اور نکتہ چینوں نے بھی اور ان لوگوں نے بھی جو خالص تنقیدی نقطۂ نظر سے کلامِ شاعر کو پرکھنے کے قائل ہیں؛ ان سب لوگوں کی تحریروں کا مرکزی خیال ایک ہی ہے کہ داغ زبان کے شاعر تھے اور روزمرہ کا حسن ان کے کلام کی اصل خوبی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ داغ کی حق تلفی اس سے زیادہ ہو ہی نہیں سکتی کہ انھیں صرف زبان اور اندازِ بیان کا شاعر کہا جائے۔ اقبال نے داغ کی شاعری کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی حیثیت بنیادی نقطے اور محور کی ہے اور کہا ہے کہ وہ ایک جذبۂ مشترک جو ہر انسانی دل میں تمنا بن کر رہتا ہے مگر ہر شخص اس کے اظہار پر قادر نہیں، داغ کے اشعار اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

بات میں اگر گہرائی کچھ نہ ہو، بس بات کہنے کا ڈھنگ اچھا ہو تو ایسی باتیں چنگاریوں کی چمک کی طرح جلد ہی دھندلا جاتی ہیں جبکہ داغ کی شاعری آج بھی قدر و قیمت کی حامل ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں سارا کرشمہ محض اندازِ بیان کا نہیں، یہ کرشمہ ہے اس انسانی جذبے کی ترجمانی کا جو آرزو بن کر ہر دل میں موجزن رہتا ہے۔

مصنف : نواب مرزا خاں داغ دہلوی
مرتبہ : بیگم ممتاز میرزا
صفحات : ۲۴۹
قیمت : ۳۴ روپے

اُردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں



ابوالکلام آزاد کی وفا شعار شریکِ حیات ۰ زلیخا بیگم

مولانا ابوالکلام آزاد کی شادی زلیخا بیگم سے ہوئی۔ تو وہ ایک نوعمر لڑکے تھے اور زلیخا بیگم ایک کم سن بچی تھیں۔ ان کے والد آفتاب الدین بغداد کے ایک شریف خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کا سلسلۂ نسب حضرت صدیق اکبرؓ سے ملتا ہے۔ آفتاب الدین، مولانا کے والد بزرگوار کے خاص مریدوں میں سے تھے۔ زلیخا بیگم اُن کی پانچویں صاحبزادی تھیں۔ پیدا ہوتے ہی انھوں نے پیر کے قدموں میں لاکر ڈال دیا۔ انھوں نے اس بچی کا زلیخا نام رکھا بعد میں یہ بچی انھیں اتنی اچھی لگی کہ اس کو انھوں نے اپنی بہو بنالیا۔

ابتدائی تعلیم سے فارغ ہوئیں تو وہ ہوش مند ہو چکی تھیں۔ اور شباب کی منزل میں قدم رکھتے ہی مولانا آزاد کی خدمت میں لگ گئیں۔ مشرقی ماحول کی پروردہ اس لڑکی نے مولانا کی ہر خواہش کو سر آنکھوں پر رکھا ہجر کی سختیاں سہیں اور مالی مشکلات بھی برداشت کیں مگر کبھی زبان پر اُف تک نہ لائیں۔ خانگی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے کام میں انھوں نے کوئی جھجک محسوس نہیں کی

مولانا آزاد بھی زلیخا بیگم کو بہت چاہتے تھے لیکن اس محبت کو وہ اپنے سیاسی مشاغل پر غالب نہیں آنے دیتے تھے، اسی طرح ان کی رفیقۂ حیات بھی ان کی رضا جوئی کو اپنا فریضہ مانتی تھیں اور ان کی مزاج داں ہونے کے سبب کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتی تھیں جو مولانا کے لیے کسی درجے میں ناگواری کی موجب ثابت ہو۔ یہاں تک کہ وہ اپنی بیماری بھی مولانا سے چھپانے کی کوشش کرتی تھیں۔ مولانا ۱۱ اپریل ۱۹۴۳ء کے ایک مکتوب میں لکھتے ہیں:

"میری بیوی کی طبیعت کئی سال سے علیل تھی۔ ۱۹۴۲ء میں جب میں جیل میں مقید تھا تو اس خیال سے کہ میرے لیے تشویش خاطر کا موجب ہوگا مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ لیکن رہائی کے بعد معلوم ہوا کہ یہ تمام زمانہ کم و بیش علالت کی حالت میں گذرا تھا۔ مجھے قید خانے میں اس کے خطوط ملتے رہے۔ ان میں ساری باتیں ہوتی تھیں لیکن اپنی بیماری کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا رہائی کے بعد ڈاکٹروں سے مشورہ کیا گیا تو ان سب کی رائے تبدیلِ آب و ہوا کی ہوئی اور وہ رانچی چلی گئیں۔ رانچی کے قیام سے بظاہر فائدہ ہوا تھا۔ جولائی میں واپس آئیں تو صحت کی رونق چہرے پر واپس آرہی تھی۔"

مولانا، اس ایثار و انکسار، محبت و مروّت فہم و فراست، صبر و استقلال کی مالک شریکِ حیات کی وفات کے بعد، اپنے مکتوب میں لکھتے ہیں:

"وہ میری طبیعت کی نتاد سے اچھی طرح واقف تھی، وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اس کی طرف سے ذرا بھی اضطرابِ طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار ہوگا اور عرصے تک اس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۹۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطرابِ خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصے تک اس سے ناخوش رہا تھا۔ اس واقعے نے ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی کا رخ پلٹ دیا اور اس نے پوری کوشش کی کہ میری زندگی کے حالات کا ساتھ دے۔ اس نے صرف ساتھ ہی نہیں دیا بلکہ پوری ہمت و استقامت کے ساتھ ہر طرح کے ناخوشگوار حالات برداشت کیے۔ وہ دماغی حیثیت سے میرے افکار و عقائد میں شریک تھی اور عملی زندگی میں رفیق و مددگار۔"

زلیخا بیگم کا انتقال ۱۹۴۳ء میں اس وقت ہوا جب مولانا آزاد احمد نگر کے قلعے میں نظر بند تھے۔ زلیخا بیگم کئی سال سے برابر علیل چلی آرہی تھیں۔ لیکن صورت یہ تھی کہ جب کبھی مولانا جیل سے باہر ہوتے تھے تو وہ اپنی قومی مصروفیات کے باعث اپنی رفیقۂ حیات کی صحت پر اور معالجہ پر ٹھیک ڈھنگ سے توجہ نہیں دیتے تھے اور جب وہ جیل میں ہوتے تھے تو زلیخا بیگم انھیں اپنی علالت کی اطلاع دے کر پریشان کرنا نہیں چاہتی تھیں۔ اسی لیے ان کی علالت کا سلسلہ دراز ہوتا گیا اور وہ تپِ دق میں مبتلا ہو گئیں۔ بسترِ مرض پر انھیں صرف مولانا کی صحت اور کامیابی کا خیال رہتا تھا۔ بارگاہِ الٰہی میں بار بار انھوں نے رفیقِ حیات کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگیں۔ اپنے شوہر کے بارے میں ہر خبر ان کے دل پر گہری چوٹ پہنچاتی تھی۔ رفتہ رفتہ غذا بھی برائے نام رہ گئی اور دواؤں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا۔ مولانا کی یاد میں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی رہتی۔ ڈاکٹر بی۔ سی رائے نے علاج میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی"! وہ ہر ملنے والے سے صرف یہی کہتی تھیں: "بس خدا کے

مناظر عاشق ہرگانوی

مارواڑی کالج، بھاگلپور ۸۱۲۰۰۷ (بہار)

مولانا آزاد مرحوم کی تاریخ رحلت

کل تک ہم سب ہند کے خادم خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیس کی فکر کریں جب تک ہم میں ہے آزاد
آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد
رحلت کی تاریخ تری نکلی مُنھ سے فغاں بن کر
دل پہ آج ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد
۱۳۷۷ھ
اتنے میں محسوس ہوا یہ جیسے کوئی کہتا ہے
من کی آنکھیں کھول کے دیکھ اب بھی ہم میں ہے آزاد
روح فکر و عمل اس کی سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں ہے آزاد دیر و حرم میں ہے آزاد

(ڈاکٹر سیّد عابد حسین)

آخر میں وہ قطعہ ملاحظہ ہو، جسے مرحومہ صالحہ عابد حسین صاحبہ نے اپنے مضمون مطبوعہ: "آج کل" ــــ عابد حسین نمبر میں درج کیا ہے :

کل تک ہم سب ہند کے باسی خوش ہو ہو کر کہتے تھے
ہم کیوں دیس کی فکر کریں، جب تک ہم میں ہے آزاد
آج بچھڑ کر تجھ سے ہم تو سر کو پکڑ کر روتے ہیں
اور تو سب فکروں سے چھٹ کر باغِ ارم میں ہے آزاد
ہے یہ ہمارا نالہ تیری رحلت کی تاریخ بھی ہے
دل پر آج ہجوم یاس تیرے غم میں ہے آزاد
۱۹۵۸ء
پھر کچھ محسوس ہوا، جیسے کوئی کہتا ہے
دل کی آنکھیں کھول کے دیکھ اب بھی ہم میں ہے آزاد
اس کی فکر روح و عمل سارے جہاں میں ساری ہے
شرق و غرب میں آزاد، دیر و حرم میں ہے آزاد



متاثر تھا اور اپنی ہمدردی کا یقین دلانا چاہتا تھا لیکن میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ میں حکومت سے کوئی بھی درخواست کرنا نہیں چاہتا۔ پھر وہ جواہر لال کے پاس گیا اور ان سے اس بارے میں گفتگو کی۔ وہ سہ پہر کو میرے پاس آئے اور بہت دیر تک اس بارے میں گفتگو کرتے رہے میں نے ان سے بھی وہی بات کہہ دی جو سپرنٹنڈنٹ سے کہہ چکا تھا۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ نے یہ بات حکومت بمبئی کے ایما سے کہی تھی۔"

آخر ۹ اپریل ۱۹۴۳ء کو وہ خبر آ گئی جس کے لیے مولانا نے اپنے آپ کو پہلے سے تیار کر لیا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں:

"۲ بجے سپرنٹنڈنٹ نے گورنمنٹ بمبئی کا ایک تار حوالے کیا جس میں حادثے کی خبر دی گئی تھی۔ بعد کو معلوم ہوا کہ سپرنٹنڈنٹ کو یہ خبر ریڈیو کے ذریعے صبح ہی معلوم ہو گئی تھی اور اس نے یہاں بعض رفقا سے اس کا ذکر بھی کر دیا تھا لیکن مجھے اطلاع نہیں دی گئی۔ اس طرح ہماری چھتیس برس کی ازدواجی زندگی ختم ہو گئی اور موت کی دیوار ہم دونوں میں حائل ہو گئی ہم اب بھی ایک دوسرے کو دیکھ سکتے ہیں مگر اسی دیوار کی اوٹ سے۔

مجھے ان چند دنوں کے اندر برسوں کی راہ چلنی پڑی۔ میرے عزم نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا مگر میں محسوس کرتا ہوں کہ میرے پاؤں شل ہو گئے ہیں۔

غافل نیم زراہ ولے آہ چارہ نیست
زیں رہ ہزناں کہ بر دلِ آگاہ می زنند"

زلیخا بیگم وفا شعار اور شوہر کی خوشی پر قربان ہو جانے والی ایک مکمل مشرقی خاتون تھیں۔ حسینہ سلطان کے ایک مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"ایک مرتبہ صبح دس بجے میری والدہ ان کے یہاں پہنچیں تو خلافِ عادت انھیں دلہن بنا دیکھا۔ پندرہ منٹ بعد مسکراتی ہوئی آئیں اور معانقہ کرتے ہوئے کہا "معاف کیجیے گا۔ آپ کو اتنی دیر میرا انتظار کرنا پڑا۔ میں مولانا کو کھانا کھلا رہی تھی۔"

بیگم آزاد کے بکھرے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کر کے والدہ بولیں "مگر بھاوج معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے بھائی کو آپ کی زلفِ پریشاں بہت پسند ہے جو آپ سر کو نہیں گوندھتیں۔"

وہ لجا کر بولیں "جی نہیں یہ بات نہیں۔ ان کے بار بار جیل جانے سے میری طبیعت کچھ خفقانی سی ہو گئی ہے کہ جو گوندھنے سے دل گھبراتا ہے۔"

وہ انداز حجاب آج بھی یاد ہے۔ میری والدہ اس دن ان پر تنقید کرنے کی ٹھان کر گئی تھیں۔ پھر ان کی خالی کلائیوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "نوج ایسی بھی کیا سادگی بیگم نہیں۔ ماشاء اللہ تمھارا سہاگ قائم رکھے ایک ایک چوڑی ہاتھ میں ڈال لیا کرو۔"

انھوں نے مسکراتے ہوئے کہا "اخر بہن نا آپ بھی نند۔ بالکل سسرال والوں کی طرح طعنے دے رہی ہیں۔ اچھا میں آئندہ سے آپ کی خوشی کا خیال رکھوں گی۔"

دوسرے ہفتے جو خود ملنے آئیں تو پشت پر چوٹی لہرا رہی تھی۔ چکن کا خوبصورت بلاؤز پہنے تھیں اور ہلکی دھانی ریشمی ساڑی زیبِ تن تھی۔ ہاتھوں میں سونے کی دو دو چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں بُندے۔ اچھے لباس اور ہلکی سی آرائش نے ان کی من موہنی صورت کو اور بھی دلربا کر دیا تھا۔ میری والدہ ان کو ... کا رکا کر دیکھتے ہوئے بولیں "ماشاء اللہ اب تو بہت ... میری بھاوج کسی سے بات تو ماشاء اللہ ... چشمِ بد دور بہت اچھی لگ رہی ہو" ... وہ حسبِ عادت لجا کر بولیں "آپ کو خوش کرنا تھا ورنہ مجھے اب یہ رنگین کپڑے اور زیور پہنتے ہوئے شرم آتی ہے ... ہے ورنہ ... کر دو تم بھی ابھی تمھاری عمر ہی کون سی ایسی ہے ہاں گہنے تو بڑھاپے میں کس پہلا پہرا آتی ہیں"

ایک دن صبح جو ہم پہنچے تو بیگم آزاد کی سرخ سی آنکھوں میں ڈورے دیکھ کر والدہ نے ان سے مسکرا کر کہا "کیا بات ہے۔" انھوں نے جواب دیا "آج کل مولانا قرآن پاک کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ رات کے دو بجے کے بعد اٹھ بیٹھتے ہیں۔ جتنی دیر وہ لکھتے ہیں میں پنکھا کھینچتی رہتی ہوں موسم بے حد گرم ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جاگیں اور محنت کریں اور میں آرام سے سوتی رہوں۔"

زلیخا بیگم نے جدوجہدِ آزادی میں اپنے شوہر کا ساتھ ان کا حوصلہ بڑھا کر بھی دیا اور اس راہ میں اپنے ذاتی آرام و آسائش کو تج کر بھی۔ ۱۹۲۲ء میں مولانا پر کلکتہ کی عدالت میں جب مقدمہ چلایا گیا اور انھیں جیل بھیج دیا گیا تو زلیخا بیگم نے مہاتما گاندھی کے نام ایک خط میں لکھا:

"میرے شوہر مولانا ابوالکلام آزاد کے مقدمے کا فیصلہ آج سنا دیا گیا۔ انھیں صرف ایک سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ یہ نہایت تعجب انگیز طور پر اس سے بدرجہا کم ہے جس کے سننے کے لیے ہم تیار تھے اگر سزا اور قید قومی خدمات کا معاوضہ ہے تو آپ تسلیم کریں گے کہ اس معاملے میں بھی ان کے ساتھ ناانصافی



لیے مجھے ایک مرتبہ مولانا کو دکھادو۔"

مولانا سے زلیخا بیگم کی آخری ملاقات ۳ اگست ۱۹۴۲ء کو ہوئی تھی۔ اس رخصت کا تذکرہ خود مولانا نے اپنے مکتوب میں اس طرح کیا ہے:

"۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لیے روانہ ہونے لگا تو وہ حسبِ معمول دروازے تک خدا حافظ کہنے کے لیے آئی۔ میں نے کہا "اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہیں آگیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے: اس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر کہنا بھی چاہتی تو اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتی تھی جو اس کے چہرے کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں، مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

گزشتہ پچیس برس کے اندر کتنے ہی سفر پیش آئے اور کتنی ہی مرتبہ گرفتاریاں ہوئیں۔ لیکن میں نے اس درجہ افسردہ خاطر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کیا یہ جذبات کی وقتی کمزوری تھی جو اس کی طبیعت پر غالب آگئی تھی؟ میں نے اس وقت ایسا ہی خیال کیا تھا، لیکن اب سوچتا ہوں تو خیال ہوتا ہے کہ اسے صورتحال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے۔ وہ خدا حافظ اس لیے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا وہ اس لیے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔"

مولانا آزاد بمبئی سے گرفتار کرکے قلعہ احمد نگر میں نظر بند کردیے گئے جہاں زلیخا بیگم کی علالت کی اطلاع مولانا کو فروری ۴۳ء میں ملی۔ اور وہ بھی خود ان کے خط سے نہیں کیونکہ ان کے جو خط مولانا کو ملتے ان میں کبھی صحت کے متعلق کوئی تذکرہ نہ ہوتا تھا۔ ۱۵ فروری کو جب مولانا کو معلوم ہوا کہ زلیخا بیگم شدید علیل ہیں تو انھوں نے ایک تار دیا جس کا جواب ایک ہفتہ بعد حسبِ سابق یہ ملا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں ہے:

"۱۵ فروری کو مجھے ایک خط ۲ فروری کا بھیجا ہوا ملا جس میں لکھا تھا کہ اس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ میں نے تار کے ذریعے مزید صورتحال دریافت کی تو ایک ہفتہ کے بعد جواب ملا کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔"

مگر تقریباً ایک ماہ بعد قلعہ احمد نگر کے سپرنٹنڈنٹ کے ذریعے مولانا کو یہ اطلاع ملی کہ ان کی اہلیہ کی علالت نے خطرناک صورت اختیار کرلی ہے۔ اس کی تفصیل مولانا یوں بیان کرتے ہیں:

"۲۳ مارچ کو مجھے پہلی اطلاع اس کی خطرناک علالت کی ملی۔ گورنمنٹ بمبئی نے ایک ٹیلیگرام کے

... زلیخا بیگم نے جدوجہد
آزادی میں اپنے شوہر کا ساتھ
ان کا حوصلہ بڑھا کر بھی دیا اور
اس راہ میں اپنے ذاتی آرام و آسائش
کو تج کر بھی ...

ذریعے سپرنٹنڈنٹ کو اطلاع دی کہ اس مضمون کا ایک ٹیلیگرام اسے کلکتہ سے ملا ہے۔ نہیں معلوم جو ٹیلیگرام گورنمنٹ بمبئی کو ملا وہ کس تاریخ کا تھا اور کتنے دنوں کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ یہ خبر مجھے پہنچا دینی چاہیے۔

چوں کہ حکومت نے ہماری قید کا محل اپنی دانست میں پوشیدہ رکھا ہے اس لیے ابتدا سے یہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا کہ نہ تو یہاں سے کوئی ٹیلیگرام باہر بھیجا جاسکتا ہے نہ باہر سے کوئی آسکتا ہے کیوں کہ اگر آئے گا تو ٹیلیگراف آفس کے ذریعے ہی سے آئے گا اور اس صورت میں آفس کے لوگوں پر راز کھل جائے گا اور اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی بات کتنی ہی جلدی کی ہو تار کے ذریعے نہیں بھیجی جاسکتی۔ اگر تار بھیجنا ہو تو اسے لکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو دیدینا چاہیے۔ وہ اسے خط کے ذریعے بمبئی بھیجے گا۔ وہاں سے احتساب کے بعد اسے آگے روانہ کیا جاسکتا ہے خطوکتابت کی نگرانی کے لحاظ سے یہاں قیدیوں کی دو قسمیں کردی گئی ہیں بعض کے لیے صرف بمبئی کی نگرانی کافی سمجھی گئی ہے بعض کے لیے ضروری ہے کہ ان کی تمام ڈاک دہلی جائے اور جب تک وہاں سے منظوری نہ مل جائے آگے نہ بڑھائی جائے۔ چوں کہ میری ڈاک دوسری قسم میں داخل ہے اس لیے مجھے کوئی تار ایک ہفتے سے پہلے نہیں مل سکتا۔ اور نہ میرا کوئی تار ایک ہفتے سے پہلے کلکتہ پہنچ سکتا ہے۔

یہ تار جو ۲۳ مارچ کو یہاں پہنچا فوجی خطِ رمز (Code) میں لکھا گیا تھا۔ سپرنٹنڈنٹ اسے حل نہیں کرسکتا تھا۔ وہ اسے فوجی ہیڈکوارٹر میں لے گیا۔ وہاں اتفاقاً کوئی آدمی موجود نہ تھا اس لیے پورا دن اس کے حل کرنے کی کوشش میں نکل گیا۔ رات کو اس کی حل شدہ کاپی مجھے مل سکی۔"

سپرنٹنڈنٹ نے مولانا سے کہا کہ اگر وہ اس تار کے متعلق کچھ کہنا چاہیں تو فوراً وہ حکومت تک پہنچا دیا جائے گا۔ مگر مولانا نے اسے صاف جواب دے دیا کہ میں حکومت سے کوئی درخواست کرنا نہیں چاہتا۔ اور مولانا اپنے ارادے میں اٹل رہے اور انھوں نے سرکار سے کسی قسم کی کوئی درخواست نہیں کی۔ اس اجمال کا ذکر کرتے ہوئے اپنے مکتوب میں مولانا لکھتے ہیں:

"جس دن تار ملا اس کے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ میرے پاس آیا اور یہ کہا کہ اگر میں اس بارے میں حکومت سے کچھ کہنا چاہتا ہوں تو وہ اسے فوراً بمبئی بھیج دے گا اور یہاں پابندیوں اور مقررہ قاعدوں سے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑے گی وہ صورتحال سے بہت

نقشِ صفات

فکر و عمل کی تفہیم و تفسیر



برملی گئی۔ یہ تو کم سے کم بھی نہیں ہے، جس کے وہ مستحق تھے۔ میں پہلے چار سال تک ان کی نظر بندی کے زمانے میں اپنی ایک ابتدائی آزمائش کر چکی ہوں اور میں کہہ سکتی ہوں کہ اس دوسری آزمائش میں بھی پوری اتروں گی۔ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ان کی سزا یابی کے بعد مجھے اپنی ناچیز ہستی کو ادائے فرض کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ میں آج سے بنگال صوبائی خلافت کمیٹی کے تمام کاموں کو اپنے بھائی کی اعانت سے انجام دوں گی۔"

زلیخا بیگم کا جذبۂ ایثار و قربانی، وطن پرستی، غلامی کے خلاف جہاد اور صبر و استقلال اُنھیں مادرِ وطن کی گنی چُنی بیٹیوں کی صف میں لا کھڑا کرتا ہے۔

ہے، جو وحدہ لاشریک ہے۔ اسی قربانی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں اطاعت گذاروں میں سب سے آگے ہوں"۔
(قرآن۔ ۶۔ ۱۶۳۔ ۱۶۴)

نام..........................

پیشہ..........................

عمر..........................

پتہ..........................

اس کے بعد تقریباً دو ہفتے تک پھر سناٹا رہا اس کے بعد ایک شمارے میں حسب ذیل طویل نوٹ شائع ہوا:

" جن صاحبان ایقان اور جاں نثارانِ اسلام نے ایک مبہم و مجمل صدائے دعوت کو سن کر اپنا نام بلا تامل بھیج دیا، اور ان تمام خطرات و وساوس سے مرعوب نہ ہوئے جو ایسے موقعہ پر قدرتی طور پر نفسِ انسانی میں پیدا ہوتے ہیں انھوں نے فی الحقیقت راہ جاں سپاری و فدویت کا پہلا امتحان دے دیا۔ اور اس طریق دعوت میں فی الحقیقت ایک بہت بڑی حکمت پوشیدہ تھی۔ اس سے یہی مقصود تھا کہ سچی پیاس رکھنے والے اور جھوٹے مدعیان تشنگی میں تمیز ہو جائے۔ جن کو سچی پیاس ہوگی وہ پانی کا نام سنتے ہی دوڑیں گے، اور پیاس کی شدت انھیں اس کا موقع ہی نہ دے گی کہ عاقبت بینیوں اور مصلحت اندیشیوں میں مبتلا ہوں۔

پس جن لوگوں نے بلا تامل قدم بڑھایا وہ الحمد للہ کہ پہلی منزل امتحان سے کامیاب گذر گئے اور بعد کی آنے والی منزل سے گذرنے کا اپنے تئیں مستحق ثابت کر دیا۔

—— تائید الٰہی عنقریب اس دعوت کو ایک عظیم الشان جماعت کی صورت میں ظاہر کرنے والی ہے، لیکن جب کہ اغراض و مقاصد کی اشاعت ہو جائے گی تو پھر یاد رہے کہ اس کی طرف سبھی بڑھیں گے لیکن ان کا اجر ان لوگوں کا سا تو نہیں ہو سکتا، جنھوں نے خطرات و خدشات کے ہجوم میں اس کا ساتھ دیا ہے"۔[۵]

اسی شمارے میں یہ وعدہ بھی کیا گیا تھا کہ رسالہ "دعوت و تبلیغ" ممبروں کے پاس بھیجا جائے گا۔ ممکن ہے اس میں پارٹی کے اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ہوں لیکن ہمارے پاس اس بات کا پتہ چلانے کا کوئی یقینی ذریعہ نہیں ہے کہ آیا اغراض و مقاصد پر مشتمل کوئی رسالہ شائع ہوا اور ممبروں کے پاس بھیجا گیا یا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ تھوڑے تھوڑے وقفے سے الہلال میں حزب اللہ سے متعلق اجمالی اور بہت حد تک ابہامی قسم کے نوٹ شائع ہوتے رہے جن میں اغراض و مقاصد کی وضاحت کیے بغیر اللہ کی راہ میں "سب کچھ" قربان کر دینے کے فضائل

... مولانا آزاد کی "مذہبی جماعت"

حزب اللہ کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو استخلاص وطن کی خاطر انگریزوں کے خلاف متحد اور مجتمع کرنا تھا۔ وہ مسلمانوں کو اور خاص طور سے علماء کو مذہب کے نام پر اکٹھا کرنا چاہتے تھے کہ ان کے ذریعے سیاسی محاذ پر مجاہدین وطن کے ہاتھوں کو مضبوط کر سکیں...

اور اس کی اہمیت پر زور دیا جاتا رہا لیکن کبھی بھی پرچے میں متعین طور سے یہ نہیں بتایا گیا کہ جماعت کا طریق کار کیا ہوگا۔ پھر اچانک چند ماہ بعد مولانا نے حزب اللہ پر ایک خاصا بڑا مضمون لکھا جس میں انھوں نے سورہ توبہ (نمبر ۹) کی آیت نمبر ۱۱۲ کو جس میں مومنین کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں حزب اللہ کی بنیاد بتایا۔ اس آیت میں مومنین کی جو خصوصیات بیان کی گئی ہیں وہ حسب ذیل ہیں:

(التائبون) وہ جو توبہ کرنے والے ہیں۔

(العابدون) اللہ کے عبادت گذار ہیں۔

(الحامدون) اس کی حمد و ثنا ہمیشہ ورد زبان رکھتے ہیں۔

(السائحون) اس کی راہ میں اپنے گھروں کو چھوڑ کر سفر کرتے ہیں۔

(الراکعون الساجدون) اس کے آگے رکوع و سجود میں مشغول رہتے ہیں۔

(الآمرون بالمعروف) نیک کاموں کا حکم دیتے ہیں۔

(الناھون عن المنکر) برائیوں کو روکنے والے ہیں۔

(الحافظون لحدود اللہ) اور سب سے آخر یہ کہ اللہ نے جو حدود قائم کر دیے ہیں ان سب کے محافظ ہیں تو ایسے مومنوں کو دین و دنیا کی فتح یابیوں کی خوشخبری سنا دو۔

مولانا آزاد کے بیان کے مطابق "خدا تعالیٰ نے اس آیت کریمہ میں آٹھ وصفوں کو بیان کیا ہے جو مومنین میں ہونے چاہئیں یا آٹھ قسم کے درجوں کو بیان کیا ہے جن میں سے ہر درجہ پچھلے سے اعلیٰ و اکمل ہے اور یہی اس جماعت کا دستور العمل ہوگا ——

حاصل سخن یہ کہ "حافظین لحدود اللہ" کا مقام جماعت "حزب اللہ" کا مرتبہ آخری ہے اور ان مراتب ثمانیہ کے طے کرنے کے بعد اس جماعت کا فرض ختم ہو جاتا ہے"۔[۹]

... اس کے بعد انھوں نے سورۃ فاطر (نمبر ۳۵) کی آیت نمبر ۳۲ (ثم اورثنا الکتاب...) کی تشریح و تفسیر کرتے ہوئے یہ نکتہ نکالا کہ:

اس آیۂ کریمہ میں خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو تین طبقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

۱۔ وہ جو اپنے نفوس پر ظلم کرتے ہیں۔

۲۔ درمیانی طبقہ جو غفلت سے متنبہ ہوا، اعمال حسنہ اختیار کیے، اوامر الٰہیہ کے آگے سر اطاعت خم کیا۔

۳۔ اعلیٰ ترین طبقہ جو نہ صرف خیرات و محاسن کا انجام دینے والا بلکہ ان میں اوروں سے پیش رو بھی ہے۔

... پس اس تقسیم قرآنی کی بنا پر اس جماعت کے بھی تین درجے قرار پائے ہیں



حزب اللہ: مولانا آزاد کی انقلابی کتابِ حیات کا ایک ورق

(۱)

مولانا ابوالکلام آزاد نے سیاست کا پہلا سبق ۱۹۰۵ء کے لگ بھگ بنگال کے اُن سیاسی لیڈروں سے سیکھا تھا جو وطن کی آزادی کے لیے خفیہ قسم کی انقلابی تحریکیں چلایا کرتے تھے۔ اگرچہ وہ زیادہ دنوں تک اُن لیڈروں کے زیرِ اثر نہ رہ سکے اور بہت جلد ہی دلوں میں ہندو بنگالیوں کی انقلابی تحریکوں سے بددل ہو گئے، پھر بھی کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خاصے دنوں تک وہ اپنے ذہن سے ابتدائے عمر کے اثرات کو پوری طرح سے دور نہ کر سکے۔ ۱۹۱۳ء میں جب ان کے ہفت روزہ الہلال کی عمر بمشکل ایک سال کی تھی انھوں نے اپنی انقلابی سیاست کے تجربوں کو مذہبی رنگ دے کر مسلمانوں میں آزمانے کی ایک کوشش کی۔

الہلال کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پہلے ہی دن سے مسلمانوں کے ذہن میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستانی ہونے کے ناطے ان کا فرض تھا کہ وہ وطن کی آزادی کے لیے دل و جان سے کوشش کریں۔ اس سلسلے میں وہ اس حد تک آگے جا چکے تھے کہ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کو "ایک فرضِ دینی اور جہاد فی سبیل اللہ" کہتے تھے[1]۔ ظاہر ہے جہاد کے لیے سرفروشوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ مولانا آزاد اپنے سماجی، علمی اور دینی پس منظر کی بنا پر مسلمانوں کے اس طبقے سے جہادی سرفروشوں کو جمع کر سکتے تھے جو مذہب کے نام پر بے چون و چرا تن من دھن لٹانے کو تیار رہتا ہے۔ الہلال کی وجہ سے اس قسم کے لوگ ان کی طرف ایک اچھی طرح جھک چکے تھے۔ ضروری نہیں ہے کہ اس طبقے کے ہر شخص نے مولانا آزاد کے خیالات کو پوری طرح سمجھ بھی لیا ہو کیونکہ وہ کچھ اس طرح اچانک اسٹیج پر نمودار ہوئے تھے اور اپنی تقریروں اور تحریروں سے انھوں نے لوگوں کے ذہنوں کو کچھ اس طرح متاثر کر دیا تھا کہ اچھے خاصے لوگ ان کے خیالات اور تحریروں کا پوری طرح سے تجزیہ کیے بغیر ان کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کو تیار تھے۔

بہرحال ۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد نے ایک بظاہر مذہبی لیکن حقیقتاً خفیہ سیاسی جماعت قائم کرنی چاہی۔ دوسری سیاسی اور مذہبی جماعتوں کے برخلاف انھوں نے اپنی مجوزہ پارٹی کے اغراض و مقاصد کو ابتدا ہی میں بیان کرنے سے احتراز کیا۔ اس کے بجائے الہلال میں انھوں نے ایک مختصر سا نوٹ بہ عنوان "من انصاری الی اللہ" (خدا کی راہ میں میرے مددگار کون لوگ ہیں؟) شائع کیا۔ اس نوٹ میں انھوں نے خاص طور سے ان لوگوں کو مخاطب کیا جو الہلال کی پالیسی سے پوری طرح متفق تھے اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ مجوزہ پارٹی ــــــ حزب اللہ (خدائی جماعت) ــــــ میں شامل ہونا چاہیں تو اپنے نام اور پتے اُن کے پاس بھیج دیں۔ اغراض و مقاصد کے بارے میں انھوں نے بتایا کہ اس کا اعلان اس وقت کیا جائے گا جب ایک معقول تعداد میں نام اور پتے جمع ہو جائیں گے[3]۔

دوسرے ہفتے انھوں نے ایک اور نوٹ شائع کیا جس میں یہ خبر دی کہ دو ہفتے بعد وہ حزب اللہ کی "دوسری منزل" کا اعلان کریں گے۔ "دوسری منزل" کی انھوں نے کوئی تشریح تو نہیں کی لیکن سیاق و سباق سے ظاہر ہوتا ہے کہ "دوسری منزل" سے ان کی مراد غالباً پارٹی کے اغراض و مقاصد کا اعلان تھا۔ الہلال کے اسی شمارے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پہلے اعلان کو پڑھ کر ان کے پاس لگ بھگ آٹھ سو آدمیوں نے نام اور پتے بھیج دیے تھے[4]۔ ظاہر ہے جنگِ آزادی کو جاری رکھنے کے لیے آٹھ سو آدمیوں کی فوج کوئی حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ حزب اللہ کے ممبر بن جائیں۔ بہرحال الہلال کے قارئین کو نا امیدی ضرور ہوئی ہوگی جب دو ہفتے بعد انھیں رسالے میں حزب اللہ کی دوسری منزل کی تشریح نظر نہ آئی ہوگی۔ دو ہفتے کیا، لگ بھگ ایک ماہ تک اس سلسلے میں بالکل خاموشی رہی، پھر ایک شمارے میں ایک چھوٹی سی خبر شائع ہوئی کہ حزب اللہ کا ممبر بننے کے لیے باقاعدہ فارم چھپوا لیے گئے ہیں جو عند الطلب بھیجے جائیں گے اور اسی کے ساتھ ساتھ ایک رسالہ "دعوت و تبلیغ" بھی بھیجا جائے گا[5]۔ مطبوعہ ممبری فارم کا نمونہ حسب ذیل ہے[6]:

نحن انصار اللہ

(ہم اللہ کے مددگار ہیں)

"میری عبادت، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا، غرض یہ کہ ہر چیز صرف اللہ رب العالمین کے لیے

مشیر الحق
وائس چانسلر، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر



کی دہشت پسند زمین دوز جماعت جوگانتر پارٹی کے دو کارکن سنتوش مترا اور بپن گنگولی پولیس کی رپورٹ کے مطابق مولانا کی جماعت کے بھی ممبر تھے[۱۴]۔ اسی طرح مولانا کے ایک پرانے خلافتی رفیق کار قطب الدین احمد نے جو الہلال کے منیجر بھی رہ چکے تھے، ۱۹۲۱ء میں انگریزوں کے باورچیوں اور بٹلروں پر مشتمل ایک "انجمن خانساماں" بنائی تھی۔ پہلے تو انھوں نے اس انجمن کے ذریعے انگریزوں کے گھریلو ملازمین میں اسٹرائک کرانے کی کوشش کی لیکن اس میں انھیں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ دوبارہ انھوں نے ایک ہندو انقلابی کی مدد سے انگریزوں کے کلب اور ہوٹلوں میں انقلابی دہشت پسندوں کو خاموشی سے پہنچانے کی کوشش کی تاکہ وہ موقع پا کر انگریز افسروں کو قتل کر دیں۔ یہ کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ خفیہ پولیس کا خیال تھا کہ اس پلاٹ میں کہیں نہ کہیں مولانا آزاد کا ہاتھ ضرور ہے لیکن وہ اپنے اس شبہ کو یقین میں نہ بدل سکی[۱۵]۔

حزب اللہ کے بارے میں مزید معلومات کا دوسرا ذریعہ خود اس جماعت کے ممبران ہیں لیکن ایسے لوگ ملیں کہاں، یہ اپنی جگہ خود ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہاں اگر ہم ان ذرائع پر بھروسہ کرنے کو تیار ہوں جو کہ مولانا آزاد کے انتقال کے بعد منصۂ شہود پر آئے ہیں تو پھر کسی نہ کسی حد تک حزب اللہ کی ٹوٹی ہوئی کڑیوں کو جوڑا جا سکتا ہے۔ مثلاً اگر ہم مولانا کے دو "مریدین" عبدالرزاق ملیح آبادی (ہندوستان: انتقال ۲۴ر جون ۱۹۵۹ء) اور غلام رسول مہر (پاکستان: انتقال ۱۶ر نومبر ۱۹۷۱ء) کی تحریروں کو مشعل راہ بنائیں تو بہت حد تک حزب اللہ کے مقاصد اور طریق کار پر روشنی پڑ سکتی ہے۔

(۲)

ملیح آبادی نے ۱۹۱۹ء میں مولانا آزاد کے ہاتھ پر باقاعدہ بیعت کی تھی اور مولانا آزاد نے انھیں صوبہ یو۔ پی کے لیے اپنا خلیفہ مجاز بھی نامزد کیا تھا تاکہ وہ اس صوبے کے لوگوں سے ان کے نام پر بیعت لے سکیں۔ اس سلسلے میں مولانا ملیح آبادی کو تحریری طور سے جو "خلافت نامہ" مولانا آزاد نے دیا تھا وہ حسب ذیل ہے:

اخویم مولوی عبدالرزاق صاحب ملیح آبادی نے فقیر کے ہاتھ پر بیعت کی ہے۔ وہ بیعت لینے اور تعلیم و ارشاد و سلوک سنت میں فقیر کی جانب سے ماذون و مجاز ہیں۔ جو طالب صادق ان کے ہاتھ پر بیعت کریں گے انھوں نے خود فقیر سے بیعت کی۔ والعاقبۃ للمتقین۔

[فقیر ابوالکلام کان اللہ لہ،
۴ر شعبان ۱۳۳۸ھ (۱۹۱۹ء)]

مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے الفاظ میں

"مولانا کی اسکیم کا خلاصہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو مذہب کی راہ سے منظم کیا جائے۔ مسلمانوں کا ایک امام ہو اور امام کی اطاعت کو وہ فرض دینی سمجھیں۔ مسلمانوں میں یہ دعوت مقبول ہو سکتی ہے اگر قرآن و حدیث سے انھیں بتا دیا جائے کہ امام کے بغیر ان کی زندگی غیر اسلامی ہے اور ان کی موت جاہلیت پر ہوگی۔ جب مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد امام کو مان لے تو امام ہندوؤں سے معاہدہ کر کے انگریزوں پر جہاد کا اعلان کر دے۔ اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ قوت سے انگریزوں کو شکست دی جائے۔ مگر امام کون ہو؟ اس منصب کے لیے زیادہ سے زیادہ معتبر آدمی کو چننا ہوگا، ایسے آدمی کو جو کسی قیمت پر دشمن کے ہاتھ نہ بک سکے۔ ساتھ ہی امام کو ہوشمند اور حالات زمانہ سے کما حقہ واقف ہونا چاہیے۔ ظاہر ہے مولانا اپنی ذات سے زیادہ کسے امامت کا اہل سمجھ سکتے تھے۔ اور میرا بھی یہی خیال تھا کہ انہی کو یہ منصب ملنا چاہیے"[۱۶]۔

اگر ہم ملیح آبادی کے الفاظ کو مولانا آزاد کے خیالات کی صدائے بازگشت تسلیم کریں تو پھر اس بات کے کہنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہو سکتی کہ حزب اللہ بنیادی طور سے ایک سیاسی جماعت تھی جس کا مقصد استخلاص وطن تھا چوں کہ مولانا آزاد کو یہ اطمینان نہیں تھا کہ خالص سیاسی مقاصد کے لیے مسلمان ان کے پیچھے چلنے پر تیار ہوں گے اس لیے انھوں نے مذہب کا سہارا ضروری سمجھا اور اور تحریک کو اس انداز سے لوگوں کے سامنے پیش کیا کہ وہ بظاہر مذہبی تحریک نظر آئے۔

مولانا آزاد کے دوسرے مرید غلام رسول مہر نے بھی مولانا کے انتقال کے بعد ان کا حسب ذیل خط شائع کیا ہے جو خاص طور سے پنجاب میں مولانا کے مریدوں کے نام ۱۹۲۱ء میں لکھا گیا تھا:

جن عزیزوں نے گذشتہ سال یا امسال یا اس سے پہلے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے ان سب کی اطلاع کے لیے میں یہ سطریں شائع کرتا ہوں۔ انھوں نے میرے ہاتھ پر پانچ باتوں کا عہد کیا ہے:

اول... امر بالمعروف (نہی) عن المنکر اور توصیۂ صبر کا، یعنی ہمیشہ نیکی کا حکم دیں گے برائی کو روکیں گے۔ صبر کی وصیت کریں گے۔

ثانیاً... الحب فی اللہ والبغض فی اللہ کا، یعنی اس دنیا میں ان کی دوستی ہوگی تو اللہ کے لیے اور دشمنی ہوگی تو اللہ کے لیے۔

ثالثاً... لا یخافون فی اللہ لومۃ لائم کا، یعنی سچائی کے راستے میں وہ کسی کی پروا نہیں کریں گے اور خدا کے سوا کسی اور سے نہیں ڈریں گے۔

رابعاً... اس بات کا کہ اللہ اور اس کی شریعت کو دنیا کے سارے رشتوں، ساری نعمتوں اور ساری لذتوں سے زیادہ محبوب رکھیں گے۔



۱۔ ہر مسلمان جو راست بازی کا متلاشی، اصلاحِ حال کا متمنی اور اسلام کے اس دورِ غربت میں خدمت و جہاد فی سبیل اللہ کی اپنے دل میں سوزش و تپش رکھتا ہے۔ نیتِ صالح، ارادۂ محکم اور اقرارِ واثق کے ساتھ دینِ الٰہی کے اس میثاق کو دہرائے: میری عبادت، میری قربانی، میرا جینا، میرا مرنا غرض یہ کہ ہر چیز صرف اللہ رب العالمین کے لیے ہے، اس قربانی کا مجھے حکم دیا گیا اور میں مسلمانوں میں پہلا "مسلم" ہوں اور اپنی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ خدا کی قربانی کے لیے تیار ہو کر اقرار کرے کہ وہ اللہ کے رشتے میں منسلک ہونا اور اس کی جماعت کے فرائض ادا کرنا چاہتا ہے۔ بس وہ طبقہ "ظالم لنفسہ" میں سے طبقہ "مقتصد" کے لیے منتخب ہو جائے گا، اور اس کے بعد اس کی آزمائش شروع ہو جائے گی اور یہ آزمائش اس وقت تک جاری رہے گی جس وقت تک کہ وہ دوسرے درجے میں شامل ہونے کا اہل ثابت نہ ہو۔

۲۔ (پہلی جماعت سے)۔ . . . ایک دوسری جماعت چھانٹی جائے گی اور اس میں شامل ہونا گویا اربابِ اقتصاد کے طبقے میں شامل ہونا ہوگا۔ . . .

۳۔ اس دوسری جماعت میں سے جو فرزندانِ حق اپنے اعمال و افعال سے درجۂ مسابقت و مرتبۂ علو و رفعت حاصل کر لیں گے ان ہی سے یہ آخری جماعت منتخب ہوگی اور یہی جماعت "حزب اللہ" کا خلاصۂ مساعی و جہاد اور اس کی اصل حکمراں جماعت ہوگی۔ یہ لوگ "سابق بالخیرات" اور "حافظین لحدود اللہ" ہوں گے۔ خدا تعالیٰ ان سے جو کام لینا چاہے گا خود لے لیگا، اور جس مقصد کی طرف انھیں کھینچے گا وہ اس طرف کھنچ جائیں گے۔ ان کے مقصد آخری کو نہ اس وقت بتلایا جا سکتا ہے اور نہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ جو سالک کہ ابتدائی دو جماعتوں سے ترقی کر کے اس درجے تک پہنچے گا وہ خود وہاں کے اسرار و رموز سے آشنا ہو جائے گا۔ اس سے پہلے وہاں کے حالات کسی پر منکشف نہ ہو سکیں گے کسی عضو جماعت کے لیے جائز نہ ہوگا کہ ان کے انکشاف کے درپے ہو اور وقت سے پہلے انھیں معلوم کرنا چاہے[10]۔

حزب اللہ کے ممبروں اور پارٹی کی مالی مدد کرنے والوں کی تفصیلات ہمارے پاس نہیں ہیں۔ نہ ہی مولانا آزاد نے اس معاملے پر کوئی روشنی ڈالی ہے۔ لیکن اس وقت کی بنگالی خفیہ پولیس کے کاغذات سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حزب اللہ کے قیام کے سلسلے میں کلکتہ میں بسے ہوئے غیر بنگالی مسلمان تاجر، دوکاندار اور ٹھیکیدار مولانا کی مالی مدد کرتے تھے تاکہ پارٹی کے کارکن مبلغین کی شکل میں مختلف علاقوں میں کام کر سکیں[11]۔

حزب اللہ کے دروازے مولانا آزاد کے بقول مردوں اور عورتوں دونوں پر کھلے ہوئے تھے۔ ایک خاتون مراسلہ نگار کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے الہلال کے مختلف شماروں میں یہ بات مختلف انداز سے کہی ہے کہ ہر شخص کا دائرۂ کار ایک ہی نہیں ہوتا ہے۔ عورتیں بھی اپنے دائرۂ کار میں رہتے ہوئے مردوں ہی کی طرح حزب اللہ کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکتی ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر شخص دربدر مارا مارا پھرے[12]۔

ہر حال ۱۹۱۴ء میں الہلال بند ہوگیا۔ اور مولانا آزاد کی زندگی میں بھی قید و بند کا ایک نیا باب شروع ہوگیا۔ اس طرح "حزب اللہ" کھلنے سے پہلے مرجھا کر رہ گئی، بایں ہمہ یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ مولانا آزاد نے تحریک حزب اللہ کو بالکلیہ تہہ کر کے رکھ دیا۔ اندازہ ہوتا ہے کہ الہلال کے بند ہو جانے کے بعد بھی خاصے دنوں تک وہ "زیرِ زمین" انقلابی طرزِ فکر کو اپنائے رہے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ انھوں نے اس موضوع پر کھل کر کبھی بھی کچھ نہیں لکھا، نہ ہی ان کے زمانے میں اس موضوع پر ان کے پیروؤں نے کچھ لکھا، اس خاموشی کی وجہ سمجھ میں بھی آتی ہے کیوں کہ، جیسا کہ ہم نے ابھی دکھلایا ہے، مولانا نے پہلے دن سے رازداری پر بہت زیادہ زور دیا تھا، اس لیے اب اگر اس جماعت کے بارے میں ہمیں کچھ مزید معلومات حاصل ہو سکتی ہیں تو وہ یا تو خفیہ پولیس کی فائلوں سے مل سکتی ہیں۔ یا پھر ان لوگوں کے ذریعے جو اس جماعت سے باقاعدہ طور پر منسلک رہ چکے ہوں۔ اول الذکر ذریعے پر اگرچہ ہم بہت زیادہ بھروسا نہیں کر سکتے لیکن اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ آگ کے بغیر دھوئیں کا وجود ممکن نہیں ہے۔

پریسیڈنسی کالج کلکتہ میں تاریخ کے استاد پروفیسر رجت رے نے اپنے ایک مضمون[13] میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ۱۹۰۵ سے ۱۹۲۵ء تک کی خفیہ زیرِ زمین انقلابی کارروائیوں پر بنگال خفیہ پولیس کے کاغذات کی مدد سے کچھ روشنی ڈالی ہے، جس سے ہمیں حزب اللہ کے بارے میں اس وقت کی بنگال گورنمنٹ کے نقطۂ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ ان رپورٹوں کی رو سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف حکومت کی نظروں میں حزب اللہ ایک خفیہ انقلابی بلکہ کسی حد تک دہشت پھیلانے والی تحریک تھی بلکہ اس وقت تک کی ہندو بنگالی زمین دوز انقلابی جماعتیں بھی اسی نظر سے اسے دیکھتی تھیں۔ اور اس کی طرف سے اس اندیشے سے چوکنی رہتی تھیں کہ کہیں یہ جماعت ترکی اور افغانستان کے حکمرانوں کی مدد سے انگریزوں کو نکال کر اس ملک میں پھر سے مسلم حکومت نہ قائم کر دے۔

اگرچہ بنگال خفیہ پولیس مولانا کو کسی دہشت گردی کے معاملے میں براہِ راست ملوث نہیں کر پائی لیکن ایک دو واقعات میں اسے شبہہ تھا کہ مولانا بلاواسطہ تو نہیں لیکن بالواسطہ ضرور شریک ہیں۔ ہندو بنگالیوں

دعوت نہیں دی، اب سوادِ اعظم کے خلاف یہ قدم کیوں اٹھایا جارہا ہے؟[۲۱]"

اس وقت کی ملکی سیاست سے علما جو اپنا دامن بچا رہے تھے اس کی ایک بڑی وجہ مولانا آزاد کے خیال میں منافقانہ ذہنیت تھی۔ ترجمان القرآن میں سورۂ توبہ کی آیت نمبر ۴۸ کی تفسیر میں انھوں نے لکھا ہے:

"غور کرو گے تو نفاق کی یہ خصلت آج بڑے بڑے مدعیان علم و مشیخت میں بولتی نظر آئے گی۔ جھوٹی دینداری اور وہمی پرہیزگاری نے سعی و عزم کی تمام راہیں ان پر بند کردی ہیں اور وہ ساعی ہیں کہ امت پر بھی بند کردیں۔ ۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ ہندوستان کے علما و مشائخ کو عزائم و مقاصد وقت پر توجہ دلاؤں ممکن ہے، چند اصحاب رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی، لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد سب کا متفقہ جواب یہی تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے ـــــ یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسن دیوبندی کی تھی جو اب رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے۔

تم نے بعض علما کے فتوے پڑھے ہوں گے کہ مسلمانوں کو وقت کی سیاسی مجالس میں شریک نہ ہونا چاہیے کیونکہ اس میں غیر مسلم عورتیں کھلے مُنہ موجود ہوتی ہیں اور اس لیے ان کی شرکت فتنہ سے خالی نہیں ہے۔ اسی طرح یہ بات بھی کہی جاتی ہے کہ ان کی شرکت سے نماز باجماعت فوت ہوجاتی ہے اور یہ تقویٰ کے خلاف ہے[۲۱]۔ یاد رکھو کہ یہ تقویٰ اور دینداری نہیں ہے جو ان کاموں کی مخالفت پر انھیں اُبھارتی ہے یہ مرض نفاق کی قسموں میں سے ایک قسم ہے اور قرآن کی شہادت اس کے لیے بس کرتی ہے[۲۲]۔"

مولانا آزاد کے مذکورہ بالا بیان سے یہ صاف ظاہر ہورہا ہے کہ وہ علما کو ان کی مرضی کے خلاف سیاست کے میدان خارزار میں نہ صرف گھسیٹنا چاہتے تھے، بلکہ ان سے یہ توقع رکھتے تھے کہ وہ آگے بڑھ کر رہنمائی کا بھی فریضہ انجام دیں گے۔ کیونکہ ان کے خیال میں اسلام میں سیاست مذہب سے الگ نہ تھی اور اگر اسلام کے ماننے والے خاص طور سے ان کے مذہبی قائدین، سیاست کے میدان میں رہنمائی کا کام انجام نہ دے سکیں تو بہتر ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ دنیا کو ایسے مذہب کی کیا ضرورت ہے جو صرف خطبۂ نکاح میں چند آیتیں پڑھ دینے یا بستر نزع پر سورۂ یٰسین کو دہرا دینے ہی کے لیے کارآمد ہوسکتا ہے[۲۳]۔"

خواہش اپنی جگہ، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اپنی جگہ پورا یقین تھا کہ علما سیاست میں حصہ لینے سے پہلو تہی کر رہے ہیں اس لیے حیرت کی بات نہ ہوگی اگر یہ خیال کیا جائے کہ حالات کے پیش نظر مولانا آزاد نے یہ طے کرلیا کہ ہوسکے تو خود ہی قیادت کا بوجھ سنبھال لیں۔ وہ حزب اللہ کی تحریک چلا ہی چکے تھے اور اس تحریک میں انھوں نے جس طرح کی بے چون و چرا قسم کی پیروی پر زور دیا تھا اس قسم کی قیادت مذہبی اصطلاح میں صرف "امامت" کی شکل میں مل سکتی تھی۔ چونکہ اس وقت مولانا آزاد ایک عالم اور ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے مسلمانوں میں پوری طرح متعارف ہوچکے تھے اس لیے ان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں معلوم ہوتی کہ وہ خود ہی اپنے دوش ناتواں پر امامت کا بار اٹھانے کے لیے تیار ہوگئے ہوں۔

(۳)

مولانا آزاد کا خیال تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی پسماندگی کا ایک بڑا سبب "امام" کی غیر موجودگی ہے ان کی رائے میں کسی امام کے بغیر جماعتی زندگی گذارنا پوری اُمت مسلمہ کے لیے گناہ کا حکم رکھتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک کوئی باقاعدہ امام نہ ہوگا اس وقت تک مسلمان شریعت کے مطابق جماعتی زندگی گذارنے پر قادر نہیں ہوسکتے۔ اس سلسلے میں ان کے خیالات کو مختصراً یوں پیش کیا جاسکتا ہے کہ کوئی جماعت انفرادی غلطیوں اور گناہوں کے ارتکاب سے یک دم تباہ نہیں ہوتی۔ انفرادی گناہ ایک ایسے سست رفتار زہر کی طرح ہے جو دھیرے دھیرے گھن کی طرح قومی زندگی کو کھوکھلا کرتا ہے۔ لیکن اجتماعی غلطیاں راتوں رات کسی بھی قوم کو تباہ کرسکتی ہیں اور کسی امام کا نہ ہونا ایک اجتماعی غلطی ہے۔ یہ بات بلا مبالغہ کہی جاسکتی ہے کہ انفرادی اصلاح بھی اس وقت تک نہیں ہوسکتی جب تک کہ حکومت کا کوئی صحیح اور صالح نظام نہ قائم ہوجائے[۲۴]۔

مولانا آزاد کے خیال میں پوری قوم کا یہ اجتماعی فرض تھا کہ وہ کسی ایک شخص کو اپنا امام منتخب کرلے اور انتخاب کے بعد اس کے ہر حکم کی بے چون و چرا پیروی کرے بشرطیکہ اس سے شریعت کی خلاف ورزی نہ ہوتی ہو۔ اس طرح جب کوئی ایسا امام سامنے آجائے گا تو وہی مسلمانوں کی ملکی اور غیر ملکی سیاست میں رہنمائی کا فریضہ انجام دے گا۔ صرف اس کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اختلافی مواقع پر فتویٰ جاری کرے نہ تو ہر عالم اس اہم فریضے کو ادا کرنے کا اختیار رکھتا ہے اور نہ ہی ہر مدرسے کا استاد اس حیثیت کا ہوتا ہے کہ وہ امام کے منصب کو پوری طرح ادا کرسکے[۲۵]۔

اگر ہم خاص طور سے اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں تو ہمیں اندازہ ہوجائے گا کہ جب تک ہندوستان کے علما کا کسی ایک شخصیت پر اتفاق نہ ہوجاتا اس وقت تک کسی شخص کا امام منتخب ہونا آسان نہ تھا۔ مولانا آزاد بھی اس سے واقف تھے اس لیے ہمیں حیرت نہ ہونی چاہیے اگر وہ یہ سوچتے رہے ہوں کہ اس زمانے کے اہم علما انھیں بحیثیت امام منتخب کرلیں۔ اس زمانے کے مشہور علما میں شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا محمد عبدالباری لکھنوی کی شخصیتیں کافی اہم تھیں



خامساً . . . اطاعت فی المعروف
کا یعنی شریعت کے ہر حکم کی اطاعت بجا
لائیں گے جو ان تک پہنچایا جائے گا۔

میں ان کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ یہ
ان کا قول تھا اور اب چاہیے کہ اپنے عمل سے
بھی اس کی پوری تصدیق کریں اور کامل انقطاع
اور راست بازی کے ساتھ اپنے تئیں اللہ
کے سپرد کر دیں۔ یہ ان کا عہد مطالبہ کرتا ہے
کہ حسب ذیل باتیں ان کی روزانہ زندگی میں
نمایاں ہو جائیں اور ہر شخص ان کو ان کی خصلتوں
اور طریقوں کی وجہ سے ممتاز دیکھ لے۔

۱۔ ولایتی کپڑوں کا خریدنا، بیچنا، پہننا
پہنانا یک قلم ترک کر دیں اور دیسی کھدر کا
لباس اختیار کریں۔

۲۔ اسلامی خلافت اور بلاد اسلامیہ کی
حفاظت ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے۔
پس جہاں تک ان کے امکان میں ہو اپنے دل
سے، اپنی زبان سے، اپنے مال سے اپنے عمل سے
اس کام میں مدد دیں۔

۳۔ کسی مسلمان کی طرف سے اپنے دل میں
کینہ و عداوت نہ رکھیں۔ اگرچہ وہ ان کا کیسا ہی
دشمن ہو۔ تمام مسلمانوں سے صلح و محبت کا برتاؤ
کریں اور اپنی جانب سے کسی مسلمان کے خلاف
قدم نہ اٹھائیں، دوسرا اٹھائے تو جہاں تک
بھی ان کے امکان میں ہو بخش دیں۔ کسی طرح
بھی اپنے وجود کو تفریق جماعت کا سبب
نہ بنائیں۔

۴۔ احکام و مصالح شرعیہ کے مطابق
ہندوؤں سے ہمارا اتحاد ہے۔ پس کامل اتفاق
اور سازگاری کے ساتھ رہیں اور ان کی جانب
سے اپنے دل میں کسی طرح کا کھوٹ نہ رکھیں اور
کوئی بات لڑائی جھگڑے کی ایسی نہ کریں کہ
جس سے اتحاد کو نقصان پہنچے۔ تمام احکام و
ارکان اسلام کی پابندی اور ٹھیک ٹھیک بجا
آوری ان چار باتوں کے علاوہ ہے اور ان
سے مقدم ہے اور ان کی بابت وہ بیعت کرتے
ہوئے سب سے پہلے عہد کر چکے ہیں۔

جو مسلمان مجھ سے اپنی بیعت کا رشتہ
قائم رکھنا چاہتا ہے اس کا فرض ہے کہ ان
باتوں پر کاربند ہو۔ جس نے اس پر عمل نہ کیا
اس سے میرا کوئی رشتہ نہیں۔ . . . .

ابوالکلام احمد[18]

مذکورہ بالا خط سے بھی بہت حد تک یہی معلوم
ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی "مذہبی" جماعت، حزب اللہ
کا بنیادی مقصد مسلمانوں کو استخلاص وطن کی خاطر
انگریزوں کے خلاف متحد اور مجتمع کرنا تھا۔ ان دونوں
خطوط کے علاوہ مولانا آزاد کی دوسری تحریروں سے
بھی یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو اور خاص طور
سے علماء کو مذہب کے نام پر اس لیے اکٹھا کرنا چاہتے
تھے کہ ان کے ذریعے سیاسی محاذ پر مجاہدین وطن کے
ہاتھوں کو مضبوط کر سکیں۔

۱۹۲۵ء کے لگ بھگ مولانا آزاد کے ایک
پنجابی مرید محی الدین قصوری نے انھیں ایک خط لکھا
تھا جس میں مولانا کے کانگریس دوست رویہ کی شکایت
کی گئی تھی اور ان پر یہ اعتراض کیا گیا تھا کہ وہ "التزام
جماعت" کا خیال نہیں رکھتے حالاں کہ آنحضرت
صلعم نے سواد اعظم کا ساتھ دینے کی تاکید کی تھی۔ مولانا
آزاد نے اس سلسلے میں قصوری کو جو خط لکھا اس میں انھوں
نے اس پر زور دیا کہ لوگوں نے "التزام جماعت" کا
مطلب صحیح نہیں سمجھا ہے۔ مولانا کے خیال میں التزام
جماعت کا مفہوم صرف یہ نہیں کہ آنکھ بند کر کے بھیڑ
کی پیروی کی جائے۔ اسی لیے انھوں نے اپنے خط میں
یہ سوال اٹھایا کہ دیکھا جائے تو ہزاروں لاکھوں مسلمانوں
میں کہیں ایک دو مسلمان ایسے نکلیں گے جنھیں صحیح معنوں
میں مسلمان کہا جا سکتا ہے تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ ان
چند گنتی کے "صحیح" مسلمانوں کو چھوڑ کر اکثریت کی
پیروی کی جائے؟ اس منطقی استدلال کو مولانا آزاد نے
اپنے زمانے کی سیاسی صورت حال پر منطبق کرتے ہوئے
لکھا "یہ ظاہر ہے کہ قوم پر سیاسی محرومی کی حالت جبھی
طاری ہوتی ہے جب سواد اعظم عزم و عمل سے محروم ہو
جاتا ہے اور محکومیت کی روٹی پر قناعت کر لیتا ہے۔
اب اگر کوئی مرد کار سعی و عزم کی دعوت دے گا تو یقیناً
اس کی راہ سواد اعظم کی راہ نہ ہوگی، فرد واحد کی راہ ہوگی
یا ایک قلیل ترین طائفہ کی۔ پھر کیا اس کے خلاف شرعاً
یہ فتویٰ صادر کرنا پڑے گا کہ سواد اعظم سے باہر ہوگیا اور
التزام جماعت کی پیروی نہ کی؟[19] اس طرح اپنے موقف
کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا کہ ان پر جماعت
سے الگ رہنے کا الزام لگایا جاتا ہے حالانکہ وہ تمام عمر
اس بات کی کوشش کرتے رہے ہیں کہ اس صحیح جماعت
کو پیدا کر سکیں جس کے بارے میں آنحضرتؐ کا ارشاد
ہے کہ جس نے جماعت سے علیحدگی اختیار کی اس نے
اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنایا۔ ان کے خیال میں عوام تو درکنار
اکثر و بیشتر علما نے بھی "سواد اعظم" اور "التزام
جماعت" کے مفہوم کو صحیح طور سے نہ سمجھا تھا۔ اس
سلسلے میں انھوں نے لکھا کہ "۱۹۱۴ء میں جب میں نے
ہندوستان کے بعض اکابر علما و مشائخ کو عزم و سعی
کی دعوت دی، بعض سے خود ملا اور بعض کے پاس
مولوی عبیداللہ سندھی کو بھیجا تو اکثر نے بعینہ یہی بات
کہی تھی جو آپ کہہ رہے ہیں یعنی علما و مشائخ کی اتنی
بڑی تعداد ملک میں موجود ہے کسی نے بھی آج تک یہ

سوانح نگاروں کو اس مسئلے میں بایں وجہ اشتباہ پیدا ہو گیا ہے کہ مولانا آزاد لاہور سشن کے اس اجلاس کے صدر تھے جس میں پہلی بار امیر الہند کے تقرر کی تجویز پیش ہوئی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ اسی وجہ سے راجپوت اور بٹ کو غلط فہمی ہوئی ہو اور انھوں نے مولانا آزاد کو امام الہند بنا دیا ہو۔

قصہ مختصر اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ استخلاص وطن کی خاطر مولانا آزاد کے ذہن میں اپنی امامت کا خیال شروع ہی سے تھا۔ وہ مذہب کے سہارے اس سیاسی مقصد کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ امامت کے منصب میں سیاسی اور مذہبی دونوں ہی قسم کے اقتدار پوشیدہ تھے اس لیے وہ چاہتے تھے کہ کسی طور اس منصب کو حاصل کرلیں تاکہ اہم سیاسی مواقع پر پورے اطمینان کے ساتھ کسی مرحلے تک پہنچ سکیں۔ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ امامت کے مسئلے کو چونکہ ایک مذہبی بنیاد حاصل ہے اس لیے انھیں علما کی مدد بھی حاصل ہو جائے گی۔ لیکن حیرت ہے کہ اسلامی تاریخ پر گہری نظر رکھنے کے باوجود وہ اس بات کا اندازہ نہ لگا سکے کہ علما بحیثیت جماعت کبھی بھی امامت کے مسئلے پر متحد نہیں ہو سکتے تھے وہ کسی "حاکم" یا "اولالامر" کے آگے تو سرِ تسلیم خم کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ شریعت کی پیروی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن خود اپنوں میں سے کسی ایک شخص کو کلی اقتدار سپرد کر دینے پر کبھی بھی رضامند نہیں ہو سکتے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ جب بھی "امیر الہند" کا مسئلہ جمعیت العلما کے اجلاس میں پیش ہوا تو اسے یا تو کورم کی کمی کی بنا پر ملتوی کرنا پڑا یا پھر مزید "غور و خوض" کے لیے اٹھا رکھا گیا۔

حواشی:

۱۔ مولانا آزاد کی انگریزی سوانح "انڈیا ونس فریڈم" کا اردو ترجمہ "ہماری آزادی" مترجم پروفیسر محمد مجیب، ص ۱۵۔

۲۔ الہلال، جلد ۱، نمبر ۲۳۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء صفحہ ۱۱۔

۳۔ الہلال، ۲/۱۶۔ ۲۳ اپریل ۱۹۱۳ء صفحہ ۲۷۵۔

۴۔ الہلال، ۲/۱۷، ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء

۵۔ الہلال، ۲/۲۰۔ ۲۱ مئی ۱۹۱۳ء صفحہ ۳۳۵۔

۶۔ فارم میں اصل قرآنی آیات چھپی ہوئی ہیں ترجمہ نہیں ہے۔ فارم کا نمونہ چونکہ الہلال کے کسی شمارے میں شائع نہیں ہوا تھا بلکہ اسے علیحدہ سے طبع کرایا تھا اس لیے اب یہ فارم بآسانی دستیاب نہیں ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز میکگل یونیورسٹی۔ مانٹریال (کناڈا) کی لائبریری میں الہلال کی جو مکمل فائل موجود ہے اس میں شمارہ ۳۰ اپریل ۱۹۱۳ء کے ساتھ ایک عدد فارم بھی تجلید میں شامل ہو گیا ہے۔

۷۔ الہلال، ۲/۲۲، ۴ جون ۱۹۱۳ء۔ صفحہ ۴۷۳۔

۸۔ مثلاً ملاحظہ ہو الہلال، ۲/۲۴، ۲۰ جون ۱۹۱۳ء، ص ۵، نیز ۳/۱، ۲ جولائی ۱۹۱۳ء۔ صفحات ۴۔۸

۹۔ الہلال۔ ۳/۲۲، ۳ دسمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۴۱۷۔۴۲۰۔

۱۰۔ الہلال۔ ۳/۲۳، ۳ دسمبر ۱۹۱۳ء صفحہ ۴۲۰۔

۱۱۔ انٹیلیجنس برانچ فائل (IB) ۱۹۱۷ء بعنوان "کلکتہ میں مولانا ابوالکلام آزاد کی قائم کردہ جمعیت حزب اللہ سوسائٹی" بحوالہ رجت رے، (تفصیل کے لیے دیکھیے نوٹ نمبر ۱۲) ص ۹۲۔

۱۲۔ مثلاً ملاحظہ ہو الہلال ۲/۱۶، ص ۲۵۵۔۲۵۸؛ ۲/۱۷، ص ۲۷۶؛ ۲/۱۹، ص ۳۱۳؛ ۲/۲۰، ص ۳۳۵؛ ۲/۲۱، ص ۳۶۷ بحوالہ:
I H. Douglas, Abul Kalam Azad: An Intellectual and Religious Biography (Delhi, 1988) PP 116-117.

۱۳۔ رجت رے کا مضمون: "Revolutionaries, Pan-Islamists and Bolshevik. Maulana Abul Kalam Azad and the Political underworld in Calcutta, 1905-1925" مشمولہ مشیر الحسن کی مرتبہ کتاب:
Communal and Pan Islamic trands in Colonial India (Delhi 1981)

۱۴۔ بحوالہ رجت رے
"Muhammadan Secret Organization, Calcutta"
(مشیر الحسن کی مذکورہ بالا کتاب، ص ۱۰۳)

۱۵۔ ایضاً... نیز IB 1921, 1922
List of labour Unions and Associations in Bengal.
(بحوالہ رجت رے، ص ۱۰۳) مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب "ذکر آزاد" (کلکتہ، ۱۹۶۰) ص ۳۹۸۔۴۰۱ نیز ص ۱۱۴ میں قطب الدین احمد کا ذکر الہلال کے منیجر کی حیثیت سے کیا ہے۔ اور ان کے کمیونسٹ ہونے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ لیکن ان کے دہشت پسند ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ذکر



کہ ان کی رائے کے بغیر امامت سے متعلق کوئی اجتماعی فیصلہ آسان نہ تھا۔ اگرچہ خود مولانا آزاد نے کہیں اس بات کا ذکر نہیں کیا ہے کہ انھوں نے کسی متعین عالم سے اپنی امامت کے سوال پر کوئی گفتگو کی ہو لیکن ان کے سوانح نگار ملیح آبادی کا بیان ہے کہ انھیں مولانا آزاد نے حکم دیا تھا کہ وہ شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا محمد عبدالباری سے ان کی امامت کے سلسلے میں گفتگو کریں۔

ملیح آبادی کا بیان ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں شیخ الہند مالٹا سے واپس آکر کچھ دنوں کے لیے لکھنؤ کے دورے پر گئے تو انھوں نے ان سے تنہائی میں ملاقات کی اور مولانا آزاد کی امامت کے موضوع پر گفتگو کی۔ پہلے تو مولانا ملیح آبادی نے امامت کا منصب خود شیخ الہند کی خدمت میں پیش کیا لیکن جب وہ اس پر راضی نہ ہوئے تو انھوں نے مولانا آزاد کا نام تجویز کیا۔ اس پر بقول ملیح آبادی شیخ نے متانت سے فرمایا "میرا انتخاب بھی یہی ہے۔ اس وقت مولانا آزاد کے سوا کوئی شخص امام الہند نہیں ہو سکتا ان میں وہ سب اوصاف جمع ہیں جو اس زمانے میں ہندوستان کے امام میں ہونا ضروری ہیں"[۲۶]

شیخ الہند کے بعد دوسرا مرحلہ مولانا عبدالباری کی اجازت کا تھا' اور یہ مسئلہ کچھ آسان نہ تھا۔ مولانا عبدالباری علی برادران کا بہت خیال رکھتے تھے اور اس وقت کی ہندوستانی سیاست میں مولانا آزاد اور علی برادران کی سیاسی چشمک کا حال کسی سے پوشیدہ نہ تھا۔ اس لیے اس کا خدشہ تھا کہ مولانا عبدالباری "امامت" کی تجویز سے متفق نہ ہوں۔ لیکن شیخ الہند کی رائے سن کر وہ بھی راضی ہو گئے اور ملیح آبادی کی فرمائش پر اپنی رائے لکھ کر دے دی جو حسب ذیل ہے:

"مسئلۂ امامت یا شیخ الاسلامی کے متعلق مجھے جمہور کی موافقت کے سوائے کوئی چارۂ کار نہیں ہے۔ جو اندیشہ ہے وہ بار بار اہل الرائے سے ظاہر کر چکا ہوں' باوجود اس کے پھر بھی مسلمانوں کی تجویز کو بسر و چشم قبول کرنے کو تیار رہوں۔ خود مجھ سے بار ہا اس منصب کے قبول کرنے کی بعض اہل الرائے نے خواہش کی مگر میں نے اپنی عدم اہلیت کے باعث اس امانت کا بار اٹھانا منظور نہیں کیا نہ آئندہ قبول کرنے کا ارادہ ہے۔ مولانا محمود حسن صاحب سے دریافت کیا تو وہ بھی اس بار کے متحمل نظر نہیں آتے مولانا ابوالکلام صاحب اسبق و آمادہ ہیں' ان کی امامت سے مجھے بھی استنکاف نہیں ہے۔ بسر و چشم قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوں بشرطیکہ تفریق جماعت کا اندیشہ نہ ہو۔ مولانا تو اہل ہیں اگر کسی نا اہل کو تمام یا اکثر اہل اسلام قبول کرلیں گے تو مجھے وہ سب سے زیادہ اطاعت گذار و فرمانبردار پائیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ تحریک دیانتاً میں اپنی سمت سے جاری کرنا نہیں چاہتا نہ کسی کو منتخب کر کے اس کے اعمال کا اپنے اوپر بار لینا چاہتا ہوں مسلمانوں کی جماعت کا تابع ہوں۔ اس سے زائد مجھے اس تحریک سے تعرض نہیں ہے"[۲۷]

یہ خط جیسا کچھ بھی ہے ظاہر ہے۔ اس خط پر مولانا آزاد اپنی امامت کی بنیاد کھڑی نہیں کر سکتے تھے اس لیے انھوں نے ۲۰ ستمبر ۱۹۲۰ء کو مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کے نام یہ خط بھیجا:[۲۸]

مولوی عبدالباری کا خط دیکھا

یارِ ما ایں دارد و آں نیز ہم

سردست اس قصے کو تہہ کیجیے اور کام کیے جائیے پنجاب سندھ و بنگال میں تنظیم قریب قریب مکمل ہے"

اب یہ بتانا مشکل ہے کہ اپنی اس کوشش میں ناکامی کے بعد مولانا آزاد نے اس سلسلے میں کچھ اور کیا یا نہیں۔ بظاہر امامت کا مسئلہ ندرطاق نسیاں ہو کر رہ گیا۔ ویسے ان کے دو سوانح نگاروں کا یہ بیان ہے کہ ۱۹۲۱ء میں علما نے انھیں باقاعدہ "امام الہند" کی حیثیت سے منتخب کر لیا تھا۔

اے۔ بی۔ راجپوت اپنی کتاب "مولانا ابوالکلام آزاد" میں لکھتے ہیں:

"لاہور میں ہزاروں علما کا اجتماع ہوا اور سب نے باتفاق رائے مولانا آزاد کو امام الہند منتخب کیا۔ یہ ایک ایسا اعزاز تھا جو ان سے پہلے ہندوستان میں کسی شخص کو نصیب نہیں ہوا تھا' مولانا آزاد اس اعزاز کو قبول نہیں کر رہے تھے لیکن علمائے لکھنؤ اور علمائے دیوبند کے اصرار پر انھیں راضی ہونا ہی پڑا"[۲۹]

دوسرے سوانح نگار عبداللہ بٹ نے اپنی مرتب کردہ انگریزی کتاب "ابوالکلام آزاد" میں شامل کیے ہوئے اپنے ایک مضمون "مولانا ابوالکلام آزاد" میں یہ بیان کیا ہے کہ جمعیت علمائے ہند کے لاہور سیشن ۱۹۲۱ء میں مولانا آزاد کو باقاعدہ امام الہند منتخب کیا گیا تھا"[۳۰]

یہ دونوں بیانات غلط فہمی پر مبنی معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اگرچہ مولانا آزاد کو عام طور سے امام الہند کہا جاتا تھا لیکن درحقیقت علما کی اس وقت کی واحد سیاسی جماعت جمعیت علمائے ہند کے دفتری کاغذات سے اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ اس عہدے پر ان کا یا کسی دوسرے شخص کا کبھی بھی انتخاب ہوا ہو۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ جمعیت کے لاہور سیشن میں اس قسم کی ایک تجویز پر غور ضرور ہوا تھا کہ کسی ایک عالم کو "امیر الہند" مقرر کیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک ذیلی کمیٹی بھی بنائی گئی تھی۔ تاکہ وہ مسئلے کے مالہ و ماعلیہ پر اچھی طرح غور کر کے جمعیت کے آئندہ اجلاس پر اپنی رپورٹ پیش کرے۔[۳۱] ذیلی کمیٹی نے اپنی رپورٹ اگلے سیشن میں پیش ضرور کی لیکن اتفاق سے اس وقت کورم پورا نہ تھا اس لیے رپورٹ پر بحث نہ ہو سکی۔[۳۲] جمعیت علما کے بارہویں اجلاس (۱۹۳۵ء) میں اس مسئلے نے پھر سر اُبھارا لیکن اس وقت بھی بعض وجوہ سے اس پر بحث و مباحثہ کو ملتوی کر دیا گیا۔[۳۳] کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کے مذکورہ بالا دونوں



مولانا آزاد کا تاریخی شعور

(۱)

تاریخی شعور "وجدانِ وقت" کے سایے میں پرورش پاتا ہے، اسی سے تاریخی ذہن بنتا ہے اور اسی سے تاریخی تصور کی آبیاری ہوتی ہے . . . Siegfried Kracauer نے His-tory and the Concept of Time میں بڑی دیدہ وری سے احساسِ وقت کی اہمیت پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے انسانی شعور بیدار ہو جاتا ہے اور تبدیلی کا جو عمل کائنات ہستی میں ظہور پذیر ہو رہا ہے، اس کا جائزہ صحیح پس منظر میں لیا جا سکتا ہے۔ مولانا آزاد کا "احساسِ زمان" بے حد نازک لیکن بے پناہ تیز تھا۔ اس نے ماضی کو سمجھنے کی ایسی بصیرت ان کو عطا کی کہ ان کی تصنیف کا ہر صفحہ تاریخ و ادب کا ایک شاہکار بن گیا۔

پنڈت نہرو نے اپنی احمد نگر جیل کی ڈائری میں مولانا کی پابندیِ اوقات کا متعدد جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے کہ جب مولانا اپنے کمرے سے نکل کر کھانے کے کمرے کی طرف ہلکے ہلکے قدم اٹھاتے ہوئے چلتے ہیں تو ٹھیک ۳۰ سیکنڈ اس وقت میں باقی ہوتے ہیں جو انھوں نے کھانے کے لیے مقرر کیا ہے ——— وقت کا یہ شدید احساس اور زندگی کو منٹوں اور سیکنڈوں سے ناپنے کا یہ انداز، ان کی شخصیت کو سمجھنے . . . اور ان کے تاریخی شعور کا جائزہ لینے میں چراغِ راہ کا کام دیتا ہے۔

وقت کے متعلق مولانا آزاد کے نظریات میں بڑی گہرائی تھی۔ لکھتے ہیں۔

"عرب کے فلسفی ابوالعلاء معری نے زمانے کا پورا پھیلاؤ تین دنوں کے اندر سمیٹ دیا تھا۔ کل جو گذر چکا، آج جو گذر رہا ہے، کل جو آنے والا ہے ——— لیکن تین زمانوں کی تقسیم میں نقص یہ تھا کہ جسے ہم "حال" کہتے ہیں، وہ فی الحقیقت ہے کہاں؟ یہاں وقت کا جو حساس بھی ہمیں میسّر ہے، وہ یا تو "ماضی" کی نوعیت رکھتا ہے یا "مستقبل" کی۔ اور ان ہی دونوں زمانوں کا ایک اضافی تسلسل ہے جسے ہم "حال" کے نام سے پکارنے لگتے ہیں ——— ہم اس کا پیچھا کرتے ہیں لیکن ادھر ہم نے پیچھا کرنے کا خیال کیا، ادھر اس نے اپنی نوعیت بدل دی۔ اب یا تو ہمارے سامنے "ماضی" ہے جو جا چکا، یا "مستقبل" ہے جو ابھی آیا ہی نہیں۔"

(غبارِ خاطر۔ ص ۲۴۸)

تسلسلِ وقت کے اس احساس میں بڑی نفسیاتی حقیقتیں مضمر ہیں۔ اس سے نہ صرف اپنی ہی زندگی کا رُخ متعین ہوتا ہے، بلکہ ماضی کو سمجھنے کے لیے پیمانے بھی سامنے آجاتے ہیں۔ فکر کو ذرا اور وسعت دی جائے تو نسلِ انسانی کی وحدت کے تصور کی جڑیں بھی یہیں ملیں گی۔ ۲۴۔ مارچ ۱۹۵۱ء یونیسکو کے ایک جلسے میں، جو دہلی میں منعقد ہوا تھا، انھوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"تاریخ کی غلط تعلیم نے انسان کو تقسیم کر دیا ہے۔ ہماری موجودہ تاریخی کتابوں میں بتایا جاتا ہے کہ

خلیق احمد نظامی
نظامی وِلا، سرسید روڈ۔ علی گڑھ، ۲۰۲۰۰۱

انسان مختلف نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر ان اقوام کی داستان میں باہمی تصادم پر زور ہوتا ہے۔ اور مختلف گروہوں میں نفرت اور منافرت کو پیش کیا جاتا ہے۔ ناگزیر ہے کہ اس طرح جو تاریخ پڑھائی جائے گی اس سے ذہنی تنگی اور تصادم پیدا ہوگا، مطمحِ نظر محدود ہو جائے گا اور بچے کے ذہن میں علیحدگی کا احساس پرورش پانے لگے گا۔"

اس سلسلے میں اپنے افکار کی مزید وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ جغرافیائی تصورات جو جغرافیہ کی کتابیں پیدا کرتی ہیں، وہ بھی ذہن میں تنگی اور عصبیت کے جذبے کو تقویت پہنچاتی ہیں۔

مولانا آزاد انسانی حدبندیوں کے قائل نہیں تھے۔ وہ بنی نوعِ انسان کی جہد و سعی، اور عروج و زوال کی داستان کو جغرافیائی، نسلی اور لسانی خانوں میں بٹا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ گاندھی جی کی ان کی نظر میں جو عزت اور بڑائی تھی اس کا حقیقی سبب بھی یہ تھا کہ وہ انسانوں کی وضع کی ہوئی مصنوعی دیواروں کو منہدم کرنا چاہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"تاریخِ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حدبندیاں قائم کی ہیں جیسے جغرافیائی حد بندی ——— قومی حد بندی ——— لسانی حد بندی ——— یہ تمام حدبندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں۔ لیکن جب تک یہ تعمیری دائرے میں رہتی ہیں تو ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کر لیتی ہیں ——— تو وہی مقاصد

نہیں کیا ہے۔

۱۶۔ عبدالرزاق ملیح آبادی "ذکرِ آزاد" کلکتہ، ۱۹۶۰ء، ص ۲۵۔

۱۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۲۴۔

۱۸۔ "نقشِ آزاد" مرتبہ غلام رسول مہر، لاہور، دوسرا ایڈیشن، ۱۹۵۶ء صفحات ۳۴۳۔۳۴۵۔ (اس خط پر مولانا غلام رسول مہر کی طرف سے ص ۳۴۵ پر حسب ذیل نوٹ بھی ہے: "یہ تحریر ۱۹۲۱ء کی ہے، یہ میرے نام نہ تھی اور نہ میرے حوالے ہوئی تھی لیکن اس کا مسودہ حسن اتفاق سے مجھے اسی زمانے میں مل گیا تھا، اسے بدیں وجہ شائع کیا جاتا ہے کہ مولانا بیعت امامت کے وقت جو عہد لیتے تھے اس کی کیفیت واضح ہو جائے۔ خود میں نے مولانا سے بیعت ۱۹۲۳ء میں کی تھی۔")

۱۹۔ "تبرکاتِ آزاد" مرتبہ غلام رسول مہر، دہلی ۱۹۶۳ء، ص ۳۸۔

۲۰۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۹۔

۲۱۔ مثال کے طور پر ملاحظہ ہو مولانا اشرف علی تھانوی کی اردو کتاب "معاملات المسلمین فی مجادلات غیر المسلمین" سب سے پہلے یہ رسالہ النور، تھانہ بھون (جلد ۱، نمبر ۱۱، ۱۳۴۹ھ مطابق ۱۹۳۰ء) میں شائع ہوا۔ بعد میں اسے مفتی محمد شفیع نے افادات اشرفیہ در مسائل سیاسیہ (دوسرا ایڈیشن، دیوبند، ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۹۴۵ء) کے نام سے شائع کیا۔ مولانا آزاد نے جس قسم کے فتووں کی طرف اشارہ کیا ہے ان کے لیے ملاحظہ ہو افادات اشرفیہ کے صفحات ۲۱ یا ۳۴۔

۲۲۔ ابوالکلام آزاد، ترجمان القرآن، لاہور، ۱۹۳۶ء، جلد دوم، صفحات ۹۵۔۹۶۔

۲۳۔ الہلال، ۱/۱۳، ۹ اکتوبر ۱۹۱۲ء۔ ص ۶۔

۲۴۔ مولانا آزاد کا خطبہ صدارت، بنگال خلافت کانفرنس، ۱۹۲۰ء... مشمولہ خطباتِ آزاد، دہلی ۱۹۵۹ء ص۔ ۹۹۔ ۱۰۲۔

۲۵۔ ایضاً۔

۲۶۔ ملیح آبادی "ذکرِ آزاد"، ص۔ ۳۶۔

۲۷۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۷

۲۸۔ ایضاً۔ ص۔ ۳۸

۲۹۔ اے۔ بی۔ راجپوت "مولانا ابوالکلام آزاد" لاہور، ۱۹۴۶، ص ۶۹۔

۳۰۔ عبداللہ بٹ (مرتب)، ابوالکلام آزادؔ، لاہور ۱۹۴۳ء، ص ۲۱۶۔

۳۱۔ مولانا محمد میاں، "جمعیت العلما کیا ہے؟ جمعیت علمائے ہند کی ۲۶ سالہ تجاویز" دہلی، جلد دوم، ص ۴۵۔

۳۲۔ ایضاً۔ ص ۴۷۔

۳۳۔ ایضاً۔ ص ۲۱۵۔

پاتے تھے۔ اس احساس اجنبیت کی جڑیں ان کے تاریخی شعور میں دور تک چلی گئی تھیں۔ لکھتے ہیں:

"فکری موثرات کے جتنے بھی احوال و ظروف Environments ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک ایک کو سامنے لاتا ہوں اور ان میں اپنے آپ کو ڈھونڈھتا ہوں، مگر مجھے اپنا سراغ کہیں نہیں ملتا۔"

(غبارِ خاطر، ص ۹۵)

یہ کیفیت بہت پہلے ان میں پیدا ہو گئی تھی۔ مسئلۂ خلافت اور جزیرۂ عرب میں لکھتے ہیں:

"افسوس! تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو، میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمھارے اس پورے ملک میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔"

وقت کے ساتھ ساتھ یہ احساس شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ بالآخر اس کی شدت نے ان کو اس منزل پر پہنچا دیا کہ وہ اپنی ذات کو ایک Ana-chronism ۔ غلط اندیشی وقت کا نمونہ سمجھنے لگے، 'ایک ثمر پیش رس کی طرح' جو وقت سے پہلے نمودار ہو گیا ہو:

"یہاں صرف موسم کے درخت ہی نہیں اُگتے موسم کے دماغ بھی اگا کرتے ہیں ــــــ اسی طرح وقت کا ہر دماغی موسم بھی اپنا ایک خاص معنوی مزاج رکھتا ہے ــــــ کبھی کبھی ایسا بھی ہونے لگتا ہے کہ نا وقت کے پھلوں کی طرح نا وقت کی طبیعتیں ظہور میں آجاتی ہیں۔ اسے کارخانۂ نشو و نما کے کاروبار کا نقص کہیے، یا زمانے کی غلط اندیشی وقت (anchronism) لیکن بہرحال ایسا ہوتا ضرور ہے ــــــ میرا اور زمانے کا باہمی معاملہ بھی شاید کچھ ایسی ہی نوعیت کا ہوا۔"

(غبارِ خاطر، ص ۹۱)

ان کے تاریخی شعور نے ان پر یہ کیفیت طاری کر دی تھی کہ وہ بار بار کہتے تھے کہ میں اس محل کا آدمی نہ تھا، لیکن اس دور کے سپرد کر دیا گیا۔ اس جملے کے پیچھے جو فکر کارفرما ہے وہ تاریخی احساس اور اپنے کمالات کے سامنے شرمندگی سے پیدا ہوئی تھی۔

(۳)

مولانا کے نزدیک تاریخ واقعات کی کھتونی تھی۔ وہ اس میں فکرِ انسانی کے ارتقاء کی داستان اور تہذیبِ انسانی کے نشو و نما کے نقوش تلاش کرتے تھے، اور اس کے تسلسل کو بامعنی سمجھتے تھے۔ جب کسی رسم یا رجحان کا تجزیہ کرتے تو تاریخی تسلسل کی کڑیاں ان کے ذہن میں ابھرنے لگتی تھیں۔ غبارِ خاطر میں لکھتے ہیں:

"انسان اپنی ساری باتوں میں حالات کی مخلوق اور گرد و پیش کے موثرات کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ موثرات اکثر صورتوں میں آشکارا ہوتے ہیں اور سطح پر سے دیکھ لیے جاسکتے ہیں۔ بعض صورتوں میں مخفی ہوتے ہیں اور تہ میں اتر کر انھیں ڈھونڈھنا پڑتا ہے۔ تاہم سراغ ہر حال میں مل جاتا ہے۔ نسل، خاندان، صحبت، تعلیم و تربیت ان موثرات کے عنصری سرچشمے ہیں۔" (غبارِ خاطر، ص ۹۳)

مولانا کو قدیم تہذیبوں کے مطالعے سے خاص دلچسپی تھی۔ ان کے امتیازی کارناموں پر غور کرتے تھے۔ اور ترقی اور تنزل دونوں کے اسباب پر ان کی نظر رہتی تھی۔ سنا ہے کہ عصرِ حاضر کا سب سے ممتاز اور دیدہ ور مورخ پروفیسر ٹائن بی (Toynbee) جس کی Study of History (دس جلدوں میں) تہذیبِ انسانی پر معرکۃ الآرا تصنیف سمجھی جاتی ہے، جب مولانا آزاد سے ملا تو ان کی وسعت معلومات اور قوتِ اخذ و تجزیہ سے حیرت میں رہ گیا۔

۱۳ر دسمبر ۱۹۵۱ء کو مشرق و مغرب میں تصورِ انسان پر ایک سمینار کا افتتاح کرتے ہوئے مولانا نے انسان کے ارتقا کی داستان ۶ ہزار سال سے شروع کی اور حیرت ناک تیز نگاہی کے ساتھ مختلف منزلوں کا جائزہ لیتے ہوئے جس طرح عصرِ حاضر پر پہنچے، وہ ان کے تاریخی شعور کا اعجاز ہے۔ انگریزی میں اس نوعیت کی کوشش F. J. Gould کے مضمون Man Has Climbed میں ملتی ہے۔

مولانا جب کسی تصور یا اعتقاد کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی تاریخی فکر ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ خدا کی ہستی کا پتہ لگانے کی جستجو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"آسٹریلیا کے وحشی قبائل سے لے کر تاریخی عہد کے متمدن انسانوں تک کوئی بھی اس تصور کی اُمنگ سے خالی نہیں رہا۔ رگ وید کے زمزموں کا فکری مواد اس وقت بننا شروع ہوا تھا جب تاریخ کی صبح بھی پوری طرح طلوع نہیں ہوئی تھی اور حیتیوں Hittites اور عیلامیوں نے جب اپنے تعبدانہ تصورات کے نقش و نگار بنائے تھے، تو انسانی تمدن کی طفولیت نے ابھی ابھی آنکھیں کھولی تھیں۔ مصریوں نے ولادتِ مسیح سے ہزاروں سال پہلے اپنے خدا کو طرح طرح کے ناموں سے پکارا اور کالڈیا کے صنعت گروں نے مٹی کی پکی ہوئی اینٹوں پر حمد و ثنا کے وہ ترانے کندہ کیے جو گزری ہوئی قوموں سے انھیں ورثے میں ملے تھے۔"

(غبارِ خاطر، ۱۱۸ - ۱۱۷)

ایک جگہ گولہ بارود اور Greek Fire کا ذکر آ گیا تو لکھتے ہیں:



جوان کے سہارے چمکتے تھے، خاک میں مل جاتے ہیں۔ ____ مہاتما گاندھی کی ہستی تاریخ عالم کی ان ہی ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حدبندیوں سے بلند تر تھے۔"

تاریخ عالم کا ایک ایسا تسلسل جس میں نہ نسلی امتیازات حائل ہوں، نہ جغرافیائی حدود کو دخل ہو، مولانا کے تاریخی شعور کا بنیادی پہلو تھا۔ مذہب میں اس نظریہ کی کارفرمائی دیکھنی ہو تو ترجمان القرآن میں دیکھی جا سکتی ہے، ثقافتی اور ادبی زندگی پر اس کے اثرات کا جائزہ لینا ہو تو ان کی تقریر و تحریر کے ہزارہا صفحات اس کی جیتی جاگتی تصویر پیش کرتے نظر آئیں گے۔

(۲)

مولانا آزاد کے تاریخی شعور نے خود ان کی زندگی کو متاثر کیا تھا۔ اور وہ اپنے آپ کو ایک تاریخ ساز دور کے تاریخی عمل میں شریک محسوس کرنے لگے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں عدالت کے کٹہرے میں بیان دیتے ہوئے کہا تھا:

"تاریخ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں ____ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کی طرح کھڑے کیے گئے، ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلارنس کے فداکار حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے۔" (قول فیصل، ص۔ ۳۴)

پھر جب بغاوت کا الزام تسلیم کرتے ہیں تو حریت اور آزادی کی تاریخ نظروں میں اس طرح پھر جاتی ہے:

"مجھ پر سڈیشن کا الزام عاید کیا گیا ہے، لیکن مجھے بغاوت کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا بغاوت آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابل احترام حب الوطنی بھی ہے جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے، لیکن آج ڈی ویرا اور گریفتھ کے لیے برطانیہ عظمیٰ کون سا لقب تجویز کرتی ہے؟ اسی آئرلینڈ کے پارنل نے ایک مرتبہ کہا تھا، ہمارا کام ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔"

(قول فیصل، ص ۷۷)

... سر ھنری ایلیٹ نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی تاریخ (جو آپ ELLIOT & DOWSON'S۔ HISTORY OF INDIA, 8 VOLS کے نام سے مشہور ھے) ترتیب دینی شروع کی، اس کا مقصد جس کو اس نے بالصراحت ایک عرضداشت میں حکومت برطانیہ کے حکام اعلیٰ کو بیان کیا ھے، یہ تھا کہ ھندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت اور دشمنی پیدا کرنے کے لیے تاریخ کو استعمال کرنا چاھیے...

ان الفاظ کے پیچھے ایک تاریخی ذہن کام کر رہا تھا، جو بالآخر پکار اٹھا۔

"مسٹر مجسٹریٹ ____! یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت ناک باب ہے، جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں ... آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔"

(قول فیصل، ص۔ ۸۰)

پھر جب علماء کو میدانِ عمل میں داخل ہونے کی دعوت دی، تو تاریخ عزیمت کا ایک باب ان کے سامنے پڑھ دیا اور کہا:

"آپ حضرت سعید بن المسیب کو دیکھتے کہ حکام کے جور کے حکم سے ان کی پیٹھ پر دُرّے لگائے جا رہے ہیں مگر ان کی زبان صدق بیان اعلانِ حق میں پہلے سے زیادہ سرگرم ہو گئی ہے ____ آپ مدینے کی گلیوں میں حضرت مالک بن انس کو دیکھتے، ان کی مشکیں اس زور سے کس دی گئی ہیں کہ دونوں بازو اکھڑ گئے ہیں اور اوپر سے پیہم تازیانے کی ضربیں پڑ رہی ہیں ____ آپ امام احمد بن حنبل کو دیکھتے ____ کہ نو جلاد یکے بعد دیگرے تازیانے لگا رہے ہیں، پیٹھ زخموں سے چُور چُور ہو گئی ہے۔ تمام جسم خون سے رنگین ہو چکا ہے ____"

(خطبۂ صدارت لاہور، ص ۴۲، ۴۰)

لیکن تاریخی ذہن رکنے کا نام نہیں لیتا اور وہ امام ابوحنیفہؒ۔ امام شافعیؒ۔ امام ابن تیمیہؒ۔ مجدد الف ثانیؒ سب کے مصائب کی تصویر پیش کر دیتے ہیں۔ ____ اس تاریخی شعور نے ان میں عزیمت اور قربانی کی ایسی تڑپ پیدا کی تھی، کہ ان کے روز و شب دار و رسن کی تمنا میں گذرنے لگے تھے۔

تاریخی احساس و شعور کی اس کیفیت نے آگے چل کر ایک اور رنگ اختیار کر لیا۔ ان کو ایسا محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے عہد کے ساتھ ذہنی جذباتی کسی طرح کی مناسبت یا ہم آہنگی نہیں رکھتے۔ ایک انگریز شاعر نے اجنبیت کی اس کیفیت کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

Wandering between two worlds, One dead the other powerless to be born.

وہ ہر طرف دیکھتے تھے، اور اپنے آپ کو ایک اجنبی



الہلال کے اثرات کے ایک پہلو کا بہت کم جائزہ لیا گیا ہے، اور وہ ہے تاریخی احساس و شعور کی بیداری میں اس کا حصہ۔ اُس وقت اسلامی ممالک ایک ذہنی بحران اور سیاسی کشمکش کے دور سے گذر رہے تھے۔ اور ہندوستان میں بھی عوام کو ان مسائل کی حقیقی نوعیت کا احساس بہت کم تھا۔ مولانا نے جس طرح ان مسائل کو تاریخ کی روشنی میں پیش کیا وہ ان ہی کا حصہ تھا اور ان کے تاریخی احساس و شعور کی کارفرمائی۔

الہلال کے ابتدائی پرچوں میں جس طرح طرابلس کا ذکر کیا ہے اور تاریخی احساس و شعور کو آواز دی ہے، اس سے ہندوستان میں ان مسائل کو صحیح پس منظر میں سمجھنے اور استبداد و استعمار کی جنگ کی اصلی نوعیت سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ اقبال نے اپنی نظم "حضور رسالت مآبؐ میں" یہ لکھ کر:

"جھلکتی ہے تری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

جذبات میں ایک آگ لگا دی تھی اور حقیقتاً یہ نظم اس تمام لٹریچر پر بھاری تھی جو اس سلسلے میں ہندوستان میں وجود میں آیا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ مولانا آزاد کے مضامین ہی تھے جنھوں نے معرکۂ طرابلس کے تاریخی پس منظر کو ذہنوں میں بیدار کیا تھا۔

مولانا سید رشید رضا کے ہندوستانی دورے کی تفصیل لکھتے ہیں، تو تاریخی شعور ذہن میں ایک ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ لکھتے ہیں:

" سرزمینِ ہند ابتدا سے نوواردوں اور اجنبیوں کی سیر و سیاحت کی جولانگاہ رہی ہے۔ اس کے زرخیز موسموں اور طلائی مندروں نے بڑے بڑے کشورستانوں کو اپنی طرف کھینچا ہے اور ہمیشہ اس کے بحری اور بری دروازوں پر ملک گیر سیاحوں کی تلواریں چمکتی رہی ہیں۔ تاریخ میں ہم نے مقدونیہ کے سکندر اور چین کے سیاحوں کو یہاں دیکھا ہے اور پھر اس کے شمالی دروازوں سے فتحیاب علموں اور نیزوں کی قطاریں صدیوں تک نہیں ٹوٹیں ——— شاید سید محمد رشید رضا پہلا سیاح تھا جو عروج و اقبال کی بہار لوٹنے کے لیے نہیں بلکہ ادبار و تنزل کی خزاں پر ماتم کرنے کے لیے آیا تھا ———" (الہلال۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۴ء)

پھر تاریخی ذہن، فکر کے نئے نئے پہلو سامنے لاتا ہے اور وہ کتنے ہی سیاحوں کی روئدادِ سفر بیان کرنے لگتے ہیں۔

⑤

مولانا آزاد کے تاریخی شعور کو فلسفے سے اور ان کے فلسفیانہ افکار کو تاریخی بصیرت سے مدد ملی تھی۔ جب فکر کے ارتقاء کا مطالعہ کرتے تو بے اختیار تاریخ کی روشنی میں چلنا پڑتا، اور وہ نہایت خود اعتمادی سے اس منزل کو طے کرتے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کی ایک کتاب پر پیش لفظ لکھتے ہوئے طلسم ہستی کے متعلق یہ شعر نقل کرتے ہیں:

ماز آغاز و ز انجامِ جہاں بے خبریم
کاوّل و آخرِ ایں کہنہ کتاب افتاد است

یعنی اس پرانی کتاب کا پہلا اور آخری ورق اس طرح کھو گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی، نہ اسی کا سراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جا کر ہوگی اور کیوں کر ہوگی ——— ؟ لیکن تاریخی شعور یہاں بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور لکھتے ہیں:

" اس وقت سے لے کر جب کہ ابتدائی عہد کا انسان پہاڑوں کے غاروں سے سر نکال نکال کر سورج کو طلوع و غروب ہوتے دیکھتا تھا، آج تک جب کہ وہ علم کی تجربہ گاہوں سے سر نکال کر فطرت کے بے شمار چہرے بے نقاب دیکھ رہا ہے انسان کے فکر و عمل کی ہزاروں باتیں بدل گئیں مگر یہ معمہ معمہ ہی رہا ——— انسٹائن (Einstein) نے اپنی ایک کتاب میں سائنس کی جستجوئے حقیقت کی سرگرمیوں کو شرلاک ہومز کی سراغ رسانیوں سے تشبیہہ دی ہے ——— ذی مقراطیس Democritus کے زمانے سے لے کر جس نے چار سو سال قبل مسیح مادہ کے سالمات (Atoms) کی نقش آرائی کی تھی آج تک، جب کہ نظریۂ مقادیر عنصری Quantum Theory کی رہنمائی میں ہم سالمات کا از سرِ نو تعاقب کر رہے ہیں ——— اس ڈھائی ہزار سال کی مسافت میں ہم نے بہت سی نئی منزلوں کا سراغ پا لیا، جو اثنائے راہ میں نمودار ہوتی رہیں، لیکن حقیقت کی وہ آخری منزلِ مقصود جس کے سراغ میں علم کا مسافر نکلا تھا، آج بھی اسی طرح غیر معلوم ہے جس طرح ڈھائی ہزار برس پہلے تھی۔" (غبارِ خاطر۔ ص ۱۰۹۔ ۱۱۰)

یہاں جس طرح ان کے تاریخی شعور نے تاریخِ عالم کا احاطہ کیا ہے وہ حیرت انگیز ہے۔ اس تاریخی شعور نے بہت سے عقائد، رسوم، افکار و امیال کی حقیقت ان پر روشن کر دی تھی۔ عقیدۂ وحدت الوجود پر گفتگو کرتے ہیں تو بے اختیار پکار اٹھتے ہیں:

" دنیا میں وحدت الوجود Pantheism کے عقیدے کا سب سے قدیم سرچشمہ ہندوستان ہے غالباً یونان اور اسکندریہ میں بھی یہیں سے یہ عقیدہ پہنچا اور مذہب افلاطون جدید Neo-Platonism نے جسے غلطی سے عربوں نے افلاطون کا مذہب خیال کیا تھا، اس پر اپنی اشراقی عمارتیں استوار کیں۔" (غبارِ خاطر ص ۱۴۴)



"آتش زنی کے لیے دو طرح کی مشینیں کام میں لائی جاتی تھیں' ایک تو منجنیق کی قسم کی تھی' جو پتھروں کے پھینکنے کے لیے ایجاد ہوئی تھی' دوسری ایک طرح کا آلہ کمان کی شکل کا تھا اور توپ کی بیڑیوں کی طرح زمین میں نصب کر دیا جاتا تھا۔ اس کی مار منجنیق سے بھی زیادہ دور تک پہنچتی تھی —— منجنیق کا لفظ اسی یونانی لفظ کی تعریب ہے جس سے انگریزی کا Machine' فرانسیسی کا Mechan- اور جرمن کا Mechanicus نکلا ہے۔ یہ آلہ عربوں نے رومیوں اور ایرانیوں سے لیا تھا' لیکن دوسرا خود عربوں کی ایجاد ہے۔ چنانچہ اُسے عربی میں "مدفع" کہتے تھے۔ یعنی کہ پھینکنے والا آلہ۔ یہی "مدفع" بعد کو توپ کے لیے بولا جانے لگا"۔ (غبارِ خاطر۔ ص۔ ۵۰)

ایک موقع پر Ego کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"میں نے ابتدائی سطور میں "ایغو" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ یہ وہی ایرانی Ego کی تعریب ہے جو ارسطو کے عربی مترجموں نے ابتدا ہی سے اختیار کر لی تھی اور پھر فارابی اور ابن رشد وغیرہ برابر استعمال کرتے رہے"۔ (غبارِ خاطر۔ ۸۸۔ ۱۸۷)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی معلومات کا خزانہ ایک تاریخی جو کٹے میں سجا ہوا حاضر رہتا ہے' اور جب چاہتے ہیں اس پر سے پردہ اٹھا دیتے ہیں۔

چائے کا ذکر نکل آتا ہے تو پندرہ سو برس کی چینی روایت سے داستان شروع کرتے ہیں' اور فرانس' انگلستان' ہندوستان' سیلون سب ملکوں میں اس کے رواج کی تاریخ بیان کر دیتے ہیں۔ (غبارِ خاطر ۱۵۳۔ ۱۶۴)

ساہتیہ اکادمی کا افتتاح کرتے ہیں تو لفظ "اکاڈیمی" کی تعریف بیان کر جاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ Plato کے اسکول کو اس نام سے موسوم کیا گیا تھا۔ یہ ایک قدیم یونانی ہیرو Akade-mus کے نام پر تھا۔ پھر کہتے ہیں کہ یونان میں تقریباً ۹۰۰ سال تک ان اکاڈیمیوں کی بہار رہی' پھر Justinian نے ان کا خاتمہ کیا' مشاہیر کی یادگار قایم کرنے اور باقی رکھنے کا ذکر آتا ہے تو تاریخی ذہن کتنی تصویریں پیش کر دیتا ہے:

"ہومر نے ایلیڈ لکھی' کالڈیا کے حجری کتب خانے میں وہ اینٹیں رکھی گئیں جن پر نامورانِ ملت کے مناقب و محامد کندہ تھے۔ عرب جاہلیہ نے اپنے سلسلۂ انساب کا ایک حرف ضائع ہونے نہ دیا اور ذوالحجہ اور عکاظ میں اسلاف کے مفاخر و معالی کی داستان سرائے قایم کی۔ مصریوں نے ایسے ایسے مینار بنائے جو ہزاروں برسوں کے بعد بھی اپنی تعمیراوین کی طرح محکم و استوار ہیں اور پھر ان کے اندر اپنے ناموروں کی لاشوں کو حنوط (ممی) کر کے محفوظ کر دیا۔ ہندوستان نے مہابھارت کے معرکے کو قومی روایتوں میں داخل کر دیا۔ اور والمیک کی سحر طرازیوں نے نسلی مفاخر کی روح کو پژمردگی سے بچایا۔ اقوامِ قدیمہ کے یہ تمام اعمال صرف اسی حقیقت کے لیے تھے کہ اسلاف و مشاہیر کی یاد زندہ و قائم رکھی جائے"۔ (لمعات صداقت۔ ص۔ ۷)

حج پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لیکن اب سے تیرہ سو برس پہلے' جب دنیا موجودہ زمانے کے تمام قرب و اجتماع سے محروم تھی' بحر احمر کے کنارے' ریگستان عرب کے وسط میں حجاز کے چٹیل اور بے زراعت وادی کے اندر ایک صدائے اجتماع بلند ہوئی' اور نسلِ انسانی کے منتشر افراد کا ایک نیا گھرانہ آباد کیا گیا۔ انسانی اجتماع و یگانگت کی یہ پکار صرف اتنا ہی نہیں چاہتی تھی کہ ملکوں کی سرحدیں اور جغرافیہ کی حدیں ایک دوسرے سے قریب ہو جائیں بلکہ اس کا مقصد نسلِ انسانی کے بکھرے ہوئے دلوں اور برگشتہ روحوں کو ایک دوسرے سے جوڑ دینا تھا"۔

(حقیقتہ الحج۔ ص۔ ۱۰)

تاریخی شعور مولانا آزاد کی ہر تحریر اور تقریر سے ٹپکتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اسی سے ان کے یہاں عالمانہ وقار اور بلندیِ فکر کا ماحول پیدا ہوا ہے۔

(۴)

مولانا آزاد نے خالصاً تاریخی موضوع کو عنوانِ سخن کم بنایا ہے لیکن ان کی ہر تحریر ان کی تاریخی دیدہ وری اور بصیرت افروز قوتِ تجزیہ کی آئینہ دار ہے تاریخ ان کے لیے کوئی علیحدہ موضوع نہیں تھا' بلکہ ان کی تحریر کی روح اور ان کی فکر کی اساس تھا۔ ترجمان القرآن مولانا کا علمی شاہکار ہے۔ اس میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مذاہب عالم کی تاریخ ان کی نظروں کے سامنے روزِ روشن کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ جس تصور کی تحقیق منظور ہوئی' اپنے ذہن کے کسی گوشے کو سامنے لے آتے ہیں۔ عقائد کی تشریح میں انھوں نے اپنے تاریخی شعور سے پورا کام لیا ہے۔ اسی طرح ان کے اکثر مضامین جو اعمال و عقائد سے متعلق الہلال میں چھپے ہیں' ان میں بھی تاریخی شعور کی ایسی ہی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مسئلۂ خلافت اور جزیرۂ عرب میں انھوں نے تاریخ اسلام کے بنیادی مسائل پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے اور اختلافات کی نوعیت اور اجتماعی اور انفرادی زندگی پر اس کے اثرات کی نشاندہی کی ہے۔ غبارِ خاطر کا وہ خط جس میں صلیبی جنگوں کی سرگزشت اور روایات کے تبادلے پر گفتگو کی ہے۔ ان کی تاریخی بصیرت کا شاہد ہے۔ (ص۔ ۱۳۰)

بھی تھا۔

تاریخِ ہند کے سلسلے میں مولانا کی دلچسپی کو سمجھنے کے لیے ایک ذاتی واقعے کی طرف اشارہ شاید نامناسب نہ ہو۔ سر ہنری ایلیٹ نے ۱۸۵۷ء کے بعد اپنی تاریخ (جواب Elliot & Dowson's History of India, 8 Vols کے نام سے مشہور ہے) ترتیب دینی شروع کی۔ اس کا مقصد، جس کو اس نے بالصراحت ایک عرضداشت میں حکومتِ برطانیہ کے حکامِ اعلیٰ کو بیان کیا ہے' یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفرت اور دشمنی پیدا کرنے کے لیے ان کی تاریخ کو استعمال کرنا چاہیے اس طرح آزادی کی تمام تحریکوں پر پانی پھر جائے گا۔ اور فرقہ واریت کا زہر ساری تحریکوں کو مضمحل اور بے جان کردے گا۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس نے محمد بن قاسم سے لے کر آخری مغل بادشاہوں تک کی سیاسی تاریخ چند عربی لیکن بیشتر فارسی مآخذ کے ترجموں کی صورت میں پیش کی اور اس کا خاص اہتمام کیا کہ اقتباسات جو ترجمہ کیے جائیں ایسے ہوں جن میں جنگ و جدال، دشمنی اور منافرت کا ذکر ہو۔ اس نے اپنی تاریخ کا سارا مواد سیاسی تاریخوں سے حاصل کیا اور ہندی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کو جنگ و جدل کی ایک ہیبت ناک داستان کا رنگ دے دیا۔ یہ تاریخ جو آٹھ جلدوں میں ہے، گذشتہ سو سال میں ہماری ساری نصابی کتابوں کی اساس بن گئی اور فرقہ واریت کا زہر قومی زندگی کی رگ رگ میں سرایت کر گیا۔

آزادی کے بعد اس پورے نظریے کی اصلاح کی ضرورت تھی۔ اور ان مآخذ کی نشاندہی بھی ضروری تھی جن کو ایلیٹ نے استعمال نہیں کیا تھا لیکن جن میں سماجی، ادبی، مذہبی زندگی کی بیش بہا تفصیلات موجود ہیں۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر میں نے ایلیٹ کی ہر جلد پر ایک جلد تیار کرنے کا منصوبہ بنایا اور ایک جلد کو شائع بھی کردیا۔ اس میں غیر سیاسی مآخذ کی نشاندہی کی اور تمام اس لٹریچر کو سامنے لایا گیا جس کے بغیر ہندی قرونِ وسطیٰ کی تصویر مکمل نہیں ہوسکتی۔ علاوہ ازیں یہ بھی بتایا کہ شاہی خاندانوں کی تاریخ تک اپنے نظریۂ تاریخ کو محدود کردینا صحیح نہیں۔ اگر اس دور کے پورے لٹریچر پر نظر ہو تو اتحاد و یگانگت اتفاق و یک جہتی کے کتنے پہلو سامنے آجائیں۔ اور نقطۂ نظر کے فرق کا بھی اندازہ ہو۔ میں نے اپنا ضمیمہ مولانا کی خدمت میں بھیجا تو وہ پڑھ کر بہت خوش ہوئے۔ محمد اجمل خاں صاحب نے ۱۰ اگست ۱۹۵۳ء کو لکھا:

"ایلیٹ کا نیا ایڈیشن انھیں (مولانا کو) مل گیا۔ اُسے دیکھ کر مولانا کو خوشی ہوئی کہ ایک ضروری کام انجام پاگیا۔"

پھر مولانا کے سیکریٹری مسٹر کے کرپلانی نے لکھا:

"Maulana Sahib ——— is very glad that you have done an excellent job."

جب مولانا سے ملاقات ہوئی تو اندازہ ہوا کہ وہ ایسے کام کے لیے کس قدر مضطرب تھے اور تاریخی فکر کی تجدید کے لیے اس کو کتنا ضروری سمجھتے تھے۔ دورانِ گفتگو میں نے عرض کیا کہ التتمش کی بڑائی مورخوں نے اس کی کامیاب جنگوں میں دیکھی تھی' جن کا بازیچہ اس نے سارے شمالی ہندوستان کو بنا دیا تھا' لیکن حضرت شیخ نظام الدین اولیاؒ کی نظر میں التتمش کا سب سے بڑا کارنامہ جس پر اس کی مغفرت ہوئی' وہ حوضِ شمسی کی تعمیر تھا جس سے ساری دہلی کو پانی ملا ——— مولانا کی مسکراہٹ کے وہ نقوش اب تک نگاہوں میں ہیں جو یہ جملہ سن کر ان کے چہرے پر ایک دم سے دوڑ گئی تھی۔ انھوں نے بالخصوص تین چیزوں کی طرف اشارہ کیا اور اس سمت میں قدم اٹھ جانے پر گہری مسرت کا اظہار کیا ——— (۱) ایلیٹ کے نقطۂ نظر کی تصحیح (۲) اس عہد کے پورے لٹریچر سے استفادے کی اہمیت پر زور (۳) ہندی قرونِ وسطیٰ کی تاریخ کو شاہی خاندانوں کے محدود پس منظر سے نکال کر وسیع تر پس منظر میں دیکھنے کی ضرورت۔

(۷)

قرونِ وسطیٰ کے بعض مورخین کے متعلق مولانا کے خیالات کی طرف اشارہ شاید ان کے تاریخی شعور کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہو۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا یونیورسٹی تشریف لائے تو شعبۂ تاریخ کا بھی معائنہ کیا اور پھر بیٹھ کر گفتگو کرنے لگے۔ اس موقعے پر دو مصنفین کے متعلق ان کی رائے ذہن میں رہ گئی۔ ضیاالدین برنی کے متعلق فرمایا کہ اس میں "تطویل بیان" بہت ہے جوہر آفتابچی کے تذکرۃ الواقعات کے متعلق فرمایا کہ اس دور میں جس طرح کی فارسی میں گفتگو ہوتی تھی اس کا بہترین نمونہ ہے۔ مولانا نے البیرونی پر جو مقالہ لکھا ہے' وہ سامنے آچکا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تاریخ کے کتنے گوشے ان کے ذہن میں تھے اور وہ البیرونی کو اس کی تحقیقی صلاحیتوں اور تجسس کی بنا پر کیا درجہ دیتے تھے' لکھتے ہیں:

"البیرونی کی زندگی کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اس کا بے لاگ علمی یعنی سائنٹیفک دماغ ہے۔ اس کی یہ خصوصیت ہر جگہ اس کے ساتھ آتی ہے۔ کوئی دینی عقیدہ' کوئی قومی روایت' کوئی تاریخی مسلمہ' اس کی اس خصوصیت کو متاثر نہیں کرسکتا' اس کی عقلیت بے لچک' بے داغ اور ناممکن التسخیر ہے۔"

(ص۔ ۱۰۵۔ ۱۰۶)

پھر سلطان محمود سے اس کے تعلقات پر گفتگو کرتے ہوئے

پھر ایک جگہ لکھتے ہیں :

"ہندوستان کے اوپنشدوں نے ذات مطلق کو ذات متصف میں اتارتے ہوئے جن تنزلات کا نقشہ کھینچا ہے، مسلمان صوفیوں نے اس کی تعبیر "احدیت" اور "واحدیت" کے مراتب میں دیکھی"

(غبارِ خاطر، ص ۲۴۰)

مولانا نے نشوو ارتقاء (Evolution) تخلیقی اصل (Creative Principle) وغیرہ پر جو گفتگو کی ہے اس میں تاریخی احساس و شعور نے کہیں ان کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ جب کسی ایسے سیاسی یا سماجی نظریے سے بحث کرتے ہیں جس کی جڑیں تاریخ میں ہیں تو ان کا ذہن اس کے تجزیے اور تنقید میں غیر معمولی بصیرت کا ثبوت دیتا ہے۔ ۲۹ اگست ۱۹۴۹ء کو کلکتہ میں آرٹس کانفرنس کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ صنعتی انقلاب اور سرمایہ دارانہ نظام کے ابھرنے کا ایک افسوسناک نتیجہ یہ ہوا کہ ہنر (art) اور دستکاری (craft) کا رشتہ ٹوٹ گیا اور ماہرینِ فنون (artists) نے دستکاروں (Craftsmen) کی طرف محض دستکار (artisans) کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔ پٹنہ یونیورسٹی میں کانوکیشن ایڈریس دیتے ہوئے انھوں نے یورپین نیشنلزم کی مذمت کی اور کہا کہ دنیا اس محدود نیشنلزم کے تصورات سے پریشان ہو چکی ہے، اور چھوٹی چھوٹی Natio-nalities کی جگہ اب Super nation-alism کی ضرورت ہے۔ مولانا کے ان خیالات کے پیچھے یورپ کی پوری تاریخ بولتی ہے۔

(۴)

تاریخ ہندوستان سے متعلق مولانا آزاد کے خیالات میں بڑی وسعت اور گہرائی تھی۔ وہ تاریخ ہند میں ایک تسلسل کا شدید احساس رکھتے تھے اور واقعات کو اسی تاریخی پس منظر میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے کہتے تھے کہ موہنجوداڑو کی تہذیب کا جنوبی ہندوستان اور مشرق وسطیٰ کی تہذیب سے موازنہ ضروری ہے Egyptology اور Syriology کو ہندوستان کی قدیم تاریخ کے سمجھنے کے لیے پوری طرح استعمال کرنا چاہیے (تقریر انڈین ہسٹاریکل کمیشن ۲۸ دسمبر ۱۹۴۸ء)۔ وہ عربی ماخذ سے بھی استفادے پر زور دیتے تھے اور محض فارسی تاریخی کتابوں تک تاریخی زاویۂ نگاہ کو محدود رکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ بنگال سے وسط ایشیا تک جس طرح ہنڈیاں جاتی تھیں اس کا تحقیقی جائزہ ضروری ہے۔

مولانا نے ہندوستان کی قدیم تہذیب کا جگہ جگہ قدیم یونانی تہذیب سے مقابلہ کیا ہے۔ موسیقی کی تاریخ سامنے آتی ہے تو لکھتے ہیں :

"یہ ماننا پڑتا ہے کہ قدیم یونانی موسیقی کی طرح عربی موسیقی بھی نسبتاً سادہ اور دقتِ تالیف کی کاوشوں سے خالی ہے۔ ہندوستان نے اس معاملے کو جن گہرائیوں تک پہنچا دیا، حق یہ ہے کہ قدیم تمدنوں میں سے کوئی تمدن بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا"

(غبارِ خاطر، ص ۲۶۳)

انھوں نے اس بات پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ البیرونی نے کتاب الہند میں ہندوستان کی موسیقی کا ذکر نہیں کیا۔

ان عوامل و اثرات کا ذکر کرتے ہوئے جنھوں نے ہندی موسیقی کو فروغ دیا، امیر خسرو کو اس طرح خراجِ تحسین ادا کرتے ہیں :

"امیر خسرو جیسے مجتہدِ فن کا پیدا ہونا اس حقیقتِ حال کا واضح ثبوت ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اب ہندوستانی موسیقی، ہندوستانی مسلمانوں کی موسیقی بن چکی تھی۔ اور فارسی موسیقی غیر ملکی موسیقی سمجھی جانے لگی تھی۔ ساز گری، ایمن اور خیال تو امیر خسرو کی ایسی مجتہدانہ اختراعات ہیں کہ جب تک ہندوستانیوں کی آواز میں رس اور ستار کے زخموں میں نغمہ ہے، دنیا ان کا نام نہیں بھول سکتی"

(غبارِ خاطر، ص ۲۶۸)

پھر ہندوستان میں موسیقی کے نشوونما پر گفتگو کرتے ہوئے کتنے ہی تاریخی واقعات بیان کر جاتے ہیں اور موسیقی سے دلچسپی رکھنے والوں کی تفصیل بیان کر دیتے ہیں۔ ۲۸ جنوری ۱۹۵۳ء کو کلا اکاڈمی کا افتتاح کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا کہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد فنون لطیفہ کی سرپرستی حکومت کی طرف سے بالکل بند ہو گئی تھی۔ ان کا تاریخی شعور ان سے مطالبہ کرتا تھا کہ نئے ہندوستان میں وہ سرپرستی واپس آنی چاہیے۔

مولانا کو ہندوستان کی اٹھارویں اور انیسویں صدی کی تاریخ سے بہت گہری دلچسپی تھی۔ پنڈت نہرو کا بیان ہے کہ وہ ان صدیوں پر خاصا لٹریچر احمد نگر جیل میں پڑھتے رہتے تھے۔ خود انھوں نے اپنی Discovery of India کا مسودہ مولانا آزاد کو سنایا تھا اور ان کے مشوروں کو خود اپنے نظریات سے ہم آہنگ پایا تھا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کی تاریخ میں مولانا کو جو دلچسپی تھی اس کا سبب واضح ہے۔ لیکن انھوں نے انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کی میٹنگ منعقدہ ۲۵ جنوری ۱۹۵۵ء میں صاف صاف کہا تھا کہ اس تاریخ کو لکھنے میں معروضیت کو رہبر بنانا چاہیے اور واقعات کی تحقیق میں کسی تعصب کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔ کہتے تھے کہ ۱۸۵۷ء کا "غدر" جس طرح برطانوی اقتدار کے لیے اچانک اور تعجب خیز حادثہ نہ تھا، اسی طرح بہادر شاہ کے لیے



کے سامنے آگئی ـــــــ (غبارِ خاطر، ص ۲۵، ۲۶) ملک احمد سے لے کر جنرل ویلزلی تک اس قلعے کی تاریخ تصور میں روشن ہوگئی اور لکھا :

" جب جنرل ویلزلی نے اس کا معائنہ کیا تھا تو اگرچہ تین سو برس کے انقلاب سہہ چکا تھا۔ پھر بھی اس کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔ اس نے اپنے مراسلے میں لکھا تھا کہ دکن کے تمام قلعوں میں صرف ویلور کا قلعہ ایسا ہے جسے مضبوطی کے لحاظ سے اس پر ترجیح دی جاسکتی ہے ـــــ یہی احمد نگر کا قلعہ ہے جس کی سنگی دیواروں پر برہان نظام شاہ کی بہن چاند بی بی نے اپنے عزم و شجاعت کی یادگار زمانہ داستانیں کندہ کی تھیں اور جنھیں تاریخ نے پتھر کی سلوں سے اتار کر اپنے اوراق و دفاتر میں محفوظ کرلیا ہے" ـــــ (غبارِ خاطر، ص ۲۰)

جب ذہن اور آگے بڑھتا ہے تو احمد نگر کے سارے معرکے جن میں عبدالرحیم خانخاناں بھی شریک رہا تھا، سامنے آجاتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں :

" احمد نگر کے نام نے حافظے کے کتنے ہی نقوش یکایک تازہ کردیے۔ ریل تیزی کے ساتھ دوڑی جا رہی تھی، میدان کے بعد میدان گذرتے جاتے تھے، ایک منظر پر نظر جمنے نہیں پاتی تھی کہ دوسرا منظر سامنے آجاتا تھا، اور ایسا ہی ماجرا میرے دماغ کے اندر بھی گذر رہا تھا۔ احمد نگر اپنی چھ سو برس کی داستانِ کہن لیے ورق پر ورق الٹتا جاتا۔ ایک صفحے پر ابھی نظر جمنے نہ پاتی کہ دوسرا سامنے آجاتا۔"

یہاں تاریخی شعور جس طرح زندگی کے شعور اور حالات گردو پیش کے احساس میں تحلیل نظر آتا ہے وہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔ قید خانے میں لے جایا جارہا ہے، قیدو محن کی زندگی گھڑی انتظار کررہی ہے، لیکن تاریخی تجسس کی نگاہیں اس خندق کی تلاش کررہی ہیں جس کا نقشہ ابوالفضل نے کھینچا ہے۔ جب جیل کا سپرنٹنڈنٹ میجر سینڈک سامنے آیا تو تاریخی ذہن نے چاند بی بی کے زمانے کے قلعہ دار چیتہ خاں حبشی کی شکل پیش کردی اور اس کا نام چیتہ خاں رکھ دیا۔ (غبارِ خاطر، ص ۵۶)۔ پھر احمد نگر کی آب ہوا کے ساتھ فیضی یاد آجاتا ہے (ص ۱۷۰)۔ پھر اورنگ زیب کی طرف ذہن چلا جاتا ہے کہ وہ برسات کا موسم اکثر احمد نگر یا پونا میں بسر کرتا تھا (ص ۱۷۱)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ احمد نگر کے نام کے ساتھ تاریخی خزانوں کے دروازے ذہن نے کھول دیے ہیں۔ اس اندرونی اور بیرونی ہم آہنگی نے ان کے تاریخی ذہن کو تیز کردیا تھا۔

جب مولانا کے ذہن میں تاریخی واقعات اور احساسات کا قافلہ چلتا تو ان کا ذوق شاعری بھی ہم عنان ہوجاتا اور شاعروں کے احساسات کی دنیا سے شعر ابھار کر پیش کرتا اور مولانا اپنے احساس جمال، تاریخی شعور اور ادبی ذوق کو ساتھ لے کر آگے بڑھتے۔ جو اشعار ذہن میں ابھرتے ان کا تاریخی پس منظر بھی نظر میں ہوتا۔ اگر اس سے متعلق کوئی تاریخی واقعہ ہوتا تو وہ بھی سامنے آجاتا۔ انھوں نے فارسی تذکروں کا مطالعہ بہت غور سے کیا تھا اور ان تذکروں کے صدہا اشعار مع سیاق و سباق ان کے حافظے میں محفوظ تھے۔ شریف خاں شیرازی، حکیم صدرائے شیرازی کے اشعار جس مناسبت اور تاریخی پس منظر میں پیش کیے ہیں وہ حیرت میں ڈال دیتا ہے

(۱۱)

مولانا آزاد کے جذباتِ حریت کا پس منظر ان کے تاریخی مطالعے میں مضمر تھا۔ انھوں نے ایران، مصر، شام وغیرہ کی سیاسی تحریکوں، ادبی رجحانات اور ثقافتی تبدیلیوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور جس طرح سامراجی قوتوں کے خلاف تحریکیں ابھری تھیں ان کا پورے تاریخی شعور کے ساتھ جائزہ لیا تھا۔ علاوہ ازیں انھوں نے اٹلی، آئرلینڈ، وغیرہ کی تحریکوں کی تاریخ بھی پڑھی تھی۔ ان کے "حزب اللہ" میں اٹلی کی Carbonari کی جھلک نظر آتی ہے۔ ان کا ذہن کبھی تاریخی تاثرات سے خالی نہیں ہوا۔ امیر عبدالقادر الجزائری کے حسرتناک انتقال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"اسلامی عروج و زوال کے ہزاروں افسانہ ہائے حسرت میں سے یہ ایک چھوٹی سی کہانی تھی جو اس طرح ختم ہوگئی۔ اپنی سرگزشت ادبار کی اس کو گویا ایک سطر سمجھیے۔ ہم نے کتنے سکندر اور نپولین پیدا کیے جن کے اعجوبہ زا کارناموں کے نشان دنیا کے چپے چپے پر نمایاں ہیں، ہماری سرزمین اقبال پر جب شجاعت و کمال کا ابر گرجتا تھا تو اس کے ہر قطرے سے سینکڑوں امیر عبدالقادر پیدا ہوتے تھے"

(الہلال۔ ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء)

جب مولانا آزاد نے اپنے زمانے کے مسلمانوں کو (جو ۱۸۳۱ء اور ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں کے حسرت ناک انجام کے بعد سیاست سے علیحدگی پر مائل تھے) جنگِ آزادی میں حصہ لینے سے گریز کرتا ہوا پایا تو ان کو سخت تکلیف ہوئی۔ اس وقت ان کے تاریخی احساس و جدان نے جس طرح کام کیا اس کا اندازہ ان سطور سے لگایا جاسکتا ہے :

" اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی ایک شرف و عظمت کا باب ہوگا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھ دوں۔ بے شک ایک باب ہوگا، مگر جانتے ہو اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا، ہندوؤں نے اس کے لیے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا، مگر مسلمان غاروں کے اندر چھپ گئے۔ انھوں نے پکارا، مگر انھوں نے اپنے منہ اور زبان پر قفل



لکھتے ہیں :

" ایک ایسے بادشاہ کی سرپرستی اُسے کیوں کر مطمئن اور خوشحال کر سکتی تھی جو ریاضیات اور ہیئت کے ایک باکمال شخص کی قدر شناسی کے لیے کوئی ذہنی استعداد نہیں رکھتا تھا اور اگر قدر شناسی کے لیے آمادہ بھی ہوتا تھا تو صرف اس لیے کہ اسے فنِ نجوم کے اوہام و خرافات کے اعتقاد سے متہم تصور کرے۔" (ص ۔ ۹۹)

اب ایسے مورخ کے متعلق بھی مولانا کی رائے سُن لیجیے جو اپنے عقائد و افکار میں بے لچک اور تعصب میں غیر معمولی طور پر سخت تھا۔ یعنی عبدالقادر بدایونی۔ مولانا کی معروضیت یہاں بھی امتیازی رنگ میں نمایاں ہوتی ہے۔ اور وہ اس کے متعلق اپنی رائے اس طرح ظاہر کرتے ہیں :

" بدایونی کا معاملہ اوروں سے الگ ہے طبقۂ عوام کا ایک فرد جس نے وقت کی درسیاتی تعلیم حاصل کر کے علماء کے حلقے میں اپنی جگہ بنائی اور دربارِ شاہی تک رسائی حاصل کر لی۔ اس کی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں اگر خصوصیت کے ساتھ کوئی چیز اُبھرتی ہے تو وہ اس کی بے لچک "تنگ نظری" بے روک تعصب اور بے میل راسخ الاعتقادی ہے۔ ہمیں اس کی انانیت نہ صرف بہت چھوٹی دکھائی دیتی ہے بلکہ قدم قدم پر انکار و تبریٰ کی دعوت دیتی ہے۔ تاہم یہ کیا بات ہے کہ اس پر بھی ہم اپنی نگاہوں کو اس طرف اُٹھنے سے روک نہیں سکتے۔" (غبارِ خاطر ص ۔ ۱۸۶)

مولانا تاریخی مواد کو استعمال کرنے سے پہلے 'مورخ کا ذہنی تجزیہ اور اس کے ماحول کا جائزہ ضروری سمجھتے تھے' اور یہ وہ بیدار تاریخی شعور ہے جو آج Psychohistory کی شکل میں مغربی مورخین کے لیے جاذبِ توجہ بنا ہوا ہے۔

(۸)

مولانا تاریخی تحقیق کے سلسلے میں آرکائیوز (Documentation) کو خاص اہمیت دیتے تھے۔ ناگپور میں انڈین ہسٹاریکل ریکارڈس کمیشن کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اُنھوں نے ۲۵ر دسمبر ۱۹۵۰ء کو کہا تھا کہ ان دستاویزوں ہی کی بنا پر صحیح تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ یہ تاریخ کا بیش قیمت مواد ہے جس کی حفاظت میں کوئی کسر نہ اُٹھا رکھنی چاہیے۔ مغل دور میں ان دستاویزوں کا تحفظ خاص طور پر کیا جاتا تھا۔ ابوالفضل، عبدالحمید لاہوری، خافی خان وغیرہ نے اپنی تاریخیں اسی مواد کی مدد سے ترتیب دی تھیں۔ ضرورت ہے کہ ان دستاویزوں کو مرتب کیا جائے، اور تاریخ کے طالب علموں کے لیے ان تک رسائی آسان بنائی جائے۔ ایک سال بعد پھر اس پر زور دیا۔

(۹)

آثارِ قدیمہ میں مولانا کو ہمیشہ دلچسپی رہی۔ دہلی میں انتہائی مصروف رہتے تھے، لیکن اگر کبھی فرصت میسر آجاتی تو آثارِ قدیمہ کو دیکھنے چلے جاتے۔ ان کی نظر میں آثارِ قدیمہ کی حفاظت تاریخی مواد کی حفاظت کے مترادف تھی۔ ۲ر فروری ۱۹۴۹ء کو ایک تقریر کرتے ہوئے انھوں نے فرمایا تھا کہ تقریباً دوسو سال سے یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ قدیم تاریخ کا سب سے اہم بلکہ واحد ذریعہ آثارِ قدیمہ ہیں۔ کاغذ اس زمانے میں ایجاد نہیں ہوا تھا اور اس کی ایجاد کے بعد جو چیزیں کاغذ پر لکھی گئیں وہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکیں اب آثار ہی سے قدیم تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے۔ اور یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کون کون سی تہذیب کے قافلے یہاں سے گذرے مصر، عراق، شام وغیرہ میں آثارِ قدیمہ کا کام ہندوستان سے زیادہ ہوا جس کی ایک وجہ یہ بھی کہ یہ علاقے یورپین تہذیب سے قریب تر تھے۔

(۱۰)

اگر تاریخ قوموں کا حافظہ ہے تو انسانی ذہن اس کے تحفظ کا ذریعہ۔ بغیر مضبوط حافظے کے تاریخی کام ممکن نہیں۔ مولانا آزاد کو قدرت نے غیر معمولی قوتِ حافظہ سے نوازا تھا۔ ان کے تاریخی احساس و شعور کو اس سے تقویت پہنچی تھی، اور وہ تاریخی حقائق کو مختلف پس منظر میں پوری وضاحت کے ساتھ دیکھ سکتے تھے، اور اس سے نتائج کا استنباط کر سکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حافظہ تاریخی شعور میں حرکت پیدا کر دیتا ہے۔ واقعات جب پردۂ ذہن پر ابھرتے ہیں تو تاریخی فکر کی گرہیں خود بخود کھلنے لگتی ہیں۔ غلام رسول مہر کو ایک بار مآثرالامراء سے نقل کی ہوئی عبارت کے ایک لفظ پر شبہ ہوا۔ مولانا سے معلوم کیا، انھوں نے جواب میں فرمایا : میرے ذہن میں تو یوں ہی محفوظ ہے۔ پھر جب اصل سے رجوع کیا گیا تو بالکل اسی طرح نکلا جس طرح مولانا نے لکھا تھا۔ خود فرماتے ہیں :

"تیس چالیس برس پیشتر کے نقوش بھی اچانک اس طرح ابھر آئیں گے کہ معلوم ہوگا ابھی ابھی کتاب دیکھ کر اٹھا ہوں مضمون کے ساتھ جلد، جلد کے ساتھ صفحہ اور صفحے کے ساتھ یہ تعین کہ مضمون ابتدائی سطروں میں تھا یا درمیانی سطروں میں یا آخری سطروں میں، نیز صفحہ کا رخ کر دہنی طرف کا تھا یا بائیں طرف کا۔"

(غبارِ خاطر، ص ۹۰)

مولانا آزاد کا تاریخی شعور کچھ اس طرح ان کی فکر کا جزو بن گیا تھا کہ جب کسی مسئلے پر غور کرتے تو اس کا سیاسی اور تمدنی پس منظر ذہن کے سامنے آجاتا۔ جب کسی صورتحال سے دوچار ہوتے تو تاریخی واقعات اس طرح ذہن میں اُبھرآتے گویا صف بستہ کھڑے ہوئے ان کے اشارے کے منتظر تھے۔ احمد نگر کے قلعے میں قید کیے گئے تو احمد نگر کی پوری تاریخ زندہ حرکت کرتی ہوئی نظروں

مولانا ابوالکلام کے تعلیمی نظریے

تقسیم ہندوستان کا صدمہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے بہت بڑا صدمہ تھا ان کے خواب چکنا چور ہو گئے اور دو قوموں کے جس نظریے سے وہ عمر کے بڑے حصّے میں لڑتے رہے اسے تسلیم کر لیا گیا لیکن اپنی تمام اداسی اور افسردگی کے باوجود مولانا نے آزادی کے بعد بھی اہم کارنامے انجام دیے اور ان کارناموں کا ایک اہم باب تھا آزاد ہندوستان کی تعلیمی پالیسی وزیر تعلیم ہونے کی حیثیت سے وہ اس کے ذمّے دار تھے۔

آزادی کے بعد کے دور میں آزاد کے تعلیمی نظریوں کو سمجھنے کے لیے دو باتیں پیش نظر رکھنا مفید ہوگا۔ ایک مسلمانوں کے دینی مدارس، مکاتب اور دارالعلوم کے سربراہوں کی وہ کانفرنس تھی جو انھوں نے لکھنؤ میں طلب کی تھی یہاں ان کا زور تھا۔ ان درسگاہوں میں پڑھائے جانے والے دینی نصاب کو 'جدید' بنانے کا مقصد یہ تھا کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی، فلسفہ اور سماجی علوم میں جو ترقیاں ہو رہی ہیں وہ اس نصاب میں شامل ہوں تاکہ دینی اور دنیاوی فکر کا سنگم ہو جائے وہ دینی علوم سے روگرداں نہیں تھے مگر یہ ضرور چاہتے تھے کہ ان ہی کے ساتھ ساتھ ایسے علوم بھی شامل کر لیے جائیں جو آج کے دور کی پیداوار ہیں۔ صرف یونانی دور کے علوم تک نہ تو خود کو محدود رکھا جائے نہ ان علوم میں جو جدید تحقیقات اور ترقیاں ہوئی ہیں ان سے آنکھیں بند کی جائیں۔ مثلاً آج ان دینی مدرسوں میں یونانیوں کی تقلید میں زمین کی گردش اور آسمان کے ساکن رہنے کا نظریہ پڑھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کانفرنس سے آزاد کے اس رویّے کا پتہ چلتا ہے کہ وہ کلاسیکی مشرقی اور دینی علوم اور مغربی اور جدید سیکولر علوم کو ملا کر ایک علمی تسلسل کو تعلیم کے لیے ضروری سمجھتے تھے گویا مشرق و مغرب کے سنگم ہی سے بہتر آگہی ممکن ہے۔

دوسرا اہم واقعہ ہے رادھا کرشنن کی مرتبہ کتاب 'مشرق و مغرب میں فلسفے کی تاریخ' History of Philosophy: Eastern [illegible] جس کا مختصر طویل دیباچہ مولانا آزاد نے لکھا تھا یہاں صرف یہی نقطہ نظر کارفرما نہیں ہے کہ مشرق اور مغرب کی مشترک آگہی سے صحیح علم ہوتا ہے اس کے ساتھ فرد اور معاشرے کے ہمہ جہت ارتقا کا تصور بھی کارفرما ہے ان کے ذہن میں یہ بات صاف تھی کہ تعلیم محض کاروباری یا معاشی مسئلہ نہیں ہے کہ دو حرف پڑھ کر آدمی روزی روٹی کمانے لگے یہ تو محض اس کا ایک رخ ہے مراد ہے انسان کی تعمیر نو، اس کی آزاد شخصیت کی تعمیر۔

ان دونوں باتوں کو ذہن میں رکھیے اور آگے بڑھیے۔

آزاد نے جب وزارت تعلیم کی باگ ڈور سنبھالی تو صورت حال یہ تھی۔ ملک تقسیم ہو چکا تھا گاندھی جی زندہ تھے اور جواہر لال نہرو ملک کے پہلے وزیر اعظم تھے گاندھی جی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے اور ان کا واضح نظریۂ تعلیم تھا وہ ملک کو مشینوں کی حکومت کی طرف لے جانا نہیں چاہتے تھے بلکہ بڑے بڑے کارخانوں کے بجائے دیہی ترقی اور گھریلو صنعت کے فروغ کے ذریعے نئے طرز کی معیشت کے حامی تھے اس کے مقابلے میں جواہر لال نہرو بڑی صنعتوں کے قیام کے حق میں تھے۔

سوال یہ تھا کہ ملک میں تعلیم کی نوعیت کیا ہوگی؟ ایسی تعلیم جو بڑی صنعتوں میں کام آئے اور ہمارے فارغ التحصیل طلبا بڑے بڑے کارخانے چلا سکیں اور سائنس اور ٹکنالوجی کی تازہ ترین ایجادات پر قابو پا سکیں یا ایسی تعلیم جس کا رُخ دیہات کی طرف ہو اور گھریلو صنعتوں کے فروغ میں مدد دے سکے۔ ملک نے دوسرے معاملات کی طرح یہاں بھی توازن کو اپنایا یعنی گھریلو صنعتیں بھی اور بڑے بڑے کارخانے بھی مگر رُخ بڑے کارخانوں ہی کی طرف رہا۔

مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی نے اس رُخ کا ساتھ دیا۔

مولانا نے ملک کو جو تعلیمی پالیسی دی بلاشبہ وہ ابھی تک ملک میں عام ناخواندگی اور جہالت کو دور کرنے میں تو کامیاب نہیں ہوسکی مگر نتیجہ ضرور ہوا کہ آج ہمارا ملک اس پورے علاقے میں جاپان اور چین کے بعد سائنسی تعلیم میں سب سے آگے ہے۔ یہ وقت کی اہم ضرورت تھی اور اس ضرورت کے تحت تعلیم کے مختلف شعبوں کی تیز رفتار ترقی کا جو کام مولانا آزاد نے شروع کیا وہ واقعی بڑا اہم تھا۔ یہ

محمد حسن
ڈی-۲، ماڈل ٹاؤن دہلی۔

پڑھا دیے۔"

(الہلال، ۱۸ دسمبر ۱۹۱۲ء)

تقسیم ہند کے بعد جب مسلمانوں کو جامع مسجد میں خطاب کیا تو پھر تاریخی ذہن حرکت میں آگیا۔ کہا:

"یہ دیکھو! مسجد کے بلند مینار تم سے اُچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟"

پھر ہمت و عزم کی روح اس طرح پھونکتے ہیں:

"ہمارے ملک کی تاریخ کے کچھ صفحے خالی ہیں۔ اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں۔"

مولانا آزاد کا تاریخی شعور، خونِ زندگی کی طرح ان کی تحریر و تقریر میں دوڑتا نظر آتا ہے۔ انھوں نے اس تاریخی شعور کو فلسفے کی گہرائی اور ادب کی چاشنی سے انتہائی دلکش بنا دیا تھا:

درد می خیزد از دلِ فیضی
سوزِ شے در کتاب می بینم



سنسکرت اور ہندوستان کے قدیم اثاثے کی بازیافت اور اس کی تعلیم و تدریس پر بھی مولانا نے زور دیا کیونکہ یہ علوم بھی ہماری عظیم الشان وراثت کا اہم حصہ ہیں. کئی ادارے قائم ہوئے یونیورسٹیاں اور اعلیٰ تعلیم کے مراکز خاص اسی مقصد سے بنائے گئے۔ اور یہ سب کچھ اس زمانے میں ہو رہا تھا جب ملک میں فرقہ وارانہ منافرت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور پورا برصغیر ان کی زد میں تھا کدورتیں اور رنجشیں ہمارے مشترکہ ورثے کو تنکے کی طرح طوفان میں بہائے لیے جا رہی تھیں لیکن آزاد کی بصیرت میں کوئی خلل واقع نہیں ہوا۔ ان کی نگاہ مستقبل پر جمی ہوئی تھی۔ اور وہ صاف طور پر دیکھ رہے تھے کہ ہندوستان کا اگر کوئی مستقبل ہے تو وہ وسیع تر یک جہتی کے تصوّر ہی سے وابستہ ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ مولانا آزاد کو اپنی کاوشوں میں مخالفت کا سامنا نہ کرنا پڑا ہو۔ مختلف حلقوں سے آزادی کے بعد بھی ان کی مخالفت ہوتی رہی ان کو غلط سمجھا گیا کسی نے ان کو اکثریتی فرقے کا ڈھنڈورچی کہا کسی نے اُن کو اقلیتی فرقے کا تنگ نظر حامی بتایا اس کے ثبوت آزادی کے بعد کے دور میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی یونین کے جلسے میں ان کے خلاف تقریر سے اور ان کی عمر کے آخری زمانے میں پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کی الزامی تقریر اور مولانا آزاد کی جوابی تقریر سے فراہم کیے جا سکتے ہیں لیکن یہ وہ قیمت ہے جو ہر اس شخص کو ادا کرنی پڑتی ہے جو اپنے دور کی دھند سے آگے بڑھ کر مستقبل پر نظر جمانے کی جرات اور جسارت کرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ مولانا نے اس تنقید کو کس رنگ میں برداشت کیا۔ غصّے اور جھنجھلاہٹ کو راستے کا پتھر نہ بننے دیا۔ اور ملک کے تعلیمی نظام کی وہ ایسی بنیادیں استوار کر گئے جن پر چل کر آج ملک اس منزل تک پہنچا ہے۔

آزادی سے پہلے مولانا آزاد کے کارنامے سونے کے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں صحافی کی حیثیت سے اردو صحافت میں ان کا نقش قدم آج بھی جگمگا رہا ہے ادب اور انشا میں ان کے نام سے جو اسلوب پہچانا گیا وہ آج بھی سدا بہار ہے مذہبی ادب اور خاص طور پر تفسیر قرآن کے سلسلے میں ان کے کارنامے آج بھی ناقابلِ فراموش ہیں آزادی کی لڑائی میں ان کی عظیم الشان جدّوجہد آج بھی ملک اور قوم کو یاد ہے لیکن آزادی کے بعد کے دور میں ان کو ایک ہارا ہوا سپاہی یا ایک اداس دل گرفتہ المیے کا ہیرو جاننے والوں کو وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کے کارنامے یاد رکھنے چاہئیں. یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے کہ مولانا آزاد کی قائم کردہ بنیادوں پر چل کر آج ملک اس منزل تک پہنچا ہے جب ڈیڑھ سو سے زیادہ یونیورسٹیاں۔ متعدد آئی۔ ٹی۔ آئی۔ میڈیکل اور سائنسی ادارے اور تحقیقاتی مرکز۔ فنونِ لطیفہ کی اکادمیاں۔ تہذیبی عالمی روابط کے ادارے قائم ہیں اور اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کے باوجود ہمارے ملک کا شمار دنیا کے چند ایسے ممالک میں ہوتا ہے جو سائنسی آگہی تکنیکی مہارت اور واقفیت اور علوم و فنون میں دسترس کے اعتبار سے ترقی پذیر ممالک میں ترقی یافتہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ مولانا آزاد کی شخصیت اور ان کے کارناموں کو ایک اور خراجِ عقیدت ہے۔



بات یاد رکھنے کی ہے کہ مولانا آزاد کے بعد وزارت تعلیم ان جیسی شخصیت حاصل نہ کر سکی بلکہ یہ وزارت بھی اہمیت کھو بیٹھی اور اکثر وزرائے تعلیم کابینہ کی سطح کے وزیر بھی نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ مولانا آزاد کے متعین کردہ راستے اور ان کے اقدامات ہی اُس وقت سے اس وقت تک قایم اور جاری ہیں بعد کے آنے والے وزیروں نے ان میں بہت کم تبدیلیاں کی ہیں جن کی حیثیت بنیادی نہیں۔ اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں تعلیمی نظام کا پورا ڈھانچہ مولانا آزاد ہی کا بنایا ہوا ہے۔

آئیے اب اس ڈھانچے کے چند حصوں پر غور کریں۔

سائنسی تعلیم و ترقی کے لیے شانتی سروپ بھٹناگر جیسے سائنس داں کی سربراہی میں سائنس کا اعلیٰ تحقیقاتی ادارہ بنایا گیا اٹیمی ترقی کا ادارہ الگ وجود میں آیا اور صنعت اور ٹکنالوجی میں کام کرنے والے سائنسی اداروں کے لیے ایک طرف تو انڈین کاونسل فار ایگریکلچرل اینڈ سائنٹیفک ریسرچ قائم ہوئی تو دوسری طرف زراعت اور دیہی ترقی کے لیے انڈین کاونسل فار ایگریکلچرل ریسرچ کا قیام عمل میں آیا۔ اسی طرح انڈین کاونسل فار میڈیکل ریسرچ بنائی گئی۔ گویا ملک میں اہم ترین سائنسی ریسرچ کی داغ بیل پڑ گئی۔ اور ان کے ساتھ ساتھ نئے ادارے وجود میں آئے جو اس تحقیقاتی کام کو زراعت و صنعت کے شعبوں تک لے جا سکیں۔

اسی کا دوسرا پہلو سماجی علوم اور فنونِ لطیفہ سے متعلق تھا۔ سماجی علوم کے لیے انڈین کاونسل فار ہسٹاریکل ریسرچ اور انڈین کاونسل فار سوشل سائنسز ریسرچ قائم ہوئیں جن کا دائرہ کار تاریخ سے لے کر اقتصادیات معاشیات اور سماجیات تک پھیلا ہوا تھا اسی سلسلے کو مکمل کر رہے تھے دو اور ادارے ایک انڈین کاونسل فار کلچرل ریلیشنز جو ہندوستان کے تہذیبی روابط کا امین تھا اور دوسرے انسٹیٹیوٹ آف انٹرنیشنل اسٹڈیز جو مولانا آزاد کی سرپرستی میں سپرو ہاؤس میں قائم ہوا اور بعد کو جواہر لال یونیورسٹی کا ہیولیٰ بن گیا۔

فنونِ لطیفہ اور ادبیات کے فروغ کے لیے مولانا آزاد نے اکادمیوں کی بنیاد ڈالی اور تین اکادمیاں وزارت تعلیم ہی کے ایماء سے قائم کی گئیں ادب کے لیے ساہتیہ اکادمی، رقص اور موسیقی کے لیے سنگیت ناٹک اکادمی اور مصوری وغیرہ کے لیے للت کلا اکادمی ان تینوں اکادمیوں کے سربراہ مولانا آزاد ہی تھے اور ان اکادمیوں کا یہی کام نہیں تھا کہ وہ ملک کے مقتدر فنکاروں کو انعام و اکرام تقسیم کریں بلکہ یہ بھی تھا کہ وہ ملک کے مختلف علاقوں کے ادبی اور فنی میلانات کو سمو کر انھیں قومی سطح پر ایک فنی وحدت اور فروغ عطا کریں۔

> ... آزادی کی لڑائی میں ان کی عظیم الشان جدوجہد آج بھی ملک اور قوم کو یاد ہے لیکن آزادی کے بعد کے دور میں ان کو ایک ماہر سیاسی یا ایک اداس دل گرفتہ ایسے کا ہیرو جاننے والوں کو وزیر تعلیم کی حیثیت سے بھی ان کے کارنامے یاد رکھنے چاہئیں۔ ...

مولانا آزاد کی تعلیمی پالیسی کا ایک رخ تھا اعلیٰ تعلیم کا فروغ چنانچہ اسی مقصد سے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن قائم ہوا۔ اور اس کے تشکیلی دور میں جناب منی دیش مکھ کو اس کا سربراہ مقرر کیا گیا یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے ملک میں یونیورسٹیوں کا جال سا بچھا دیا اور اعلیٰ تعلیم کو نہ صرف مالی امداد کے ذریعے بڑھاوا دیا بلکہ نظریاتی طور پر سمت و رفتار کا تصور بخشا اور ان سبھی اعلیٰ تعلیمی درسگاہوں میں ایک ضابطہ بندی اور معیار بندی پیدا کی۔

مولانا آزاد محض وزیر تعلیم ہی نہیں تھے بلکہ ملک کی کابینہ کے ایک نہایت اہم رکن بھی تھے اس لحاظ سے وہ پورے ملک کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے تھے۔ کانگریس کے لیے ہندوستان اور مغربی ایشیا کے مسلم ممالک سے قریبی رابطے کا تصور نیا نہ تھا گو اسے کانگریس کے سیاسی شعور کا حصہ بنانے میں بھی مولانا آزاد کی کانگریسی رہنما کی حیثیت سے بڑی اہم خدمات رہی ہیں لیکن جب ملک آزاد ہوا تب بھی مغربی ایشیا کے مسلم ممالک سے تہذیبی اور سیاسی رابطوں کو اہمیت دی جاتی رہی اور مولانا آزاد نے اسی مقصد سے عربی مجلہ ثقافۃ الہند اپنے رفیق کار عبدالرزاق ملیح آبادی کی ادارت میں جاری کیا اور تعلیمی نظام میں اس علاقے سے ہندوستان کے تعلقات کو بڑی اہمیت دی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ادارہ علوم مشرقیہ اور حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں ادارہ علوم اسلامی کا فروغ بھی مولانا آزاد کا مرہونِ منت ہے۔

مولانا کو تاریخ سے خاص شغف تھا دراصل وہ ان انسائیکلوپیڈی شخصیتوں میں تھے جو علم کو اکائی سمجھتے ہیں اور اسے ادوار اور اقسام میں تقسیم نہیں کرتے شعبہ وار مہارتوں کے دور میں ایسے قد آور اور ہمہ جہت قاموسی نایاب ہوتے جاتے ہیں لیکن مولانا انسانی فکر و عمل کی پوری داستان کو ایک ہی سلسلے میں پرو کر دیکھتے تھے اور اس میں ماضی اور حال کی تفریق نامناسب تھی اسی لیے مولانا کی سرکردگی میں خصوصی توجہ ہوئی نیشنل آرکائیوز اور نیشنل میوزیم پر اور ان میں گزرے ہوئے زمانے کی بیش قیمت دستاویزوں اور نشانیوں کو محفوظ رکھنے کو خاص طور پر اہمیت دی گئی۔

ایک آرزو پر مبنی تھا جس کی تکمیل آزادی کے بعد ہوئی تھی۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ جنگِ آزادی کے زمانے میں وطنیت و قومیت کے الفاظ بعض اوقات ایک ہی معنی میں استعمال کیے گئے۔ چنانچہ وطن پرستی اور قوم پرستی کے درمیان کم ہی فرق کیا گیا۔ دوسرے سوال کا جواب دینے میں مشکل یہ ہے کہ ہر وطن دوست اور قوم پرور کوئی ضروری نہیں ہے کہ وطن پرست اور قوم پرست بھی ہو۔ اس لیے کہ سرزمین کی محبت ایک بات ہے اور اس کی پرستش دوسری بات۔ ممکن ہے کہ اس وجہ سے وطن دوستوں اور قوم پروروں نے اپنے نقطۂ نظر کے لیے وطنیت و قومیت کے الفاظ بالعموم استعمال کیے ہوں، جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے وطنیت و وطن پروری میں معنی کا فرق نہیں۔ لسانی اصلیت کا فرق ہے۔ پہلا لفظ عربی قاعدے پر ہے اور دوسرا فارسی قاعدے پر۔ ٹھیک یہی فرق قومیت و قوم پرستی کا بھی ہے۔

بہرحال نصف صدی قبل نیشن کے تصوّر پر جو بحث و نزاع ہوئی اس میں توجہ اس انگریزی لفظ کے اُردو ترجمے پر نہیں، اس کے سیاسی مفہوم پر مرکوز رہی۔ اس سلسلے میں علامہ اقبال اور مولانا حسین احمد مدنی کے درمیان جو مباحثہ ہوا اس کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ مولانا کے پیشِ نظر عربی زبان میں لفظ "قوم" کا قدیمی استعمال تھا۔ جب کہ اقبال کے مدِّنظر انگریزی لفظ "نیشن" کے سیاسی مضمرات تھے۔ اس موضوع پر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنی تصنیف "مسئلہ قومیت" میں مفصّل بحث کی ہے۔ یہ تینوں حضرات معروف و مسلّم علما و فضلا ہیں اور ان میں کسی کا مطمحِ نظر خدا پرستی کے مقابلے میں زمین پرستی نہیں ہے۔ نیشن کے ساتھ "ازم" جوڑ کر اردو میں اس کا ترجمہ "یت" کے ساتھ کیا جائے یا "پرستی" کے ساتھ، مقصد کسی کا بھی پرستش نہیں، صرف الفت اور وابستگی ہے۔ لہٰذا لفظوں کے چکر سے نکل کر دیکھنا یہ چاہیے کہ نیشن کے تصور کا وہ کون سا پہلو ہے جس پر بحث و نزاع کا سارا زور پڑتا ہے۔ اور اس معاملے میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نقطۂ نظر کیا ہے؟

> ...بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام لے کر اُٹھے۔ اس کے بعد انہیں تحریکِ آزادی میں شرکت کرتے ہی قومیت کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا جو آہستہ آہستہ اُبھر کر پورے ملک کی فضا میں ایک انتشار پیدا کرنے لگا تھا۔ . .

نیشن یا وطن بحیثیت سیاسی تصور کے زمین کے علاوہ حسب ذیل عناصر پر مشتمل ہے:

۱۔ نسل
۲۔ زبان
۳۔ عقیدہ
۴۔ تہذیب

غیر منقسم ہندوستان کے باشندے فی الواقع ایک مخلوط نسل سے تعلق رکھتے تھے جو عمومی طور پر سب کے لیے یکساں تھی اور اس کی بنا پر اختلاف کی گنجائش گویا نہیں تھی۔ سوا اس کے کہ ہندوؤں نے اونچی اور نیچی ذات کا ایک بالکل مصنوعی اور غیر انسانی تفرقہ کھڑا کر رکھا تھا۔ زبان کا جھگڑا غیر ملکی سامراج نے زبردستی انیسویں صدی کے اواخر میں پیدا کیا، ورنہ اُردو پورے ملک کا مشترک عوامی ذریعۂ اظہار بن چکی تھی۔ اور اس کو ہندوی، ہندی اور ریختہ یا ہندوستانی کہا جاتا تھا۔ جس کا اصلی رسم خط تو عربی و فارسی تھا۔ مگر سنسکرت کی ملاوٹ کے ساتھ اس کا ایک نیا رسم خط دیوناگری بھی بنا لیا گیا تھا۔ اس کے باوجود ہندوستانی بہ خط فارسی و ناگری پر ایک طرح کا قومی اجماع ہو گیا تھا۔ عقیدے کا اختلاف البتہ اہلِ ملک کے درمیان کل بھی پایا جاتا تھا اور آج بھی پایا جاتا ہے اور یہ محض ہندو مسلم ناموں کے دو فرقوں تک محدود نہیں بلکہ نہ صرف عیسائی، یہودی، پارسی اور سکھ فرقوں کے عقیدے مختلف ہیں، خود ہندو کہلانے والوں کے جتنے بھی طبقات ہیں سب کے عقائد ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ تہذیب کا معاملہ یہ ہے کہ معاشرت کا فرق تو فرقوں اور طبقوں کے درمیان کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ مگر تمدن پورے ملک کا مغلوں کے وقت سے یکساں رہا ہے۔ تہذیب کا تعلق بلاشبہ اصلاً معاشرت سے ہے جسے انگریزی میں کلچر (Culture) کہتے ہیں، لیکن تمدن (Civi-lisation) کے اثرات و نقوش بھی تہذیب پر مرتب ہوتے ہیں۔

اب نیشن یا قوم کا لفظ دو معنوں میں لیا جا سکتا ہے، ایک نظریاتی، دوسرے انتظامی۔ انتظامی معنی میں ایک ملک کے تمام باشندگان ایک حکومت کے افراد بن جاتے ہیں۔ یہ گویا ایک جغرافیائی صورت ہے جس کے بارے میں کسی اختلاف کی ضرورت کبھی کسی کو محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ برطانوی سامراج کے عہد میں حکومت غیر ملکی تھی۔ لیکن نظریاتی معنی میں جن حضرات نے...



مولانا ابوالکلام آزاد کا تصوّرِ قومیت

انگریزی کے جن لفظوں نے عصرِ حاضر کی اردو آبادی میں افکار و اعمال کی ایک نزاع برپا کی ہے ان میں سرِ فہرست لفظ "نیشن" (Nation) اور اس سے مشتق نیشنلزم (Nationalism) ہے۔ ان الفاظ کے مفہوم اور ان سے وابستہ تصوّر پر بہت ہی گرم بحثیں ہوتی رہی ہیں، جن میں بعض اوقات بڑے بڑے مشاہیر نے حصہ لیا ہے۔ لیکن کوئی قطعی فیصلہ علمی سطح پر آج تک نہیں ہو سکا ہے، اگرچہ ایک سیاسی نتیجہ ضرور یہ نکلا ہے کہ مغلوں اور انگریزوں کے ادوار کا غیر منقسم ہندوستان پہلے دو، پھر تین حصّوں میں تقسیم ہو گیا۔ تقسیم کے بعد بھی نیشنلزم کی بحث ختم نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ آزاد ہندوستان میں اکتالیس سال سے قومی یک جہتی کا مسئلہ اور اس کے حل کے لیے مباحثہ جاری ہے۔ ملک میں قائم ہونے اور پروان چڑھنے والی جمہوریت (Democracy) نے اس مباحثے کو اکثریت (Majority) اور اقلیّت (Minority) کے نام پر کچھ اور تیز کر دیا ہے۔ حالانکہ دستورِ ہند نے تمام شہریوں کے یکساں حقوق اور مساوی مرتبے کی ضمانت دی ہے مگر فرقہ وارانہ (Communal) انداز سے مذہب اور زبان وغیرہ کا حوالہ دے کر سیاسی گفتگو میں تعداد کی بنا پر کم اور بیش کی تفریق کر دی گئی ہے۔ لہٰذا سکولرزم (Secularism) کو اسٹیٹ کی پالیسی قرار دینے کے باوجود نیشنل انٹی گریشن (National Integr-ation) یعنی قومی یک جہتی کا مقصد ہنوز حاصل نہیں ہو سکا ہے۔

اس تناظر میں جنگِ آزادی کے عظیم مجاہد اور جدید ہندوستان کے ایک اہم معمار، مولانا ابوالکلام آزاد کے تصوّرِ قومیت کا مطالعہ اہلِ نظر کے لیے بصیرت کا باعث ہوگا اور ممکن ہے کہ اس سے آزاد ہندوستان میں قومی یک جہتی کے مسئلے کا حل دریافت کرنے میں بھی مدد ملے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ "قومیت" اور "قوم پرستی" کے الفاظ ایک دوسرے سے جدا معنی رکھتے ہیں۔ اگرچہ دونوں ہی الفاظ عام طور پر انگریزی کے لفظ "نیشنلزم" کے ترجمے ہیں جو مختلف مواقع پر مختلف اصحاب نے کیے۔ آج کے محاورۂ زبان میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ "قومیت" دراصل ایک دوسرے انگریزی لفظ "نیشنلٹی" (Nationality) کا مترادف ہے جو ایک خالص انتظامی اصطلاح ہے۔ اور اس کے بارے میں کوئی نظریاتی نزاع نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر ملک کے رہنے والے کی قومیت کا تعلق اس کے ملک سے ہی ہوتا ہے۔ لیکن آج سے پچاس سال قبل کے سیاسی مباحث میں، لفظ "قومیت" کا استعمال، مثال کے طور پر، خود مولانا آزاد نے قومی احساس کے معنی میں کیا جس کا مقصود تھا وطن دوستی، یعنی اہلِ وطن کے اجتماعی مفاد اور ان کی مجموعی و عمومی صلاح و فلاح کا احساس و شعور۔ سوال یہ ہے کہ کیا لفظ "قومیت" استعمال کرتے ہوئے مولانا کے سامنے لفظ "نیشنلزم" تھا جس کا ترجمہ وہ کرنا چاہتے تھے؟ اس سوال کا کوئی واضح اور معیّن جواب دینا بہت مشکل ہے۔ لیکن یہ حقیقت تو ثابت ہے کہ مولانا نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے قوم پرستی کے بجائے قومیت کا لفظ استعمال کیا۔ یہ نکتہ وطن دوستی اور وطن پرستی کے فرق کا تجزیہ کرنے سے بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ حالانکہ دونوں الفاظ ایک انگریزی لفظ "پیٹریوٹزم" (Patriotism) کے ترجمے ہیں۔ جب کہ اس انگریزی لفظ کا ایک تیسرا اُردو ترجمہ "وطنیت" بھی ممکن ہے اور مروّج رہا ہے۔ یہاں ایک سوال اٹھتا ہے، کیا وطن پرستی اور قوم پرستی کا مفہوم ایک ہی ہے۔ اس موقعے پر ایک لسانی سوال یہ بھی اٹھ سکتا ہے کہ کیا وطنیت و وطن پرستی ایک طرف اور قومیت و قوم پرستی دوسری طرف ایک دوسرے کے مترادف الفاظ ہیں؟

پہلے سوال کا جواب نسبتاً آسان ہے، وہ اس طرح کہ ایک سرزمین کے ساتھ وابستگی کا خیال وطن اور قوم میں بالعموم مشترک ہوتا ہے، اِلّا یہ کہ کوئی قوم اپنی سرزمین سے اکھڑ چکی ہو، لیکن قوم میں حاکمانہ اختیار (Sovereignty) کا پہلو بھی مضمر ہے۔ جب کہ وطن جائے پیدائش اور جائے رہائش کے سوا کچھ نہیں۔ اس لحاظ سے غلام ہندوستان میں اہلِ ملک کے لیے بلا امتیازِ فرقہ و طبقہ وطن تو ایک حقیقت تھی، لیکن قوم کا تخیّل

عبدالمغنی
وارثی کنج، عالم گنج، پٹنہ ۸۰۰۰۰۷

میں شریک ہوئیے، صرف اس راہ پر چلیے جو اسلام کی بتلائی ہوئی صراط المستقیم ہے ......

قرآن انتظام عالم کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ شخصی استیلا و اقتدار کی مخالفت کرے .....

پس مسلمانوں کا فرض ہونا چاہیے کہ وہ جائز آزادی کے حصول کے لیے کوشش کریں اور پارلیمنٹری حکومت انھیں جب تک نہ مل جائے اپنے اصولِ مذہبی کی خاطر چین نہ لیں .....

اسلام نے ہم کو آزادی بخشنے اور آزادی کے حاصل کرنے، دونوں کی تعلیم دی ہے ہم جب حاکم تھے تو ہم نے آزادی دی تھی۔ اور اب ہم محکوم ہیں تو وہی چیز طلب کرتے ہیں .....

۶ ہمارا جوش اور ایجی ٹیشن قانون اور امن کے حدود کے اندر ہوگا۔ کیونکہ خدا نے کہا ہے کہ فساد مت کرو ......"

(ص ۱۸ ـ ۳۰ ـ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد حصہ دوم، مرتبہ منشی مشتاق احمد)

یہ گویا ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک مولانا ابوالکلام آزاد کا نہ صرف نظریاتی موقف بلکہ سیاسی منشور رہے، جس کے بنیادی نکات حسب ذیل ہیں۔

۱: دین اسلام ایک جامع اور مکمل نظامِ حیات ہے۔

۲: اس نظام میں دین و دنیا کی تفریق نہیں۔

۳: اسلامی نظریۂ سیاست مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے لیے کافی ہے۔

۴: اس نظریے کے تقاضے ہیں ــــ (الف) آزادی، (ب) جمہوریت، (ج) پرامن جدوجہد۔

۵: اسلامی نظام آفاقی ہے۔

لہٰذا زیرِ نظر مجموعۂ مضامین میں "عید الفطر" کے موضوع پر بیان دیا گیا ہے:

"اسلام کی اخوتِ عمومی تمیزِ قوم و مرز بوم سے پاک ہے، اور اس کا ایک ہی خدا اپنے ایک ہی آسمان کے نیچے تمام پیروان توحید کو ایک جسم واحد کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔" (ص ۱۰۔۱۱)

لیکن مولانا آزاد کا اسلامی سیاسی شعور انھیں اس دور میں مسلم لیگ کے طریق کار پر تنقید کرنے سے باز نہیں رکھتا۔ چنانچہ زیرِ نظر مجموعۂ مضامین میں "مسلم یونیورسٹی" کے عنوان سے مندرجۂ ذیل سطریں مولانا کے ذہنی رویّے کا پتہ دیتی ہیں:

"جو قوم چالیس برس تک محض حکومت کی بھیک اور دریوزہ گری پر زندگی بسر کرتی رہی ہو جس نے ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے سے انکار کر دیا، جس نے ہر موقع پر پولیٹیکل جدوجہد کو ایک جرم اور بغاوت سمجھا، اور جس نے خود کبھی کچھ نہیں کیا مگر ہمیشہ کام کرنے والوں کی تضحیک و تحقیر کی اور طرح طرح کے باغیانہ خطابات سے انھیں یاد کیا، آج اسے کیا حق ہے کہ گورنمنٹ اس کی پروا کرے، کیوں نہ اس کو ذلیل و خوار بنایا جائے اور کیوں نہ اس کی امیدوں کو ذلت کے ساتھ ٹھکرا دیا جائے؟" (ص ۵۰)

آگے چل کر "قوم کی اشخاص پرستی" کے عنوان سے مسلم لیگ کی بعض کارروائیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ارشاد کرتے ہیں:

"سلف گورنمنٹ کی خواہش تو مسلمانوں کا قدرتی حق ہے جس کے سیکھنے کے لیے ان کو قرآن کے سوا اور کسی معلم کی ضرورت نہیں۔" (ص ۷۸)

پہلے اقتباس میں "قوم" سے مراد ملّت اسلامیہ ہے جیسے دوسرے اقتباس میں اس کی سیاسی منزل بھی اسلام کے حوالے سے ہی "سلف گورنمنٹ" بتائی جا رہی ہے، اس کے بعد "یا لیت قومی یعلمون" کے زیرِ عنوان مولانا ہندوستانی مسلمانوں کو تعداد اور غیرتِ ملّی کے لحاظ سے "خاندانِ اسلام کا سب سے بڑا گھرانا" قرار دیتے ہوئے اعلان کرتے ہیں:

"جو مسلمان یورپ کی تجارت اور مصنوعات کو خریدتا اور استعمال کرتا ہے، وہ گویا دشمنانِ اسلام و توحید کی کھلی اعانت کرتا ہے۔" (ص ۹۳)

ساتھ ہی اپنے اعلان کی توصیف اس طرح کرتے ہیں:

"یہ کوئی ملکی اور سیاسی مسئلہ نہیں ہے بلکہ ایک خالص دینی معاملہ ہے، اور ہر مسلمان بشرطیکہ مسلمان ہو، اس کی تعمیل پر مجبور ہے۔"

مذکورہ بالا بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا دینی و ملی شعور ہی انھیں بتدریج سیاسی و قومی تحریک کی طرف لا رہا تھا۔ چنانچہ اسلام کے آفاقی تصورِ انسانیت کے تحت وہ "خدمتِ عالم و خدمتِ وطن" کو ایک دوسرے کے ساتھ فطری طور پر ہم آہنگ سمجھنے لگے:

"اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لیے محترم ہے، تو وہ خاک تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترام محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام فرزندانِ انسانیت ہمارے بھائی ہیں، تو وہ انسان تو بدرجۂ اولیٰ ہمارے احترام اخوت کے مستحق ہیں جو اس خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بہنے والے پانی کے پینے والے اور اسی فضا پر محبوب کو پیار کرنے والے ہیں۔"

(ص ۵۷۔ مضامین مولانا ابوالکلام آزاد حصہ چہارم، مرتبہ منشی مشتاق احمد)

یہ وہی تخیل ہے جو اقبال کے ترانۂ ہندی

ہندوستان میں ایک سے زیادہ قوموں کی بات کی، ان کے پیشِ نظر عقیدے اور تہذیب کا اختلاف خصوصی طور پر تھا۔ جب کہ مسلمانوں کے درمیان ایک قوم کا تصور رکھنے والے بھی عقیدے کا فرق تسلیم کرتے تھے۔ صرف تہذیب کے معاملے میں وہ معاشرت کے بجائے تمدن کو مدّنظر رکھ کر یکسانی پر زور دیتے تھے۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے بعض اوقات معاشرتی فرق کا مذاق اڑانے کے باوجود ہندوستانیوں کے اندر بہت سے اختلافات کو "کثرت میں وحدت" ۔(Unity in diversity) کا نعرہ لگا کر تسلیم کر لیا۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اختلاف کو صرف تنوع سمجھتے تھے جو کسی بھی اکائی کے مختلف پہلوؤں میں پایا جا سکتا ہے۔ اور اس کی بنا پر ایک مجموعے کے عناصرِ ترکیبی میں فرق کے باوصف تفریق و تقسیم کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ لیکن اس امر کا امکان باقی رہ جاتا ہے کہ ہر عنصر اپنی ہستی کے تشخص اور اپنے مستقل کردار کے تحفظ پر اصرار کرے، خاص کر جب اس کو دیگر عنصر یا عناصر کی طرف سے جارحیت کا اندیشہ ہو۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے اوّل اوّل "قوم" کا لفظ بالکل غیر سیاسی معنوں میں استعمال کیا، جیسا کہ ان کے زیرِ ادارت شائع ہونے والے ماہنامے "لسان الصدق" کی اشاعت مئی ۱۹۰۴ء میں "انجمن حمایت الاسلام" پر ایک تبصرے سے واضح ہے۔ مولانا انجمن کے کارکنوں کی تعریف کرتے ہوئے ان کے دلوں کو "قومی ہمدردی اور... حب الوطنی کے گراں بہا خزانے سے مالا مال" بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "قوم کو ایسے ہی گمنام، غریب، معمولی مگر قومی محبت کے نشے سے چور، حب الوطنی کے جذبات میں سرشار لوگوں کی ضرورت ہے۔..." انجمن حمایت الاسلام مسلمانوں کا ایک ملی ادارہ تھا مگر مولانا کے خیال میں اس کے کارکن حب الوطنی اور قومی محبت کے جذبات سے سرشار تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ایک اجتماعی خدمت انجام دے رہے تھے۔ اور ان کے کاموں سے عوامی فلاح کے نتائج پیدا ہو رہے تھے؛ لہٰذا مولانا نے انھیں محبِ وطن اور ہمدردِ قوم قرار دیا۔ لیکن "لسان الصدق" ہی کی اشاعت جنوری ۱۹۰۴ء میں مولانا "نیشنل کانگریس" کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے انڈین نیشنل کانگریس میں اس وقت تک عمومی طور سے مسلمانوں کی عدم شمولیت کے مدّنظر سوال اٹھاتے ہیں:

" پھر اس کانگریس کو قومی کہنا کیا معنی رکھتا ہے؟"

اس سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا لفظ "نیشنل" کے ترجمے، لفظ "قومی" کے سیاسی مفہوم سے واقف تھے۔ اس کے باوجود وہ اس لفظ کا استعمال غیر سیاسی مفہوم میں بھی کرتے تھے، جیسا انجمن حمایت الاسلام پر تبصرے سے عیاں ہے۔ تو اس صورتِ واقعہ سے بہ آسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۴ء تک مولانا آزاد کا تصورِ قومیت بالکل واضح اور متعین نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ ان کے ذہن میں یہ خیال اس وقت بھی پرورش پا رہا تھا کہ قومی کہلانے کی مستحق وہی چیز ہوگی جس میں تمام فرقوں کی شمولیت ہو یا زیادہ صاف لفظوں میں کہنا چاہیے کہ جس چیز میں تمام فرقوں کی شمولیت ہوگی تو وہ قومی کہلائے گی۔ (اقتباسات کے حوالے کے لیے دیکھیے "مضامین لسان الصدق" مرتبہ عبدالقوی دسنوی، نسیم بک ڈپو، ۱۹۶۷ء)

قومیت کا خیال کسی انداز سے ذہن کے کسی گوشے میں رکھنے کے باوجود "الہلال" کے دور تک مولانا ابوالکلام آزاد نظریاتی طور پر ایک زبردست ملّی و اسلامی تحریک کے علم بردار رہے۔ ایک سوال کے جواب میں وہ "الہلال کے مقاصد اور پولیٹیکل تعلیم" کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ہم نے تو اپنے پولیٹیکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ . . . . . اسلام انسان کے لیے ایک جامع اور اکمل قانون لے کر آیا۔ اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لیے وہ حکم نہ ہو۔ وہ اپنی توحیدی تعلیم میں نہایت غیور ہے اور کبھی پسند نہیں کرتا کہ اس کی چوکھٹ پر جھکنے والے کسی دوسرے دروازے کے سائل بنیں۔ مسلمانوں کی اخلاقی زندگی ہو یا علمی، سیاسی ہو یا معاشرتی، دینی ہو یا دنیوی، حاکمانہ ہو یا محکومانہ وہ ہر زندگی کے لیے ایک اکمل ترین قانون اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ دنیا کا آخری اور عالمگیر مذہب نہ ہو سکتا۔ . . . . . .

الہلال کا مقصدِ اصلی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے تمام اعمال و معتقدات میں صرف کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ پر عمل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور خواہ تعلیمی مسائل ہوں، خواہ تمدنی، سیاسی ہوں، خواہ اور کچھ وہ ہر جگہ مسلمانوں کو صرف مسلمان دیکھنا چاہتا ہے۔ . . . .

پس الہلال کی اور تمام چیزوں کی طرح پالٹکس میں بھی یہی دعوت ہے کہ نہ تو گورنمنٹ پر بیجا اعتماد کیجیے اور نہ ہندوؤں کے حلقۂ درس

ہوئی جو مسلمانوں کو نظریاتی طور پر مطلوب تھی جبکہ وہ قومی یک جہتی بھی پیدا ہوگئی جو تحریکِ آزادی کی کامیابی کے لیے درکار تھی۔ چنانچہ قومی سیاست کا قوام ملک میں مشترکہ قومیت کے تصور سے تیار ہوا۔ اس قوام سے مولانا آزاد اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا وہ کام لینا چاہتے تھے جس کا تہیہ وہ میدان عمل میں قدم رکھتے ہوئے بیس سال قبل اپنی فکری زندگی کی بالکل ابتدا میں کر چکے تھے۔ لہٰذا لاہور میں ۱۸ - ۲۱ نومبر ۱۹۲۱ء کو جمیعتہ العلمآ ہند کا خطبۂ صدارت ارشاد کرتے ہوئے وہ علمائے دین کو یاد دلاتے ہیں :

" ہمارے کاندھوں پر اللہ کے رسولوں اور نبیوں کی نیابت کا مقدس بوجھ ہے اور ہمارے سامنے حق کی شہادت اور امتِ مرحومہ کی احیا و تجدید کا عظیم الشان کام ہے "۔

(ص ۸۹ خطباتِ آزاد)

آگے چل کر اس خطبے میں مولانا "مسئلۂ احیا و تجدیدِ ملت" کو جمیعتہ العلما کے قیام کی اصل وجہ بتاتے ہوئے " اصلاح دینی کے مبادیات " کی تشریح کرتے اور ان کی دعوت و تبلیغ کو ۱۹۱۲ء میں الہلال کی اشاعت کا مقصد قرار دیتے ہیں :

۱ - " اسلام کے نظم شریعت میں دین و دنیا کی تقسیم نہیں ہے "۔

۲ - " مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل ہے "۔

۳ - " اس مسلک کی بنیاد اس ایمانی اور اعتقادی حقیقت پر بھی تھی کہ شریعتِ اسلامیہ آخری و اکمل شریعت ہے "۔

۴ - " مسلمانوں سے ابتدا واتباع شریعت مہجور نہیں ہوا مگر علمائے اسلام کی غفلت و اعراض سے "۔ (ص ۱۱ - ۱۲، خطباتِ آزاد)

اب مولانا آزاد چاہتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں علمائے اسلام اپنا منصبی فریضہ ادا کریں اور " افراد قوم کی شیرازہ بندی "۔ " یورپ کے اجتماعی طریقوں کی نقالی " کے بجائے ' حیاتِ اجتماعی کے لیے اسلام کے تجویز کیے ہوئے نظم کی بنیاد پر کریں۔

(ص ۱۲۷ خطباتِ آزاد)

یہاں ایک بار پھر مولانا نے " قوم " کا لفظ ملتِ اسلامیہ کے لیے استعمال کیا ہے ' جب کہ اس سے قبل وہ اصلاح دینی کے مبادیات بتاتے ہوئے " مسلمانوں کی قومیت صادقہ کی بنیاد صرف شریعت کا علم و عمل " قرار دے چکے ہیں۔ اس کے بعد دلی میں ۱۵ دسمبر ۱۹۲۳ء کو انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاسِ خصوصی سے خطاب کرتے ہوئے مولانا ترکوں کی فتح پر مبارکباد ان لفظوں میں دیتے ہیں :

" انصاف کا نہ تو کوئی وطن ہے ' نہ کوئی قومیت اس کی قومیت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف بالاتر اور عالمگیر انسانیت ہے "۔ (ص ۱۶۴ خطباتِ آزاد)

لیکن آگے چل کر اس خطبے میں مولانا تحریک خلافت میں اپنی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار پھر واضح کرتے ہیں کہ یہ خدمات " نہ صرف بحیثیت مسلمان ہونے کے بلکہ بحیثیت ہندوستانی ہونے کے میرا قومی فرض ہے " (ص ۱۷۱) اس تاریخی خطبے کے تقریباً آخر میں مولانا نے " ہندو مسلم اتحاد " پر وہ مشہور زمانہ بیان دیا کہ اس اتحاد کے بغیر اگر آزادی ملی تو پورے " عالم انسانیت کا نقصان " (ص ۲۰۵) ہوگا جسے گوارا کرنے کے لیے وہ ہرگز تیار نہیں ہیں۔ اس کے بعد مولانا نے " ہندوستان کی متحدہ قومیت " (ص ۲۰۹) پر تاکیدی نشان لگاتے ہوئے ہندوستان کے تمام فرقوں اور جماعتوں کو مطمئن کر کے تحریکِ آزادی میں متحدہ طور پر شامل ہونے کا موقع دینے کے لیے ایک " میثاق ملی " کا ذکر کیا۔

متحدہ قومیت کا تذکرہ مولانا آزاد آل انڈیا خلافت کانفرنس' منعقدہ کانپور' ۱۹۲۵ء میں بھی کرتے ہیں' جب کہ اس کے بعد جمیعتہ اہلِ حدیث کو کلکتہ' ستمبر ۱۹۳۴ء میں خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

" اسلام اور مسلمانوں کا حریف اگر کوئی بھی ہو سکتا ہے ' تو عیسائی مذہب اور عیسائی قوم ہے دوسرا کوئی نہیں "۔ (ص ۲۴۹ خطباتِ آزاد)

۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۴ء تک مولانا آزاد نے قومیت کے تصور کی جو کچھ وضاحت کی وہ ایسے وقت میں تھی جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں مسئلۂ قومیت نے وہ رنگ پورے طور پر اختیار نہیں کیا تھا جس کے نتیجے میں بالآخر ملک تقسیم ہوگیا۔ اگرچہ اس کے ابتدائی آثار تو تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے زمانے سے نمایاں ہونے لگے تھے اور اس سے بھی پہلے برطانوی سیاست اس کی تخم کاری انیسویں صدی کے اواخر میں کر چکی تھی۔ ۱۹۳۴ء تک مولانا نے اس مسئلے پر جو کچھ اظہار خیال کیا اس کا ماحصل یہ تھا :

۱ - ملت اسلامیہ ایک مستقل وجود رکھتی ہے اور اس کی تنظیم و ترقی ہمیشہ اس کے اپنے اصولوں کی بنیاد پر ہوگی۔

۲ - لیکن اس تنظیم و ترقی کا فروغ اسی وقت ہوگا جب ملک آزاد ہو جائے گا۔

۳ - ملک کی آزادی کے لیے فرقہ وارانہ اتحاد اور متحدہ تحریک ضروری ہے۔

۴ - یہ تحریک سیاسی میدان میں ایک متحدہ قومیت کی بنیاد پر ہی چلائی جا سکتی اور کامیاب ہو سکتی ہے۔



اور ترانۂ ملّی کے درمیان کسی تضاد کے بجائے تطبیق کی کلید فراہم کرتا ہے۔ مولانا آزاد نے "اتحاد اسلامی" کا بین الملّی نسخہ گویا اسی تخیّل کے تحت تجویز کیا:

" درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے۔ اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد نہیں قرار دیتا اور انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کو اس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہیے، اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دُور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جُدا کر دیا ہو۔"

(کلکتہ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۱۴ء منقول از خطبات آزاد مرتبہ مالک رام، ساہتیہ اکادمی، ۱۹۷۴ء)

مذکورہ بالا خطبے میں آگے چل کر مولانا نے پان اسلامزم کی تشریح و تائید کرتے ہوئے اسے "نصف صدی سے یورپ کی تمام مسیحی طاقتوں" کی وضع کی ہوئی اس متفقہ حکمت عملی کا سب سے موثر توڑ بتایا ہے جو "مشرقی مسئلے" کے نام سے عالم اسلام میں انتشار برپا کر کے اسے تباہ کرنے کے لیے روبہ عمل لائی گئی تھی۔

پان اسلامزم کا تصور ہی فی الواقع ہندوستان کی اس عظیم الشان تحریکِ خلافت کا محرّک تھا جس نے بین الملّی وحدت کے ساتھ ساتھ ملک میں فرقہ وارانہ اتحاد اور جنگ آزادی کی متحدہ قومی و عوامی جدوجہد کا صور پھونک دیا، ترک موالات یا عدم تعاون کا نعرہ بلند کیا اور بالآخر جنوبی ایشیا بالخصوص برصغیر سے برطانوی سامراج کا خاتمہ کر کے اہل ملک کے ہاتھوں میں اقتدار کی منتقلی کا سامان کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس تحریک کے ایک اہم قائد، نظریہ ساز اور مجاہد تھے۔ یہ تحریک الہلال کے دور سے اب تک مولانا کی دس سالہ ملّی و قومی سرگرمیوں کا نقطۂ عروج تھی۔ مولانا کے سیاسی نقطۂ نظر اور تصوّرِ قومیت کی بہترین عملی شکل اس تحریک کی صورت میں رونما ہوئی۔ مجلس خلافت، آگرہ، ۲۵ اگست ۱۹۲۱ء کا جو خطبۂ صدارت مولانا نے ارشاد کیا اس کے حسب ذیل الفاظ فرقہ وارانہ سوال اور مذہب و سیاست کے مسئلے پر مولانا کے موقف کی موثر ترجمانی کرتے ہیں:

" تحریکِ خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں، تو بحیثیت ہندوستانی ہونے کے اُنھیں انجام دینا چاہیے۔ یہ بھی ایک سچّی حقیقت ہے۔ مگر سب سے پہلی حقیقت یہ ہے کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ ہو جائیں . . . میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔ یہ اعتقاد قرآن مجید کی نصّ قطعی پر مبنی ہے۔ فی الحقیقت یہ وہ چیز ہے، جو اگر ایک طرف ترک موالات کے اصول کو ہمارے سامنے نمایاں کرتی ہے، تو دوسری طرف ہندو مسلمانوں کے مسئلے کو واضح کرتی ہے۔"

(ص ۷۴، خطبات آزاد)

اس تاریخی بیان کے خاص نکات یہ ہیں:

۱۔ دیگر ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی مسلمانوں کو مسلمان ہی کی حیثیت سے ہر کام کرنا ہے۔

۲۔ مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے کہ اپنے وطن کے غیر مسلموں کے ساتھ اتحاد و اتفاق رکھیں۔

۳۔ اہلِ ملک کا یہ فرقہ وارانہ اتحاد ہی انھیں ایک غیر ملکی سامراج کے خلاف ترک موالات کے قابل بناتا ہے۔

۴۔ سیاسی سطح پر اہلِ ہند کی قومی یک جہتی اور اس کے بل پر بیرونی اقتدار کے ساتھ مقابلے کی دعوت مولانا آزاد اپنے طور پر پچھلے دس سال سے دے رہے تھے۔

انھی نکات کی بنا پر مولانا آزاد زیرِ نظر خطبے کے شروع ہی میں "تحریک خلافت اور آزادیِ ہند کی تحریک" کا تذکرہ مشترک طور پر کرتے ہیں۔ اور اس طرح دونوں کو ایک ہی سمجھتے ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ خلافت ایک اسلامی اصول کا نام ہے جو دراصل جمہوریت کی بہترین شکل ہے اور ہر قسم کی ملوکیت کے خلاف۔ اپنے وقت میں برطانوی سامراج ایک بدترین ملوکیت تھی جس سے ٹکر لینے کے لیے مسلم قائدین اور علمائے دین نے ایک سیاسی واقعے سے متاثر ہو کر خلافت کی تحریک چلائی۔ غیر مسلم راہنماؤں نے مسلمانوں کی ہمدردی اور برطانوی حکومت کی مخالفت کے لیے تحریکِ خلافت میں شرکت کی اور اسے تحریک آزادی کا ایک معرکہ بنا دیا۔ اس طرح ملک میں نہ صرف مذہب و سیاست کی وہ یکجائی



ساتھ اس ورثے کے تحفظ و ترقی کی زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر کوشش کریں۔ اس سلسلے میں اسلام پر قائم رہتے ہوئے جہاں تک مسلمانوں کی وطن دوستی اور قوم پروری کا تعلق ہے، مولانا آزاد کے بہ قول "اسلام کی روح" خود اس راہ میں ان کی رہنمائی کرتی ہے اور ملک کی فلاح و ترقی کی جدوجہد میں "اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب" سدِّ راہ نہیں ہوتی، بلکہ ممد و معاون ہوتی ہے، اس لیے کہ ملک میں اس تعلیم، اس تاریخ ان علوم و فنون اور اس تہذیب کا فروغ بھی اسی وقت ممکن ہے جب ملتِ اسلامیہ کے افراد اہلِ ملک کے ساتھ مل کر اپنے قدرتی وطن کی تعمیر و ترقی کے لیے کوشاں ہوں۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد کے اندر مسلمانانِ دہلی کے اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد نے یاد دلایا:

"ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے"۔

(ص ۔ ۳۴۸ خطباتِ آزاد)

دو قومی نظریے کو حیاتِ معنوی کے لیے مہلک بتانے کے بعد مولانا آزاد کی پوری توجہ دنیا میں قوم پرستی کی بڑھتی ہوئی ہلاکت آفرینیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ دسمبر ۴۷ء میں پٹنہ یونیورسٹی کے جلسۂ تقسیم اسناد کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے ارشاد کیا:

"اقوام کی ترقی کے راستے میں تنگ نظری ایک سنگِ گراں کا حکم رکھتی ہے .... سیاسیات میں یہ روگ قومیت کا چولا پہن کر آتا ہے۔ علم و فضل اور تہذیب و ثقافت کی اقلیم میں یہ خرابی قومیت اور وطنیت کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے"۔

(ص ۔ ۱۸۱، آزاد کی تقریریں مرتبہ انور عارف، نیو تاج آفس دہلی)

یہ نہ صرف تقسیم ہند کی لکیر کے دونوں طرف نوزائیدہ سیاسی قوموں کی جارحانہ قوم پرستی کی تباہ کاریوں پر مولانا آزاد کا ردِّعمل اور تبصرہ ہے، بلکہ اس سیاق و سباق میں آگے چل کر وہ عصر حاضر کی نظریاتی قوم پرستی کا ایک تاریخی تجزیہ کر کے اہل ملک کو آفاقیت کا پیغام دیتے ہیں:

"یہ واضح رہے کہ انیسویں صدی کے یورپ میں جس قومیت کے چرچے تھے اس کے تار و پود بکھر چکے ہیں۔ اور آج دنیا میں قومیت کی قبا کسی کے جسم پر بھی چست و راست نہیں آتی۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ یہ قیود جلد از جلد اٹھا دی جائیں۔ آج دنیا قومیت کی نہیں بلکہ فوق القومیت کی طالب ہے۔ عصر حاضر میں تنگ نظری کے لیے مطلق گنجائش نہیں ہے۔ اقوامِ عالم کی صف میں اگر ہم کوئی ممتاز مقام چاہتے ہیں تو اس کا امکان صرف اسی صورت میں ہے جب ہم نظریاتی اعتبار سے بین الاقوامی نقطۂ نظر کے حامل ہو جائیں"۔

اس کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں مہاتما گاندھی کی یادگار کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مولانا نے نئی دہلی میں اہلِ ملک کو خبردار کیا۔

"یہی حال قومی حد بندی کا ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی تعارف تھا، یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حد بندی، جو ایک ذریعہ پہچان کا تھی، جب اپنی حدود سے گزر جاتی ہے، تو دنیا میں بڑی خوں ریزیاں اسی قومی حرص و طمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں ہوئی ہیں"۔

(ص ۲۳۶، خطباتِ آزاد)

یہاں اشارہ بیسویں صدی کی قوم پرستانہ عالمی جنگوں کی طرف بھی ہے۔ چنانچہ یونیسکو اور بین الاقوامیت پر ۲۴ مارچ ۱۹۵۱ء کو نئی دہلی میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں:

"اگر ہمارے پیشِ نظر عالمی اتحاد کا حصول ہے، اور اس چیز پر سب متفق ہیں کہ ایسے اتحاد کے بغیر انسان کا مستقبل تاریک رہتا ہے، تو ہماری تمام تر کوششیں آفاقی شہرت کی خاطر نئی پود کی تعلیم و تربیت پر مرکوز ہونی چاہئیں"۔

(ص ۲۱۸، آزاد کی تقریریں)

اس سلسلے میں تمام بنی آدم کو بہ اعتبار تخلیق ایک جوہر سے متعلق اور کائنات کے تمام افراد کو ایک دوسرے کا گوشت پوست قرار دیتے ہوئے مولانا نتیجہ نکالتے ہیں:

"انیسویں صدی میں جو قومیت، حریت اور حریت پسندی کا ایک مضبوط قلعہ تھی، آج انسانی ترقی کی راہوں میں روڑے اٹکا رہی ہے۔ اس کے اثرات اتنے قوی ہیں کہ ہم عالمی اتحاد پر کامل یقین و اعتماد کے باوجود جب تک قومیت کی قیود سے آزاد اور اس کی سطح سے بلند و بالا نہیں ہوں گے انسان کا مستقبل تاریک رہے گا"۔

(ص ۔ ۲۲۲، آزاد کی تقریریں)

مولانا آزاد یونیسکو کا سب سے بڑا کارنامہ "انسان کے بنیادی حقوق کا ایک نیا اور عالمگیر اعلان" بتاتے ہیں۔ یہ بات انھوں نے جون ۱۹۵۱ء میں یونیسکو کے اجلاس پیرس میں یونیسکو کے نصب العین پر بولتے ہوئے کہی۔ اس کے بعد ۵ نومبر ۱۹۵۲ء کو یونیسکو



۵۔ ایک آفاقی ملت ہونے کے اعتبار سے ملتِ اسلامیہ کے عالمی مفاد کا تقاضا ہے کہ وہ ہر حال میں ہندوستان کو برطانوی سامراج سے آزاد کرانے کی مؤثر جد و جہد کرے۔

بیسویں صدی کے اوائل میں مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی اصلاح و تنظیم اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام لے کر اٹھے۔ اس کے بعد انھیں تحریک آزادی میں شرکت کرتے ہی قومیت کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا جو آہستہ آہستہ ابھر کر پورے ملک کی فضا میں ایک ایسا انتشار پیدا کرنے لگا تھا جسے دور کیے بغیر نہ ملت کی اصلاح و فلاح کا سامان ہوتا نظر آتا تھا نہ ملک کو آزادی و ترقی نصیب ہونے کی توقع تھی مغربی تصور جمہوریت نے عقیدے کے لحاظ سے آبادی کو اکثریت و اقلیت میں تقسیم کر کے قومیت کے مسئلے کی پیچیدگی بہت بڑھا دی تھی، خاص کر اقلیت کے دل میں اکثریت کی جانب سے شبہات پیدا کر دیے تھے۔ اور اکثریت میں بھی ایسے عناصر نمایاں ہونے لگے تھے جو ان شبہات کو اپنی بعض سرگرمیوں سے تقویت دے رہے تھے۔ یہاں تک کہ تعداد کے اعتبار سے ملک کی سب سے بڑی اقلیت ہونے کے سبب مسلمانوں پر اکثریت کے بعض حلقوں کے خیالات و اقدامات کا رد عمل ہونے لگا، نتیجتہً فرقوں کے درمیان اعتماد کا ایک بحران پیدا ہوا اور مسلمان اپنے ملی وجود کے تشخص و استقلال کے طلب گار ہوئے۔ چنانچہ آزادی کی راہ میں ایک مشکل فرقہ وارانہ مسئلہ چٹان بن کر کھڑا ہو گیا۔

یہی وہ صورت حال تھی جس میں مولانا آزاد کو انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس رام گڑھ مارچ ۱۹۴۰ء میں اپنے سیاسی موقف اور تصورِ قومیت کی وضاحت ان ولولہ انگیز الفاظ میں کرنی پڑی:

"میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں، اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں میں ہندوستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں۔ میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔"

(۹۸۔۲۹۷ خطباتِ آزاد)

اس اصولی وضاحت کے بعد مولانا نے ہندوستان کو اسلام کی دین "جمہوریت" اور انسانی مساوات" وغیرہ کا سراغ لگاتے ہوئے ملکی سیاست میں ابھرے ہوئے فرقہ وارانہ سوال کا یہ قطعی جواب دیا۔

"ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں اب یہ سانچہ ڈھل چکا ہے اور قسمت کی اس پر مہر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علاحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا دے سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔"

(ص ۳۰۰ خطباتِ آزاد)

ان بیانات میں قومیت کو ایک قدرتی چیز، ایک ثابت شدہ واقعہ قرار دیا گیا ہے، جو اپنے وقوع کے لیے کسی جماعت کی سیاست اور کسی ادارے کی قانون سازی کا محتاج نہیں، اس میں نظریاتی قوم پرستی (Nationalism) کا کوئی شائبہ نہیں، ایک فطری قومیت (Nationality) کا اعلان ہے، جو ایک جغرافیائی و تاریخی حقیقت ہے اور انتظامی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی قومیت ملک کے تمام باشندگان کے درمیان مشترک ہے، خواہ ان کے عقائد و اطوار کتنے ہی مختلف ہوں، اور اسی متحدہ قومیت کی ضرورت تقسیم ہند سے قبل تحریک آزادی کی قومی سیاست کو تھی جس کی علم بردار اس وقت مولانا آزاد کے زیر صدارت آل انڈیا کانگریس کمیٹی تھی۔

اس متحدہ قومیت کے عناصر و عوامل یکساں اور مساوی طور پر ہندو اور مسلمان دونوں تھے، خواہ مذہب اور کلچر کے لحاظ سے ان کے درمیان جو فرق و اختلاف ہو اور وہ اپنے اپنے روایتی ورثے پر الگ الگ جتنا بھی فخر کریں، وہ جس طرح چاہیں پوری آزادی، بے خوفی، اطمینان اور اعتماد کے

مولانا ابوالکلام آزاد — ایک دُور افتادہ صدا

مولانا ابوالکلام آزاد ہمارے مجاہدینِ آزادی کی صفوں میں ایک نمایاں مقام رکھتے ہیں مگر ابوالکلام محض کسی سیاسی لیڈر کا نام نہیں ہے' وہ ایک روشن ستارہ تھا جو آسمانِ ہند پر اس لیے طلوع ہوا تھا کہ صبحِ آزادی کی آمد کا اعلان کرے اور بشارت دے کہ زندگی اب ایک نئی کروٹ لے رہی ہے۔ اب جو دن طلوع ہوگا وہ مظلوموں کی بالادستی اور ظالموں کی شکست و پستی کا دن ہوگا' وہ ایک شعلۂ جوالہ تھا جس نے ظلمتوں کے دامن کو تار تار کردیا تھا' اُس کے قلم نے نصف صدی تک ایسی آگ برسائی کہ سامراجیوں کی توپ و تفنگ کو تودۂ خاکستر میں بدل دیا' اُس کی زبان نے اپنی خطابت سے وہ سیلِ بے اماں پیدا کردیا کہ سامراج کے سفینے کو دامنِ ساحل تک پہنچنا دوبھر ہوگیا۔

مولانا آزاد پچھلی صدی کے نصف آخر کی پیداوار تھے اور موجودہ صدی کے نصف اول پر چھائے رہے۔ اس طرح انھوں نے دو صدیوں کے قدیم و جدید گہواروں میں پرورش پائی۔ قدیم نے ان کو سنوارا تھا تو جدید نے نکھارا تھا' اُن کے ذہن میں حدت ہی نہیں جدت بھی تھی۔ خیالات تر و تازہ اور شاداب تھے۔ افکار میں مذہب' فلسفہ اور سماجی علوم کا ایک سنگم بن گیا تھا جس میں مشرق و مغرب کے دھارے یوں پیوست ہوگئے تھے کہ قدامت کی آبرو اور جدت کی آب و تاب دونوں اپنی پھبن دکھاتے تھے۔ وہ خود کہتے ہیں:

"جو کچھ قدیم ہے وہ ورثے میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اس کے لیے اپنی راہیں آپ نکالیں۔ میرے لیے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا رہا ہوں' خاندانی تعلیم اور سوسائٹی نے جو کچھ میرے حوالے کیا تھا میں نے اوّل روز ہی اس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا تھا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشے میں روک نہ ہوسکیں تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں ساتھ نہ چھوڑا۔"

انھوں نے رائج الوقت معیار کے مطابق عربی' فارسی کی تعلیم حاصل کی' اسلامی تہذیب و ثقافت اور دینیات کا ناقدانہ مطالعہ کیا۔ اور علومِ قرآنیہ میں گہری بصیرت پیدا کی۔ اس کے ساتھ ہی وہ انگریزی ادبیات سے اور عمر کے آخری دور میں فرانسیسی ادب سے بھی واقفیت حاصل کرتے رہے مبداءِ فیاض سے اجتہادی فکر کا ملکہ ودیعت ہوا تھا۔ اوائل عمر ہی سے اپنے ماحول کا سکوت و جمود توڑنے کے لیے وہ ایک انقلابی صدا اور ایک باغی کی للکار بن گئے۔ یہی جذبہ انھیں میدانِ سیاست میں کھینچ لایا۔ اور انھوں نے تقریباً نصف صدی تک اپنے قلم سے اور اپنی شعلہ بار خطابت سے ایسا جادو جگایا کہ غلامی کی زنجیروں میں ہانپتے ہوئے ہندوستانیوں کے ضمیر کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا اور اُن میں ایسی غیرت اور اتنا حوصلہ پیدا کردیا کہ وہ ان سلاسل کو ریزہ ریزہ کردیں اور آزادی کے میدان میں قدم بڑھاتے ہوئے ترقی کی منزلوں میں اقوامِ عالم کے ہمدوش ہوجائیں۔

سیاست میں مولانا آزاد کا نظریہ خالص وطن پرستی اور متحدہ قومیت کا نظریہ تھا۔ انھوں نے مذہب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور مذہب کے دائرے سے نکل کر وہ اپنی شناخت کرانے پر کبھی راضی نہ ہوئے' مگر انھوں نے مذہب کو اپنے سیاسی نظریات پر غالب نہ آنے دیا اور بڑے قومی مفاد کو مذہبی تنگ نظری کی قربان گاہ پر کبھی نہیں چڑھایا۔ مولانا آزاد کا میدان سیاست میں کودپڑنا کسی ذاتی مفاد یا نام و نمود کی خواہش کا تقاضا نہیں تھا۔ غالب نے ایک فارسی شعر میں کہا ہے کہ میں کچھ اپنی خوشی سے شعر سے نہیں کہتا' بلکہ خود شعر نے یہ خواہش کی کہ وہ میرا فن بن جائے:

ما نبودیم بدین مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہشِ آن کرد کہ گردد فنِ ما

اسی طرح سیاست نے مولانا آزاد کو اپنی طرف کھینچ لیا' اگر وہ غلامی کا دور نہ ہوتا' اہلِ وطن ذلت اور استحصال کی زندگی نہ گذار رہے ہوتے تو مولانا آزاد کبھی سیاست کا رخ نہ کرتے اور اپنے فکر و فلسفے کے عالمِ دیگر میں مگن رہتے' مگر آزادیٔ وطن کے لیے انھوں نے اتنی بڑی قربانی دی کہ اپنے اعلیٰ پایے کے علمی کارنامے بھی نامکمل چھوڑ دیئے' یہ علمی دنیا کا ایسا نقصان اور ایسی حرماں نصیبی ہے جس کی کبھی تلافی نہیں ہوسکتی۔

نثار احمد فاروقی
ڈی۔ ۱۱۔ موریس نگر' دہلی یونیورسٹی' دہلی۔ ۱۱۰۰۰۷

کی جنرل کانفرنس کے نویں اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے مولانا نے بین الاقوامی کشیدگی کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ساتھ امنِ عالم کے لیے بقائے باہمی کا یہ نسخہ تجویز کیا :

"ہر شخص اس اصول کو تسلیم کرتا ہے کہ تمام اقوام کو حقِ خود اختیاری حاصل ہے۔ اب نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ہر ملک کو اپنے ہی طرز کی سوسائٹی اور حکومت پسند کرنے کا حق بھی حاصل ہے اور اس معاملے میں کسی دوسرے ملک کو اپنا حکم جتانے کا حق نہیں ہے" (ص ۲۷۲ ۔ آزاد کی تقریریں)

یہ آفاقی تصور انسانیت کی وہ وسیع النظری اور رواداری ہے جس پر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی مولانا آزاد سے اتفاق کرتے تھے۔ یہ آفاقیت مولانا آزاد کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ انھوں نے اوّل روز سے ایک نصب العین کے طور پر اسے اپنی تمام سرگرمیوں کا نشانہ بنایا تھا۔ اس لیے کہ جس اسلامی نظریے کا پیغام وہ دنیا کو دینا چاہتے تھے اس کا کلمہ اسی آفاقیت پر مبنی تھا۔ وہ ایک خدا ایک انسان کے قائل تھے۔ اس معاملے میں اصولاً ان کے اور اقبال کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ البتہ تحریکِ آزادی کے دوران میں مسئلۂ قومیت پر بعض جہتوں سے دونوں کی رایوں میں اختلاف ہوا جو دراصل سیاستِ وقت کے متعلق دونوں کے اندازوں میں فرق پر مبنی تھا۔ نظریۂ قوم پرستی نہ اقبال کا مقصود تھا نہ آزاد کا۔ لیکن آزاد سیاسی قومیت پر زور دیتے تھے۔ جب کہ اقبال بہ یک وقت بین الملیت اور بین الاقوامیت دونوں پر تاکیدی نشان لگاتے تھے۔ اس جہت سے اقبال نے ملک کے شمال مغربی خطّے میں خصوصیت کے ساتھ مسلمانوں کے ملّی استقلال کی تجویز پیش کی، جب کہ آزاد نے مسلم آبادی کے علاقوں کی صوبائی خود مختاری کو کافی سمجھا۔ درحقیقت یہ ملک کی آزادی میں حائل ہونے والے فرقہ وارانہ مسئلے کا حل تھا جو اقبال اور آزاد نے اپنی اپنی صواب دید کے مطابق پیش کیا۔ تقسیم ہند اور آزادی کے بعد یہ مسئلہ اصولی طور پر اپنے آپ تحلیل ہو گیا اور دونوں ملکوں میں انتظامی قومیت کا قانون نافذ ہو گیا۔ جہاں تک فرقہ وارانہ اتحاد کا تعلق ہے، اقبال اور آزاد دونوں ہی اس کے مبلّغ تھے۔ لیکن آزادیِ ہند کے بعد ظاہر ہے کہ تبلیغ کا رُخ بدل گیا۔

اس صورت واقعہ نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اس بات کا موقع دیا کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں عالمی سیاست کو مدّنظر رکھتے ہوئے اہل ملک اور پوری دنیا کو بین الاقوامیت کی تلقین کریں، تاکہ جارحانہ قوم پرستی ماضی قریب کی طرح آئندہ بھی انسانیت کے لیے ایک لعنت نہ بن جائے اور بیسویں صدی کی دو عظیم جنگوں کے بعد تیسری کسی جنگ کا سدّباب ہو، بنی آدم کو باہمی کشمکش اور غارت گری سے نجات ملے، بقائے باہم کے اصول پر پائدار امن قائم ہو اور تعمیر و ترقی کے منصوبے روبہ عمل آسکیں۔

اس طرح واضح ہے کہ مولانا آزاد کا تصوّر قومیت بہ یک وقت وطن دوستی اور انسان دوستی سے مرکب ہے۔ چنانچہ وہ ہندوستانی قوم کی آزادی، اصلاح اور ترقی پر سارا زور اسی لیے دیتے تھے کہ اپنی بود و باش کے مخصوص خطّے میں اپنے خاص انداز سے وہ پوری انسانیت کی خدمت کرنی چاہتے تھے اور بہت اچھی طرح سمجھتے تھے کہ موجودہ بین الاقوامی دور میں ایک آفاقی نقطۂ نظر کے بغیر نہ تو دنیا کے کسی گوشے میں امن قائم ہو سکتا ہے۔ نہ وہاں کے باشندوں کی صلاح و فلاح کے لیے کوئی مفید کام ہو سکتا ہے۔ اصولی طور پر مولانا آزاد اپنے اسلامی نظریۂ حیات کے تحت تمام مخلوقات کو اللہ کا کنبہ تصور کرتے تھے اور عملی طور پر ہندوستان میں یہاں کے تمام فرقوں اور طبقوں کو متحد کر کے حریت، مساوات اور اخوت کی بنیادوں پر ان کی سیاسی، معاشی، تعلیمی اور اخلاقی بہبود کے لیے کوشاں تھے۔ مولانا آزاد کا یہ موقف جدید ہندوستان کے بہترین مفادات کا تحفظ اِسی طرح کرتا ہے جس طرح عصر حاضر کے عالمِ انسانیت کے بلند ترین مقاصد کا۔

احساس شاعرانہ اور مزاج قلندرانہ تھا وہ لکھتے یا بولتے تھے تو "ماورائے سخن" بھی ان کے جذبات کوندے کی طرح لپکتے تھے۔ اور ایسا محسوس ہوتا تھا کہ الفاظ ان کے سیلِ افکار میں خس و خاشاک کی طرح بہے جا رہے ہیں ہندوستان کی سیاسی تاریخ نے ان سے بڑا خطیب اور مقرر پیدا نہیں کیا جس کی آواز دل کے بعید ترین گوشوں سے ٹکراتی تھی۔ مولانا آزاد کے علم و فضل اور فکر و فلسفے نے ان کی شخصیت کے گرد متانت اور وقار کا ایک ایسا حصار بھی کھینچ رکھا تھا جس کی وجہ سے وہ کبھی "عوامی لیڈر" نہیں بن سکے یعنی عوام سے ان کا رابطہ اتنا براہِ راست نہیں تھا جیسا مثلاً مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو کا تھا۔ تحریکِ آزادی میں اور حصولِ آزادی کے بعد بھی مولانا آزاد کی حیثیت دماغ کی سی تھی، گاندھی جی اس تحریک کا ضمیر اور پنڈت نہرو اُس کا قلب تھے۔

مذہب میں اجتہادی راہ نکالنا آسان نہیں بلکہ پُرخطر ہے۔ مولانا آزاد کی مذہبی فکر میں بھی مجتہدانہ شان ہے، اُنھوں نے مذہبی مسائل اور مباحث پر بھی گہری بصیرت اور فکر کے ساتھ لکھا ہے۔ اسلام کے ابتدائی دور سے آج تک قرآنِ کریم کی سیکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں۔ مولانا آزاد نے بھی ترجمان القرآن لکھنی شروع کی جو افسوس کہ نا تمام رہ گئی مگر اس نقشِ نا تمام میں بھی اُن کی منفرد شان پوری آن بان کے ساتھ موجود ہے۔ سورۂ فاتحہ کی جیسی تفسیر مولانا آزاد نے لکھی ہے اُسے علومِ قرآنیہ کے ذخیرے میں ایک قابلِ فخر اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

مولانا آزاد بلاشبہ ایک عبقری (GENIUS) ایک نابغۂ روزگار شخصیت اور اپنی وضع کے طرح دار دانشور تھے جو آخری دور میں آئے مگر بقول ابوالعلاء المعرّی وہ چیزیں لے کر آئے جو ان کے پیشرو نہ لا سکے تھے مگر یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا آزاد جیسے دانشوروں کی منڈی میں کساد بازاری کا سکہ چل رہا تھا، اور طوق زرّیں کے لیے "گردنِ خر" ہی کو حقدار سمجھا جاتا تھا، عربی کے مشہور شاعر ابوالطیب المتنبی کا شعر ہے:

ذُو العقلِ یَشقیٰ فِی النَّعیم بعَقلِہٖ
واَخُو الجَہالَتِہ فی الشَّقاوَۃِ یُنعَمٖ

یعنی ایک دانشور نعمتوں میں رہ کر بھی روحانی کرب و اذیت میں مبتلا رہتا ہے اور ایک جاہل انسان اذیتوں میں بھی عیش کر لیتا ہے۔ مولانا آزاد کی تحریروں سے ان کے ذہنی کرب کا اندازہ لگانا دشوار نہیں۔ انھوں نے پوری زندگی ایک عظیم قومی مقصد کے لیے وقف کر دی، عمرِ عزیز کا بہترین حصہ جیل کی سلاخوں کے پیچھے گذار دیا۔ ایثار اور قربانی کے ہر موقعے پر آگے آئے اور ایسی بھرپور زندگی گذار کر بھی اس طرح چلے گئے جیسے کوئی درویش دامن جھاڑ کر اٹھ جاتا ہے۔ انھیں یقیناً اس کا صدمہ تھا کہ ان کی انتہائی مزاحمتوں کے باوجود ملک تقسیم ہوا اور لاکھوں انسان آوارہ و بے خانماں ہوتے لیکن تقسیم کے بعد وہ برِصغیر میں امن و آشتی کے سب سے بڑے علمبردار اور صلح و بقائے باہم کے طلب گار بھی رہے۔ انھوں نے آزادی کے بعد اس ملک کی تعمیرِ نو میں اور مستقبل کا خاکہ بنانے میں پسِ پردہ رہ کر بہت اہم رول ادا کیا۔ وہ پنڈت نہرو کے سب سے زیادہ معتبر مشیر تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اس ملک کو جہاں پانسو سے زیادہ بولیاں بولی جاتی ہیں، بھانت بھانت کی رسمیں اور مختلف مذاہب ہیں، تہذیب و ثقافت کی ایک طویل اور رنگ برنگی تاریخ ہے، اگر کسی ایک شیرازے میں باندھ کر رکھا جا سکتا ہے تو وہ قومی اتحاد و یک جہتی، سکولرازم اور باہمی رواداری کی ڈور ہی ہو سکتی ہے۔ اس کے لیے انھوں نے رہنما خطوط بھی بنائے مگر فرقہ پرستی کی زہریلی ہواؤں کے جھکڑ ہر نقشے کو مٹاتے رہے، اس نے بھی آخر عمر میں مولانا آزاد کے ذہنی و روحانی کرب کو دو چند بلکہ دہ چند کر دیا تھا۔ اگر غیروں کی حکومت ہوتی تو وہ ایک بار پھر میدان میں کود پڑتے مگر اب جو بساط بچھی تھی اس کے بچھانے میں تو خود ان کا ہاتھ بھی شامل تھا اس لیے فریاد کرتے تو کس سے کرتے؟ وہ اپنے کنجِ عزلت میں سمٹتے گئے، اور بقولِ خود ایک دور افتادہ صدا بن کر رہ گئے۔

مگر ہم ہوش کے کانوں سے سنیں تو اُس مردِ مجاہد کی وہ "دور افتادہ صدا" آج بھی فضا میں لرزش پیدا کر رہی ہے، وہ شعلۂ نوا آج بھی رہ رہ کر ہمارے دلوں کی طرف لپک رہا ہے مگر ہم نے اپنے دل و دماغ کی کھڑکیاں بند کر لی ہیں، وہ آواز آتی ہے اور صدائے بازگشت کی طرح پلٹ جاتی ہے اس مردِ آگاہ کی زندگی میں کسی نے اُسے نہ پہچانا تو اب جبکہ تین نسلوں کا فاصلہ درمیان میں حائل ہو کر حجاب بن گیا ہے، اب کون پہچانے گا، جب وہ للکار رہا تھا اس وقت کسی نے کان نہ دھرے تو اب کون سنے گا؟ بقول میر تقی میرؔ:

سنگ کو موم کریں پل میں ہماری باتیں
لیکن افسوس یہی ہے کہ کہاں سنتے ہو



میدانِ سیاست میں جس نظریاتی پلیٹ فارم پر انھوں نے پہلے دن اپنے قدم جمائے تھے ان میں کوئی لرزش یا لغزش نہ آنے دی، نہ اغیار کی بے اعتنائی سے افسردہ ہوئے نہ اپنوں کی بیوفائی سے آزردہ۔ مگر ایک موقع پر دل کا کانٹا کھل گیا تو کیسی حسرت سے کہتے ہیں :

" افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو، میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمھارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔ افسوس کہ تم حقیقی اور سچی بات کہنے والوں کو پسند نہیں کرتے، تم نمائش کے پجاری، شور و ہنگامے کے بندے اور وقتی جذبات و انفجار و ہیجان کی مخلوق ہو، تم میں نہ امتیاز ہے نہ نظر، نہ تم جانتے ہو نہ پہچانتے ہو، تم جس قدر تیز دوڑ کر آتے ہو اتنی ہی تیزی کے ساتھ فرار بھی ہو جاتے ہو۔"

دوسرے ایک موقع پر انھوں نے شکوہ کیا ہے کہ :

"میری زندگی کا سارا ماتم یہ ہے کہ میں اس عہد اور محل کا آدمی نہ تھا مگر اس کے حوالے کر دیا گیا۔"

اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی کے منبر سے ان کی وہ آخری صدا گونجی تھی جس میں ابوالکلام کا پورا جلال و جمال موجود تھا۔ اُس کے بعد تو وہ میر کے لفظوں میں "منقار زیر پَر" ہی رہے اور رسمی تقریروں سے زیادہ ان کی زبان سے کچھ اور نہ نکلا۔ انھوں نے کیسے دل کو چھونے والے لفظوں میں کہا تھا :

" سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں، ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی بے وطنی کی زندگی گزاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا وہاں میرے بال و پَر کاٹ لیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی، بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے، میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ —— ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے اس کو چھوڑ دو، یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں، لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کر دی اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کر سکتے —— ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا، 'جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اُس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حرّیت سے کٹ کر گرنے والی ہیں' —— آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے، یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

> ... مولانا آزاد کا سیاست میں کود پڑنا کسی ذاتی مفاد یا نام و نمود کی خواہش کا تقاضا نہیں تھا۔ اگر وہ غلامی کا دور نہ ہوتا، اہل وطن ذلت اور استحصال کی زندگی نہ گزار رہے ہوتے تو مولانا آزاد کبھی سیاست کا رُخ نہ کرتے اور اپنے فکر و فلسفے کے عالم دیگر میں مگن رہتے...

مولانا آزاد نے سیاست کے لیے صحافت کی راہ اختیار کی، الہلال اور البلاغ اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندوستانی صحافت کی تاریخ میں بقائے دوام کی مسند پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ الہلال گھُپ اندھیرے میں روشنی کی تیز کرن بن کر پھوٹا تھا جس نے خواص کے دل و دماغ کو جھنجھوڑا اور عوام کے لہو کو گرمایا۔ آزادیِ ہند کی تاریخ میں الہلال کی خدمات کو فراموش کر دیا جائے تو اِس سے بڑی احسان فراموشی اور کچھ نہیں ہو سکتی۔

مولانا ایک دانشور تھے۔ عصری مسائل پر ان کی نظر گہری تھی، اپنی خطابت میں وہ نہایت جذباتی اور انقلابی تھے مگر ان کے سیاسی نظریات جذبات کی پیداوار نہیں تھے وہ ٹھنڈے منطقی دماغ سے مسائل کا تجزیہ کرتے تھے، اور وقتی جوش میں بہہ نہیں جاتے تھے۔ ان کا ذوقِ جمالیات بھی رچا ہوا اور منفرد تھا، وہ مذہبی عالم ہونے کے باوجود موسیقی اور مصوری کے رموز و لطائف سے بھی آگاہ تھے اس کا اندازہ غبارِ خاطر کے مطالعے سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ فارسی عربی اور اُردو شعر و ادب کا بھی بڑا ستھرا اور نکھرا ہوا مذاق رکھتے تھے اور اپنی تحریروں میں اشعار نگینوں کی طرح جڑ دیتے تھے۔ ان کا اسلوبِ نثر بھی یگانہ و یکتا تھا جس میں ہندوستانی بولی کی صلابت اور کھرا پن، فارسی کی جاذبیت و شیرینی، عربی خطابت کا جلال و جبروت ایک دوسرے سے گلے ملتے ہوئے دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کی نظر حکیمانہ، دماغ فلسفیانہ



اخبار "وکیل" امرتسر میں گزار دی لیکن مولانا آزاد کی علمی ادبی اور صحافتی شہرت کا دار و مدار "الہلال"، "البلاغ"، "تذکرہ"، "الہلال دورِ جدید"، "ترجمان القرآن" اور "غبارِ خاطر" کا مرہونِ منّت ہے۔ یہ مولانا کے ایسے شاہکار ہیں کہ جس کی مثال اُردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کی تحریر ہو یا خطابت دونوں میں سمندر کی وسعت، پہاڑ کی عظمت، دریا کی روانی، طوفان کی تیزی اور نسیمِ سحر کی نرمی جھلکتی ہے۔ ان کی ہمہ گیر شخصیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ انھوں نے متعدد علوم و فنون میں مہارت حاصل کرلی تھی۔ طب، فلسفہ، منطق، مذہب، تاریخ، ادب، موسیقی، نفسیات اور جغرافیہ غرض کون سا موضوع ہے جس پر مولانا نے عمیق مطالعہ نہ کیا ہو۔ اسی طرح ان کی تصنیفات کی فہرست بھی بہت طویل ہے۔ قدرت نے انھیں حافظہ اتنا غضب کا دیا تھا کہ جو چیزیں ایک مرتبہ مطالعے سے گزر جاتیں تقریباً حفظ ہو جایا کرتی تھیں۔ مطلب، مفہوم اور اشعار ہی نہیں پوری پوری عبارتیں اور مکالمے تک انھیں یاد ہو جاتے تھے۔ اور اکثر یہ تک بتا دیتے تھے کہ کون سی عبارت کس کتاب سے لی گئی ہے اور یہ کہ عبارت کتاب کے داہنے صفحے پر ہے یا بائیں صفحے پر نیز یہ کہ صفحے کے شروع میں ہے، وسط میں یا آخر میں۔

"تذکرہ" میں تحریر فرماتے ہیں کہ "جو کچھ پایا ہے صرف عشق کی بارگاہ سے پایا ہے، جتنی رہنمائیاں ملیں صرف مرشدِ فیض و ہادیِ طریق سے ملیں، علم کا دروازہ اسی نے کھولا، عمل کی حقیقت اسی نے بتلائی، معرفت کے صحیفے اس کی زبان پر تھے، حقیقت کے خزانے اس کے دستِ کرم میں تھے، شریعت کے حقائق کا وہی معلّم تھا، طریقت کے نشیب و فراز میں وہی رہبر تھا۔ قرآن کے بھید اسی نے بتلائے۔ اسرار اسی نے کھولے، نظر اسی نے دی، دل اسی نے بخشا، کون سا الجھاؤ تھا جو اس کی سلجھی ہوئی نظر سے نہ سلجھ گیا۔ کون سی بیماری تھی جس کی دوا اس دارالشفا سے نہ مل سکی۔" اسی عشقِ حقیقی سے مولانا کو علم القرآن، تفسیر، حدیث اور فقہ پر عبور حاصل ہوا۔ اسی نے آپ کو سیاست، فلسفہ اور تاریخ کا عالم بنایا۔ اسی نے آپ کو شعر و شاعری اور فنِ تنقید کا

> ... مولانا ابوالکلام آزاد ان قومی رہنماؤں میں سرِ فہرست تھے جو کردار اور گفتار دونوں کے غازی ہوتے ہیں۔ ان کی ذہانت، طباعی اور نکتہ رسی نے ملکی سیاست میں انقلاب پیدا کردیا تھا۔ مہاتما گاندھی اور آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم رہنما سیاسی پیچیدگیوں میں ہمیشہ ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے ...

ماہر و کامل بنایا۔ اسی کی بدولت ان میں سیاسی گتھیوں کو سلجھانے اور عوام میں صحیح قسم کا مذہبی اور سیاسی شعور بیدار کرنے کا سلیقہ عطا ہوا۔ آزادی کی جدوجہد اور غیر ملکی حکومت کی مخالفت انھوں نے تحریکِ آزادی کے باقاعدہ آغاز سے پہلے ہی شروع کردی تھی۔ "الہلال" ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا تھا ۱۹۱۵ء میں اس کی ضمانت ضبط ہوگئی اور ۱۹۱۵ء میں اسی مخالفت کی وجہ سے مولانا کو بنگال سے جلاوطن کردیا گیا۔ چار سال تک رانچی میں نظربند رہنے کے بعد ۱۹۲۰ء میں جب وہ رہا ہوئے تو گاندھی جی سے ان کی پہلی ملاقات ہوئی، اور اسی سال وہ گاندھی جی کی زیرِ قیادت تحریک ترکِ موالات میں شریک ہوئے۔ یہ رفاقت اور دونوں کے دل میں ایک دوسرے کی محبّت و عزّت آخر تک برقرار رہی۔ سیاسی مفکّر اور قومی رہنما کی حیثیت سے مولانا کا تعارف کرانا بے انتہا مشکل ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کے لیے صحیح فرمایا کہ وہ عام دُنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاست داں ہیں۔ وہ ایک ہی وقت میں زبردست عالمِ دین اور ہندوستانی اتّحاد کے نمائندے اور شارح ہیں۔ اور ان دونوں چیزوں کے اتّحاد میں انھوں نے کبھی کوئی دقّت محسوس نہیں کی۔

ان کی سیاست کی بنیاد شرافت پر تھی۔ وہ محکومی کو مسلمانوں کے ملّی وقار کے منافی مانتے تھے اور عالمِ اسلام میں اس عزّت و وقار کی بحالی کے لیے ہندوستان کی آزادی کو ضروری سمجھتے تھے۔ آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دیتے تھے۔ "الہلال" کے اجرا کا یہی اصل مقصد تھا۔ مولانا اسلام کی آفاقیت، رواداری، انسان دوستی کے مفسّر بھی تھے اور مبلّغ بھی۔ اس لیے مسلمانوں کو غیر ملکی حکمرانوں کے سحر اور اثر سے نکال کر اہلِ وطن کے دوش بدوش آزادی کی جنگ میں صف آرا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان پر مسلمانوں کا اتنا ہی حق مانتے تھے جتنا کہ اس ملک میں رہنے والے دوسرے فرقوں کا ہے اور ان کا یہی تصوّر ملک کے لیے خدمات اور فرائض کے بارے میں بھی تھا۔ ان کی سیاسی زندگی میں فہم و فراست کی تابانی کے ساتھ ساتھ صبر و ضبط کی فراوانی بھی ملتی ہے۔ انھوں نے آزادی کی قومی تحریک کے

میرِ کارواں

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد ـــ نام ہے اس عظیم المرتبت شخصیت کا جو بیک وقت ایک بلند پایہ ادیب و انشا پرداز، جلیل القدر صحافی، منفرد سیاست داں، ممتاز مفسر قرآن، عدیم المثال محدث، مایۂ ناز مفکر اور شہرۂ آفاق مجاہد آزادی کی حیثیت سے مقبول و معروف رہی ہے۔ دراصل مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت متنوع اذواق و اشواق کا مجموعہ تھی۔ انھوں نے غیر معمولی ذہانت اور خداداد صلاحیت سے ادبی، صحافی، سیاسی، سماجی، مذہبی اور ثقافتی موضوعات پر اپنی تقریر و تحریر سے ایسے لافانی نقوش چھوڑے ہیں، جن کی مثال مفقود ہے۔

دراصل مولانا آزاد جیسی عظیم المرتبت شخصیت شاذ و نادر ہی پیدا ہوتی ہے۔ آدمی تو لاکھوں برس سے پیدا ہوتے ہی رہے ہیں اور یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا مگر آدمیوں کے اس انبوہ میں کتنے ایسے ہوئے ہیں، جنھیں میر کارواں کہا جا سکا اور قدرت نے ان کے اندر وہ اوصاف و محامد جمع کر دیے جن کی طرف شاعر مشرق نے اشارہ کیا ہے:

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لیے

مولانا ابوالکلام آزاد کو اگر اس معیار پر پرکھا جائے تو ان کی شخصیت ان اوصاف کی بھرپور نمائندگی کرتی ہے وہ ان قومی رہنماؤں میں سرفہرست تھے جو کردار اور گفتار دونوں کے غازی ہوتے ہیں۔ وہ عظیم مفکر، زبردست عالم، آتش نوا مقرر، صاحب طرز ادیب اور انشا پرداز، بے مثال صحافی اور اخبار نویس ہی نہ تھے بلکہ فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تاریخ و سیر میں بھی ان کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ ان کی ذہانت، طباعی اور نکتہ رسی نے ملکی سیاست میں انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ مہاتما گاندھی اور آنجہانی پنڈت جواہر لال نہرو جیسے عظیم رہنما سیاسی پیچیدگیوں میں ہمیشہ ان سے مشورہ کرتے رہتے تھے۔ وہ تاریخی شخصیت تو تھے ہی لیکن انھوں نے تاریخی کارناموں کے علاوہ تاریخ ساز کارنامے بھی انجام دیے۔ ان کارناموں کی رنگا رنگی اور کثرت تاریخ لکھنے والوں کو حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ عام طور پر تاریخی شخصیتیں اپنے کارناموں کو کسی ایک میدان تک ہی محدود رکھتی ہیں لیکن مولانا آزاد نے سیاست، صحافت، ادب، تاریخ اور فلسفہ ہر میدان میں محیر العقول کارنامے انجام دیے۔ ان کا تاریخی نام فیروز بخت تھا۔ ان کے والد نے تاریخ پیدائش اس مصرعے سے نکالی تھی:

جواں بخت و جواں طالع جواں باد

اس مصرعے کو مولانا کی زندگی کی تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ مولانا کے خاندان میں تین مختلف خاندان جمع ہو گئے تھے اور یہ تینوں خاندان ہندوستان اور حجاز کے بہت ہی ممتاز اور باعزت خاندان میں شمار کیے جاتے تھے۔ قدرت نے علم و فضل اور رشد و ہدایت کے اتنے اوصاف و محامد مولانا کے خاندان میں جمع کر دیے تھے کہ جن کی بدولت اس کی عظمتوں کا محاصرہ ناممکن نظر آتا ہے۔

محمد عثمان عارف نقشبندی
گورنر اتر پردیش، راج بھون، لکھنؤ

اپنے بچپن میں ہی مولانا نے ادب اور صحافت کے میدان میں قدم رکھا تھا۔ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے پہلا مضمون لکھا۔ اس وقت ان کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ ۱۹۰۲ء سے ان کے مضامین اس زمانے کے بلند پایہ رسالے مخزن لاہور میں شائع ہونے لگے تھے۔ ۱۹۰۳ء میں مولانا نے اپنا رسالہ "لسان الصدق" کلکتہ سے شائع کیا۔ اس رسالے نے، حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد کو بہت متاثر کیا۔ انھیں دنوں لاہور میں مولانا وحید الدین سلیم نے جب مولانا آزاد کا تعارف حالی سے یہ کہہ کر کرایا کہ یہ "لسان الصدق" کے ایڈیٹر ہیں، تو حالی کو بڑی حیرت ہوئی۔ انھیں یقین ہی نہیں آیا اور وہ یہی سمجھتے رہے کہ یہ مدیر "لسان الصدق" کے صاحبزادے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۰۵ء سے مارچ ۱۹۰۶ء تک مولانا الندوہ لکھنؤ کے مدیر رہے۔ اس زمانے میں ان کے قلم سے جو علمی و ادبی تحریریں نکلیں انھوں نے ان کی شہرت و عظمت میں چار چاند لگا دیے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک مختصر مدت

مولانا آزاد اور مرزا غالب

مولانا غلام رسول مہر کی مشہور تالیف "غالب" (۱۹۳۶ء) شائع ہوئی اور مولانا کی نظر سے گذری تو انھیں لکھا:

"مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ آپ ایک مکمل سوانح عمری لکھنی چاہتے ہیں اگر یہ خیال ہوا ہوتا تو بہت سی باتیں آپ کو لکھ کر بھیج دیتا۔ کتاب پڑھتے ہوئے ہر تیسرے چوتھے ورق کے بعد ایسے مقامات آئے میرے لیے اس طرح کی معلومات کا زبانی کہہ دینا آسان ہے۔ لکھنا مشکل ہے۔ تاہم کوشش کروں گا کہ پہلی فرصت میں بعض ضروری باتیں لکھ کر بھیج دوں تاکہ دوسرے اڈیشن میں کام آئیں۔"

مہر صاحب نے مولانا کے خیالات اور معلومات سے استفادے کی یہ صورت نکالی کہ "غالب" کا ایک نسخہ بیچ بیچ میں سادہ ورق لگوا کر مولانا کی خدمت میں بھیج دیا۔ یہ نسخہ کئی سال تک مولانا کے پاس رہا۔ ان اوراق میں مولانا نے غالب اور اس عہد سے متعلق بہت سی یادداشتیں اپنی معلومات اور اپنے والد کی روایات سے تحریر فرمادیں۔ اور بعض مقامات پر مولانا مہر مرحوم کی تحریر میں اصلاح بھی فرمادی۔ ان یادداشتوں اور اصلاحوں میں بہت سے نکتے زبان و بیان اور لغات و لسانیات سے متعلق ہیں۔ مولانا مہر مرحوم نے "غالب" کے دوسرے اڈیشن میں ان معلومات کو متن میں شامل کرلیا تھا اور مولانا آزاد کے انتقال کے بعد جب انھوں نے مولانا کے خطوط "نقشِ آزاد" کے نام سے مرتب فرمائے تو مجموعے کے آخر میں مولانا کے قلم سے یہ تمام یادداشتیں بھی مرتب فرمادیں۔

مولانا آزاد نے زبان و قواعد کے بارے میں اپنی ان یادداشتوں میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

اولاً ـــــ وہ مباحث جو غالب کی زبان دانی اور فارسی میں ان کی نظر اور عبور سے متعلق ہیں۔ اس سلسلے میں غالب کے استاد عبدالصمد (ان کی شخصیت کے وجود و عدم وجود کی بحث سے قطع نظر، اور زبان دانی کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"عبدالصمد غیر معمولی قابلیت و استعداد کا آدمی تھا۔ مرزا غالب نے "درفش کاویانی" کے آخر میں جو فوائد لکھے ہیں اور انھیں عبدالصمد کی طرف نسبت دی ہے، ان سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ فارسی زبان کے اصول و قواعد اور قدیم فارسی کے رموز و دقائق کا اگر وہ ماہر تھا تو یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ سنسکرت اور قدیم فارسی کے باہمی رشتے کا راز بھی اس پر کھل چکا تھا اور دونوں زبانوں کے مرادفات کی صحیح مثالیں بڑی حد تک اس پر نمایاں ہوچکی تھیں:-

مرزا غالب "درفش کاویانی" کے فوائد میں لکھتے ہیں:

درزبان دری و زبان سنسکرت توافق بیش ازان ست کہ شمردہ آید۔

پھر مثالیں دی ہیں، جو صحیح ہیں اور سر ولیم جونس وغیرہ کے ابتدائی مباحث میں بھی ان ہی سے کام لیا گیا ہے۔ مہ اور مہا، سوم بہ معنی ماہ، سکھ بہ معنی رفیق، پاتی بہ معنی مکتوب و پتیا بہ معنی پیام، دشٹ سنسکرت بہ معنی نگاہ و شست فارسی، پرتاب در ہردو زبان بہ معنی بزرگی و کرامت، پرشاد و فرشاد بہ معنی تبرک، پاس ہندی و پاش فارسی، ہردو بہ معنی شوکت، مہمان بہ معنی سیف و ضیافت، کان دکھان بہ معنی معدن، چکل و چھاکل بہ معنی ظرفے کہ برائے نگاہ داشتن آب از چرم سازند، دشت در ہردو زبان بہ معنی مکروہ، حال در ہردو زبان بہ معنی دام، تال ہردو زبان بہ معنی آب گیر، تنگل بہ کسر اول مرادف پینہ و در سنسکرت تھنگی، بوم فارسی بہ معنی زمین، بھوم و بھومی در سنسکرت بہ ہمیں معنی: تپاس فارسی و تپسیا سنسکرت بہ معنی ریاضت، جنگل بہ معنی بیابان در ہردو زبان مشترک ـــــ سریر در فارسی بہ معنی جسم و شریر در سنسکرت، کام فارسی بہ معنی مقصد و سنسکرت بہ معنی شہوت و جماع، کامنا بہ معنی خواہش، من بہ میم مفتوح در ہردو زبان بہ معنی قلب، بانو و بنوبہ معنی خاتون، ستان و استھان بہ معنی محل، ساسان در فارسی ہماں معنی دارد کہ در سنسکرت سنیاسی دارد۔ یعنی درویش مرتاض۔

سلاطین ساسانیہ کے تلقب کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ ان کا مورث اعلیٰ قلندرانہ زندگی بسر کرتا تھا۔

ابوسلمان شاہجہانپوری
کراچی (پاکستان)

سب سے زیادہ اہم اور طوفانی دور میں یعنی ۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۶ء تک اس کی سربراہی جس ذہانت، نکتہ رسی اور ہوش مندی سے کی۔ اس سے حصولِ آزادی کی راہیں سمٹ گئیں اور اس کی منزل بہت قریب آگئی۔ مولانا آزاد ہندوستان کو جلد سے جلد آزاد دیکھنے کے آرزومند تھے۔ مگر آزادی کے لیے ہندوستان کے سبھی فرقوں کے آپسی اتحاد کو بہت ضروری سمجھتے تھے۔ انھوں نے بارہا اس کا اعلان کیا کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان یہاں کے ۲۲ کروڑ ہندو بھائیوں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ دونوں مل کر ہندوستان کی ایک قوم اور نیشن بن جائیں۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ۱۹۲۳ء میں انھوں نے بڑی صفائی کے ساتھ کہا تھا کہ: "آج ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں سے اتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کر دے کہ آزادی ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتی ہے بشرطیکہ ہندوستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں آزادی اور سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا مگر اس اتحاد سے دست بردار نہ ہو سکوں گا کیوں کہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن ہمارا میل محبت اور آپسی اتحاد جاتا رہا تو یہ عالمِ انسانیت کا نقصان ہے۔"

مولانا آزاد [illegible] کے ذریعے صحافت [illegible] تک پہنچایا۔ "تذکرہ"، "ترجمان القرآن" اور "غبارِ خاطر" جیسے علمی و ادبی شاہکار آنے والی نسلوں کی رہبری کے لیے چھوڑے۔ ملک کی آزادی کے لیے دس سال سات مہینے قید و بند کی مصیبتوں میں گزار دیے اور "قولِ فیصل" کے ذریعے ایک ایسی گراں قدر یادگار چھوڑ گئے جو ایک مثالی سیاسی تعلیم ہے۔

مولانا آزاد کی ہمہ گیر شخصیت اور ان کی عظمتوں کا تذکرہ کیسے کیا جائے، "سفینہ چاہیے اس بحرِ بیکراں کے لیے"۔ وہ ہندوستان کی علمی، ادبی، سیاسی، مذہبی، تہذیبی اور ثقافتی قدروں کے امین تھے۔ انھوں نے ہندوستان کی سوئی ہوئی قومیت کی روح کو بیدار کیا۔ وہ اپنے انداز کے موجد بھی تھے اور خاتم بھی۔ اور یہی خوبی اس عظیم شخصیت کی یگانگی کی دلیل ہے۔

کِس کِس طرح جھکا کر چھوڑا اور کِس لیے؟ صرف اس لیے کہ جانتا تھا کہ اگر سو روپے ماہوار بخشش بند ہوگئی تو جینے کا کوئی سہارا باقی نہ رہے گا جب کلب علی خاں نے تواضعاً لکھا کہ نسبت تلمذ رکھتا ہوں، تو لکھتے ہیں:

"یہ دُکان بے رونق کی خریداری ہے۔ میں تو حضور کو اپنا استاد، اپنا مرشد، اپنا آقا جانتا ہوں اب پیر و مرشد نے لکھا ہے کہ ارتنگ و ارژنگ متحدالمعانی ہیں، تو میں نے بے تکلف مان لیا۔ نہ لغت نویسوں کے بہ موجب بلکہ اپنے خداوند کے حکم کے مطابق۔"

پھر جب اس پر بھی اظہارِ ناراضگی ہوا تو لکھتے ہیں۔

"خط پڑھتے ہی کانپ اٹھا۔ عالم نظروں میں تیرہ و تار ہو گیا۔ گناہ معاف کیجیے نویدِ عفو سے تقویت پہنچایئے۔"

پھر جس شخص کی رگِ گردن اس قدر سخت ہو کہ ہندوستان کے تمام فارسی ادیبوں میں سے خسرو کے سوا اور کسی کے آگے نہ جھکتی ہو، اور فیضی اور ابوالفضل جیسے باکمالوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا تھا[1]۔ وہ کلب علی خاں کے آگے ہاتھ جوڑ کر سر جھکا رہا ہے کہ میں نے خداوند نعمت کا حکم مان لیا اور اپنی تحقیق سے باز آیا[2]۔

اخبار دوربین اور کلکتے کے ادبی ہنگامے[3]

کلکتے میں انگریزی حکومت کے استقرار کی وجہ سے نئی چیزوں سے لوگ آشنا ہو چکے تھے۔ فارسی میں کئی اخبار نکلے۔ من جملہ ان کے "دوربین" بھی تھا، جس کے کئی ایڈیٹر ہوئے۔ آخری ایڈیٹر نواب شمس الہدیٰ مرحوم کے والد (نواب عبداللطیف) تھے۔

میں نے ان کے وہ پرچے دیکھے ہیں، جن میں مرزا غالب مرحوم کے ہنگام ورود و قیام کلکتہ، یہاں کے مشاعرے اور صحبتیں اور شعرائے کلکتہ کی مخالفت اور مثنوی بادِ مخالف وغیرہ حالات چھپے تھے۔ اور پھر ایک پرچے میں مرزا غالب مرحوم کی بالزام قمار بازی، دلی میں گرفتاری اور سزا یابی کی خبر بڑے طعن و تشنیع و استہزا کے ساتھ چھپی تھی۔

اس وقت کلکتے کے شعرا و ادبا ان اخبارات میں فارسی نظم و نثر لکھا کرتے تھے۔ غدر کے بعد جب مرزا غالب مرحوم نے "قاطع برہان" شائع کی، جس میں "برہان قاطع" پر اعتراضات کیے گئے تھے، اور ان کے ایرادات مقلدین لغت ہند پر نہایت شاق گذرے اور ایک عام ایجی ٹیشن ان کے خلاف پھیل گیا تو اس میں بڑا حصہ کلکتہ کے ان فارسی اخبارات ہی نے لیا تھا، اور بہ کثرت مضامین اس موضوع پر شائع ہوتے رہتے تھے۔ میں نے وہ تمام پرچے دیکھے ہیں۔

قاطع برہان

میری تیرہ برس کی عمر تھی کہ مدراس کے ایک اخبار "تحریر نارنگار" میں "یادگارِ غالب" کا اشتہار دیکھا۔ یہ اخبار ہر ہفتے سرورق پر ایک مخمس قدسیؔ کی مشہور نعتیہ غزل "مرحبا سید مکی مدنی العربی" پر چھاپا کرتا تھا، اس لیے حافظ ولی اللہ، والد مرحوم کے خادم خاص اور میرے الف، بے، تے کے استاد، اسے بڑی دلچسپی سے پڑھا کرتے تھے۔ والد مرحوم کے ایک مرید، حاجی مصلح الدین سوداگر، انھیں ہر ہفتے لا کر دیا کرتے تھے۔ بہر حال میں نے بڑے شوق سے کتاب منگائی۔ یہ میرے اردو مطالعے کا بالکل آغاز تھا۔ کتاب میں "برہان قاطع" کے معرکے کا جب حال پڑھا تو شوق ہوا کہ یہ تمام کتابیں دیکھنی چاہئیں۔ چنانچہ "قاطع برہان" اس کا دوسرا ایڈیشن "درفش کاویانی" "قاطع القاطع" "ساطع برہان" "محرق قاطع" "موید برہان" "تیغ تیز" "شمشیر تیز" وغیرہ تمام رسائل بہ سعی و جستجو جمع کیے۔ چوں کہ اس زمانے میں فارسی ادب اور فارسی لغات کے مطالعہ و تحقیق کا بھی شوق تھا اور تصحیح الفاظ کی بڑی کاوش رہتی تھی۔ اس لیے پوری دلچسپی کے ساتھ مطالعے کا موقع مِلا۔ واقعہ یہ ہے کہ مرزا غالب نے یہ چند اجزا لکھ کر علم و تحقیق کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔ افسوس ہے کہ خواجہ حالی نے (یادگار غالب میں) اس بحث کو زیادہ تفصیل کے ساتھ نہیں لکھا۔

قاطع برہان کے رد میں سب سے زیادہ مبسوط کتاب مولوی احمد علی کی موید البرہان ہے۔ یہ ڈھاکہ کے باشندے تھے مگر ایرانیت کے تصنع میں اپنے نام کے ساتھ آغا لکھواتے تھے۔ کلکتہ کے فارسی دانوں میں اس تصنع کا مرض عام طور پر رہا ہے۔ اب بھی بنگال کے بہت سے خاندان اپنے کو غزنوی، غوری، شیروانی اور سہروردی ظاہر کرتے ہیں۔ یہ مدرسہ عالیہ میں مدرس تھے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کی مطبوعات کی تصحیح بھی کرتے تھے۔ فارسی مثنویوں کے حال میں ایک رسالہ "ہفت آسمان" لکھا تھا، جو (ایشیاٹک) سوسائٹی نے چھاپ دیا ہے۔

مرزا غالب کے حالات میں ضروری ہے کہ اس معاملے پر بہ تفصیل نظر ڈالی جائے۔ برہان قاطع کی جو خرافات انھوں نے نقل کی ہیں، انھیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ کوئی صاحب علم و بصیرت کیوں کر ان کی تائید کر سکتا ہے؟ مگر مصیبت یہ ہے کہ سارا معاملہ ایک طرح کا منطقی مصادرہ تھا۔ اعتراض ہندی لغت نویسوں پر تھا اور ہندی لغت نویسوں ہی کا کلام بہ طور دلیل کے پیش کیا جاتا۔

رضا قلی خاں ہدایت، صاحب "مجمع الفصحا" نے مرزا غالب کے چند سال بعد "فرہنگ انجمن آرائے ناصری" لکھی، جو تہران میں چھپ گئی ہے۔ اسے پیش نظر رکھنا چاہیے اس معاملے پر اسلہ مباحث نقل کر کے



الف، فارسی کرابتداءِ کلمہ میں افادۂ نفی کرتا ہے۔ مثلاً اخواستی واجنبان۔ سنسکرت میں بھی یہی اثر رکھتا ہے۔ مثلاً امرواچل۔

مرزا غالب نے اس مشابہت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور وال اور ت، سین اور شین وغیرہ کے استبدال کی بھی مثالیں دی ہیں، جو بالکل صحیح ہیں۔

پارسیوں کا دینی لٹریچر

پارسیوں کا جو دینی لٹریچر اٹھارویں اور انیسویں صدی میں مستشرقین یورپ اور بمبئی کے پارسیوں کی کوششوں سے نمایاں ہوکر شائع ہوا۔ ان میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو صریح اسلامی عقائد اور اسلامی روایات کا عکس معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً زردشت کی معراج جنت و دوزخ کے مشاہدات، پل صراط وغیرہ۔

اسپیگل وغیرہ محققین ان تحریرات کی زبان و اسلوب کے مطالعے کے بعد اس نتیجے تک پہنچے کہ یہ بعد از عہدِ اسلام کے مجوسی اختراعات ہیں۔ اور ان کی قدامت زیادہ سے زیادہ دسویں صدی عیسوی تک لے جائی جا سکتی ہے اور وہ بھی ہر تحریر کے لیے نہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبدالصمد پر یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو چکی تھی۔ چنانچہ "درفش کاویانی" کے خاتمے میں، سب سے پہلا فائدہ اسی مضمون کا ہے۔ مینار اور چینور وغیرہ مصطلحات کو بعد کی اختراعات قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں:

"مولانا ماہر مرزوم تم عبدالصمد این راز با من می گفت و بر فریب و نیرنگ پارسیان می خندید و نگارندۂ دبستان مذاہب را یکے از اینان می دانست۔"

البتہ معلوم ہوتا ہے کہ دساتیر کے بارے میں جو دھوکا سر ولیم جونس وغیرہ کو ابتدا میں ہوا تھا اس کی حقیقت عبدالصمد پر نہیں کھلی تھی۔ وہ دساتیر کو ساسان پنجم کی واقعی تصنیف تصور کرتا تھا۔ اور مرزا غالب بھی عمر بھر اسی دھوکے میں رہے۔ حالاں کہ دساتیر بھی سر تا سر جعل و اختراع ہے اور قطعاً ظہور اسلام کے بہت بعد لکھی گئی ہے۔ مُلّا فیروز نے گورنر بمبئی کی فرمائش سے اس کا ترجمہ کر کے مع اصل کے شائع کیا تھا۔ لیکن بہت جلد اہل علم کا فیصلہ اس کے خلاف صادر ہو گیا۔

لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں ساسانی حکومت کے خاتمے اور تازیوں کے استیلا کی خبر بھی صاف صاف لفظوں میں دے دی گئی ہے۔ نیز ظہور اسلام کی۔ گویا ساسان پنجم یا اردشیر بابکان کو ادھورا مزدکی وحی سے یہ امور معلوم ہو گئے تھے۔

محققین کا فیصلہ ہے کہ اس کی زبان "اوستا" یا اس کی شرح "پاتخوان" کی زبان نہیں ہے بلکہ محض ایک بناوٹی اسلوب ہے، جس میں پرانے الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں۔

بہر حال عبدالصمد ایک غیر معمولی علم و استعداد کا آدمی تھا ______ بلاشبہ مرزا غالب کی غیر معمولی فارسی مناسبت و رسوخ میں اس کی تعلیم کو بہت بڑا دخل ہوگا اور اس بارے میں وہ جو کچھ لکھتے ہیں، حرف بہ حرف صحیح ہے۔

دبستان مذاہب کے مصنف کی نسبت بھی ان کا خیال صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آذر کیوان کا ایک شاگرد اس کا مصنف تھا۔ محسن فانی وغیرہ کی نسبتیں غیر معتمد ہیں۔ سر ولیم جونس نے پہلے اس کتاب کو تاریخ ایران کی مشکلات کا حل سمجھ لیا تھا اور بڑی ٹھوکر کھائی تھی۔ ان ہی کے ایما و مصارف سے محمد حسین نے اسے کلکتہ سے چھاپا تھا۔

برہان قاطع والی مصیبت

"رام پور" کے مجموعے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلب علی خاں ابتدا میں مرزا غالب سے ادبی علاقہ رکھنا چاہتے تھے اور ایک نثر معائنے کے لیے بھیجی تھی۔ بہ ظاہر شاگردانہ درخواست اصلاح تھی۔ مگر دراصل ان سے مداحی کرانا چاہتے تھے۔ انھوں نے بڑی تعریف کی طاہر وحید اور طباطبائی سے بڑھا دیا۔ لیکن چوں کہ اصلاح کے معاملے میں دانستہ تسامح ممکن نہ تھا، اس لیے بعض الفاظ کی تصحیح کر دی۔ کلب علی خاں پر یہ بات گراں گذری۔ ان کے اساتذہ نے ہندوستانی لغت نویسوں کی عبارتیں نکال کر پیش کر دیں اور وہ انھوں نے مرزا کو بھیج دیں۔ مرزا بے چارے اب رام پور کے وظیفے پر جی رہے تھے۔ یہ معاملہ دیکھ کر بہت پریشان ہوئے۔ برہان قاطع والی مصیبت یہاں بھی پیش آ گئی۔ پہلے ہندوستانی لغت نویسوں کے باب میں اپنا عقیدہ لکھا۔ پھر جب اس پر کلب علی خاں بگڑ گئے، تو زار نالی کر کے معافیاں مانگیں۔ ارتنگ اور ارژنگ کو برہان قاطع وغیرہ نے مرادف لکھا ہے، لیکن قطعاً غلط ہے۔ ارتنگ مانی اور ارژنگ ایک مصور کا نام تھا۔ نظامی نے "شیریں خسرو" میں کہا ہے:

بقصر دوستم مانی و ارژنگ
طراز سحر می بستند بر سنگ

نواب کلب علی خاں نے اپنی نثر میں انھیں مرادف سمجھ کر جمع کر دیا تھا۔ غالب نے اس سے اختلاف کیا۔ اسی طرح "آشیاں چیدن" کو عرفی کے مکتبی شارحوں نے "آشیاں بستن" کے معنوں میں لیا ہے، مگر غلط ہے۔ کلب علی خاں اس پر مصر ہوئے اور ثبوت میں عرفی کی شرح پیش کی۔

زمانے کی ستم ظریفی

زمانے کی ستم ظریفی دیکھنی چاہیے کہ غالب جیسے مغرور فن و کمال کو ایک خام کار مسند نشین کے آگے



مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت

مفکّر، عالم، مدبّر، مجاہدِ آزادی، مذہبی رہنما، مفسّرِ قرآن، صحافی، مقرر محی الدین احمد ابوالکلام آزاد ایک ایسی باکمال ہستی تھے جو بطنِ گیتی سے صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ غبارِ خاطر جیسی لاثانی تصنیف کے خالق کی آخری کتاب ان کی انگریزی میں سوانح عمری India Wins Freedom (ہندوستان آزادی حاصل کرتا ہے) ہے جو ۱۹۵۸ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ یہ کتاب سیاسی پہلو سے اس نصف صدی کی اہم ترین تصنیف سمجھی جاتی ہے اور اب تک یہ بیس بار طبع ہو چکی ہے اور کئی ہندوستانی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

ایک عام ہندوستانی کے لیے وہ ایک بلند پایہ سیاسی رہنما تھے جن کا اعتقاد، ایمان اور مسلک آخر تک متزلزل نہیں ہوا۔ مولانا عزم، استقلال اور ہمت کا پیکر تھے اور سخت، صبر آزما اور حوصلہ شکن حالات میں بھی انھوں نے کانگریس کا دامن نہیں چھوڑا اس وقت بھی نہیں جب وہ اپنے ہی مذہب کے لاتعداد گمراہ لوگوں اور سیاسی مخالفوں کے طعن و تشنیع اور ملامت کا نشانہ بنے۔ حوادث کے سخت سے سخت طوفانوں اور آندھیوں نے بھی ان کے پائے استقلال کو نہیں ڈگمگایا۔

۱۹۱۹ء یا ۱۹۲۰ء کی بات ہے کہ مولانا آزاد پہلی دفعہ دلّی میں سُنے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دلّی والوں کی اپنی مخصوص سماجی زندگی تھی اور عوام میں سیاسی شعور زیادہ بیدار نہیں ہوا تھا۔ آصف علی نئے نئے کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ وہ اپنے عمدہ وضع قطع کے انگریزی لباس میں دھواں دھار تقریر کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے پہلے پہل دلّی میں ایک کانگریسی کے طور پر ایک مقامی تھیٹر میں تقریر کی تھی۔ اُس وقت کے تحریری حوالوں کے مطابق جب آصف علی کی تقریر جذبات کو مشتعل کرنے والی ایک بجلی کی گرج تھی وہاں مولانا آزاد کی تقریر ایک ایسی موثر آواز تھی جو دلوں میں اُتر گئی اور جس نے لوگوں میں حب الوطنی کے ارفع جذبات بیدار کر دیے۔

... داس، موتی لال نہرو اور ... صاحب ... تحریکِ سول نافرمانی کے چوٹی کے لیڈروں میں سے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز کے بمبئی ... پر ہڑتال وہاں ہوئی اور عوام پر گولی بھی ... اس کا اثر دوسرے شہروں میں بھی ہوا۔ برٹش سرکار نے یہی بہتر سمجھا کہ ان سب چوٹی کے لیڈروں کو گرفتار کر لیا جائے۔ مگر اس سے حالات میں بہتری نہیں آئی۔ ۲۴ دسمبر کو پرنس آف ویلز کو کلکتہ پہنچنا تھا وہاں پرنس کے خلاف ہڑتال اور مظاہروں کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ وائسرائے ریڈنگ نے بڑی کوشش کی کہ کلکتے میں ہڑتال اور مظاہرے نہ ہوں اور انھوں نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت کانگریس کو صوبائی خود اختیاری دلانے کا وعدہ بھی کیا مگر مولانا آزاد اور موتی لال نہرو ہڑتال کو رد کرنے کے سخت خلاف تھے۔ مولانا آزاد کی طرف سے ایک بیان جاری ہوا جس میں کلکتے کے شہریوں کو اپنے طے شدہ پروگرام پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برٹش سرکار کے سخت اقدامات کے باوجود کلکتے میں ۲۴ دسمبر کو پرنس آف ویلز کی آمد کے خلاف زبردست ہڑتال اور مظاہرے ہوئے اور کرسمس تہوار کی تقریبات کے باوجود سارا کلکتہ ایک نیم تاریک اور اجڑے شہر میں تبدیل ہو گیا۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی میں مولانا آزاد کی رائے کا ہمیشہ احترام کیا جاتا رہا۔ ۱۹۲۴ء کی بات ہے، گاندھی جی اور مولانا آزاد جیل میں تھے۔ باقی چوٹی کے لیڈروں میں اختلاف رائے تھا۔ سی۔ آر۔ داس، موتی لال نہرو، اجمل خاں اور وٹھل بھائی پٹیل اس بات کے حق میں تھے کہ کانگریس کونسلوں کے الیکشن میں حصہ لے اور ان میں طاقت حاصل کر کے اندر سے انگریزی حکومت کا تختہ پلٹ دے مگر راجگوپال آچاریہ راجندر پرشاد اس رائے کے سخت خلاف تھے۔ تاہم خیال یہ تھا کہ چونکہ چوٹی کے لیڈروں کی اکثریت اس کے حق میں تھی اور گاندھی جی اور آزاد جیل میں تھے، اسمبلیوں کے اندر سے لڑائی جاری رکھنے کی تجویز مان لی جائے گی۔ مگر راجہ جی

م۔ م۔ راجندر
۶۸، چتروہار، نئی دہلی ۱۱۰۰۹۲

پر تفصیل بحث کرنی چاہیے۔ فارسی لغت کے لیے صرف یہی لغت مستند تصور کی جاسکتی ہے۔

کیا اچھا ہو اگر درفشِ کاویانی کو بعد کے مباحث کے اضافے کے ساتھ ازسرِ نو شائع کردیا جائے یا تیغ تیز اور لطائفِ غیبی بہ جنسہٖ آخر میں شائع کردی جائیں۔ درفشِ کاویانی میں طباعت کی غلطیاں بہت ہیں۔ ان کی تصحیح بہت ضروری ہے۔

حواشی

۱۔ ایک خط میں صاحب عالم مارہروی کو مخاطب کرکے مرزا غالب لکھتے ہیں:

"ہندوستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا خسرو کہ خسروِ قلمروِ سخن طرازی ہے، یا ہم چشم نظامی گنجوی وہم طرح سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گو ئی میں مشہور ہے کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔"

(عودِ ہندی۔ ص۔ ۶۱)

۲۔ ایک دوسری جگہ فیضی کے بارے میں لکھتے ہیں:
"میاں فیضی کی بھی کہیں کہیں ٹھیک نکل جاتی ہے۔"

۳۔ یہاں سے اس بحث کے آخر تک کی عبارت "ابوالکلام کی کہانی خود ان کی زبانی" مرتبہ مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے ماخوذ ہے۔○

ے لیں۔ جب مولانا آزاد کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے بخوشی صدارت نہرو کے حوالے کر دی۔ یہ ایک بڑی ذاتی قربانی تھی اور عام حالات میں ہر آدمی اسے اپنی ہتک سمجھتا۔ مگر مولانا آزاد نے ایک بیان میں کہا۔ "یہ بات بالکل غیر اہم ہے کہ کانگرس کا صدر میں ہوں یا جواہر۔ ہم دونوں میں خیالات کا کوئی فرق نہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ شملہ کانفرنس ناکام نہ ہو۔"

پھر ۱۵ ارجون کو آل انڈیا کانگرس کمیٹی کی وہ میٹنگ ہوئی جس میں ملک کی تقسیم کو منظور کیا جانا تھا۔ گاندھی جی اس جلسے میں خاص طور پر مدعو تھے۔ سب لیڈروں نے محسوس کر لیا تھا کہ اس حل کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ گاندھی جی بھی بے دلی سے اس کے حق میں تھے مگر کچھ مخالفت ناگزیر تھی اور یہ گروپ خاصہ طاقتور تھا۔ گاندھی جی کی تقریر کے بعد مولانا آزاد نے تقریر کی۔ انھوں نے مخالفوں کی تسلی کے لیے یہاں تک کہہ دیا۔ "جلد ہی ملک کے تقسیم شدہ حصے پھر مل جائیں گے۔" یہ آواز ان کے دل کی تھی اور ان کی تقریر کے بعد مخالفت برائے نام رہ گئی۔

مولانا آزاد نہرو سے بہت محبت کرتے تھے لیکن نہرو کوئی غلطی کرتے تو ان کی مخالفت سے بھی گریز نہ کرتے۔ جب صوبہ سرحد میں اس بات پر ریفرینڈم ہونا تھا کہ وہ ہندوستان میں شامل ہونا چاہتا ہے یا پاکستان میں تو خان عبدالغفار خاں کی ریڈ شرٹ پارٹی یعنی خدائی خدمتگاروں نے اس کا بائیکاٹ کر دیا۔ نہرو ریفرینڈم سے پہلے صوبہ سرحد کے دورے پر جانا چاہتے تھے۔ آزاد نے یہ کہہ کر ان کی مخالفت کی کہ وہاں فضا اب سازگار نہیں ہے اور اس موقعے پر آپ کا جانا الٹا اثر پیدا کرے گا جو کانگرس کے حق میں نہیں ہوگا۔ انھوں نے نہرو کو یہ بھی بتایا کہ یہ ریفرینڈم انگریزوں کی گہری چال ہے تاکہ صوبہ سرحد ہندوستان میں شامل نہ ہو اور پاکستان بننے کے بعد جلد یا بدیر پختونستان کا ایک آزاد اور کمزور ملک قائم ہو جائے جو ہندوستان کے اثر سے باہر ہو۔ مولانا آزاد کی یہ بات کہ نہرو کا صوبہ سرحد کا دورہ کامیاب نہیں ہوگا ٹھیک ثابت ہوئی اور وہاں کئی مقامات پر مسلم لیگ اور انگریزوں کی سازش سے ان کے خلاف مظاہرے ہوئے اور ریفرینڈم کا فیصلہ ۴۹ - ۵۱ فیصد ووٹوں سے پاکستان کے حق میں ہوا۔ یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا کہ سردار پٹیل نے بھی مولانا آزاد کی اس رائے سے اتفاق کیا تھا۔

۱۹۵۴ء میں جب ملک میں یہ اعلان کیا گیا کہ پنڈت نہرو چاؤ۔ این۔ لائی کی دعوت پر چین کا دورہ کریں گے تو مولانا آزاد پہلے ہندوستانی مدبّر تھے جنھوں نے اس دورے کی کامیابی پر شک کیا اور انھوں نے نہرو کو یہ تنبیہہ بھی کی کہ وہ اس پر زیادہ گہرائی سے سوچیں۔ نہرو کے چین جانے سے پہلے ہی کوریا سے یہ خبر آگئی کہ چینی لیڈروں نے چین میں ہمارے نمائندے سے یہ کہا کہ ہندوستان نے ابھی تک اپنی غلامانہ ذہنیت کو نہیں چھوڑا تھا کیونکہ ابھی تک فوجی احکام انگریزی میں دیے جاتے تھے۔ مولانا آزاد نے نہرو سے کہا کہ آپ چینیوں سے دو سوالوں کا جواب معلوم کریں۔ ایک یہ کہ کیا وہ کمیونسٹ پہلے ہیں اور ایشیائی بعد میں اور دوسرے کیا چین دوسرے چھوٹے ایشیائی ملکوں کے تحفظ کی گارنٹی دے گا؟ نہرو چین چلے تو گئے اور ان کا وہاں شاندار خیر مقدم بھی ہوا اور "ہندی چینی بھائی بھائی" کے نعرے بھی لگے مگر نہرو چینیوں سے مولانا آزاد کے بتائے ہوئے سوالوں کے جواب حاصل نہیں کر سکے اور ہم سب جانتے ہیں کہ چین نے ۱۹۶۲ء میں ہندوستان کے شمالی علاقوں پر حملہ کر دیا تھا۔

آزادی کے بعد زبان کی بنیاد پر صوبوں کی تشکیل عمل میں آنی شروع ہو گئی۔ اس وقت اس اقدام کا خطرہ اتنا محسوس نہیں کیا گیا جتنا آج کیا جا رہا ہے۔ آندھرا کے بننے کے بعد کئی اور علاقوں سے ایسی مانگیں سر اٹھانے لگیں۔ پنڈت نہرو اور ان کی کیبنیٹ اور کانگرس ہائی کمانڈ اس کی مخالفت کرنا چاہتے تھے مگر جب بیدگام میں پنڈت نہرو کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کیا گیا تو انھوں نے فضل علی کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کر دیا۔ اس کمیشن کی رپورٹ میں زبان کے آدھار پر صوبوں کی تشکیل کی بہ حیثیت مجموعی حمایت کی گئی۔ اس سے ایک بڑا خطرہ پیدا ہو گیا اور بمبئی اور دوسرے علاقوں سے نئی مانگیں اٹھائے جانے کا اندیشہ بڑھ گیا۔ پنڈت نہرو کو صلاح دی گئی کہ فضل علی رپورٹ کو حکومت صرف اپنی رہنمائی کے لیے استعمال کرے اور فیصلہ آزادانہ خود لے۔ نہرو اس سلسلے میں قوم کو ریڈیو سے مخاطب کرنا چاہتے تھے مگر مولانا آزاد نے اس کی مخالفت کی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ملک میں صوبوں کی تشکیل زبان اور دیگر علاقائی ترجیحات کی بنا پر کی جائے کیونکہ اس سے قومی یکجہتی کو خطرہ پیدا ہوگا۔ گزشتہ دو تین دہائیوں کے واقعات نے یہ ثابت کر دیا کہ مولانا آزاد اپنے خیالات میں کتنے صحیح تھے۔

مولانا آزاد ہر معاملے میں اپنی آزاد رائے رکھتے تھے اور عام حالات میں ان پر اثر ڈالنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی ایک مثال بابو راجندر پرشاد کے دوبارہ راشٹرپتی کے طور پر کھڑے ہونے کا معاملہ تھا۔ راجن بابو اور نہرو میں کچھ معاملات میں شدید اختلافات پیدا ہو گئے تھے۔ یہ معاملات راجن بابو کے لیے ذاتی نوعیت کے تھے اور وہ سرکار کے ان معاملوں میں دخل

اور راجندر بابو کی کوششوں سے کانگریس کے گیا کے اجلاس میں اس تجویز کو رد کر دیا گیا۔ سی۔ آر۔ داس نے اپنی اس شکست کو اتنا محسوس کیا کہ انھوں نے صدر کانگریس کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ سال کے اختتام پر مولانا آزاد جیل سے رہا کر دیے گئے۔ وہ جیل میں بھی ان حالات کا مطالعہ کرتے رہے تھے اور انھیں اس بات کا دکھ تھا کہ کانگریس ہائی کمانڈ کے ممبروں میں جنگِ آزادی کو آگے بڑھانے کے طریقوں پر اختلاف رائے تھا۔ سی۔ آر۔ داس اور موتی لال نہرو کے گروپ کے آدمیوں نے اپنے گروپ کا نام سوراج پارٹی رکھ دیا تھا۔ مولانا آزاد ایک ایسے حل کی تلاش میں لگ گئے جس سے دونوں گروپوں میں سمجھوتہ ہو سکے۔ ان کی کوشش تھی کہ کوئی بیچ کا راستہ اختیار کیا جائے اور کانگریس اسمبلیوں میں داخل ہو کر اندر سے لڑائی بھی جاری رکھے۔ کوئی اور لیڈر ہوتا تو شاید اس کی سمجھوتے کی کوشش کامیاب نہ ہوتی مگر مولانا آزاد کی رائے کا احترام دونوں گروپ کرتے تھے اور ان کی تجویز کا خیر مقدم کیا گیا۔ دلی میں مولانا آزاد کی صدارت میں کانگریس کا ایک خصوصی جلسہ ہوا اور اس میں رسمی طور پر ان کے فارمولے کو اتفاق رائے سے قبول کر لیا گیا۔ اس طرح سے مولانا آزاد کی دانشمندی سے کانگریس ایک نازک صورتِ حال پر قابو پا گئی۔

دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں ہونے والا کانگریس کا اجلاس بڑی تاریخی اہمیت رکھتا تھا۔ اس کی صدارت کے لیے کانگریس کی صوبائی کمیٹیوں نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کا نام تجویز کیا تھا مگر گاندھی جی نے ایک بیان میں جواہر لال نہرو کو ترجیح دی۔ اس پر کانگریس کے تمام سینئر لیڈر حیران رہ گئے اور بہت سوں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی حق تلفی ہوئی ہے۔ لیکن گاندھی جی کا کہنا تھا کہ اب جنگِ آزادی میں ایک ایسا نازک موڑ آنے والا ہے جس میں نئے خون اور جوش کی ضرورت ہوگی۔ اس موقع پر بھی مولانا آزاد نے اپنی مخصوص دوراندیشی کا ثبوت دیا۔ انھوں نے کہا کہ جواہر ہندو اور مسلم نوجوانوں کو یکساں اپیل کرے گا اور صدارت کے لیے اس سے زیادہ موزوں نام نہیں ہے۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۲۹ء میں کانگریس کے لاہور کے جلسے کی صدارت پنڈت جواہر لال نہرو نے کی اور

> ... مولانا آزاد میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ نہ ہی انھوں نے کسی اہم سے اہم معاملے کو جس کا تعلق ان کی ذات اور ساکھ سے ہوا اپنی حب الوطنی کے جذبے پر اثر انداز ہونے دیا ..

۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو دریائے راوی کے کنارے مکمل آزادی کا وہ تاریخی اعلان پڑھا گیا جو بعد میں ہمارے جمہوریہ کا سنگِ بنیاد بنا۔ اس اعلان کا مسودہ تیار کرنے میں مولانا آزاد کا ہاتھ بھی تھا۔

۱۹۴۰ء کے رام گڑھ میں ہوئے کانگریس کے تاریخی سالانہ اجلاس کے لیے مولانا آزاد کا انتخاب کیا گیا۔ سیاسی اعتبار سے یہ بڑا اہم دور تھا کیونکہ محمد علی جناح کا اثر و رسوخ مسلمانوں میں بڑھ رہا تھا اور وہ یہ دعوے کر رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے واحد نمائندے ہیں۔ انگریز حکام ہندوؤں اور مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کر کے "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کی پالیسی پر عمل پیرا تھے اور جزوی طور پر کامیاب ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اس کے برعکس کانگریس کا دعویٰ تھا کہ وہ تمام ہندوستانیوں کی نمائندہ جماعت ہے جن میں مسلمان بھی شامل ہیں۔ محمد علی جناح نے اب مولانا آزاد کے لیے کانگریس کا Show Boy یعنی "نمائشی آدمی" کی تضحیک آمیز اصطلاح استعمال کرنی شروع کر دی تھی۔ مگر مولانا آزاد کردار اور مسلک کے اعتبار سے لوہے کے آدمی تھے۔ وہ انگریزوں کی چالوں کو سمجھتے تھے۔ انھیں حب الوطنی سب سے زیادہ عزیز تھی اور انھوں نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ ان کے گمراہ سیاسی مخالف انھیں کیا کہتے ہیں۔ انھوں نے ایک اخباری نمائندے سے کہا: "جناح مجھے کیا سمجھتا ہے مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔ نہ ہی اس کی آواز مسلمانوں کی آواز ہے۔ مجھے اپنا وطن جان سے زیادہ عزیز ہے اور اس قسم کے سستے اور رکیک جملے مجھے مشتعل نہیں کر سکتے۔"

مولانا آزاد میں غرور کا شائبہ تک نہ تھا۔ نہ ہی انھوں نے کسی اہم سے اہم معاملے کو جس کا تعلق ان کی ذات اور ساکھ سے ہوا اپنی حب الوطنی کے جذبے پر اثر انداز ہونے دیا۔ ۱۹۴۶ء میں شملہ کانفرنس کے دنوں میں جب مرکز میں عارضی حکومت بنائے جانے اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کی تشکیل کی بات چیت چل رہی تھی اور مولانا آزاد کانگریس کے صدر کے طور پر اس بات چیت میں جس میں جناح اور لیاقت علی بھی شریک تھے، پورا حصہ لے رہے تھے تو جناح نے کچھ ایسے سوال اٹھا دیے جن کی وجہ سے بات چیت کا آگے بڑھنا مشکل ہو گیا اور یہ محسوس کیا گیا کہ نہرو آزاد سے کانگریس کی صدارت

مولانا آزاد کی انتظامی صلاحیتیں

گوپی ناتھ امن صاحب نے ایک بار مولانا آزاد کی جامع کمالات شخصیت کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان کی شخصیت کا گلدستہ رنگ برنگ کے پھولوں سے آراستہ ہے اور ہر رنگ اپنی جگہ اتنا گہرا اور واضح ہے کہ یہ طے کرنا محال ہو جاتا ہے کہ کون سا رنگ دوسرے رنگ پر حاوی ہے اور ان کی ذات کا کون سا پہلو دوسرے پہلو سے برتر یا افضل ہے۔ امن صاحب نے مزید کہا تھا "جب ایک ذات میں بہت سی خوبیاں جمع ہوں تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے، کہ اس کی کون سی خوبی سب سے نمایاں ہے۔ مولانا عالم زیادہ بڑے تھے یا سیاست داں۔ ان میں قوتِ تحریر زبردست تھی یا قوتِ تقریر۔ ان میں ذکاوت زیادہ تھی یا حافظہ۔ ان میں قوتِ برداشت زیادہ تھی یا برجستگی ان میں تنظیم زیادہ تھی یا ادراکِ حقیقت۔ اس کا اندازہ وہی شخص کر سکتا ہے جس میں ان خوبیوں کو سمجھنے کی پوری صلاحیت ہو۔"

اس میں شک نہیں کہ مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں جن میں یہ طے کرنا آسان نہیں کہ کون سا پہلو دوسرے پہلو پر فضیلت رکھتا ہے۔ وہ عالمِ دین تھے، مفکر تھے اعلیٰ درجے کے صحافی تھے خطیب تھے، سیاست داں تھے۔ جنگِ آزادی کے صفِ اوّل کے مجاہد تھے۔ یہ سب ان کی ذات کی وہ صفات ہیں جو روزِ روشن کی طرح ہم سب پر عیاں ہیں۔ ہمارے دور کے مفکروں صحافیوں اور مورخوں نے مولانا کے ایک ایک وصف اور ان کے ایک ایک عمل کا جائزہ لیا ہے پھر بھی ابھی بہت گنجائش ہے کہ ان کے افکار اور اقوال کی مزید چھان بین اور تحقیق کی جائے اور نئی نسل کے لوگوں کو اس عظیم الشان شخصیت اور اس کے عظیم کارناموں سے روشناس کرایا جائے تاکہ ان کے اعمال اور اقوال آنے والوں کے لیے مشعلِ راہ بن سکیں شخصیت کا جائزہ اور سنجیدگی سے لیا جا سکے۔

موجودہ مضمون سے راقم الحروف کا مقصد مولانا کی ذات اور ان کے کارناموں کا تعارف پیش کرنا نہیں یہ میرے لیے چھوٹا منہ بڑی بات ہوگی۔ مولانا نے دینی مسائل کو سلجھانے میں جو کارنامہ انجام دیا اس کے لیے عالمِ اسلام ہمیشہ ہمیشہ ان کا مرہونِ منت رہے گا۔ صحافت کے میدان میں مولانا نے عوامی ذہن کی جو تربیت کی اس کی مثال نہیں ملتی۔ آزادی کی راہ میں ان کی قربانیاں ناقابلِ فراموش ہیں ان تمام صفات کے علاوہ ایک پہلو اور ہے جو مولانا کی ذات کو سطحِ عام سے بالاتر کرتا ہے اور وہ ہے ان کی عظیم الشان تنظیمی اور انتظامی صلاحیت۔ اس خوبی کا اندازہ ہمیں ان سرکاری اور غیر سرکاری فائلوں کے مطالعے سے ہوتا ہے جنھیں مولانا کی میز تک پہنچنے کا شرف حاصل ہوا ہے۔

حصولِ آزادی کے بعد مولانا نے حکومتِ ہند کی وزارتِ تعلیم کی ذمہ داری سنبھالی تعلیم کے وسیلے سے مولانا نے ایک نئے سماج کی بنیاد ڈالی اور تعلیمی ڈھانچے کو وہ روپ دیا جس پر ہمارا آج کا سماج کھڑا ہے۔

تعلیم اور کلچر کا ڈھانچہ متعیّن کرتے ہوئے مولانا نے ہندوستانی کلچر کو بیرونی ممالک سے روشناس کرانے کے لیے انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کی بنیاد رکھی اور اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وہ اس کونسل کے کام کو بڑی دلچسپی اور لگن کے ساتھ تا زندگی آگے بڑھاتے رہے۔ فی الحال اسی کونسل کی چند فائلوں کا معائنہ کیا جا سکتا ہے جن کی فوٹو کاپیاں پیشِ خدمت ہیں۔ ان فائلوں پر مختلف حالات میں مولانا کے صادر کیے ہوئے احکامات ہمیں یہ بتائیں گے کہ یہ فیصلے کرنے والی شخصیت کتنی عظیم رہی ہوگی۔

انتظامی فیصلے قانونی فیصلوں سے مختلف اس لیے ہوتے ہیں کہ قانونی فیصلے قانون کے شکنجے میں کسے ہوئے ہوتے ہیں اور قانون کی روشنی ہی میں ہر فیصلہ ہوتا ہے۔ جبکہ انتظامی فیصلے بہت سی پیچیدگیوں اور مصلحتوں پر منحصر ہوتے ہیں۔ انتظامی فیصلوں میں انسانی جذبات احساسات اور انفرادی رجحانات کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ ایسے فیصلے تلخ بھی ہوتے ہیں اور شیریں بھی۔ جو فیصلے دیانتداری اور ایمانداری۔۔۔ کے اصولوں پر کیے جاتے ہیں اُن کی نوعیت ان فیصلوں سے مختلف ہوتی ہے جن کے پیچھے خود غرضی یا کسی قسم کا تعصب کارفرما ہو۔

مولانا کے فیصلوں سے خواہ وہ تلخ ہوں یا شیریں اندازہ ہوتا ہے کہ ہر قسم کے فیصلے غیر انسانی جذبات سے بالاتر ہو کر لیے گئے ہیں۔ ان کے فیصلوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو تلخ ہیں۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید کنبہ پروری اور جانب داری کی وجہ سے ایسا نہ کر پاتا۔

گلزار نقوی
چیف لائبریرین، آئی۔سی۔سی۔آر، آزاد بھون، نئی دہلی



دینے کے خلاف تھے۔ نہرو بضد تھے اور وہ یہ چاہتے تھے کہ جمہوریہ ہندوستان کے نئے صدر رادھا کرشنن ہوں۔ مگر مولانا آزاد کی رائے مختلف تھی - وہ بابو راجندر پرشاد کے دوبارہ راشٹرپتی بنائے جانے کے حق میں تھے۔ اس رائے کے لیے ان کے پاس معقول وجوہ تھیں۔ اور آخر میں آزاد اور ان کے ہم خیال دوسرے رہنما اپنی بات منوانے میں کامیاب ہوئے اور راجندر پرشاد دوسری بار راشٹرپتی کے طور پر منتخب ہوئے۔

جب ۱۹۵۸ء میں کچھ اخباروں میں یہ خبر چھپی کہ ایک مشہور جوتشی نے یہ پیشن گوئی کی ہے کہ ٹی - ٹی - کرشنا مچاری جو اُن دنوں اقتدار کی انتہائی بلندی پر تھے جلد ہی سر کے بل گرنے والے ہیں تو سیاسی حلقوں میں کافی حیرانی ہوئی۔ ستیہ نارائن سنہا نے اس جوتشی کو بلا بھیجا تو اس نے ایک اور پیشن گوئی کر دی — "جس دن کرشنا مچاری حکومت سے باہر ہوں گے، مولانا آزاد غسل خانے میں گر پڑیں گے اور اس کے چار روز بعد ان کی وفات ہو جائے گی"

جب مولانا آزاد کے ساتھ یہ حادثہ پیش آیا تو کلکتے سے ڈاکٹر بی۔ سی رائے کو بلوایا گیا۔ انھوں نے معائنے کے بعد یہ اعلان کیا کہ مولانا آزاد خطرے سے باہر ہیں۔ جب پارلیمنٹ ہاؤس میں ستیہ نارائن سنہا نے پنڈت نہرو سے جوتشی کی بات کا ذکر کیا تو وہ چلّا کر بولے "تم کیا بکواس کر رہے ہو۔ بدھان (ڈاکٹر رائے) کو یقین ہے کہ آزاد کو کوئی خطرہ نہیں ہے" اس کے چار دن بعد ہندوستان کے وزیرِ تعلیم مولانا آزاد راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔

اس طرح آسمانِ صحافت کا یہ آفتاب غروب ہو گیا۔ پنڈت نہرو مولانا آزاد کی وفات سے بُری طرح ہل گئے۔ مولانا آزاد ان کے مشیر تھے۔ وہ مولانا کی ہر رائے کی قدر کرتے تھے۔ ان کی موت پر پنڈت نہرو نے کہا "وہ ایک گوہرِ یکتا تھے۔ ایسے انسان بار بار پیدا نہیں ہوتے"

حواشی

۱- Political History of Modern India By Hutchinson

۲- India By Durga Das

۳- آزاد میموریل لیکچرز

۴- نہرو میوزیم لائبریری میں دستیاب دستاویزات۔

۵- ٹائمز آف انڈیا، ہندوستان ٹائمز اور ٹریبیون کے اُس دور کے پرچے بذریعہ مائکرو فلم۔

بملاحظہ اقدس عالیمرتبت جناب صدر صاحب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

بتوسط

جناب سکریٹری صاحب انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز حیدرآباد ہاؤس نئی دہلی

جناب عالی۔

بصد عجز و ادب التماس ہے کہ فدوی نے مورخہ ۱۵ جنوری ۵۲ء کو ایک عریضہ برائے اضافہ تنخواہ پیش کیا تھا۔ جس میں اضافہ تنخواہ کی درخواست بسلسلہ ہاؤس الاونس کی گئی تھی۔ اور جو ۱۹ ماہ حال کو [illegible] واپس آ گیا۔ فدوی نے جس امر خاص کی طرف توجہ مبذول کرانے کی کوشش کی تھی غالباً [illegible] کی وضاحت نہ کر سکا۔ [illegible] توجہ فرمانی کی درخواست کر رہا ہے۔

فدوی کو کونسل سے [illegible] فیصدی مبلغ ۲۴/ [illegible] ہاؤس الاونس ادا کیا جاتا ہے [illegible] فدوی کو [illegible] [illegible] ملازم سرکاری ملازم تصور نہیں کیا جاتا۔ [illegible] ۵۲ء [illegible] کرایہ ادا کر رہے ہیں۔ اس طرح علاوہ مقررہ ہاؤس الاونس کے فدوی کو اپنی [illegible] تنخواہ سے [illegible] ادا کرنے پڑتے ہیں اور اگر ملازمین سرکاری کی شرح بھی لگائی جائے (یعنی [illegible] فیصدی تنخواہ خاص ۳۲ روپیہ [illegible] ہاؤس الاونس یعنی ۲۴ روپیہ) تو پھر بھی فدوی کو مبلغ [illegible] روپیہ [illegible] رقم ادا کرنی ہوگی جو مجھ جیسے کم [illegible] ملازم کے لئے تکلیف دہ ہے۔

امید کہ درخواست [illegible] توجہ [illegible] جائیگا [illegible] کرم ہوگا

والسلام

مورخہ ۲۳ جنوری ۵۲ء

[illegible]

سپرنٹنڈنٹ انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز

حیدرآباد ہاؤس نئی دہلی۔

(درخواست [illegible])

This may kindly be placed before the President, ICCR

S.A.Ali
23rd Jan 52

Enclosures

ICCR/65/52-86 dated 16.1.52 with H.M.Orders dated 19.1.52.
along with other relevant papers.

To

ان کی ایک تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے نورالدین صاحب کو کونسل کی لائبریری کا کام سونپا تھا اور تنخواہ صرف ایک روپیہ ماہوار مقرر کی تھی یہ صاحب کوئی اور نہیں بلکہ ان کے حقیقی بھتیجے یعنی بڑے بھائی ابوالنصر آہ کے صاحبزادے تھے۔ ایک اور جگہ سرکاری فرائض سے متعلق کوتاہی اور فرض کی ادائیگی میں کمی پاتے ہوئے مولانا نے ایک دوسرے قریبی عزیز کے بے عاطر خواہ سزا تجویز کرنے میں ذرہ برابر بھی تکلف کر کام نہیں لیا۔ کوئی بھی معمولی کردار کا آدمی اپنے متعلقین کے لیے ایسے فیصلے نہیں کر سکتا خواہ وہ سرکاری نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے کتنے ہی ضروری کیوں نہ ہوں۔

کونسل کے ابتدائی دور میں مولانا کی دلچسپی اس حد تک تھی کہ انھوں نے تنظیم اور انتظامیہ سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی اپنی ذاتی نگرانی میں رکھا تھا۔ اُس دور کے رہنماؤں کو سرکاری پیسے کے صحیح استعمال کا کتنا خیال تھا اس کا اندازہ ہمیں ذیل کے واقعے سے ہوتا ہے۔

موسم گرما کا آغاز تھا اور دفتر میں کوئی معقول انتظام ٹھنڈے پانی کا نہ تھا۔ تجویز ہوئی کہ چار نئے مٹکے (بڑے مٹی کے گھڑے) فراہم کیے جائیں اس کے ساتھ ساتھ یہ مسئلہ بھی زیرِ غور تھا کہ اسٹاف میں اضافہ ہونے کی وجہ سے چند کرسیاں بھی مہیا کرائی جائیں۔ ان دونوں تجویزوں کا ایک سرکاری نوٹ مولانا کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ جس پر مولانا کا فیصلہ یہ تھا کہ گھڑے خریدے جا سکتے ہیں لیکن کرسیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ کام زمین پر بیٹھ کر بھی کیا جا سکتا ہے۔

ایک اور فیصلہ جو اپنی نوعیت میں تھوڑا سا مختلف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کرسیوں کی خریداری کو رد کرنے والا شخص جذبۂ ہمدردی اور انسان دوستی سے عاری نہ تھا۔ یہ واقعہ ۱۹۵۲ء کا ہے۔ کونسل کے اسٹاف میں ایک صاحبزادے کا تقرر ہوا جو کافی بدحال تھے اور معاشی پریشانیوں میں مبتلا تھے سرکاری اصول کے تحت ضروری تھا کہ تقرر پانے والے کی عمر کم از کم اٹھارہ سال ہو مگر یہ صاحبزادے ابھی سولہویں سال سے ہی گذر رہے تھے کہ اپنی بے پایاں ذہانت اور لیاقت کی بنا پر کونسل میں ملازمت پا گئے۔ دو سال بعد جب سرکاری حسابات کی جانچ ہوئی تو آڈٹ پارٹی نے اس معاملے کو گرفت میں لے لیا۔ جس وقت یہ اعتراض اٹھایا گیا اس وقت موصوف مقررہ عمر کو پہنچ چکے تھے۔ اب برطرفی تو ہو ہی نہیں سکتی تھی لہٰذا آڈٹ نے یہ تجویز پیش کی کہ ان کی گزشتہ خدمات کو کم تنخواہ والی جگہ پر سمجھا جائے۔ اور آڈٹ پارٹی کے مطابق نقد پچھتر روپے کی رقم مذکورہ ملازم سے واپس لے لی جائے۔ یہ مطالبہ نوعمر ملازم کے لیے ناگہانی آفت تھی۔ قلیل آمدنی کے اس ملازم کے لیے پچھتر روپے کی رقم اس زمانے میں واپس کرنا قطعی ناممکن تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا دوستوں کی صلاح پر عمل کرتے ہوئے اس نے اپنی ساری پریشانی اور روداد مولانا کی خدمت میں بصورت اپیل پیش کر دی۔ مولانا نے ایک مصیبت زدہ کی درخواست پر انتہائی ہمدردانہ طور سے غور فرمایا۔ اور سارے اصولوں کو برطرف رکھتے ہوئے اپنا حکم ذیل کے الفاظ میں صادر فرمایا۔

”درخواست کنندہ اس حیثیت میں نہیں ہے کہ اس رقم کو واپس کرے اور نہ ہی اس میں اس کی کوئی غلطی ہے۔ یہ ذمہ داری ایڈمنسٹریشن کی ہے اس رقم کو واپس لینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں اس رقم کو معاف کرتا ہوں۔“

مولانا کے انتظامی فیصلوں کے بارے میں یہ مضمون حرفِ اوّل کی حیثیت رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ بشرطِ توفیق میں اس سلسلے میں کچھ اور اہم واقعات روشنی میں لا سکوں گا۔

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS,
NEW DELHI-1.

ICCR/103PartII/52- 2819 October 10, 1952.

The President ICCR kindly sanctioned (vide his orders dated 29.1.52) the appointment of Dr.A.C.Sen as Editor, Indo - Asian Culture on Rs.500/- P.M. plus allowances for six months. He joined his post in this office on 24.3.52 (forenoon), hence that period expired on 23.9.52 afternoon.

Dr.A.C.Sen is now recommended to be placed on the same footing as other members of the ICCR i.e. termination of his services in this Council with one month's notice on either side.

The President ICCR's orders in this connection are solicited.

[signature]
Secretary ICCR.
10.10.52.

To

P.S. to Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
NEW DELHI.

Minister would like a copy of Dr Sen's appointment letter to be attached to this.
UKripalani
13/10/52

Secy ICCR

Sma/Cae.

A copy of the appointment letter of Dr A.C.Sen is attached herewith.

[signature]
Secretary ICCR.
13.10.52.
14

P.S. to Minister of Education.

ICCR/103 Part II/52- 2838 Dated 14. x.52

مجھے امید ہے کہ جو کام انکے سپرد ہوا ہے وہ اسے برابر انجام دیتے رہینگے۔ سردست ایک برس کے لیے اور مدت تقرر کی بڑھا دی جاتی ہے۔ شرائط وہی ہونگی جو ابتدائی تقرر کی چٹھی میں لکھے گئے تھے

ابوالکلام ۱۴ اکتوبر ۵۲

ICCR/[illegible] - 435 [illegible] February [illegible], 1952.

I was appointed vide Ministry of Education, [illegible] [illegible], No.F.43/1/50-A.I(C) dated 21 st March 1950 [illegible] for one year from March 6,1950 as Secretary, Indian Council for Cultural Relations, New Delhi, in the Scale of Rs. 800-[illegible]-[illegible]-1250 plus allowances and the continuation of [illegible] for [illegible] March 6, 1951 in my service in the above capacity was sanctioned by the President, Indian Council for Cultural Relations [illegible] his order dated December 15, 1951 [illegible].

As the previous sanction pertaining to my [illegible] expires on March 5,1952, it is requested that the case of extension of my services with effect from March 6, 1952 [illegible] be placed before the President, Indian Council for Cultural Relations for [illegible] orders.

Secretary
Indian Council for Cultural Relations
Hyderabad House, New Delhi.

The [illegible] Secretary,
[illegible] Education,
Government of India,
New Delhi.

[illegible]

جن لفظوں میں گزشتہ سال ان کے تقرر کا آرڈر کیا گیا تھا (یعنی بحیثیت [illegible] کے [illegible] نوٹس کی بنیاد پر تقرر) ویسا ہی ایک آرڈر ٹائپ کرا کر پیش کیجیے تو دستخط کر دوں

[illegible]

The Order signed by the President is placed on the file
[illegible] 1/3/52

اب کم سے کم جو بات کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس سال انکی ترقی
روک دی جائے ۔ اگر انھوں نے اپنے طرزِ عمل سے اپنے کو حقدار ثابت کیا
تو آئندہ سال اس معاملہ پر غور کیا جائے گا

.... کو میری یہ تحریر دکھا دی جائے

ابوالکلام
آزاد ۱۲ ۔ مئی
Secy ICCR

مولانا کے اس حکم کے بعد ان صاحب نے اپنی صفائی میں فل اسکیپ سائز کے چار صفحوں پر مشتمل درخواست انگریزی میں دی اور مولانا سے اس فیصلے پر نظر ثانی چاہی۔ مولانا نے اس پر لکھا:

میں نے پوری طرح غور کر کے یہ فیصلہ کیا ہے ۔ اب اس میں
کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی

ابوالکلام
آزاد ۱۵ ۔ مئی

Secy ICCR

19/5/53

Supdt:
Pl. keep it in the confidential file for the present.
H.R. ...
15-5-53.

[illegible] Remains under sealed cover on the forenoon [illegible] 5-53

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS,
HYDERABAD HOUSE,
NEW DELHI-1.

File No 33 Confidential

No. ICCR/103 Part III/53- 3127

Dated, the 6th May, 1953.

The Annual Increment of Mr. .... ICCR, falls due on the 1st of June, 1953, which may kindly be got sanctioned by the President ICCR. The copy of the letter of appointment together with that of sanction pertaining to his last year's Annual Increment is enclosed for ready reference.

1. Name: .....
2. Designation. .... ICCR.
3. Scale of Pay: Rs.300-20-600.
4. Rate of Increment: Rs.20/-.
5. Pay before Increment (i.e., on 31.5.53). Rs.340/-,P.M.
6. Pay after Increment (i.e. with effect from 1.6.53) : Rs.360/-,P.M.

S.H. Burney
Secretary, ICCR.

Supdt. Pl. see it & do the needful. S.H. Burney 15-5-53

DE/13

To
P.S. to the Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
New Delhi.

.... کی سروس کا پچھلا ریکارڈ جو میرے علم میں آیا ہے ~~نہایت~~
~~[illegible]~~ وہ اچھا نہیں ہے - میں چاہتا تھا کہ انھیں ملازمت سے
الگ کیا جائے لیکن چونکہ سکریٹری صاحب نے مجھ سے خاص طور پر سفارش کی
اور یہ کہا کہ انھیں وارننگ دیدی گئی ہے اور امید ہے کہ آئندہ انکا طرز عمل
درست ہو جائیگا اسلیے میں نے انکی سفارش منظور کرکے اپنی رائے بدل دی -

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

(131)

[illegible]DENT
[MAU]LANA ABUL KALAM AZAD

PHONE 43[illegible]
HYDERABAD HOUSE
NEW DELHI-1

File No 307

OUR REF No. : A/103PartIII/53- 4934/54-55

[illegible] I[illegible]

Personal File of
Shri N. Krishnaswamy
Welfare Officer.

Dated, the 25th September, 1953.

My dear Mr. Kripalani,

I enclose herewith a copy of our Vice-President of the [illegible] Section, Shri [illegible]'s letter dated the 23rd September 1953, proposing the appointment of Shri Krishnaswamy as Welfare Officer of the ICCR for one year with effect from 1st October 1953; and also copy of the synopsis submitted to me by Shri Krishnaswamy [illegible] his qualifications and career.

The terms suggested by Shri [illegible] Saheb for his appointment are:-

1. Lump sum of Rs.400/- per month only as his salary,
2. [illegible] for his [illegible] Delhi,
3. Travelling and Dearness Allowance while sent outside Delhi,
4. The services to be terminable at one month's notice on either side.

I, therefore, [illegible] letter for favour of [illegible]'s earliest orders, as the appointment of a Welfare Officer has been awaiting for some time after the departure of Mr. Ch[illegible], our former Welfare Officer.

Supdt.
Pl. keep it on the record. Issue tentative letter of appointment as sanctioned. Regd. Hamid Ali.
S.H. Burney
30.9.53.

Yours sincerely,

S.H. Burney
(S.H.Burrey)
Secretary, ICCR.

Bill 30/9/53

Encl. As above.

Shri [illegible]. Kripalani,
Private Secretary to the Minister of Education,
Government of India, Ministry of Education,
New Delhi.

پہلے جو آدمی مقرر کیا گیا تھا اسکی تنخواہ کیا تھی؟

SHB/Malik.

ابوالکلام ۲۵/۹

اچھی بات ہے - سردست صرف ایک برس کیلیے رکھا جائے



INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE : 43205
HYDERABAD HOUSE,
NEW DELHI-1.

REF

No.EQ.1/..   29th May, 1953.

My dear Mr. Kripalani,

I forward herewith an application of Dr. Sen dated 28th May 1953, requesting for himself regular grades of pay in the scale of Rs.720-40-1000, and an enhanced salary of Rs.800/-, including two increments of Rs.40/- each. He has given his reasons in support of his application briefly but clearly.

The English Quarterly has just now completed its first year successfully and there is no doubt that it has been appreciated equally in India and the foreign countries. We owe much of the success to the efforts of Dr. Sen, its sole Editor.

As the matter lies entirely in the province of the President I send the application for the President's kind consideration and early orders.

Supdt. I have communicated the President's order to Dr. Sen. Pl. keep on the file.
S.H. Burney
10-7-53

Yours sincerely,

S.H. Burney
(S.H. Burney)
Secretary, ICCR.

File
[initials] 10/7/53

Shri K. Kripalani,
P.S. to Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
New Delhi.

SHB/GCL.

میگزین کوارٹرلی ہے - ایک تمام
ارٹکل مختلف لوگوں کے لکھے ہوئے ہیں جنہیں معقول رقم
معاوضے میں دی جاتی ہے - مسٹر سین کو صرف نفاست
ترتیب دے کر پریس میں بھیج دینا پڑتا ہے
ایسی حالت میں مجھے امید کرنی چاہیے کہ جو تنخواہ انھیں دی جا رہی ہے
کم نہیں ہے -

آزاد ۵ - جولائی

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

(51)

CONFIDENTIAL & SEALED

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE 43205
Jaipur House
NEW DELHI 1.

REF ICCR/33/64-

Dated, the 19th February, 1954.

My dear Mr. Kripalani,

Mr. . - is the - - - - in the ICCR office since the 1st June 1950. Last year the President ICCR did not sanction his annual increment (copy of his order dated the 12th May 1953 enclosed herewith for reference).

The main cause, I think, was the case of misappropriation of stamps and tampering with the despatch work by a clerk, whom I turned out from the ICCR service.

The President's order, withholding the sanction for the increment due to the . . . . last year, was perhaps justified at the moment and, I believe, it has served its purpose.

After having worked in this office for more than 15 months, I am now in a better position to judge things in their right perspective. After all the supervision of the ICCR work was equally the responsibility of the previous Secretary and if he failed to detect those things, I don't think the ~~Superintendent~~ could be solely held responsible for them. I cannot, however, imagine that he had any hand. No one could question his bona fides.

Anyhow the things have certainly improved after that event and the - - - - · has been discharging his duties satisfactorily with the help of the small office that we have.

These are hard times and I think he has suffered more than his share of blame for the past event. Recently he had also got married and his financial liabilities have naturally increased.

Full nine months have now elapsed since that order of the President was passed and I had a mind to reopen the case last month, but did not like to bother the President about it as he was not doing well.

I feel it my duty to reopen it now for the President's favourable consideration. I, therefore, recommend that the President may be kindly pleased to revise his order dated the 12th May 1953 and sanction the full payment of the amount due to the . . . . for his annual increment from 1st June 1953.

I am taking this action of my own accord in the hope that the President would be pleased to give it his best consideration.

Yours sincerely,

S.H. Burney
(S.H.BURNEY)
Secretary, ICCR.

Encl: As above.

Shri K. Kripalani,
Private Secretary to the Minister of Education,
Government of India, Ministry of Education,
New Delhi.

ایک سال کے لیے .... کی ترقی روک دی گئی تھی
ابھی سال پورا نہیں ہوا ہے بہرحال سکریٹری صاحب اب

SHB/Malik.

اگر ان کے طرز عمل سے مطمئن ہیں تو ۱- مارچ ۵۴ سے انکی تنخواہ میں وہ اضافہ کیا جائے جو



INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

(49

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

Jaipur House, NEW DELHI 1.
PHONE 43205

REF ICCR/33/54- 1048

Dated, the 16th February, 1954.

CONFIDENTIAL & MOST IMMEDIATE.

My dear Mr. Kripalani,

At the time of the visit of His Highness The Maharaja of Bhutan early last month, our office and the Library were shifted from the Hyderabad House to the Eastern Rotunda of Jaipur House, and at that time I received the enclosed letter from the Ministry of Education, in which it was stated that the ICCR office and the Library would be again re-shifted to the Hyderabad House at the latest by the middle of this month.

I have already addressed to you my letter No. ICCR/30/54-889 dated the 4th instant on this subject.

Yesterday an officer from the Estate Office visited us at Jaipur House and from the papers with him I learnt that now there was a note in the External Affairs Ministry to the effect that our office should not be permitted to return to Hyderabad House, and some other accommodation be found by the Estate Office for the ICCR office. The reason given was that they wanted to treat the Hyderabad House as Guest House, and for safety purposes, they did not want our office to remain there. This is really very surprising since they have another much larger office of their own - External Publicity Division - also there. The ICCR had never given any cause of complaint so long it was in the Hyderabad House.

Anyhow, this is against the understanding, under which we were shifted, as would be clear from the enclosed letter of the Ministry and so far as I think also against the wishes of the President ICCR. The ICCR has unfortunately no building of its own as yet, and we were paying rent to the Hyderabad State and cleared off their arrears of Rs. 26,000/- last year on the strict understanding that we wanted to stay there.

As the President ICCR is not doing well these days, I did not want to bother him about this matter, but if I do not bring it to his notice at this moment, I do not know, what other difficulties we may have to face for our office and the Library, if proper steps are not taken immediately.

This short note is to be treated as confidential and may kindly be shown to the President ICCR for his information and action. I shall also let you know of further developments in time.

Yours sincerely,

S. H. Burney

(S.H. BURNEY)
Secretary, ICCR.

Encls: As above.

Mr. K. Kripalani,
Private Secretary to the Minister of Education,
Government of India, Ministry of Education,
New Delhi.

SHB/Malik.



INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL [KAL]AM AZAD

PHONE 43205
PATAUDI HOUSE, ~~HYDERABAD HOUSE~~
NEW DELHI-1

File 307
OUR REF. No. ICCR/103PartIV/54-55 5428
Personal File of
Shri N. Krishnaswamy
Welfare Officer.

21st September, 1954.

My dear Mr. Kripalani,

I enclose herewith Shri Kakasaheb Kalelkar's original letter (copy retained on the file) addressed to the President ICCR regarding the extension of the term of Shri N. Krishnaswamy's services as Welfare Officer of the ICCR.

I may be permitted to point out the following for the President's information :-

1. In the Council as it is, no appointments are made on the permanent basis. Even the Secretary's appointment and extensions are for specified periods.

Similarly the Welfare Officer's extension could be made for another year or so, as the President may be pleased to sanction.

I have informed Shri Kakasaheb Kalelkar also about it and he agrees to the idea.

2. As to the accounts, the Welfare Officer has submitted yesterday to me his accounts for Rs. 600/-, advanced to him last time for his tour in the South, and those accounts are being checked by the office.

As to the previous bills, he assures me to regularise them shortly, and Shri Kakasaheb Kalelkar has also written to me to say that he will do the needful early to our satisfaction.

Please return the original letter of Shri Kakasaheb Kalelkar with the President's orders on the same. I also enclose herewith copy of the original letter of appointment dated 30.9.53 appointing the Welfare Officer for one year from 1st October 1953.

Encl. As above.

Yours sincerely,
S.H. Burney
(S.H. BURNEY)
Secretary, ICCR.

Supdt.
Pl. keep on the file for necessary action with effect from 1st October & inform the W.O.'s the President's orders about his salary.
S.H. Burney 22/9/54

[initials] 24/9/54

To

Shri K. Kripalani,
Private Secretary to the
Minister of Education,
Government of India,
New Delhi.

شری کرشنا سوامی کی ملازمت ایک برس کے لیے اور بڑھائی جاتی ہے۔ اب انھیں چارسو روپیہ تنخواہ ملیگی۔
آزاد ۲۳-۹-۵۴

SHB/Malik.

انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز

کونسل کے کتب خانے کی نگرانی اور حفاظت کے لیے
نورالدین احمد کو آنریری افسر مقرر کیا جاتا ہے ۔ وہ سردست
یہ کام بغیر تنخواہ کے کریں گے ۔ ضابطہ پورا کرنے کے لیے
انکی تنخواہ ایک روپیہ ماہوار رکھی جاتی ہے ۔ ۲۵ اگست ۵۴ء
سے انھیں چارج لے لینا چاہیے

آزاد ۲۳ ۸ ۵۴ء

Bll 23/8/54

Supt.

Pl. Keep it on the file & inform the gentleman, with letter of appointment, to take over charge immediately on the 25th August forenoon as ordered by the President.

[illegible] Banerjee
23/8/54

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

14

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE 43205

PATAUDI HOUSE, ~~HYDERABAD HOUSE~~
NEW DELHI-1

OUR REF. No. ICCR/103PartV/54-5790

29th October 1954.
30

My dear Mr Kripalani,

I forward herewith in original for the President's favourable consideration Dr.Sen's written request with two relevent enclosures for attending the Indian History Congress Session at Ahmedabad from 27th to 29th December 1954 at an estimated expense within Rs.110/- only.

This time Dr.Sen also proposes to read a paper of his own there.

Yours sincerely,

S. H. Burney
(S.H.Burney)
Secretary.

Shri K.R.Kripalani,
P.S. to Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
NEW DELHI-2

Encls: As above.

SHB/Gae.

یہ کاغذ چھٹیوں میں رکھا تھا۔
غالباً سکریٹری صاحب نے پھر دوبارہ
لکھا تھا اور میں نے منظوری دیدی ہے
لیکن اگر خیال ہو کہ ایسا نہ ہوا ہو
تو اب منظوری دیدیتا ہوں۔
ڈاکٹر سین کانگریس کے اس اجلاس میں ضرور شریک ہوں

File.

14/12/54. ا ک آزاد
ON

INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRESIDENT
MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE 43205

YOUR REF. No. ICCR/103-V/54-526

PATAUDI HOUSE,
~~HYDERABAD HOUSE~~
NEW DELHI-1

October 23, 1954.

My dear Shri Kripalani,

I enclose herewith Shri Kaka Saheb's letter dated the 22nd October 1954, addressed to the President ICCR, enclosing therewith the application of Shri Prabodh Mehta for appointment as the Assistant Welfare Officer of the ICCR.

As he has already discussed the matter with the President and obtained his approval, I have nothing further to add, except to point out that Shri Kaka Saheb has now recommended for a salary of Rs.400/- instead of Rs.250/-, suggesting amendment of the budget provisions also accordingly.

Yours sincerely,

S.H. Burney
(S. H. BURNEY)
Secretary, ICCR.

Enclo: (i) Shri Kaka Saheb's original letter, and (ii) original application of Shri Prabodh Mehta (to be returned to office with the President's orders).

To

Shri K. Kripalani,
Private Secretary to the
Minister of Education,
Government of India,
New Delhi.

SHB/Malik.

۲۵۰ - روپے اس جگہ کی تنخواہ ہے
اب اسے بڑھانا مناسب نہیں ہوگا
آگے آئندہ دیکھا جائیگا
ابوالکلام ۲۹ / ۱۰

(Ministry of Education).

Minister may kindly see the letter which Kaka Sahib Kalelkar wrote to the Secretary, Indian Council for Cultural Relations. He has sent a minute of the discussions held with the Minister on 1st April 1955. Flag X

Kaka Sahib has suggested that the Vice-President of the African Section will be authorised to sanction payments in connection with the work of the Africa and West Indies Section and Student Service Unit, subject to overall sanction contained in the budget. He has also suggested that the Vice-President may sign cheques.

The comment of the office on this is that "with the possibility of considerable expansion in the activities of the Council in the near future, it is desirable from every point of view and especially to relieve the growing burden of the President that ~~with~~ some decentralisation of authority is effected at the top."

The Office has suggested that all Vice-Presidents "have authority to take decisions and sanction payment on the recommendation of the Secretary and subject to the overall sanction contained in the budget."

Minister may kindly indicate if this should be done and if so, the amount up to which the Vice-Presidents could be authorised to sanction payments.

Regarding the signing of cheques, Office has suggested and I agree that it would add to the confusion of accounts if more persons are authorised to sign cheques and operate bank accounts of the Council. If the money is sanctioned by the Vice-President direct, payment should not present any difficulty.

Of the other points mentioned in Kaka Sahib's note, I am informed that Shri Prabodh Mehta can for the present be sent to Bombay for only two or three months. The question of permanent transfer may be taken up later.



INDIAN COUNCIL FOR CULTURAL RELATIONS

PRES' MAULANA ABUL KALAM AZAD

PHONE 43205

PATAUDI HOUSE, ~~HYDERABAD HOUSE~~, NEW DELHI-1

OUR REF No. ICCR/103-V/55-482

29th January 1955.

My dear Mr. Kripalani,

On the representation from the Superintendent of my office the President ICCR was pleased on the 19th May 1952 to grant him a relief of Rs.40/- P.M. in excess of the 10% of his pay, for paying the rent of his house with effect from 1st May 1952 (the original order and the application flag 'B' enclosed herewith for reference).

The Superintendent has now placed before me a note representing that the rent of his suite has increased considerably and he needs further aid. His original note and the enclosures placed herewith.

From the statement flag 'C' it appears that since 1952 the Superintendent has paid altogether Rs.190/6/- in this manner. Since December 1954 he has been paying in excess of the 10% of his pay plus Rs.40/- already sanctioned by the President, the sum of Rs.17/15/- P.M.

As a non-government servant he is entitled to no concessions from the Government departments concerned and efforts by him to this end have proved unsuccessful.

The Superintendent therefore prays that Rs.190/6/- be sanctioned for his past payments, and Rs.17/15/- P.M. be allowed till his salary itself is high enough to adjust this increased demand by itself.

(الف) As regards the request for refund I find that a substantial increase has regularly taken place from May 1954 only and if any relief for past payments could be considered, it should be taken since that month only. The total amount since May 1954 would come to Rs.167/12/- only.

(ب) Now as to his request for further monthly relief of Rs.17/15/- P.M. I may be permitted to put in a word in his favour. There is no doubt that there has been marked increase in the office work and the Superintendent's responsibilities have also naturally increased and he has to manage in a single room with his wife and child.

I feel that he deserves this partial relief and recommend his case for the President's favourable consideration.

Yours sincerely,

S. H. Burney
(S.H.Burney)
Secretary.

Encls: As above.

Shri K.R.Kripalani,
P.S. TO Minister of Education,
Government of India,
Ministry of Education,
NEW DELHI.

الف اور ب منظور
ابوالکلام
۵۵

SHB/Gae.

(2)

INDIAN CO[illegible] CU[illegible] [illegible]TIONS,

The Finance Committee of the Council at its first meeting on October 5th, 1955 made the following recommendations regarding the appointment of a Librarian for the Council Library:-

".......that Shri Noor-ud-din Ahmed, at present working as Honorary Librarian be appointed in this post. The post should carry a salary of Rs.275-20-475-25-750. The Committee also recommend that Shri N.D. Ahmed by given a starting salary of Rs.325/- within the scale suggested above. The appointment may take effect from the 1st October, 1955."

As desired by the Vice-President Prof. Humayun Kebir this recommendation of the Finance Committee is submitted to the President for his consideration and approval.

President

Secretary, ICCR.
13. X. 1955

(۱) نورالدین کی تنخواہ سردست ۳۲۵ سے شروع کی جائے

(۲) تنخواہ کے ساتھ وہ الاؤنس بھی دینا چاہیے جو ہم کونسل کے ملازموں کو دے رہے ہیں

(۳) مجھے معلوم ہوا ہے کہ نورالدین کو اگست سے تنخواہ دینا طے ہو گیا تھا، اس لیے ان کی ملازمت ۱-اگست سے قرار دی جائے نہ کہ ۱-اکتوبر سے

آزاد ۱۹ — ۱۰

The other proposals of ... ka Sahib may be accepted.

H. Kabir

(Humayun Kabir).
16. 4. 1955.

Minister.

سکریٹری صاحب یہ فائل لیکر مجھ سے بات کر لیں۔

آزاد ۲/۵/۵۵

Secretary will please bring this file and discuss personally.

Sd.(A.K.) Azad.
2. 5. 1955.

Secretary.

بہتر ہے وائس پریسیڈنٹ کو اختیار ہوگا کہ ایک ہزار روپیہ تک کے خرچ کا فیصلہ کر دیں اور اسکی اطلاع پریسیڈنٹ کو دیدیں۔

ایک ہزار کی رقم کا مطلب یہ ہے کہ ایک وقت میں اس سے زیادہ کا خرچ نہ ہو اور اگر اسکے بعد پھر کوئی خرچ ہزار روپیہ تک کا پیش آجاوے تو ضروری ہوگا کہ ~~اسکی پہلے اطلاع پریسیڈنٹ کو~~ پچھلے ہزار روپیہ کی منظوری پریسیڈنٹ کی انھیں مل گئی ہو۔

آزاد ۳/۵/۵۵

Ministry of Education
& Scientific Research,
Govt. of India.

سکریٹری انڈین کونسل فور کلچرل ریلیشنز

کتب خانہ کے لائبریرین کی جگہ ابھی تک خالی ہے   D 6820/57

چونکہ نورالدین احمد نے اسکے لیے آمادگی ظاہر کی ہے

کہ بلا تنخواہ کام کریگا۔ اسلیے اسے مقرر کیا جاتا

ہے تنخواہ صرف ایک روپیہ ماہوار ہوگی۔

آزاد ۱/۷/۵۷   Vice-President may kindly see.

Secy. ICCR   Inam Rahman
1.7.57

Vice-President (Dr. Sayyidain)   Vyyam
Secy/292/57 4955   4/7

Secretary/ICCR   Inam Rahman
2.7.57



The President,
Indian Council for Cultural Relations,
New Delhi.

Sir,

Most respectfully I beg to state that due to certain personal circumstances of mine I find myself unable to continue in my service as the Librarian of the Council, and therefore I hereby beg to tender my resignation from the said post and request to be relieved of my charge as early as possible.

Yours respectfully,

Nooruddin Ahmed
(Nooruddin Ahmed)
Librarian, I.C.C.R.

Dated: 5th. September, 1956.

انڈین کونسل کے لائبریرین نورالدین کی یہ درخواست مجھے ملی
میں انکا استعفا منظور کرتا ہوں ۔ سکریٹری صاحب سردست
لائبریری کی نگرانی کا عارضی انتظام کر دیں ۔ آئندہ کسی دوسرے
شخص کے تقرر کے معاملے پر غور کیا جائیگا

آزاد ۵ ستمبر ۵۶ء

Spoken to the President and Vice-President Sri K G Saiyidain. The Library Assistant Sri Abbas will continue to look after the Library under the supervision of the Secretary. Sri Nooruddin Ahmad is to be relieved of his charge as soon as possible.

[illegible]

Inam Rahman
28.9.56

مولانا آزاد مرزا غالب کے شیدائیوں میں تھے جس کا ثبوت مولانا کی متعدد تحریروں سے ملتا ہے چنانچہ 'الہلال' میں بھی انھوں نے غالب کا غیر معروف کلام چھاپنے کا اہتمام کیا تھا۔ اس تبصرے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی پسندیدگی کے باوجود شاعر کی زندگی کے حقائق کو تسلیم کرنے میں بھی تامل سے کام نہیں لیتے تھے۔ مکاتیب غالب کے بیشتر خطوط میں غالب نے نوابان رام پور سے مختلف قسم کی مالی امداد کی درخواست کی ہے۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو غالب کے عقیدت مندوں نے اس اشاعت کو ان کی شاعرانہ خود داری کے پیش نظر بادل ناخواستہ ہی قبول کیا تھا۔ اس کے برخلاف مولانا آزاد نے ان کی اشاعت کو ضروری اور مستحسن جانا۔ مولانا کی رائے میں ان خطوط کی اشاعت سے غالب کی آخری زندگی کے اہم گوشے اہل ادب کے سامنے آئے تھے اس طرح یہ تبصرہ مبصر ابوالکلام کی تنقیدی بصیرت اور وسیع النظری کا بھی ایک ثبوت ہے۔

مولانا کی دوسری تحریر کا تعلق بھی مکاتیب غالب اور اس کے طابع سے ہے جو محولہ تحریر سے پانچ ماہ قبل لکھی گئی ہے۔ مکاتیب غالب کو کتاب خانۂ عالیہ رام پور کی مطبوعات کے سلسلے میں بطور سلسلہ ریاست رام پور نے طبع اور شائع کرایا تھا۔ اور اس کی طباعت کا کام جیسا کہ تبصرے سے معلوم ہوگا، بمبئی کے مطبع قیمہ نے انجام دیا تھا۔ کتاب کی اہمیت اور اس کی نکاسی کی متوقع تیز رفتاری کے باعث مالکان مطبع نے جو خود عربی فارسی اردو کی مطبوعات کے تاجر بھی تھے ریاست سے سول ایجنسی لینا چاہی اس کے لیے نقد زر ضمانت کا مطالبہ ریاست کی طرف سے کیا گیا۔ چونکہ مطبع قیمہ کے مالکان یعنی شرف الدین الکتبی و اولادہ' کا مولانا سے گہرا تعلق تھا اس لیے انھوں نے ضمانت کی شرط سے مستثنیٰ کردیے جانے کی غرض سے مولانا کا ایک سفارشی خط مولانا عرشی کے نام لکھوایا۔ اس میں مولانا نے پُرزور الفاظ اور اپنے تجربے کے حوالے کے ساتھ ضمانت سے مستثنیٰ کیے جانے کی خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد جائز معاملات میں سفارش کردیا کرتے تھے۔ یقینی طور پر تو نہیں کہا جاسکتا اس لیے کہ مجھے اپنے والد مرحوم سے دریافت کرنے کا کبھی خیال ہی نہیں آیا لیکن مولانا آزاد کے مرتبے کو پیش نظر رکھ کر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ میسرز شرف الدین الکتبی کو ضمانت کی شرط سے مستثنیٰ کردیا گیا ہوگا۔ اس لیے کہ وہی اس کتاب کے سول ایجنٹ مقرر کیے گئے تھے اور اس حیثیت سے ان کا پتا کتاب کے فلیپ پر چھپا بھی تھا۔ ذیل میں یہ مکتوب نقل کیا جاتا ہے:

(۲)

بمبئی
۷-۱-۱۹۳۸ء

جناب من،

مولوی عبدالصمد شرف الدین صاحب سے مجھے معلوم ہوا کہ ریاست رام پور نے کوئی کتاب چھپوائی ہے اور اس کی ایجنسی کے لیے نقد ضمانت کی شرط قرار دی گئی ہے۔ میں مولوی عبدالصمد صاحب کو ان کے والد مرحوم کے زمانے سے جانتا ہوں۔ انھوں نے کتابوں کی تجارت کا سلسلہ میرے ہی ایما سے شروع کیا تھا۔ یہ کاروباری معاملات میں ہر طرح قابل اعتماد اور دیانت دار ہیں۔ بے عنوانی اور بے قاعدگی کے کسی اندیشے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ یہ بالکل غیر ضروری ہوگا کہ ان سے ضمانت کی رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو کوشش کیجیے کہ اس شرط سے یہ مستثنیٰ کردیے جائیں۔

والسلام علیکم
ابوالکلام

مولوی امتیاز علی صاحب عرشی
رام پور

تیسری تحریر بھی سابق تحریروں کی طرح کتب خانۂ عالیہ رام پور اور مولانا عرشی مرحوم ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ ۱۹۵۲ء کے پارلیمانی الیکشن میں مولانا آزاد کا انتخاب حلقۂ رام پور سے ہوا تھا۔ اس زمانے میں دوران الیکشن پنڈت جواہر لال نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد دونوں رام پور تشریف لاتے تھے۔ پنڈت جی تو کتب خانے نہ آسکے لیکن مولانا اپنی بے انتہا الکشنی مصروفیات کے باوجود بھی کتب خانے کو نہ بھولے اور کچھ وقت نکال کر تشریف لے ہی آئے۔ اس تحریر سے دو تین امور سامنے آتے ہیں پہلا یہ کہ وہ اس سے پہلے بھی کبھی کتب خانے کی زیارت کرچکے تھے اور اس کی اہمیت کا وہی پہلا نقش اب تک ان کے دل پر قائم تھا جو مصروفیات کے باوجود وہ کتب خانے



مولانا آزاد کی کچھ نادر تحریریں

مولانا ابوالکلام کی بکھری ہوئی تحریریں مختلف ادب دوستوں کی توجہ سے کئی مجموعوں کی شکل میں مُرتب اور شائع ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود ابھی ایسی تحریریں باقی ہیں جن سے مولانا آزاد میں دلچسپی رکھنے والے اور ان پر تحقیقی کام کرنے والے حضرات بھی اس لیے واقف نہیں کہ وہ ابھی تک مدوّن و مرتّب نہیں ہو سکیں۔

آج کی صحبت میں مولانا مرحوم کی ایسی ہی چند تحریریں جو غیر معروف یا کم معروف ہیں پیش کرنا مقصود ہے۔ ان میں سے پہلی تین کا تعلق کتب خانۂ عالیہ رام پور اور میرے والد مرحوم مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی ذات سے ہے۔

ذیل میں پہلے انھیں تینوں کا تعارف اور ان کی نقل پیش کی جاتی ہے۔ ساتھ ہی اصل کے عکس بھی شامل کیے جا رہے ہیں۔ یہاں ان میں کی پہلی تحریر مولانا عرشی کی اوّلین مرتبہ کتاب "مکاتیب غالب" کی طبع اوّل کے بارے میں مولانا ابوالکلام کا مختصر تبصرہ ہے۔ یہ کتاب ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ مولانا کا تبصرہ مکاتیب غالب کے طابع قیمہ پریس بمبئی کے مالکان کی درخواست پر لکھا گیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا قیام ان دنوں بمبئی میں تھا۔ اس تبصرے کو اسی زمانے میں مکاتیب غالب کے گرد پوش پر بھی چھاپ دیا گیا تھا۔

چونکہ مولانا آزاد نے اپنی اس تحریر میں اس بات پر اپنی مسرّت کا اظہار فرمایا ہے کہ مکاتیب غالب کی طباعت میں نسخ ٹائپ استعمال کیا گیا، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ٹائپ کے نمونے کے طور پر کتاب کے گرد پوش سے مطبوعہ تبصرے کا عکس ہی ذیل میں درج کر دیا جائے تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون سا ٹائپ تھا جس کے حسن سے متاثر ہو کر مولانا نے اپنی مسرت کا اظہار کیا۔ اُردو میں ٹائپ طباعت سے مولانا کی دلچسپی اس امر سے ظاہر ہے کہ "الہلال" اور "البلاغ" دونوں کو انھوں نے ٹائپ میں طبع کرنا پسند کیا تھا۔ گو اُس وقت تک الٰہ آبادی ٹائپ ہی میسّر تھا جو حُسن میں مصری ٹائپ سے کمتر ہے جس کی تعریف و توصیف ذیل کی تحریر میں نظر آتی ہے۔ مولانا کی ٹائپ کے لیے پسندیدگی کے اظہار پر اب نصف صدی کا طویل عرصہ گزر چکا ہے لیکن آج بھی اُردو کی قسمت کاتبوں کے ہاتھ ہی میں ہے ایران اور شرق اوسط کے تمام ممالک حتیٰ کہ افغانستان جیسا پس ماندہ ملک بھی ٹائپ کی طباعت کو اپنا چکا ہے اور اسی باعث ان ممالک کی مطبوعات کا معیار نشر و طباعت ہماری زبان اُردو کے معیاروں سے بدرجہا بلند ہے اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ عہد جدید کی رفتار طباعت اور اس کے حسن سے اردو کو آشنا کرنے کے لیے ٹائپ کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے۔ بہر حال مولانا کا تبصرہ اور ان کے پسندیدہ ٹائپ کا نمونہ ذیل میں ملاحظہ فرمائیے:

(۱)

تبصرہ مولانا ابوالکلام

«مکاتیب عالب» کی اشاعت پر ریاست رامپور مستحق تبریك ہو۔ اگر عالب کی رقعات کا یہ مجموعہ شائع نہ ہوتا تو انکی آخری زندگی کی متعدد اہم گوشی تاریخ کی روشنی سی محروم رہجاتی

عرشی صاحب نی ترتیب کی ساتھہ بحث و نظر کا فریضہ بھی مؤلفانہ قابلیت کی ساتھہ انجام دیا ہی۔ خصوصیت کی ساتھہ مجھی اس بات سی خوشی ہوی کہ طباعت کی لیے نسخ ٹائپ اختیار کیا گیا جس سی بہتر ٹائپ اردو طباعت کی لیے نہین ہوسکتا۔ اس سلسلہ مین مطبع قیمہ بمبئی کی کارگزاری کا بھی اعتراف کرنا چاہیے۔

ابو الکلام، ۲۱ مئی ۱۹۳۸ ع

اکبر علی خاں عرشی زادہ
پھلوار، رام پور ۲۴۴۹۰۱

دہلی میں ایک بڑے نامی گرامی بزرگ گزرے ہیں میاں محمد نذیر حسین محدث دہلوی۔ (متوفی ۱۳۲۰ء) جن سے صدہا تشنگانِ علم نے فیض حاصل کیا۔ ان کے انتقال کے برسوں بعد ان کی یادگار میں حکیم اجمل خاں مرحوم کی تحریک پر ایک پبلک لائبریری کا قیام عمل میں آیا۔ اور کتب خانۂ نذیریہ عالمہ کہلایا۔ یہ ۱۹۲۶ء کا واقعہ ہے۔ اس کتب خانے کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد کے دست مبارک سے کرایا گیا تھا۔ اور اس کے نگراں میاں صاحب محدث کے نواسے مولوی سیّد عبدالرؤف صاحب مقرر ہوئے تھے جو تاحیات اس کی تندہی سے خدمت انجام دیتے رہے۔ اس زمانے میں یہ کتب خانہ پھاٹک حبش خاں میں تھا جہاں وہ ۲۱ ستمبر ۱۹۵۰ء تک تقریباً ۲۴ سال رہا۔ لیکن عمارت کتب خانے کے شایانِ شان نہیں تھی اس لیے اسے ۵۰ء میں اتحاد منزل پہاڑی بھوجلہ پر منتقل کر دیا گیا۔ نئی عمارت شاندار بھی تھی اور شایانِ شان بھی۔ مولانا نے اس کا دوبارہ معائنہ ۴۹ء میں کیا تھا اور عمارت کے نامناسب ہونے کو محسوس کرتے ہوئے اس کا اظہار بھی فرمایا تھا۔ عبدالرؤف صاحب کے انتقال کے بعد لائبریری کے حالات دگرگوں ہوتے گئے یہ ذخیرہ نادر کتب کے علاوہ قدیم اخبارات و رسائل کے فائلوں کے لحاظ سے بھی بہت گراں قدر ہے۔ چونکہ یہ مسلسل برباد اور ضائع ہو رہا تھا اس لیے حکیم عبدالحمید صاحب نے ہمت سے کام لیا اور اپنی تحویل میں اسے ہمدرد نگر تغلق آباد منتقل کر دیا جہاں یہ آج کل ہے، اور اس طرح اسے ایک اچھا مکان اور کافی سرمایہ میسّر آگیا۔ اب یقین ہے کہ جو کچھ باقی رہ گیا ہے وہ مناسب انداز سے محفوظ ہو جائے گا۔ مولانا آزاد نے بڑی دردمندی اور عقیدت کے جذبے کے ساتھ کتاب معائنہ پر ذیل کی رائے تحریر فرمائی:

(۶)

کتب خانۂ نذیریہ عالمہ، بیادگار حضرت مولانا سید محمد نذیر حسین صاحب محدث دہلوی نوّر اللہ مرقدہ، جن کے فیوض اور برکات سے صدہا علماء و طلبہ مشرف نور ہوئے، دیکھنے کا دوبارہ اتّفاق ہوا، جو مولوی سیّد محمد عبدالرؤف صاحب کی سرگرم کوشش سے قائم ہوا ہے۔ یہ دیکھ کر نہایت خوشی ہوئی کہ باوجود ہر طرح کی بے سرو سامانیوں کے کتب خانے نے اپنی کمیت اور کیفیت میں کافی ترقی کی ہے۔ کتابوں کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہو رہی ہے اور اخبارات و رسائل کی بہت اچھی تعداد فراہم ہے۔ (افسوس) کہ اہل دہلی نے اس ضروری اور مفید کام کی طرف اس درجہ توجہ نہ کی جس درجہ متوقع تھی۔ ورنہ اس کے لیے ایک اچھے مکان اور کافی سرمایے کی فراہمی میں دشواری نہ تھی۔ مجھے امید ہے کہ دہلی سے باہر کے اہل خیر کی توجہ اب اسے زیادہ عرصے تک اسی ابتدائی حالت میں نہ رہنے دے گی۔ اور کم از کم اس درجہ سامان اس کے لیے مہیّا ہو جاوے گا کہ ایک اچھے مکان میں منتقل کیا جا سکے اور کتابوں کی خرید اور جلد بندی کے لیے ایک کافی سرمایہ فراہم ہو جائے۔

ابوالکلام

۲۷ جنوری ۱۹۴۹ء

مولانا آزاد کی ساتویں تحریر جو یہاں پیش کی جا رہی ہے ان کا ایک مختصر مضمون ہے جو گاندھی جی کے اخبار "ہری جن سیوک" کے لیے انھیں کی فرمائش پر لکھا گیا تھا۔ اور اس کی اشاعت مورخہ ۲۶ جون ۴۶ء میں شائع ہوا تھا جسے مشترک زبان میں انتخاب کیا گیا۔ گاندھی جی ہندی اور اُردو کے قضیے کو نبٹانے کے لیے سہل زبان کے مبلغ تھے جس کا نام انھوں نے ہندوستانی رکھا تھا۔ چنانچہ یہ اخبار بھی وہ اسی زبان میں شائع کیا کرتے تھے۔ اس کے لیے خاص طور پر مولانا آزاد سے سہل اردو یعنی ہندوستانی میں ایک مضمون زبان کے مسئلے ہی پر لکھوایا۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں یہ تحریر اس لحاظ سے نادر ہے کہ اس سے پہلے انھوں نے ہندوستانی میں کچھ اور نہیں لکھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مولانا نے اس میں سنسکرت کے صرف ایک دو لفظ ہی استعمال کیے ہیں جن میں سے ایک جاگرتی بھی ہے زبان کے مسئلے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ مضمون بہت اہم ہے ذیل میں اسے بتمام و کمال نقل کیا جاتا ہے:

(۷)

گاندھی جی نے ہندوستان کو بہت سی چیزیں دی ہیں مگر شاید کم لوگوں کا دھیان اس طرف گیا ہوگا کہ ایک بڑی چیز جو ہندوستان کو ان کے ہاتھوں سے ملی وہ اس کی ملکی زبان ہے۔ بہت سی بولیاں رکھنے پر بھی ہندوستان اپنی ملکی بولی نہیں رکھتا تھا۔ گاندھی جی نے اس کی یہ کمی پوری کر دی۔

آنا نہ بھولے۔ دوسرے یہ کہ ان کی نظر میں کتب خانے کی ترویج و ترقی کا پروگرام تھا۔ افسوس یہ کہ وہ اسے اپنی زندگی میں پورا نہ کر سکے اور تیسرے یہ کہ مولانا عرشی کی لیاقت علمی کے وہ کس قدر قائل اور ان کی ذات کو کتب خانے کے لیے اتنا اہم اور مفید جانتے تھے کہ خاص طور پر اپنے اطمینان اور نہایت درجہ خوشی کا اظہار کرنا ضروری جانا۔ ذیل میں کتابِ معائنہ سے اس کی نقل اور آئندہ صفحات میں اس کا عکس پیش ہے:

(۳)

ایک عرصے کے بعد مجھے اس قیمتی کتب خانے کے معائنے کا پھر موقعہ ملا۔ ہندوستان میں جو گنتی کے ذخائر ہیں ان میں ایک گراں مایہ ذخیرہ یہ ہے۔

امید ہے حالات کی تبدیلیوں نے جو اَب نئی صورت پیدا کر دی ہے وہ اس کتب خانے کی مزید اصلاح و ترقی کا موجب ثابت ہوگی۔

یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ایک صاحبِ علم فرد کی خدمت و نگرانی اسے حاصل ہے۔ یعنی مولوی امتیاز علی صاحب عرشی کی۔

ابوالکلام آزاد

۱۲ جنوری ۵۲ء

چوتھی تحریر ایک مختصر مکتوب ہے جو اُردو والوں کی جانی پہچانی اور کئی مشاہیر ادب کی ممدوح شخصیت عطیہ بیگم فیضی کے نام لکھا گیا ہے۔ شیخ محمد اکرام مولف شبلی نامہ نے اسے دریافت کیا تھا لیکن وہ اس کی تاریخ تحریر نقل کرنا بھول گئے۔ یہ مکتوب مولانا آزاد کے اپنے مخصوص اسلوب کا ایک خوبصورت نمونہ ہے اگرچہ بہت مختصر۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عطیہ بیگم اور مولانا کے درمیان بھی سلسلۂ مراسلت قائم تھا شیخ اکرام نے مولانا کے صرف دو مکتوب عطیہ بیگم کے پاس دیکھے تھے لیکن ضیاء الدین برنی بی اے نے جو عطیہ بیگم کے بہت نزدیک تھے اور جنھوں نے سب سے پہلے اقبال پر ان کی انگریزی کتاب کا ترجمہ اُردو میں شائع کیا مولانا آزاد کے متعدد خطوط عطیہ بیگم کے ذخیرے میں موجود ہونے کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر ابوسلمان الہندی صاحب مقیم کراچی کوشش فرمائیں تو باقی ماندہ خطوط بھی منظر عام پر آسکیں گے۔

بہر حال ذیل میں وہ مکتوب پیش ہے:

(۴)

بلاشبہ ایک گرفتاری سے رہائی مل چکی ہے لیکن اور کتنی ہی گرفتاریاں باقی ہیں۔ اُس گرفتاری کی نہ طلب تھی نہ انکار۔ لیکن بعض گرفتاریاں ایسی ہیں کہ چھوٹنا بھی چاہیں نہیں چھوٹ سکتے مثلاً آپ کے لطف و عنایت کی اسیری:

خلاص حافظ ازاں زلف تابدار مباد

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ شیخ اکرام نے اس خط کی تاریخ کتابت نوٹ کرنا ضروری نہیں جانا لیکن ایک اور ذریعے سے پتا چلتا ہے کہ یہ جنوری ۲۳ء کی کسی تاریخ کا خط ہے۔ نکہت سہسوانی کے نام انھوں نے کلکتے سے ۱۵ جنوری ۲۳ء کو ایک خط لکھا ہے اس میں بھی اسیری سے رہائی کا تذکرہ تقریباً انھیں الفاظ میں ہے جن میں عطیہ بیگم سے کیا گیا ہے۔ ذیل میں اس خط کو حنیف نقوی صاحب کے شکریے کے ساتھ مع عکس پیش کیا جاتا ہے ملاحظہ ہو کہ یہ دونوں خط ایک ہی واقعے اور ایک ہی زمانے سے متعلق ہیں:

(۵)

کلکتہ

۱۵ جنوری ۲۳ء

السلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ

بلاشبہ بریلی کی صحبت مختصر تھی لیکن اس کے لیے کافی تھی کہ آپ مجھے یاد رہیں۔ شکر گزار ہوں اور آرزومند۔

ایک گرفتاری سے رہائی مل چکی ہے مگر ابھی اور کتنی ہی گرفتاریاں باقی ہیں۔ دیکھیے ان سے کب تک رہائی ملے۔

خزاں کیا، فصل گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے، اور ماتم بال و پر کا ہے

فقیر
احمد کان اللہ لہٗ

چھٹی تحریر نذیریہ پبلک لائبریری دہلی سے متعلق ہے۔

نمبر
۲/۱/۳۸ء

خان صاحب مولوی عبدالصمد شرف الدین صاحب

مجھے معلوم ہوا کہ ریاست رامپور نے گورنمنٹ سے ٹھیکیداری سے
اور ایجنسی کے لیے نقد ضمانت کی شرط قرار دی گئی ہے
میں مولوی عبدالصمد صاحب کو ان کے والد مرحوم کے زمانے سے جانتا
ہوں۔ انھوں نے کئی برسوں کی تجارت کا سلسلہ یہاں رکھا ہے شروع
کیا تھا۔ یہ کاروباری معاملات میں ہر طرح قابل اعتماد اور
دیانت دار ہیں۔ بے عنوانی اور بے قاعدگی کے کسی اندیشے
کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ یہ بالکل غیر ضروری ہوگا کہ ان سے
ضمانت کی رقم کا مطالبہ کیا جائے۔ اگر ممکن ہو تو کوشش کیجیے
کہ اس شرط سے یہ مستثنیٰ کر دیے جائیں۔ والسلام علیکم

مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی
رامپور

ابوالکلام

جمعہ ۱۵ جنوری ۳۳ء

مخلص بے ریا محبت فرما

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقین ایسے ہی سے کافی تھی کہ آپ مجھے یاد رہیں۔ شکر گزار ہوں
اور آرزومند ایک بار آنا ہی ہے، اس کا جی چاہتا ہے مگر ابھی اور
کئی برس گرفتار رہنا باقی ہیں۔ دیکھیے اپنے کب رہائی ملے

فرمایا فصلِ گل میں نئے ہی گلشن کو کون ہے ہم
وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

مخلص احمد سعید



انگریزی زبان حکومت کے دروازے سے آئی لیکن آتے ہی سارے ملک پر چھاگئی اور اس طرح چھاگئی کہ ہماری تعلیمی علمی اور سماجی زبان کی جگہ اسی کو مل گئی۔ اب پڑھے لکھے ہندوستانی اپنی ملکی زبان میں بات چیت کرنا شرم کی بات سمجھنے لگے تھے۔ بڑائی اور عزت کی بات یہی سمجھی جاتی تھی کہ ہر موقع پر انگریزی زبان سے نکلے۔ لوگ اپنی نج کی بات چیت میں بھی انگریزی کو بھلانا پسند نہیں کرتے تھے۔

پچھلی صدی کے آخری حصے میں ملک کی نئی سیاسی جاگرتی شروع ہوئی اور انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی۔ اب کانگریس کے جلسے اس لیے ہونے لگے کہ ملک کی قومی مانگوں اور قومی فیصلوں کی آواز دنیا کو سنائی جائے۔ لیکن یہ آواز بھی اپنی زبان میں نہیں اٹھتی تھی انگریزی میں اٹھتی تھی۔ ہندوستان اب انگلینڈ کو یہ بات سنانا چاہتا تھا کہ اس کا ملک خود اس کے لیے ہے دوسروں کے لیے نہیں ہے لیکن یہ بات کہنے کے لیے بھی اسے اپنی ہندوستانی زبان نہیں ملی تھی وہ دوسروں ہی کی زبان اُدھار لے کر اپنا کام چلانا چاہتا تھا۔

لیکن جیوں ہی گاندھی جی نے ملک کے سیاسی میدان میں قدم رکھا، اچانک ایک نیا انقلاب ابھرنا شروع ہوگیا۔ اب ملک کی آواز خود اس کی زبان میں اٹھنے لگی اور ملک کی زبان میں بات چیت کرنا شرم کی بات نہیں رہی۔ انھوں نے لوگوں کو یاد دلایا کہ شرم کی بات یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی زبان بولیں، شرم کی بات یہ ہے کہ اپنی زبان بھول جائیں انھوں نے ۲۱-۱۹۲۰ء میں سارے ملک کا دورہ کیا اور سیکڑوں تقریریں کیں لیکن ہر جگہ ان کی تقریروں کی زبان ہندوستانی ہی رہی۔

مجھے یاد ہے کہ پچھلی لڑائی کے زمانے میں، جب میں رانچی میں قید تھا تو میں نے اخباروں میں اس کانفرنس کی کارروائی پڑھی تھی جو سنہ ۱۹۱۷ء میں لارڈ چیمس فورڈ نے دلّی میں بلائی تھی۔ گاندھی جی اس کانفرنس میں شریک ہوئے تھے مگر انھوں نے یہ بات بطور شرط کے ٹھہرائی تھی کہ وہ تقریر ہندوستانی میں کریں گے۔ اس وقت اخباروں نے اس واقعے کو ایک نئی اور عجیب طرح کی بات خیال کیا تھا۔ لیکن یہ نئی بات بہت جلد ملک کی سب سے عام بات بننے والی تھی۔ چنانچہ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ جو جگہ پچیس برس پہلے انگریزی زبان کی سمجھی جاتی تھی وہ ہندوستانی زبان نے لے لی ہے۔

ابوالکلام آزاد

مولانا کے اس مختصر مضمون کے خاتمے پر گاندھی جی نے مضمون کے بارے میں چند جملے لکھے ہیں مناسب ہوگا کہ ان کو بھی قارئین کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ گاندھی جی نے تحریر کیا ہے۔

"اوپر کا لکھان میری تعریف کے لیے نہیں ہے۔ جو آدمی اپنا دھرم سمجھ کر کچھ سیوا کرتا ہے اس میں تعریف کیا ہے؟ مولانا صاحب عالم ہیں۔ فارسی اور عربی کا گیان رکھتے ہیں اس لیے اُردو خوب جانتے ہیں لیکن وہ مانتے ہیں کہ نہ تو عربی فارسی لدی اُردو ہندوستان کی عام زبان ہوسکتی ہے اور نہ سنسکرت بھری ہندی۔ اس لیے وہ اُردو اور ہندی کا میل چاہتے ہیں اور دونوں کو ملاکر بولتے ہیں میں نے ان سے پرارتھنا کی ہے کہ ہر ہفتے ایک چھوٹا سا ہندوستانی لیکھ دیتے رہیں جس سے ہندوستانی کا ایک نمونہ ہریجن سیوک پڑھنے والوں کو ملتا رہے۔ اس کوشش کا پہلا نمونہ اوپر کا لکھان ہے۔

م ک گاندھی"

گاندھی جی کے اس نوٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا آزاد سے مستقل کچھ نہ کچھ ہندوستانی میں لکھتے رہنے کے لیے کہا تھا۔ ہوسکتا ہے مولانا آزاد کی تحریریں ہریجن سیوک کے آئندہ شماروں میں تلاش کی جائیں تو کچھ اور بھی مل جائیں۔ اگرچہ مولانا آزاد کی سیاسی مصروفیات اور ۴۶ء و ۴۷ء کے پر آشوب زمانے کے پیش نظر کچھ زیادہ تحریریں دریافت ہونے کی توقع نہیں کی جاسکتی۔



مولانا ابوالکلام آزاد کی ادبی شخصیت
("غبارِ خاطر" کے آئینے میں)

مولانا آزاد نے یوں تو نثر میں کئی چیزیں لکھی ہیں۔ مثلاً تذکرہ وغیرہ تاہم ان کے خطوط کا مجموعہ یعنی "غبارِ خاطر" ہی دراصل ان کی ادبی شخصیت کا نمائندہ بھی ہے، اور تمام و کمال اظہار بھی۔ یہ خطوط مولانا نے قلعۂ احمد نگر میں، جہاں وہ قید تھے، نواب صدر یار جنگ کے نام لکھے ہیں، چونکہ ایامِ اسیری میں خط بھجوانے کی اجازت نہ تھی، اس لیے ان کے خطوط جو وہ وقتاً فوقتاً لکھا کرتے تھے جمع ہوتے رہے، اور بعد میں ان کی رہائی کے بعد چھپ گئے۔

سوال یہ ہے کہ ان خطوط کی ادبی حیثیت کیا ہے؟ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان خطوط کو مکتوبات سے موسوم کرنے، اور ان میں مکتوب نگاری کے بعض لوازم کی پابندی کرنے کے باوجود، یہ مکتوب نگاری کی روایت سے مطابقت نہیں رکھتے، اس لیے مکتوب نگاری کی صنف کی حیثیت سے ان کی قدر سنجی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگی۔ عالمی ادب میں مکتوب نویسی ایک منفرد ادبی صنف کے طور پر متعارف ہوئی ہے، اردو میں غالب کے خطوط ادبی روایت کا درجہ رکھتے ہیں، غالب کے بعد اقبال، فیض اور سجاد ظہیر سے لے کر تنہا انصاری تک، جن جن حضرات نے خطوط لکھے ہیں، وہ کم و بیش اسی روایت کی توسیع کرتے ہیں۔ اس روایت کی رو سے مکتوب نگار اور مکتوب الیہ میں ایک ذہنی رشتہ قائم ہو جاتا ہے، یہ ایک ذہنی خلوت کا عالم ہے، جس میں کسی تیسرے کا گذر نہیں ہوتا، مکتوب نگار انتہائی بے تکلفی، برجستگی بذلہ سنجی اور اپنائیت سے مخاطب ہوتا ہے، اور بے ساختہ پن سے اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتا ہے۔ خط کی ابتدا سے تا آخر یہ رشتۂ مخاطبت قائم رہتا ہے اور مکتوب نگار اپنے معتقدات اور نظریات یہاں تک کہ تعصبات و ترجیحات کا بھی بے محابا اظہار کرتا ہے۔ مکتوب نگاری کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سنجیدہ علمی اور فلسفیانہ افکار و نکات بھی سادگی، اختصار اور بے تکلفی سے بیان کیے جاتے ہیں، اور کہیں سے کہیں تک مراسلہ مضمون یا مقالے کی گرانباری کا احساس نہیں دلاتا "غبار خاطر" کے مکتوبات پر نظر ڈالیے، تو یہ تاثر قائم ہونے میں دیر نہیں لگتی کہ یہ مکتوبات مکتوب نگاری کے ذیل میں نہیں آتے، مکتوبات میں حرفِ مخاطبت یعنی کہ "صدیق مکرم" اور خاتمے پر "ابوالکلام" لکھنے سے یا کہیں کہیں پر، جیسا کہ شروع شروع کے خطوط سے ظاہر ہوتا ہے، راست تخاطب کے باوجود، یہ مکتوب نگاری کے نمونے قرار نہیں دیے جا سکتے۔ ان مکتوبات میں مصنف نے دورانِ اسیری، زندگی کے واردات، مطالعات، مشاہدات، فلسفیانہ افکار اور ذاتی تاثرات کی ایک عالمانہ اور محققانہ سطح پر بازآفرینی کی کوشش کی ہے، یہ خطوط علم و آگہی کے دفاتر کھولتے ہیں، مثلاً معمۂ ہستی، فنِ موسیقی یا انانیتی ادب کے بارے میں مصنف کے عالمانہ اور فلسفیانہ خیالات پر غور کیجیے تو معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اپنے حافظے کی مدد سے ان موضوعات و مسائل کے بارے میں اپنے علم و خبر کا اظہار کر رہے ہیں، اور مکتوب الیہ سے ان کا تخاطب برائے نام رہ جاتا ہے۔ کم و بیش یہی انداز دیگر مکتوبات کا بھی ہے۔ جن مقامات پر علمی مباحث یا فلسفیانہ تصریحات کے بجائے بذلہ سنجی یا طنز و مزاح کی چاشنی ملتی ہے، وہاں مخاطب کی موجودگی کے احساس کے بجائے خطاب کنندہ ہی حاوی نظر آتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو "غبارِ خاطر" کے مکتوبات، مکتوبات سے زیادہ انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے حالتِ اسیری میں قلم ہاتھ میں لے کر اپنے حافظے میں محفوظ واقعات اور مشاہدات کو سپردِ قرطاس کیا ہے، اور ساتھ ہی اپنی علمیت، عقاید، افکار اور نظریات، کا اظہار بھی کیا ہے، چنانچہ "غبار خاطر" میں مذہب، خدا، کائنات اور غم و مسرت جیسے گمبھیر مسائل سے لے کر حریفانِ سقف و بام یعنی چڑیوں سے محاذ آرائی جیسے مزاحیہ واقعے کے بیان تک، مصنف نے پوری ذہنی آزادی اور طبیعت کی ترنگ کے مطابق، اپنے خیالات و تاثرات کو قلمبند کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نگارشات انشائیہ نگاری ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ انشائیہ بنیادی طور پر طبیعت کی ترنگ، جیسا کہ جانسن نے کہا ہے، کا ہی اظہار ہے، یعنی مصنف ذہنی کیفیت میں قلم برداشتہ، کسی خارجی یا داخلی محرک کے تحت ایک فطری بہاؤ میں ذاتی تاثرات

حامدی کاشمیری
صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر، کشمیر۔







"یہ چبھن عمر کے ساتھ ساتھ برابر بڑھتی گئی، یہاں تک کہ چند برسوں کے اندر عقائد و افکار کی وہ تمام بنیادیں جو خاندان، تعلیم اور گرد و پیش نے چنی تھیں، یہ یک دفعہ متزلزل ہو گئیں۔"

"اس بے رنگ منظر سے آنکھیں اکتا گئی تھیں، اور سبزہ و گل کے لیے ترسنے لگی تھیں۔"

مولانا آزاد ایک ہمہ گیر ادبی شخصیت کے مالک ہیں، وہ ادبی روایت کے سر چشموں سے فیض یاب ہونے کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی پیش رفت کے نتیجے میں جدت پسندی کا احترام بھی کرتے ہیں۔ انھوں نے انتہائی بالیدہ شعری شعور کے باوصف اپنے خیالات کے اظہار کے لیے نثر کا پیرایۂ بیان ہی منتخب کیا، اور اسے اپنی معجز بیانی سے آسمان پر پہنچا دیا، ان کا نثری اسلوب منفرد اور توانا ہے۔ یہ ان کی شخصیت سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ ان کی شخصیت میں جو نظم و ضبط، تعقل، شائستگی، تمکنت اور شعریت ہے، ان کا اسلوب بھی ان ہی خواص سے آراستہ ہے۔ یہ جمال و جلال کے نادر امتزاج کا مکمل نمونہ ہے، اس میں نزاکتِ گل بھی ہے اور صلابتِ سنگ بھی، تخیل بھی ہے، حقیقت بھی، سنجیدگی بھی ہے، مزاح بھی، غم پسندی بھی ہے، اور خوش طبعی بھی، فلسفہ بھی ہے، اور شعریت بھی، اسلوب کے یہ بدلتے رنگ جادوئی کشش رکھتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے مختلف کیفیات کے اظہار کے لیے مختلف اسالیب تراشے ہیں، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، ان کے یہاں ایک ہی بنیادی اسلوب کی گرفت برقرار رہتی ہے، یہ اسلوب توازن ... استدلالیت اور ترسیلیت سے قابلِ شناخت ہوتا ہے۔ اردو نثر میں غالب، حالی اور سر سید نے اسی نوع کے اسلوب کی ابتدا کی، اور مولانا آزاد نے اسے استحکام عطا کیا، مثلاً:

"انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اس کے تقلیدی عقاید ہیں، اسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں، وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اس لیے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔"

"ہم اس الجھاؤ کو نئے نئے حل نکال کر سلجھانے کی جتنی کوششیں کرتے ہیں وہ اور زیادہ الجھتا جاتا ہے، ایک پردہ سامنے دکھائی دیتا ہے، اُسے ہٹانے میں نسلوں کی نسلیں گزار دیتے ہیں، لیکن جب وہ ہٹتا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ سو پردے اور اس کے پیچھے پڑے تھے۔"

"عجیب معاملہ ہے میں نے بارہا غور کیا کہ میرے تصور میں آتش دان کی موجودگی کو اتنی اہمیت کیوں مل گئی ہے، لیکن کچھ بتلا نہیں سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ سردی اور آتش دان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ میں سردی کے موسم کا نقشہ اپنے ذہن میں کھینچ ہی نہیں سکتا، اگر آتش دان نہ سلگ رہا ہو۔"

"بعض پھولوں پر رنگ کی بوندیں اس طرح پڑ گئی تھیں کہ خیال ہوتا تھا، صناعِ قدرت کے موقلم میں رنگ زیادہ بھر گیا ہو گا، صاف کرنے کے لیے جھٹکنا پڑا، اور اس کی چھینٹیں قبائے گل کے دامن پر پڑ گئیں۔"

مولانا آزاد کے اسلوب کی خوبی یہ ہے کہ تعقلی انداز کے باوجود اس میں شعری لطافت موجِ زیریں کی طرح موجود ہے، نتیجے میں فلسفے کے خشک مباحث بھی دلچسپ ہو گئے ہیں، انھوں نے گاہے گاہے فطرت یا اشیا کی جو تصویر کشی کی ہے وہ لاجواب ہے، ان کا لہجہ شعریت آشنا ہے، شعریت زدہ نہیں۔

"اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہوتی ہیں، تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔"

"نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں، اور اوپر ستاروں کی ان گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔"

منظر کشی کے علاوہ جو خاص بات ان کی شاعرانہ شخصیت پر دلالت کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے جس تحسیس یا دعوے پر زور دیتے ہیں اس سے مماثل کسی شعر کو بھی نقل کرتے ہیں، اور قاری کو:

دامِ ہم رنگِ زمیں بود، گرفتار شدم

کے مصداق ان کی دلیل کا قائل ہونا پڑتا ہے، ہو سکتا ہے کہ اس میں ان کی کسی شعوری کاوش کا دخل نہ ہو، جیسا کہ خود لکھتے ہیں۔

"بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ کوئی بات



سے لے کر خارجی اشیاء و اشخاص کے بارے میں اپنے خیالات کو قلم بند کرتا ہے، یہ کام غیر منظم اور غیر منصوبہ بند ضرور ہوتا ہے، اور منتشر الخیالی کا تاثر پیدا کرتا ہے، تاہم مجموعی طور پر انتشار کے باوجود تسلسل و تعمیر سے عاری نہیں ہوتا، یہ بات سے بات پیدا کرنے کا صناعانہ انداز ہے، جو یاوہ گوئی پر نہیں بلکہ معقولیت اور معنویت پر منتج ہوتا ہے۔

مولانا آزاد نے متعدد موضوعات پر خامہ فرسائی کی ہے، ان میں چائے نوشی، قلعۂ احمد نگر، مذہب، موروثی عقائد، سحر خیزی، قید خانہ، چیتہ خان، خلوت پسندی، خاندان، عادات و خصائل، تعلیم، زندگی، کائنات، خدا، وحدت الوجود، مادہ، روح، پانچویں صلیبی حملے کے بارے میں، ژرو، این ڈ ویل کی یادداشت، چائے کے اقسام اور تاریخ، آنس وان، انانیتی ادب، حکایت زاغ و بلبل، پھولوں کی اقسام، چڑیا چڑے کی کہانی، قلندر اور فن موسیقی وغیرہ شامل ہیں، ان موضوعات کے بارے میں مصنف نے بغیر کسی کدو کاوش کے، روانی اور برجستگی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، اور طرز تحریر میں جو بے ساختگی اور شگفتگی ہے وہ بھی انشائیہ نگاری کے اصول کی توثیق کرتی ہے، مصنف نے غالباً اسی مناسبت سے کتاب کا نام "غبار خاطر" (جو آنندرام مخلص کے ایک رسالے سے مستعار لیا گیا ہے) رکھا ہے۔ مزید برآں کتاب کے دیباچے میں وہ اپنے مکاتیب کو "قلم برداشتہ لکھے ہوئے" قرار دیتے ہیں، اور عنوان کے نیچے یہ شعر درج کیا ہے:

میرسد تا چہ نوشت ست کلک قاصر ما
خط غبار من ست این غبار خاطر ما

اور اس کا ذکر دیباچے میں بھی کیا ہے، بات سے بات نکلنے کی جانب خود بھی اشارہ کیا ہے:

"بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو لکھنے میں مشغول ہوں، اتنے میں کوئی دلنشیں بات نوکِ قلم پر آگئی، یا عبارت کی مناسبت نے اچانک کوئی پُر کیف شعر یاد دلا دیا، اور بے اختیار اس کی کیفیت کی خود رفتگی میں سراسر وشانہ ہلنے لگا یا منہ سے ہا نکل گیا۔"

مغربی ادب میں انشائیہ نگاری نے اپنی ادبی اہمیت منوالی ہے، اردو میں حالیہ برسوں میں انشائیہ نگاری کو فروغ ملا ہے، وزیر آغا جدید دور کے ایک اہم انشائیہ نگار ہیں، انھوں نے "اوراق" کے ذریعے اسے مقبول بنانے میں نمایاں رول ادا کیا ہے، چنانچہ اب کئی مستند ادیب انشائیے لکھ رہے ہیں، اور جو انشائیے لکھے جارہے ہیں وہ ادبی خوبیوں سے معمور ہوتے ہیں، انشائیے میں مصنف کی شخصیت کے پرتو ہر جگہ نظر آتے ہیں، جو قاری کے دل و دماغ کو منور کرتے ہیں، اس میں روزمرہ زندگی کے واقعات، اشخاص، اشیا اور مناظر سے لے کر زندگی کائنات اور موت کے اسرار تک ہر موضوع پر خیال آرائی اور خیال افروزی کا انداز نمایاں رہتا ہے۔

> ... "غبار خاطر" کے مکتوبات، مکتوبات سے زیادہ انشائیہ نگاری کے تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے حالت اسیری میں قلم ہاتھ میں لے کر اپنے حافظے میں محفوظ واقعات اور مشاہدات کو سپرد قرطاس کیا ہے اور ساتھ ہی اپنی علمیت، عقائد، افکار اور نظریات کا اظہار بھی کیا ہے...

مولانا آزاد کی نگارشات کی ادبیت اس بات میں مضمر ہے کہ انھوں نے موضوعات کے برتاؤ میں شخصی نقطۂ نظر کو برابر قائم رکھا ہے، ان کی شخصیت کی تب و تاب سے ان کی تحریر کا ہر فقرہ روشن ہے، چنانچہ ان کی شخصیت کی انفرادیت ہمہ گیری اور ترفع کا احساس گہرا ہوجاتا ہے، یہ شخصیت ان کی انانیت، خلوت پسندی، موسیقی سے لگاؤ... تشکیک، تجسس، تحمل، خود ضبطی، مذہبیت اور شائستگی کے تابناک عناصر سے جگمگاتی ہے اور ممتاز و منفرد ہوجاتی ہے یہی وہ خصوصیت ہے، جو ان کی نثر کو ادبی وقار عطا کرتی ہے۔

"عام حالات میں مذہب انسان کو اس کے خاندانی ورثے کے ساتھ ملتا ہے اور مجھے بھی ملا۔ لیکن میں موروثی عقائد پر قانع نہ رہ سکا۔"

"میں آپ کو بتلادوں، اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے؟ میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا، کوئی حالت ہو، کوئی جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔"

"ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔"

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے، تو کیا مضائقہ، وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا، اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینے میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔"



مولانا آزاد کا ایگو

مولانا ابوالکلام آزاد کی تصنیف "غبارِ خاطر" اُردو کے ادبِ عالیہ میں شمار ہوتی ہے۔ اس کتاب کے ۱۶ مکاتیب میں، دس صفحات پر مشتمل ایک مکتوب (یا مضمون) انانیتی ادب کے بارے میں بھی ہے۔ انانیتی ادب سے مولانا کی مراد ایسی تمام تصنیفات اور تحریرات ہیں جن میں مصنف نے خود اپنے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہو۔ اس میں خودنوشت سوانح عمریاں، ذاتی واردات و تاثرات، اور شخصی اسلوبِ فکر بھی شامل ہیں۔ انانیتی ادب کی معنویت اور ماہیت پر مولانا کی یہ بحث بہت دلچسپ اور خیال انگیز ہے جس میں مولانا نے مصنف اور اس کے ایگو پر متعدد زاویوں سے روشنی ڈالی ہے اس مکتوب میں اگرچہ مولانا آزاد نے خود اپنے ایگو کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں لکھا مگر بین السطور میں وہ سب کچھ موجود ہے جو اس مضمون کا محرک ہے اور وہ سب کچھ بھی جس سے خود مولانا اپنے آپ کو متصف سمجھتے تھے۔

انانیتی ادب کے بارے میں غبارِ خاطر کا درج ذیل اقتباس مولانا کے نقطۂ نظر پر کافی روشنی ڈالتا ہے:

"ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ کبھی کبھی ایسی شخصیتیں بھی دنیا کے اسٹیج پر نمودار ہو جاتی ہیں جن کی انانیت کی مقدار اضافی نہیں ہوتی بلکہ مطلق نوعیت رکھتی ہے۔ یعنی خود انھیں ان کی انانیت جتنی بڑی دکھائی دیتی ہے اتنی ہی بڑی دوسرے بھی دیکھنے لگتے ہیں۔ ان کی انانیت کی پرچھائی جب کبھی پڑے گی تو خواہ اندر کا آئینہ ہو خواہ باہر کا۔ اس کے ابعادِ ثلاثہ ہمیشہ یکساں طور پر نمودار ہوں گے۔

ایسے احض الخواص افراد کو عام معیارِ نظر سے الگ رکھنا پڑے گا۔ ایسے لوگ فکر و نظر کے ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے۔ ادب و تصنیف کے علم و قوانین انھیں اپنے کلیتوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانے کو ان کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں۔ ان کی ہر "میں" ان کی ہر "وہ" اور "تم" سے زیادہ دل پذیر ہوتی ہے۔"

(غبارِ خاطر مطبوعہ مکتبہ اسرار لاہور۔ صفحہ ۲۰۷)

اس معیار کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر ہم مولانا کی تصانیف غبارِ خاطر، تذکرہ اور انڈیا ونس فریڈم (جس میں کسی نہ کسی طور سے خودنوشت واردات و سوانح کی جھلک پائی جاتی ہے) کا بغور مطالعہ کریں تو اس حقیقت کے آشکار ثابت ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ مولانا خود کو ایک ایسا ہی "احض الخواص" انسان سمجھتے تھے جس کا زمانے پر یہ حق ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کی ہر "میں" کے آگے سرِ تسلیم خم کرتا رہے۔

خودنوشت سوانح کے مصنفین کو مولانا نے تین زمروں میں تقسیم کیا ہے:

۱۔ سینٹ آگسٹائن۔ روسو، اسٹرنڈبرگ، اناطول فرانس اور آندرے ژید، مغربی ادبیات میں۔

۲۔ غزالی، ابن خلدون، بابر، جہانگیر اور ملا عبدالقادر بدایونی، مشرقی ادبیات میں۔

نامی انصاری
۱۴/۲۱-۱۴ اے، نواب صاحب کا احاطہ، سول لائنز، کانپور ۲۰۸۰۰۱

۳۔ ٹالسٹائی۔

نمبر ایک اور دو کے مصنفین میں بقول مولانا آزاد مشترکہ خصوصیت یہ ہے کہ اگرچہ ان کی انانیت مطلق نہیں ہے تاہم ان کی تحریریں اتنی بے تکلف اور بے ساختہ ہیں کہ ہم ان مصنفین کے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی تحریروں کو پڑھنے سے خود کو باز نہیں رکھ سکتے۔ اس کے بعد احض الخواص مصنفین آتے ہیں جن کی انانیت مطلق اور قائم بالذات ہے۔ یعنی ان کو اپنے ایگو کے اظہار کے لیے کسی بیرونی تفاعل کی ضرورت نہیں ہے۔ اس زمرے کے مصنفین میں مولانا آزاد نے مثال صرف ٹالسٹائی کی دی ہے۔ مگر ان کا اندازِ تحریر اس کا متقاضی ہے کہ خود مولانا کو بھی اسی زمرے کے مصنفین میں جگہ دی جائے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے غبارِ خاطر کے دیباچے پر غور کر لینا چاہیے جو اگرچہ مولوی محمد اجمل خاں کے نام سے شائع ہوا ہے مگر جملوں کی ساخت زبان اور اسلوب ایسا ہے کہ اسے مولانا سے منسوب کرنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی

"لوگ نثر میں اشعار لاتے ہیں تو عموماً اس طرح لاتے ہیں کہ کسی جزئی مناسبت سے کوئی شعر یاد آ گیا۔ اور کسی خاص محل میں درج کر دیا گیا۔ لیکن مولانا اس قسم کی تحریرات میں جو شعر درج کریں گے اس کی مناسبت محض جزئی مناسبت نہ ہوگی بلکہ مضمون کا ایک ٹکڑا بن جائے گی۔ گویا خاص اسی محل کے لیے شاعر نے یہ شعر کہا ہے اور مطلب کا تقاضہ پورا کرنے اور ادھوری بات کو مکمل کر دینے کے لیے اس کے بغیر چارہ نہیں۔ اس طرزِ تحریر پر وہی شخص قادر ہو سکتا ہے جو کامل



برسوں تک حافظے میں تازہ نہیں ہوتی، گویا کسی کونے میں سو رہی ہے یا کسی وقت اچانک اس طرح جاگ اُٹھے ہی جیسے اسی وقت دماغ نے کواڑ کھول کر اندر لے لیا ہو، اشعار و مطالب کی یادداشت میں اس طرح کی واردات اکثر پیش آتی رہتی ہے۔"

بہرحال، جو بھی صورت ہو، وہ متعدد مقامات پر ہمیں خوب صورت اور خیال انگیز اشعار کا سامنا کراتے ہیں، اور ہم حیران رہ جاتے ہیں کہ مصنف کس ندرت اور زیرکی سے اپنے خیالات کی صحت کی توثیق شعری حوالوں و آثار (اشعار کے حوالے سے) سے کراتے ہیں قاری کو اپنے خیالات کے قائل کرانے کا یہ انوکھا انداز مولانا آزاد ہی کے حصے میں آیا ہے۔

مولانا آزاد کی ادبی شخصیت میں وزن اور وقار ہے، وہ اپنے مکاتیب میں زنداں کے شب و روز یادداشت میں محفوظ گھریلو یا سماجی زندگی کے بیان ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ ایک مفکر کی طرح مابعد الطبیعاتی مسائل مثلاً ہستی، کائنات، خدا، اخلاق اور مذہب پر بھی غور و فکر کرتے ہیں۔ ظاہر ہے وہ آفرینش اور زوال کے اسرار کو کھوجنے کا فلسفیانہ تجسس بھی رکھتے ہیں، علمی ادب کی ارضیت کے ساتھ ساتھ ماورائیت پر بھی محیط ہوتا ہے، اور غور و فکر کی نئی نئی راہیں کھول دیتا ہے، مولانا آزاد کی تحریروں میں یہ خصوصیت ہر جگہ نمایاں ہے انھوں نے فلسفے کا مطالعہ کیا ہے کہتے ہیں "طالب علمی کے زمانے سے فلسفہ میری دلچسپی کا خاص موضوع رہا ہے، عمر کے ساتھ ساتھ یہ دلچسپی بھی برابر بڑھتی گئی۔"

تاہم یہ واقعہ ہے کہ وہ طبعاً مفکر واقع ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تشکیک کی راہوں سے گذر کر بھی تجدید اعتقاد کی منزل پر آ گئے، فلسفہ عقیدہ اور مذہب کے باہمی عمل کے بارے میں لکھتے ہیں۔

" فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا، اور پھر اسے بند نہیں کر سکے گا۔ مگر عقیدہ نہیں دے سکے گا، لیکن مذہب ہمیں عقیدہ دے دیتا ہے، اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لیے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ عقیدے کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف ان ہی باتوں پر قناعت نہیں کر سکتے جنھیں ثابت کر سکتے ہیں، اور اس لیے مان لیتے ہیں، یہاں کچھ باتیں ایسی بھی ہیں، جنھیں ثابت نہیں کر سکتے لیکن مان لینا پڑتا ہے۔"

چنانچہ مولانا آزاد نے کئی ماورائی مسائل کو ایک مفکر کے زاویۂ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے، ملاحظہ ہو:

" اس طلسم ہستی کے معمے پر غور کیجیے، جو خود ہمارے اندر چاروں طرف پھیلا ہوا ہے، انسان نے جب سے ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولی ہیں، اس معمے کا حل ڈھونڈ رہا ہے۔"

" زندگی اور حرکت کا یہ کارخانہ کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ اس کی کوئی ابتدا بھی ہے یا نہیں؟ یہ کہیں جا کر ختم بھی ہوگا یا نہیں؟ خود انسان کیا ہے، یہ جو ہم سوچ رہے ہیں کہ انسان کیا ہے، تو خود یہ سوچ اور سمجھ کیا چیز ہے، اور پھر حیرت اور درماندگی کے ان تمام پردوں کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟"

اوّلیت کا شرف

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کی جنگ آزادی کا سہرا انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد سے جڑا ہوا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اگر یہ بھی کہا جائے کہ جنگِ آزادی کی کہانی ساتھ ہی جنگ کے نہایت جری سپاہی آزادیِ وطن کے متوالے مولانا ابوالکلام آزاد کی داستانِ حیات بھی شروع ہوتی ہے اور ساتھ ساتھ چلتی ہے تو یہ بات بھی کچھ کم باوزن معلوم نہیں ہوتی ہے۔

کانگریس کی بنیاد ۱۸۸۵ء میں پڑی اور اس کے صرف تین سال بعد مولانا آزاد مکے میں پیدا ہوئے جہاں سے ۱۸۹۵ء میں وہ ہندوستان آئے اور ۱۹۰۳ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے والد کے جانشیں بننے کے بجائے جنگ آزادی کے سپاہی بن کر میدان جنگ میں اترنے کی تیاری کرنے لگتے ہیں، تقسیم بنگال سے متاثر ہوتے ہیں، انقلابیوں کے سربراہ شیام سندر چکرورتی سے تعلق پیدا کرتے ہیں، ممالک اسلامیہ کا سفر کرتے ہیں اور وہاں کے انقلابیوں سے راہ و رسم پیدا کرتے ہیں، واپس آ کر چند سال بعد ۱۳ جولائی ۱۹۱۲ء سے "الہلال" جاری کرتے ہیں، اسی کے ساتھ ہندوستان کی جنگِ آزادی کی راہ پر آہستہ آہستہ چل نکلتے ہیں اور پھر انگریزوں کے خلاف رفتہ رفتہ صف آرائی میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہ بات بھی اہمیت رکھتی ہے کہ مولانا آزاد نے آزادی کی لڑائی میں اس وقت نہایت بے باکی اور جرأت مندی کے ساتھ حصہ لینا شروع کیا، جب ہمارے بہت سے رہنما اپنے متعلق فیصلہ نہ کر پائے تھے کہ انھیں اس میدان میں کب اور کیسے اترنا ہے اور کس طرح حصہ لینا ہے۔

("ابوالکلام آزاد" از عبدالقوی دسنوی، شائع کردہ ساہتیہ اکادمی)



کم لذّتم و قیمتم افزوں ز شمار است
گوئی ثمرِ پیشتر از باغ وجودم

اس شعر سے مولانا کو خود اپنی ذات سے مطابقت نظر آتی ہے کہ وہ بے اختیار اپنی زندگی کے کوائف و تجارب اور خاندانی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے زندگی کی ہر راہ میں اپنی انفرادیت کا نقش بٹھاتے لگ جاتے ہیں۔

"اس بے مزگی میں بھی اپنی قیمت ہمیشہ گراں رہی۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزہ ملے یا نہ ملے مگر یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی۔"

"مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں، جس طرف بھی نکلنا پڑا اکیلے ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں کا ساتھ نہ دے سکا۔"

"جس راہ میں بھی قدم اٹھایا وقت کی منزلوں سے اتنا دور ہوتا گیا کہ جب مڑ کے دیکھا تو گرد راہ کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا اور یہ گرد بھی اپنی ہی تیز رفتاری کی اڑائی ہوئی تھی۔"

طبعم بہ رساں کہ بہ سازی بعالمے
یا ہمتے کہ بر سرِ عالم تواں گزشت

"پہلا طریقہ اختیار کر نہیں سکتا تھا کیونکہ اس کی طبیعت ہی نہیں لایا، ناچار دوسرا طریقہ اختیار کرنا پڑا۔"

حکایت بادہ و تریاک، چڑیا چڑے کی کہانی، چائے نوشی، حکایت زاغ و بلبل، موسیقی، حتیٰ کہ زلیخا بیگم کی وفات والے مکتوب میں بھی کسی نہ کسی پیرائے میں مولانا کے ایگو کا واضح اظہار نظر آتا ہے۔ قلعہ احمد نگر میں نظر بندی کے دوران چونکہ فرصت و فراغت بھی میسر تھی اور دل و دماغ بھی اپنی مصنوعی پرتیں اتارنے پر آمادہ تھے۔ اس لیے ان خطوط میں مولانا کے ایگو کا منظر نامہ بہت روشن نظر آتا ہے۔ اور غبارِ خاطر کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی صاحبِ نظر ان کے ایگو کے اثرات کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"تذکرہ" کا معاملہ "غبارِ خاطر" سے قدرے مختلف ہے۔ بظاہر یہ مولانا کی خود نوشت سوانح ہے۔ مگر اس میں سوانح سرے سے مفقود ہیں۔ اس لیے کہ مولانا خود کو ستر پردوں میں چھپا کر رکھنے کے عادی تھے۔ اشاروں کنایوں میں وہ "میں" کے اظہار میں مضائقہ نہیں سمجھتے مگر اس کے برملا اظہار کو وہ اپنے مرتبے سے فروتر جانتے ہیں۔ ۱۹۶۸ء میں جب مالک رام صاحب نے "تذکرہ" کو نئے سرے سے ایڈٹ کر کے چھاپا تو اس میں انھوں نے دو باتیں خاص طور سے نوٹ کیں۔ اوّل یہ کہ "تذکرہ کا غائر مطالعہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ ان کے دل میں رہ رہ کر کوئی خیال کروٹیں لے رہا ہے" اور دوم یہ کہ "وہ کوئی خاص دعویٰ کرنے کو پر تول رہے ہیں"۔ مالک رام صاحب کے اس خیال کی بنیاد "تذکرہ" کے دو مقامات ہیں جن کے ضروری اقتباسات حسب ذیل ہیں:

ا۔ کہہ نہیں سکتا کہ یہ خیال کس درجہ سرورِ قلب وکیف دماغ کا باعث ہوا کہ الحمدللہ علم حدیث و سنّت کی خدمت و چاکری کی سعادت میں ہمیشہ سے یہ خاندان ممتاز رہا ہے۔۔ عجب نہیں کہ بادۂ کہن وقت کی خمار آلودگیوں کے علی الرغم پھر جام و مینا کی گردش تک پہنچے اور یہ سرمستی پارینہ دارو نے تازہ سے ترکیب پا کر ہنگامۂ گزشتہ اور شورشِ رفتہ کی دست افشانیوں اور پاکوبیوں کا عالم از سرِ نو تازہ کر دے۔"

(تذکرہ۔ مرتبہ مالک رام۔ صفحہ ۳۰۲)

ب۔ "گو ہمرہانِ راہ اب تک اسی منزل میں کمریں کھولے بے فکر پڑے ہیں مگر اپنا کاروانِ طلب اب کسی دوسری ہی منزل کے آثار سامنے دیکھ رہا ہے۔"

(تذکرہ ص ۳۳۵)

تذکرہ کے آخری باب میں اگرچہ مولانا آزاد نے اپنے حالات و کوائف بیان کیے ہیں مگر اس میں انشا پردازی اور استعارہ سازی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے تاہم مندرجہ بالا دونوں مقامات اور ان کے سیاق و سباق پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مالک رام صاحب کا اندازہ بالکل درست ہے۔ مولانا نے ۱۹۲۰ء میں پورے ہندوستان میں اپنی امامت پر بیعت کے لیے جو تحریک چلائی تھی یہ بھی دراصل ان کے ایگو کی ہی کرشمہ سازی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ بقول مالک رام صاحب اس تحریک کے مضمرات بہت جلد ان کی سمجھ میں آ گئے اور وہ اس راہِ پُرخار سے دامن بچا گئے۔ صاف بات تو یہ ہے کہ مولانا آزاد کا ایگو عالمِ طفلی ہی میں بیدار ہو گیا تھا اور جیسے جیسے عمر بڑھتی گئی یہ پختہ سے پختہ تر ہوتا گیا:

بادہ گر خام بُود، پختہ کند شیشۂ ما

"جس حال میں رہے نقص و ناتمامی سے دل کو ہمیشہ گریز رہا اور شیوۂ تقلید و روشِ عام سے پرہیز، جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے کبھی دوسرے کے نقشِ قدم کی تلاش نہ ہوئی، اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لیے اپنا نقشِ قدم رہ نما چھوڑا۔" (تذکرہ، صفحہ ۳۲۹)

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علم و ادب، فکر و فلسفہ دین و مذہب، تدبّر اور سیاست کے میدان میں وہ نابغۂ عصر تھے اور ان معاملات میں کم از کم ان کے زمانے میں مشکل ہی سے چند نفوس ان کے ہمسر تھے۔ مگر ان کی خود پسندی یا انانیت بھی اسی درجے کی تھی اور وہ خود کو ابن تیمیہ، رازی اور غزالی سے کم نہ سمجھتے تھے۔ امام الہند ہونے کا ان کا دعویٰ ان کے ایگو

درجے کا شاعرانہ فکر رکھنے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کے بے شمار اشعار بھی اپنے حافظے میں محفوظ رکھتا ہو، اور مطالب کی ہر قسم اور ہر نوعیت کے لیے جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں فوراً " حافظہ سے نکال سکتا ہو" پھر ساتھ ہی ساتھ اس کا ذوق بھی اس درجہ سلیم اور بے داغ ہو کر صرف اعلیٰ درجے کے اشعار ہی حافظہ قبول کرے اور حسنِ انتخاب کا معیار کسی حال میں بھی درجے سے نہ گرے۔"

(دیباچہ از مولوی محمد اجمل خاں صفحہ ۱۶)

مندرجہ بالا اقتباس پر مولانا آزاد کے خاص اسٹائل کی چھوٹ کس طرح پڑ رہی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث میں جائے بغیر میں صرف اس فقرے کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں :

" جس طرح کے اشعار بھی مطلوب ہوں، فوراً حافظہ سے نکال لے سکتا ہو۔"

"نکال لے سکتا ہو" مولانا کا خاص اسٹائل ہے۔ اردو والے اس موقع پر "نکال سکتا ہو" لکھیں گے "نکال لے سکتا ہو" کبھی نہ لکھیں گے۔ اس قسم کے فقرے غبارِ خاطر کے متن میں کئی جگہ ملتے ہیں :

۱۔ ہم اپنے ذہنی آثار تو ہر چیز سے " بچا لے جا سکتے ہیں" مگر خود اپنے آپ سے نہیں بچا سکتے۔

(غبارِ خاطر۔ ص۔ ۲۰۱)

۲۔ چھبیس برس گزر چکے وہی سانچا کام دے رہا ہے اور اب اس قدر پختہ ہو چکا ہے کہ " ٹوٹ جا سکتا ہے" مگر لچک نہیں کھا سکتا۔

(غبارِ خاطر۔ ص۔ ۵۸)

مطلب صرف یہ ہے کہ اندرونی شہادتوں اور مولانا کی افتادِ طبع کی بنیاد پر اگر اسے مولانا آزاد کا خود نوشت دیباچہ تسلیم کر لیا جائے تو یہ دیباچہ بھی اسی ایگو کا ایک نقشِ جمیل ثابت ہوگا جس کی طرف انانیتی ادب والے مکتوب میں مولانا نے بار بار اشارے کیے ہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مولانا "میں" بولنا بھی چاہتے ہیں اور دنیا پر ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتے کہ وہ "میں" بول رہے ہیں۔ اس کے لیے کبھی وہ محمد اجمل خاں کا سہارا لیتے ہیں کبھی فضل الدین احمد کا اور کبھی دوسرے کا۔ اس ضمن میں وہ ٹالسٹائی کی "میں" کے قدرتی سرجوش کا تذکرہ جس والہانہ انداز میں کرتے ہیں وہ خاص طور سے قابلِ غور ہے :

" ٹالسٹائی غالباً ان خاص شخصیتوں میں تھا۔ جن کی انانیت کی مقدار اضافی ہونے کی جگہ ایک مطلق نوعیت

> ... میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ ان کے "دماغ کا مغرورانہ احساس" ہمہ وقت ان کو اپنی لپیٹ میں لیے رہتا تھا، مگر اتنا کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نہ صرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں بلکہ سارے برِصغیر میں خود کو سب سے زیادہ قدآور اور بلند مرتبت سمجھتے تھے۔۔۔

رکھتی تھی۔ اس کی انانیت خود اُسے جتنی بڑی دکھائی دی، دنیا نے بھی اسے (اتنا ہی) بڑا دیکھا۔ پچھلی صدی کے آخری اور اس صدی کے ابتدائی دور میں شاید ہی وقت کا مصنف اس خود اعتمادی کے ساتھ "میں" بول سکا جس طرح یہ عجیب و غریب روسی بولتا رہا۔"

(غبارِ خاطر۔ ص۔ ۲۰۸)

اس عجیب و غریب روسی مصنف کے علاوہ "وہ فیضی" ابو فراس ہمدانی، ابن سنا الملک، فردوسی اور میرانیس کے ایگو کے نقوش بھی مرتب کرتے ہیں مگر ان سب کے پسِ پردہ خود ان کی اپنی ذاتِ خوش صفات ہے۔ جسے وہ سامنے لانا بھی نہیں چاہتے۔ مگر اپنی انا کے قدرتی سرجوش کو دبا بھی نہیں سکتے۔ غبارِ خاطر کے اگر سب نہیں تو بیشتر مکاتیب ان کے ایگو کی ہی صدائے بازگشت بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ مثلاً چائے والا مکتوب جو کتاب کے ۱۸ صفحات کو محیط ہے۔ اس مکتوب میں انھوں نے چائے نوشی کے بارے میں اپنے بعض اختیاراتِ خاص اور طریقۂ کار کا ذکر کیا ہے۔ مگر پورے مکتوب کا لب لباب دراصل ان کے ایگو ہی کا عکس ہے۔ جگہ جگہ اس قسم کے جملے ملتے ہیں :

" واقعہ یہ ہے کہ وقت کے بہت سے مسائل کی طرح اس معاملے میں بھی طبیعت سوادِ اعظم کے مسلک سے متفق نہ ہو سکی۔"

" غور فرمائیے کہ میرا رُخ کس طرف ہے اور زمانہ کدھر جا رہا ہے۔"

" جمعیت بشری کی یہ فطرت ہے کہ ہمیشہ عقلمند آدمی اکا دکا ہوگا، بھیڑ بیوقوفوں ہی کی رہے گی۔"

" لوگوں کو جو لذت مٹھاس میں ملتی ہے مجھے نمک میں ملتی ہے۔ کھانے میں نمک ملا ہوا ہے مگر اوپر سے اور چھڑک لوں گا۔ میں صباحت کا نہیں ملاحت کا قائل ہوں۔"

" جواہر لال چونکہ مٹھاس کے بہت شائق ہیں اس لیے گڑ کا بھی شوق رکھتے ہیں۔ میں نے یہاں ہزار کوشش کی کہ شکر کی نوعیت کا یہ فرق جو میرے لیے اس درجے نمایاں ہے، انھیں بھی محسوس کراؤں لیکن نہ کرا سکا۔"

۱۲ اکتوبر ۱۹۴۲ء کے مکتوب میں مولانا نے حکیم صدرائے شیرازی کا یہ شعر درج کیا ہے اور لکھا ہے کہ صبح سو کر اٹھا تو بغیر کسی ظاہری مناسبت اور تحریک کے یہ شعر خود بخود زبان پر طاری تھا :

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مودودی

(اسلوب کی روشنی میں)

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودی بیسویں صدی عیسوی کی دو ایسی عظیم ہستیاں ہیں جنھوں نے تعمیری ادب کی تخلیق میں اپنے شب و روز کو ایک کردیا اور دنیائے ادب اُردو اور عالمِ اسلام کو اپنی تصنیفات کا وہ ذخیرہ عطا کیا جن کی اثر انگیزی نے لاکھوں افراد کی زندگی کا رُخ بدل دیا اور ان دونوں ہم عصروں کے اسلوب کے حسن اور طرزِ نگارش نے علمی و ادبی حلقوں سے بے پناہ دادِ تحسین وصول کی۔

مولانا ابوالکلام آزاد کی سحر طرازی کا زمانہ آج بھی اسی طرح معترف ہے جس طرح ان کی حیات میں تھا اور جس کی تصدیق مولانا حسرت موہانی صاحب نے اس طرح کی تھی:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظمِ حسرت میں کچھ مزہ نہ رہا

اور مولانا مودودی کے متعلق عالمِ اسلام کے ایک ممتاز ادیب و شاعر جناب نعیم صدیقی فرماتے ہیں: "مولانا مودودی ایک بڑے ادیب کی حیثیت سے زبان و بیان اور اسالیب کا ایک نیا اسٹائل لے کر آئے تھے اور اپنے اسی ہتھیار سے انھوں نے اسلام کے لیے جہاد کیا۔" جناب ماہر القادری فرماتے ہیں:

نگارش پر تری حسنِ ادب نے ناز فرمایا

مولانا آزاد اور مولانا مودودی میں بہت سی باتیں مشترک ہیں اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جو دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہیں۔ جو باتیں مشترک ہیں ان میں سب سے اہم تو یہ ہے کہ ان دونوں حضرات کا موضوع بنیادی طور پر "اسلامیات" تھا اور ان دونوں کی بہترین تحریریں ان کی تفاسیرِ قرآن ہیں۔ ان دونوں کے بارے میں یہ بات بھی پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان دونوں کی دینی کتابوں سے بہتر نثر اُردو زبان و ادب میں نہیں لکھی گئی ہے۔ اُردو زبان و ادب اور صحافت کے میدان میں بھی ان دونوں حضرات کا جو مقام تھا وہ کسی سے مخفی نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کا "الہلال" اور "البلاغ" اٹھا کر دیکھ لیں ان کی عظمت کے اعتراف سے انحراف ناممکن ہوگا۔ اسی طرح مولانا مودودی کے "ترجمان القرآن" پر نظر ڈالیں۔ بہت ساری گتھیاں سلجھتی چلی جائیں گی۔

لیکن دونوں ہم عصروں میں جو چیز دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے وہ دونوں کا اسلوب بیان ہے۔ مولانا آزاد کے یہاں سابقین سے استفادے کے باوجود لطیف احساسات و جذبات کی نزاکت پائی جاتی ہے۔ آپ کے یہاں رعد کی سی گرج اور طوفان کی سی جلالی کیفیت پائی جاتی ہے لیکن مولانا مودودی کے یہاں کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے نسیمِ سحر کے پُر لطف جھونکے مقصدیت کے آب سے تر پھولوں کی شبنم آلود پیشانیوں کو چھوتے ہوئے گذر رہے ہیں۔ مولانا آزاد کی تحریروں میں خطیبانہ للکار اور ولولہ انگیز باتیں ہیں تو مولانا مودودی کے اسلوب میں نرمی اور ملائمت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو اُردو کے ان دو صاحبِ طرز ادیبوں میں دونوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے۔

جہاں تک نثری ادب اُردو کے اسلوب کا تعلق ہے اس صدی کے پہلے ربع تک پانچ اسلوب سامنے آتے ہیں۔ اولاً وہ دینی ادب ہے جسے صوفیائے کرام نے تیار کیا تھا اور جس میں اسلوب کے حسن کی زیادہ فکر نہیں کی جاتی تھی۔ ہاں زبان کی صحت کا پورا پورا اہتمام کیا جاتا تھا۔ چونکہ اس ادب کا اہم موضوع مذہب اور مذہبی مسائل ہوا کرتے تھے اس لیے وہاں عربی اصطلاحات کا استعمال زیادہ ہے اور تشبیہات و استعارات میں تخیل کا حصہ نہیں کے برابر ہے۔ دوسری روایت نثرِ سادہ اور صاف ستھرے ادب کی ہے جس میں مذہبی امور کے ساتھ ساتھ معاشی، سیاسی، معاشرتی اور علمی موضوعات پر بھی قلم اٹھایا گیا ہے۔ اس روایت کے بانی سرسیّد احمد خاں کہلاتے ہیں۔ سرسیّد کے بعد علامہ شبلی نعمانی ایک نئی آب و تاب کے ساتھ آسمانِ ادب پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کی کاوشوں نے زیادہ حسین اور زیادہ متوازن روایت اسلوب قائم کی۔ انگریزی الفاظ کی بھرمار جو سرسید کی نثر میں پائی جاتی تھی اس سے علامہ شبلی نے احتراز کیا اور اُردو نثر کو عربی و فارسی ادب کے

محمد فاروق اعظم
صدر بزمِ اہلِ قلم، بھاگل پور ۲

کا ہی ایک مظہر تھا۔ اب صرف ایک سوال باقی رہ جاتا ہے۔ کیا دنیا نے بھی ان کے ایگو کو اتنا ہی بڑا دیکھا جتنا خود ان کو نظر آیا اور کیا ٹالسٹائی کی طرح ان کا ایگو بھی مطلق اور قائم بالذات تھا' اضافی نہ تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا جواب نفی میں ہونا چاہیے۔ ایگو کے لیے خارجی اسباب اتنے اہم نہیں جتنا خود انسان کا اندرونی استحکام اور روحانی ترفع۔ اس کے لیے صرف خود شناسی ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا ترفع بھی ایک بلند روحانی سطح پر ہونا چاہیے۔ میرا خیال ہے کہ مولانا آزاد اس وصف سے متصف نہ تھے۔ قدرت نے ان کو بڑا دماغ 'بے پناہ قوتِ حافظہ' اور خود مکتفی خارجی وسائل مہیا کیے تھے جن کا انھوں نے بھرپور استعمال کیا۔ مگر وہ اس روحانی بلندی پر نہ پہنچ سکے جو شخصی ارتقا کی اصل منزل ہوتی ہے اور جہاں پہنچنے کے بعد فروتنی' عاجزی اور انکساری کے اوصاف خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ میں یہ کہنے کی جرأت تو نہیں کر سکتا کہ ان کے "دماغ کا مغرورانہ احساس"[2] ہر وقت ان کو اپنی لپیٹ میں لیے رہتا تھا' مگر اتنا کہنے میں کوئی حرج نہیں کہ وہ نہ صرف اپنے گرد و پیش کے لوگوں میں بلکہ سارے برصغیر میں خود کو سب سے زیادہ قد آور اور بلند مرتبت سمجھتے تھے۔ غبارِ خاطر میں زندہ افراد کا تذکرہ بہت کم ہے مگر جن لوگوں کے نام آئے ہیں' مثلاً مولانا کا خادم خاص عبداللہ' جیلر' وارڈر' چیتا خاں' باورچی' جواہر لال' کلکٹر اور واحد متکلم نے جس بلندی سے ان پر نگاہِ غلط انداز ڈالی ہے اس سے کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہو ہی سکتا ہے کہ اپنے گرد و پیش کے لوگوں کو وہ کیا سمجھتے تھے۔ انڈیا ونس فریڈم (ہماری آزادی) جن لوگوں نے پڑھی ہے انھوں نے واضح طور سے محسوس کیا ہوگا کہ اس میں واحد متکلم نے اپنے قد کو اتنا دراز کر دیا ہے کہ گرد و پیش کے سارے لوگ کوتاہ قامت نظر آنے لگے ہیں۔

مہاتما گاندھی فقیر منش تھے۔ ان کے خود نوشت سوانح "تلاش حق" میں واحد متکلم بہت نمایاں ہے مگر اس میں تصنع نہیں ہے۔ اس لیے اس کی دل پذیری سے مشکل ہی سے کوئی انکار کر سکے گا۔ گاندھی نے اپنی خاندانی برتری یا سیاسی بصیرت اور فہم و تدبر کے عمق کا گانا نہیں گایا ہے بلکہ ہر واقعہ ایک بے رنگ سادگی کے ساتھ بیان کر دیا ہے مگر پڑھنے والا ان کی دردمندی اور دل سوزی اور حق کے لیے ان کے جینے اور مرنے کے جذبے کو مشکل ہی سے فراموش کر سکتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد "میں" بہت کم بولتے تھے مگر ان کے "تم" اور "وہ" میں ہی ان کا "میں" بار بار بولنے لگتا تھا۔

حواشی

۱۔ اُردو میں ہم ایگو بجنسہٖ لے سکتے ہیں کیوں کہ ہمیں گاف سے احتراز کرنے کی ضرورت نہیں
(غبارِ خاطر ص۔ ۲۱۰)

۲۔ جب جیلر آتا تھا تو میں حسبِ معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے' اور پھر لکھنے میں مشغول ہو جاتا۔ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں۔ میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ تمام ظاہر داریاں دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں۔ جسے "دماغ کا مغرورانہ احساس" کھیلتا رہتا تھا اور اس لیے کھیلتا تھا کہ کہیں اس کے دامنِ صبر و وقار پہ بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبہ نہ لگ جائے۔ (غبارِ خاطر۔ ص ۲۶۳)

پہلی کی ہے اور کون سی بعد کی۔ مولانا آزاد کی سحر طرازی کا زمانہ معترف ہے لیکن ہر شخص دیکھ سکتا ہے کہ ان کی تحریروں پر اتار چڑھاؤ کے کتنے ادوار گذرے ہیں اور 'الہلال' و 'البلاغ' کی صورت میں ایک طویل عرصہ گزارنے کے بعد "غبارِ خاطر" کی صورت میں وہ ڈھلی ڈھلائی زبان ملتی ہے جسے بجا طور پر مولانا آزاد کی نثر نگاری کا نقطۂ عروج قرار دیا جا سکتا ہے۔

مولانا آزاد کی عظمت اور ان کی سحر نگاری کے اعتراف کے باوجود ان کی تحریر میں جو تصنع اور تکلف پایا جاتا ہے اسے ہر شخص پہلی ہی نظر میں محسوس کر سکتا ہے۔ مولانا الفاظ اور جملوں کا ایک فسوں باندھتے تھے اور اپنی لاہوتی زبان سے مضامین کا ایسا سماں پیدا کر دیتے کہ اس کے اندر پہنچ کر آدمی خود کو بھول جاتا۔

مولانا مودودی بھی آزاد کی عظمت کا اعتراف کرتے تھے۔ مولانا مودودی کے عنفوانِ شباب کے دور میں ایک بار "جہاد" کے موضوع پر مولانا آزاد اپنی سحر بیانی سے لوگوں کو محظوظ کر رہے تھے اور اتفاق سے مولانا مودودی بھی اس مجلس میں شریک تھے۔ مولانا آزاد کی انقلابی تقریر سننے کے بعد وہیں مولانا مودودی کے دل میں "جہاد" کے موضوع پر ایک کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور وہاں سے لوٹ کر چند دنوں کی کاوش کے بعد اپنی پہلی اور شاہکار تصنیف "الجہاد فی الاسلام" مرتب کی جو آج بھی بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔

آخر میں یہ کہہ کر اپنی بات کو ختم کروں گا کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی چودھویں صدی ہجری کی اُردو نثر میں دو درخشندہ ماہتاب و آفتاب کے مانند تھے اور انھوں نے جو علمی ادبی خدمات انجام دی ہیں وہ ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ⬡

داغ دہلوی

حیات اور کارنامے

داغ کی تربیت اور ان کے ادبی مزاج کی پرورش لال قلعے میں اس زمانے میں ہوئی تھی جب بہادر شاہ ظفر اور مغل شاہزادے جانتے تھے کہ مغل حکومت کی شمع کے گل ہونے کا وقت آگیا ہے۔ اس عہد کے مغلوں اور خاص طور سے بادشاہ کی شاعری کے نشاطیہ لب و لہجے میں حزن و ملال اور مایوسی کی لے تھی۔ یہ لوگ اپنے ذہنی کرب کو نغمہ و شعر میں ڈھال رہے تھے۔ اس کے برعکس داغ کی رگوں میں مغل خون نہیں تھا۔ وہ قلعے کے نہیں، قلعے کے باہر کے آدمی تھے۔ ان کی والدہ چھوٹی بیگم نے ولی عہد مرزا فخرو سے شادی کی تھی۔ داغ ان کے ساتھ قلعے میں داخل ہوئے جہاں انھیں اپنے عہد کے بہترین علوم و فنون حاصل کرنے کا موقع ملا۔ انھوں نے میر تقی میر کے شاگرد غلام حسین شکیبا کے بیٹے سید احمد حسین سے تعلیم حاصل کی۔ محمد امیر پنجہ کش سے خطاطی کا فن سیکھا، مرزا عبداللہ بیگ نے بانک بنوٹ پر قدرت حاصل کرائی۔ سمن خاں اور بندو خاں سے گھوڑ سواری اور خود مرزا فخرو سے تیر اندازی اور بندوق چلانے کا فن سیکھا۔ بہادر شاہ ظفر اور ولی عہد مرزا فخرو کے استاد محمد ابراہیم ذوق نے شعری ذوق کی تربیت کی۔

آسودگی کی زندگی نے داغ کو فکر کی سطح پر زندہ دلی، شگفتگی، رجائیت اور لذت اندوزی عطا کی اور لال قلعے کے ماحول نے اظہار کی سطح پر زبان کی سلاست، فصاحت، محاورے اور روز مرہ کا شعور دیا اور انھیں الفاظ کا مزاج شناس بنایا۔

اُردو اکادمی، دہلی نے داغ پر دو روزہ سیمینار منعقد کیا تھا۔ اس سیمینار کے لیے ممتاز محققوں اور ناقدوں سے داغ کے سوانح، شخصیت اور فن کے مختلف پہلوؤں پر جو مقالے لکھوائے گئے تھے، وہ اس کتاب میں یکجا کر دیے گئے ہیں۔

مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی

صفحات : ۲۳۸

قیمت : ۳۱ روپے (مجلد)

اُردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے ساتھ اس تہذیب کی بنیاد پڑی جسے ہم مشترکہ ہندوستانی تہذیب کہتے ہیں۔ ہندوستان میں داخل ہونے والے پہلے مسلمان عرب تھے، پھر ترک اور مغل آئے اور انھوں نے یہاں اپنی حکومتیں قائم کیں۔ یہ حکمراں خاندان تہذیب و تمدن کی اعلیٰ روایات ساتھ لائے تھے لیکن مقامی آبادی اپنی الگ تہذیبی اور تمدنی روایات رکھتی تھی اور ان روایات کی جڑیں یہاں کی دھرتی میں پیوست تھیں اور قدامت کی سند اپنے ساتھ رکھتی تھیں۔ ابتدا میں غالباً ان قدیم اور نووارد میلانات کا ایک دوسرے سے ٹکراؤ ہوا ہوگا لیکن بالآخر ان کے امتزاج سے ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جو رواداری اور کشادہ دلی کی قدروں کی حامل تھی۔ مغل دور میں اس تہذیب کو عروج حاصل ہوا اور آج ہمارے علوم و فنون کا شاید ہی کوئی ایسا شعبہ ہو جسے اس تہذیب کی فیض رسانی سے بے بہرہ کہا جا سکے۔ اس تہذیب کی بنیادی خصوصیات دوامی اہمیت رکھتی ہیں اور ان سے آج بھی فیضان کرنے کی ضرورت ہے۔ کثرت میں وحدت کا جو خواب نیا ہندوستان دیکھ رہا ہے اس کی تعبیر تلاش کرنے میں ماضی کے تجربات ہمارے سچے معاون بن سکتے ہیں۔

اس کتاب میں ممتاز دانش وروں کے جو مقالے شامل ہیں وہ اس مشترکہ تہذیب کی تشکیل اور اس کے فروغ کے مختلف مراحل کو سامنے لاتے ہیں اور اس کی روح کو اجاگر کرتے ہیں، نیز اُردو نے اس روح کی جس طور ترجمانی کی ہے اس سے خیال انگیز بحث کرتے ہیں۔

مرتب : ڈاکٹر کامل قریشی

صفحات : ۴۵۹

قیمت : ۳۹ روپے

اردو اکادمی، دہلی سے طلب کریں



جاندار اجزا سے مالامال کیا۔ ان کی روایت میں سادگی وضاحت، رنگینی اور شیرینی پائی جاتی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے ان تینوں روایتوں سے ہٹ کر ایک الگ روایت کی بنا ڈالی۔ مولانا آزاد مذکورہ بالا تینوں روایتوں سے متاثر تھے لیکن آزاد کی نثر کی بنیادی خصوصیت خطابت و رومانیت ہے وہ جذبات سے دلیل کا کام لیتے ہیں اور الفاظ کے سیلاب میں عقل و احساس کو بہالے جاتے ہیں۔ ان کی نثر سے اُردو نثر نگاری میں ایک چوتھے اسلوب کا اضافہ ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ یہ اسلوب انھی پر ختم ہو گیا۔

اور اگر یہ بات کہی جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ مولانا مودودی صاحب نے سب سے زیادہ اثر مولانا ابوالکلام آزاد ہی سے قبول کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ابتدا میں مولانا مودودی کی تحریروں پر مولانا آزاد کا رنگ نمایاں تھا جو بعد کو اپنے طرز میں ڈھلتا گیا اور اس طرح قدم بہ قدم اُردو نثر کی پانچویں روایت کی بنا پڑ گئی مولانا مودودی نے مذکورہ چاروں روایتوں سے استفادہ کیا اور اپنے لیے ایک الگ راہ متعین کی اس وقت تک جو ادب پارے عالم وجود میں آئے تھے آپ نے ان کی خامیوں سے احتراز کیا اور خوبیوں کو اپنے یہاں جگہ دینے کی کوشش کی۔ ان کی تحریر میں تازگی اور شگفتگی کا عنصر غالب ہے۔ مولانا مودودی کی تحریر میں شبلی کی سی رنگینی بھی ہے مگر فکری نظم و ضبط کے ساتھ۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی خطابت ان کے یہاں صرف تخاطب کا رنگ لیے ہوتے ہے۔

مولانا مودودی پر ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے ماہنامہ ”ترجمان القرآن“ کی عام فضا وہ نہیں ہے جو ”الہلال“ کی ہے۔ ”الہلال“ کی عبارت میں ایک کڑک اور چمک ہے جو بحر دل کی موجوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہے لیکن قاری پر بہت پائدار اثر نہیں چھوڑتی۔ وہ آتشِ نمرود میں بے خطر کود پڑنے پر آمادہ ضرور کرتی ہے مگر مولانا مودودی کی طرح ایسا ٹھنڈا استدلال نہیں رکھتی جو نمرودِ وقت کو استدلال کی قوت سے توحید کا قائل کر دے۔ بے شک مولانا آزاد بہ یک جنبشِ قلم دست بوسی ہی نہیں پا بوسی بھی کرا سکتے ہیں لیکن مولانا

> ... مولانا مودودی پر ابتدا میں مولانا ابوالکلام آزاد کا اثر معلوم ہوتا ہے لیکن ان کے ماہنامے ”ترجمان القرآن“ کی عام فضا وہ نہیں ہے جو ”الہلال“ کی ہے۔ ”الہلال“ کی عبارت میں ایک کڑک اور چمک ہے جو بحر دل کی موجوں میں ایک اضطراب پیدا کر دیتی ہے...

مودودی لوگوں کو آہستہ آہستہ اپنا گرویدہ بناتے ہیں۔ ان کی تصنیف آتشِ نمرود کو گلزار بنانے کا حوصلہ رکھتی ہے۔ مولانا آزاد اپنے قلم سے صورِ اسرافیل پھونک کر محشر بپا کر دیتے ہیں لیکن پل صراط پار نہیں کراتے اور مولانا مودودی پلِ صراط پار کرانے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

مذکورہ بحث سے ان دونوں بزرگوں میں سے کسی کی برتری دکھانا مقصود نہیں بلکہ اصل مسئلہ صرف اسلوب کا ہے اور اس میں حالات کو بڑا دخل ہے مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے حالات یکسر مختلف تھے۔

مولانا آزاد کی تحریر میں جذبات کا عنصر غالب ہے جب کہ مولانا مودودی اپنے جذبات پر بندھ باندھتے ہیں۔ زبان کے چٹخارے پر توجہ نہیں دیتے وہ لفظوں کے انتخاب میں کوشش کرتے ہیں کہ وہ ان کے استدلال کو پوری طرح واضح کرنے والے اور عام فہم ہوں۔

مولانا آزاد اپنی تحریر میں اشعار کا استعمال بہت زیادہ کرتے تھے۔ ان کی تحریروں میں اشعار کے استعمال کے سلسلے میں آزاد کے ذوق کی داد کافی دی جاتی ہے۔ مولانا مودودی نے بھی اپنی تحریروں میں مناسب موقع و محل کے ساتھ اشعار کا استعمال کیا ہے اور جب بھی انھوں نے شعر کا استعمال کیا ہے تو ان کا حسنِ انتخاب ان کی توضیحی نثر میں تخلیقی حسن پیدا کرنے کا باعث ہوا ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو ___ فرماتے ہیں:

”ایمان فی الحقیقت عشق ہے کہ جب کوئی شخص اس میں گرفتار ہو جاتا ہے تو اس راہ کی مزاحمت مزاحمت نہیں معلوم ہوتی، کوئی مصیبت مصیبت نہیں رہ جاتی اور شوقِ منزل راستے کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ عشق کی آگ سارے مصائب و شدائد اور تمام آلامِ حیات کو جلا کر خاک کر دیتی ہے:

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غمِ جاناں بنا دیا“

مولانا آزاد اور مولانا مودودی کی تحریروں میں ایک نمایاں فرق اسلوب کی یکسانیت کا ہے۔ مولانا مودودی کی تمام تحریروں میں اسلوب کی یکسانیت اس قدر نمایاں ہے کہ بعض وقت یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کی کون سی تحریر



کم لذّتم و قیمتم افزوں ز شمار ست
گوئی اثرِ پیشتر از باغ وجودم![۳۵]

دیدنی ہے کہ آزاد نے تعلیمی فکر و نظام پر جو اعتراضات اُس وقت وارد کیے تھے وہی آج ہر دانشور کی زبان پر ہیں۔ لیکن قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ جو تجویز اور طریق کار آزاد نے پیش کیا تھا وہ آج تک کسی بھی مدرسے میں تعمیل پذیر نہیں نظر آتا۔ آزاد کی بعض تنقیدیں ملاحظہ ہوں۔ لکھتے ہیں:

"... اگر فنونِ عالیہ کو الگ کر دیا جائے، تو درسِ نظامیہ میں بنیادی موضوع دو ہی رہ جاتے ہیں؛ علومِ دینیہ اور معقولات۔ علومِ دینیہ کی تعلیم جن کتابوں میں منحصر رہ گئی ہے، اُس سے اُن کتابوں کے مطالب و عبارت کا علم حاصل ہو جاتا ہو، لیکن خود اُن علوم میں کوئی مجتہدانہ بصیرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ معقولات سے اگر منطق الگ کر دی جائے، تو پھر جو کچھ باقی رہ جاتا ہے اُس کی علمی قدر و قیمت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ تاریخِ فلسفۂ قدیم کے ایک خاص عہد کی ذہنی کاوشوں کی یادگار ہے۔ حالاں کہ علم کی دنیا اس عہد سے صدیوں آگے بڑھ چکی۔ فنونِ ریاضیہ جس قدر پڑھائے جاتے ہیں، وہ موجودہ عہد کی ریاضیات کے مقابلے میں بمنزلہ صفر کے ہیں، اور وہ بھی عام طور پر نہیں پڑھائے جاتے... جامع ازہر قاہرہ کے نصابِ تعلیم کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ ہندوستان میں متاخرین کی کتبِ معقولات کو فروغ ہوا۔ وہاں اتنی وسعت بھی پیدا نہ ہو سکی۔

اے طبل بلند بانگ، در باطن ہیچ!

سید جمال الدین اسد آبادی نے جب مصر میں کتبِ حکمت کا درس دینا شروع کیا تھا تو بڑی جستجو سے چند کتابیں وہاں مل سکی تھیں، اور علمائے ازہر اُن کتابوں کے ناموں سے بھی آشنا نہ تھے۔ بلا شبہ اب ازہر کا نظامِ تعلیم بہت کچھ اصلاح پا چکا ہے، لیکن جس زمانے کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت تک اصلاح کی کوئی سعی کامیاب نہیں ہوئی تھی، اور شیخ محمد عبدہ، مرحوم نے مایوس ہو کر ایک نئی سرکاری درسگاہ دارالعلوم کی بنیاد ڈالی تھی۔"[۳۶]

جملۂ معترضہ کے طور پر پھر یہ کہے بغیر نہیں رہا جاتا کہ یہ طویل اقتباس آزاد کی ۱۹۴۲ء

> ...آزاد کی اپنی تعلیم و تربیت دینی طریق کار پر ہوئی تھی، اس لیے لازمی طور پر انھوں نے پہلے اسی میں اصلاح اور تبدیلی لانے کی کوشش کی، لیکن معاشرے کے عام حالات اور سیاسیات سے دوچار ہونے کے بعد جب وہ انگریزی زبان اور رسمی نظام تعلیم کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوئے تو ان کی تخلیقیت اور منفرد تعلیمی بصیرت نے اس کی خامیاں بھی ٹٹول لیں۔ اور اس میں بھی زبردست اصلاح اور تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی...

کی تحریر سے پیش کیا گیا ہے یعنی آج سے ۴۶ سال (تقریباً نصف صدی) پہلے کی تحریر سے، لیکن کس قدر حسرت انگیز ہے یہ امر کہ بعینہٖ آج بھی "مدارسِ عربیہ" کی صورتِ حال حرف بہ حرف یہی کچھ ہے جو اُس وقت تھی۔

اسی کے ساتھ آزاد کی ایک اور رائے ملاحظہ ہو جس میں ایک ہلکی سی تنقید سرکاری نظامِ تعلیم پر کی گئی ہے۔ ۱۳؍ دسمبر ۱۹۲۰ء کو مدرسۂ اسلامیہ کلکتہ کی افتتاحی تقریب میں، جس میں گاندھی جی نے شرکت فرمائی تھی، آزاد نے ایک بہت ہی مختصر خیر مقدمی تقریر کی تھی جو بہت حد تک سیاسی CONTEXT بھی رکھتی تھی، لیکن اس کے ساتھ اس میں تعلیم کے حقیقی مسئلے سے متعلّق بھی بڑا گہرا نکتہ موجود ہے۔ آزاد کی تقریر کا یہ حصّہ ملاحظہ ہو:

"ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں، اُن میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیلِ علم کا مقصدِ اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا ہے۔ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈنا چاہیے کہ وہ علم ہے، لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا اس لیے شوق دلاتی ہے کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ پس اب ہندوستان میں علم کو علم کے لیے نہیں بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ بڑی بڑی تعلیمی عمارتیں، جو انگریزی تعلیم کی نو آبادیاں ہیں، کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟ مشتاقانِ علم اور شیفتگانِ حقیقت سے؟ نہیں، ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول کے پرستاروں سے، جن کو یقین دلایا گیا ہے کہ بلا حصولِ تعلیم کے وہ اپنی غذا حاصل نہیں کر سکتے۔"[۳۷]

یہ تقریر اگرچہ بہت ہی مختصر ہے، لیکن بڑی شدّ و مدّ کی تقریر ہے۔ آزاد کا یہ ایک فقرہ کہ "علم خدا کی ایک پاک امانت ہے" کس قدر اہم اور اپنی معنویت میں بے پناہ ہے! فلسفۂ معرفت و علوم، Epistinology، فلسفۂ اخلاق یا چاہے جس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے۔ لیکن اسی کے ساتھ آزاد نے تعلیم اور معیشت کے ارتباط اور بے تعلّقی کا مسئلہ بھی چھیڑ دیا ہے،

مولانا آزاد اور اندیشۂ تعلیم

مولانا آزاد نے جس زمانے میں آنکھ کھولی تھی، اس سے تقریباً نصف یا پون صدی پہلے ہی ہندوستان میں تعلیمی نظام ٹوٹ کر بے جان ہو چکا تھا۔ یعنی دین و دنیا کی تفریق پیدا ہو چکی تھی۔ دینی بنیاد کے تعلیمی ادارے اور غیر دینی یا آزاد تعلیمی ادارے، معاشرے کے دو علیٰحدہ علیٰحدہ محور بن چکے تھے۔ آزاد کا خاندانی پس منظر مذہبی تھا اس لیے وہ دینی تعلیمی نظام سے بہرہ ور ہوتے۔ اس تعلیم کا حال خود ان کی زبانی سُنیے :

"انگریزی تعلیم کی ضرورت کا تو یہاں کسی کو وہم و گمان بھی نہیں گزر سکتا تھا، لیکن کم از کم یہ تو ہو سکتا تھا کہ قدیم تعلیم کے مدرسوں میں سے کسی مدرسے سے واسطہ پڑتا۔ مدرسے کی تعلیمی زندگی گھر کی چار دیواری کے گوشۂ تنگ سے زیادہ وسعت رکھتی ہے اور اس لیے طبیعت کو کچھ نہ کچھ ہاتھ پاؤں پھیلانے کا موقع مل جاتا ہے، لیکن والدِ مرحوم یہ بھی گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ کلکتہ کے سرکاری مدرسۂ عالیہ کی تعلیم اُن کی نظروں میں کوئی وقعت نہیں رکھتی تھی اور فی الحقیقت قابلِ وقعت تھی بھی نہیں؛ اور کلکتہ سے باہر بھیجنا انھیں گوارا نہ تھا۔ انھوں نے یہی طریقہ اختیار کیا کہ خود تعلیم دیں یا بعض خاص اساتذہ کے قیام کا انتظام کر کے اُن سے تعلیم دلائیں۔"[1]

اپنی تعلیمی زندگی پر تبصرہ کرتے ہوئے آزاد کی نگاہ پورے تعلیمی نظام پر پڑتی ہے۔ وہ جن الفاظ میں یہاں تنقید کرتے ہیں وہ فنِ تعلیم و تربیت سے متعلق اُن کی ماہرانہ بصیرت کا ثبوت ہیں، لکھتے ہیں :

"خود اُس تعلیم کا حال کیا تھا جس کی تحصیل میں تمام ابتدائی زمانہ بسر ہوا؟ اس کا جواب اگر اختصار کے ساتھ بھی دیا جائے تو صفحوں کے صفحے سیاہ ہو جائیں، ایک ایسا فرسودہ نظام جسے فنِ تعلیم کے جس زاویۂ نگاہ سے بھی دیکھا جائے، سرتاسر عقیم ہو چکا ہے، طریقِ تعلیم کے اعتبار سے ناقص، مضامین کے اعتبار سے ناقص، انتخابِ کتب کے اعتبار سے ناقص..."[2]

آزاد کا یہ تبصرہ اگرچہ دینی تعلیمی نظام سے متعلق ہے، لیکن ان کے یہ الفاظ اُس وقت کے دینی اور غیر دینی دونوں تعلیمی نظاموں پر صادق آتے ہیں۔ بلکہ میں تو یہاں تک محسوس کرتا ہوں کہ اگر اوپر دیے ہوئے اقتباس میں ماضی کے صیغوں کو حال کے صیغوں سے بدل دیا جائے تو آج بھی دینی اور غیر دینی دونوں ہی تعلیمی نظاموں کے لیے یہ تبصرہ بالکل صحیح ثابت ہوگا! اور اگر رسمی تعلیمی نظام (یعنی موجودہ جمہوری نظامِ تعلیم) کے لیے یہ نہ بھی تسلیم کیا جائے کہ وہ سرتاسر عقیم ہے تو اس کے سقیم ہونے میں بہرحال کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔

عقیل الغروی

سفینۃ الہدایہ ٹرسٹ، دہلی ۱۱۰۰۵۱

جیسا کہ اوپر مکرّر اشارہ کیا گیا کہ آزاد کی اپنی تعلیم و تربیت دینی طریقِ کار پر ہوئی تھی، اس لیے لازمی طور پر انھوں نے پہلے اسی میں اصلاح اور تبدیلی لانے کی کوشش کی۔ لیکن معاشرے کے عام حالات اور سیاسیات سے دوچار ہونے کے بعد جب وہ انگریزی زبان اور رسمی نظامِ تعلیم کے ثمرات سے بہرہ اندوز ہوئے تو ان کی تخلیقیت اور منفرد تعلیمی بصیرت نے اس کی خامیاں بھی ٹٹول لیں۔ اور اس میں بھی زبردست اصلاح اور تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اس مطالعے سے مولانا ابوالکلام آزاد کے "نظریۂ تعلیم" تک رسائی کے ساتھ ساتھ آزاد کی عظمت و انفرادیت کی ایک انوکھی تعبیر بھی سامنے آتی ہے۔ اور وہ یہ کہ آزاد اپنی شخصیت میں رچی ہوئی "تعلیمی صداقت" اور اپنے تعلیمی افکار و نظریات کے اعتبار سے اپنے زمانے کے مخروط (CONE) کی چوٹی پر متمکن نظر آتے ہیں۔ اس تعبیر کی وضاحت یہ ہے کہ آزاد اپنے دَور کے عام تعلیم یافتہ یا دانشور طبقے سے بہت بلند اُس منزلِ فکر و نظر پر دکھائی دیتے ہیں، جہاں سے ایک "عبقری" اپنے بعد آنے والے دَور کے تعلیم یافتہ طبقے کے فکری رجحانات اور اقدار کی تشکیل کرتا ہے۔ اور اس اعتبار سے آزاد اگر حکیم صدرائے شیرازی کے اس شعر میں اپنی کیفیت کا اظہار پا رہے تھے تو بالکل بجا تھا :

ابوالکلام آزاد ـ شخصیت اور کارناموں پر تفصیلی تبصرہ

دہلی اردو اکادمی کے سکریٹری شریف الحسن صاحب نے پچھلے دِنوں دہلی اردو اکادمی کی مطبوعات کا ایک سیٹ ہمیں بخشا اور ہم نے گھر لاکر پیکٹ کھولا تو موتیوں کی مالا نکلی۔ اس مالا کا ایک موٹا سا (۵۰۰ صفحے کا) دانہ زیر نظر کتاب ہے۔ یعنی اکتوبر ۱۹۸۵ء میں مولانا ابوالکلام پر اکادمی کی طرف سے جو سمینار ہوا تھا، اس میں پڑھے جانے والے مضامین کا مجموعہ، جس میں ۲۶ مقالے شامل ہیں اور اس کے مُرتّب ڈاکٹر خلیق انجم صاحب جنھوں نے مجموعے کا سب سے تفصیلی اور وزنی مقالہ (مولانا کے سوانح) ۱۳۰ صفحوں میں سمویا ہے اور ماخذ بھی ۲۶ ہی رکھے ہیں۔ جو براہِ راست موضوع سے متعلق ہیں۔ ورنہ دہلی کے بعض اساتذہ اردو سے یہ رسم چل نکلی ہے کہ دائیں بائیں سے بھی ماخذوں اور حوالوں کے نام دیتے چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ پڑھنے والا لکم بخنی مارا، پہلے سے مرعوب ہوجائے، دم نہ مار سکے۔

خلیق صاحب نے شرافت برتی کہ سوانح ابوالکلام کی کتابیات میں ان تمام ہستیوں کی آپ بیتیوں یا سوانح اور ان تمام انجمنوں، جماعتوں، پارٹیوں اور متعلقہ پلیٹ فارموں کی رپورٹوں اور تذکروں کے نام نہیں گِنا دیے جن کا ذکر اصلاً یا ضمناً اس مقالے میں آگیا ہے، اور ابوالکلام کی سیرت کے تعلق سے آنا بھی چاہیے تھا۔

خلیق صاحب اس قدر "انجمن" ہو گئے ہیں کہ انھیں اپنی تحریروں پر نظرِ ثانی کی مہلت نہیں ملتی۔ جس طرح کے مضامین پر وہ قلم اٹھاتے رہے ہیں انھیں قلم سے لکھا ضرور جاتا ہے لیکن پھر ٹھہر کر، آپریشن تھیٹر میں ٹیبل پر لٹا کر تیز باریک نشتر سے کھرچا بھی جاتا ہے۔ کاٹ پیٹ کر ٹلنکے بھی بکھرے جاتے ہیں یہ عمل ٹھہراؤ اور صبر و سکون چاہتا ہے جو بہت کم اہلِ قلم کو میسّر ہے۔ زیر نظر مقالے کو سلامتی یوں نصیب ہوگئی کہ یہاں بیشتر خود مولانا کی تحریروں کے اقتباس جوڑے گئے ہیں۔ اور ان اقتباسات میں خلیق انجم کے لگاتے ہوئے جوڑ گراں نہیں گذرتے۔ دلّی والوں کی سادہ سلیس زبان لکھنے بلکہ لکھ سکنے میں مولانا آزاد کو تو بیسیوں برس لگ گئے (اس کی وجہیں بھی تھیں) خلیق انجم کو یہ نعمت ہاتھ تلے مہیا ہے وہ جب بھی بے تکلفی سے لکھنا (یا بولنا) چاہیں لکھ لیتے ہیں۔ یہ مقالہ 'سوانح ابوالکلام'، اس کی ایک تازہ ترین مثال ہے۔

مولانا کی زندگی کے بعض واقعات ایسے ہیں جنھیں خود مرحوم کے آنکھوں دیکھتے فرضی، افسانوی یا خیالی کہا جانے لگا تھا۔ مثلاً بزرگوں کے کارنامے اور رشتے یا ان کے والد کی دس جلدوں میں مطبوعہ عربی تصنیف یا الازہر، قاہرہ میں مولانا کی طالب علمی۔ خلیق انجم نے اوّل تو ان کی تفصیل سے کنارہ کیا۔ ذکر آیا تو لکھ دیا کہ فلاں فلاں صاحبان نے اختلاف کیا ہے۔ اصلیت یہ ہے کہ نسیم احمد فریدی، یوسف بنوری، قاضی عبدالودود، اور آج کل نثار احمد فاروقی مولانا کے خود نوشت بیانات کو نامعتبر کہتے رہے ہیں۔ موخرالذکر نے تو اس طرح کے آوازے کسے ہیں گویا وہ اور مولانا ساتھ کھیلے ہوئے تھے۔

ظ۔ انصاری

۳۳، شیریں۔ کلابا۔ بمبئی۔ ۳۱۔

فالتو باتیں . . مگر

اس دیدہ زیب قابل قدر اور بر وقت مجموعے کا کم از کم ایک تہائی حصّہ تو قطعاً غیر ضروری ہے اور کم از کم آٹھواں حصّہ ایک دوسرے کو دوہرانے میں نکل گیا ہے۔ وہی اشعار، وہی حاشیے وہی اقتباس اور بے ضرورت لمبے لمبے حوالے۔ لیکن مُرتّب پر اُنگلی نہیں اٹھائی جاسکتی۔ سمیناروں میں ایک محدود موضوع پر جب بھی مقالے پڑھے جائیں گے اور ان سب کو زیورِ طبع سے آراستہ کرنا لازم ٹھہرے گا، یہی ہوگا۔

پھر ہماری زبان کی تازہ ترین مصیبت یہ ہے کہ سرکاری یا انجمنی اداروں کے "جمہوری" تقاضوں کی تسکین کی خاطر اذان دے کر سبھی کو "باجماعت" کے لیے پکارنا پڑتا ہے ——— چاہے ان میں بے وضو بھی آجائیں۔ اس مجموعے میں ایک سے زیادہ مقالے ان عزیزوں نے پڑھے ہیں (اور مجموعے میں جوں کے توں شامل ہیں) جنھیں موضوعِ سخن سے نزدیک و دور کی کوئی مناسبت نہیں۔ اسی طرح مولانا کی شاعری کے باب میں جو پانچ مضامین شامل ہیں۔ اگر وہ کسی کارن چھپنے سے یا جلد بندی کے وقت چھوٹ گئے ہوتے تو آزاد شناسی یا اس مجموعے کی وقعت میں کوئی فرق نہ پڑتا ——— حالاں کہ ان کے لکھنے والے سب نامور اور اپنے اپنے دائرے کے مستند اہلِ قلم ہیں۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد، پروفیسر ظہیر احمد صدیقی، سیّد ضمیر حسن دہلوی، ڈاکٹر اعجاز علی ارشد اور سیدہ شانِ معراج۔ مولانا کی شاعری جو ایک وقتی اور عبوری دور، نوعمری کی ایک لہر تھی، اس کا الگ سے جائزہ لینا اور اس

جو تعلیمی اخلاقیات کے اعتبار سے بہت ہی نازک ہے اور عملی اعتبار سے بے حد پیچیدہ ـــــ اور اگر تاریخ کے معلوم سرے سے تعلیم کی خارجی صداقت کا اقتصادی حوالے سے مطالعہ کیا جائے تو کچھ عجب طرح کے نتائج سامنے آئیں گے۔ لیکن اس مطالعے کے لیے آزاد کی تحریروں سے کوئی مدد نہیں ملے گی، اس لیے یہاں بے موقع ہوگا۔

یہاں تک آزاد کے جو تنقیدی خیالات پیش کیے گئے اُن میں تعلیم کے طریق کار اور نصاب کی تشکیل و تدوین سے متعلق خالص تکنیکی موشگافیاں سامنے نہیں آسکی ہیں۔ اس سلسلے میں "عربی نصابِ تعلیم کمیٹی" کے اصلاحی اجلاس (منعقدہ لکھنؤ ۲۲ فروری ۱۹۴۷ء) کا صدارتی خطبہ[۵]، جو قدرے طویل ہے، از اوّل تا آخر بے حد اہم ہے۔ اس میں نظری اور عملی، تحقیق اور تنقید، ہر اعتبار سے آزاد کی نظر کی وسعت اور گہرائی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ علوم کی ماہیت، فلسفۂ معرفت تعلیمی نفسیات غرض کہ کتنے ہی متعلقہ بصائر کے حامل نکات آزاد بکھیرتے چلے گئے ہیں۔ (چونکہ یہ دقیق فنی بحث صرف "مدارس عربیہ" کے طریقۂ تعلیم کے ماہرین ہی کی دلچسپی کی چیز ہے اس لیے یہاں اس کا ذکر محض طوالت کا باعث ہوگا)۔ لیکن کچھ اسی خطبے پر منحصر نہیں، آزاد اس کے علاوہ، اپنی اکثر تحریروں میں ایک زبردست تعلیمی مفکر کی حیثیت سے جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ یہ بات نظر انداز کرنے کی نہیں ہے کہ آزاد کا سب سے بڑا تصنیفی کارنامہ "ترجمان القرآن" صرف ان کے اندر کے مُصنّف کی تخلیقی انفرادیت کا سرجوش نہیں، بلکہ تعلیمی صداقت کے شعور سے بھرپور ایک انقلابی تعلیمی مفکر کا سرجوش ہے[۶]۔

یہ محض ایک اتفاق نہیں تھا کہ آزاد، آزاد ہندوستان کے پہلے مرکزی وزیر تعلیم بنے، بلکہ یہ تاریخ کا ایک عظیم الشان اتفاق تھا کہ آزاد کو وہی منصب ملا جس کے وہ اہل تھے! یہ ہمارے مورخین اور ناقدین کی بہت بڑی قدر ناشناسی رہی ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو بالعموم آزاد ہندوستان کے تعلیمی معماروں میں شمار نہیں کیا جاتا ہے!

حواشی

۱۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۶۷ء، ص ۹۶ (مکتوب نمبر ۱۱)۔

۲۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۶۷ء، ص ۹۷ (مکتوب نمبر ۱۱)۔

۳۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۶۷ء، ص ۹۰ (مکتوب ۱۱)۔

۴۔ "غبارِ خاطر" مرتبہ مالک رام، طبع ۱۹۶۷ء، ص ۹۸ (مکتوب ۱۱)۔

۵۔ "خطباتِ آزاد" مرتبہ مالک رام، شائع کردہ ساہتیہ اکادمی۔

۶۔ "خطباتِ آزاد" مرتبہ مالک رام، شائع کردہ ساہتیہ اکادمی۔

۷۔ دیکھیے "ترجمان القرآن" کے پہلے ایڈیشن کا پیش لفظ بعنوان "قرآن حکیم کی تعلیم و اشاعت"۔

کے سننے والے حاضرین میں کئی ایک ابھی زندہ ہیں اور وہ بیک آواز یقین دلاتے ہیں اگرچہ یہ الفاظ اور جملے مولانا کی مختلف اوقات کی تقریروں سے چن کر جوڑ لیے گئے ہیں لیکن اس روز موصوف نے ہرگز نہیں کہے تھے۔ ایک مختصر سی تقریر آئندہ کے مشورے کے ساتھ کی اور رخصت ہوگئے۔

ضمیر حسن صاحب دہلوی ہیں۔ اس فرضی تقریر کے بارے میں تصدیق کے مواقع انھیں بہتر حاصل تھے۔ مگر انھوں نے مقالہ ہی بے دلی سے لکھا۔ اس لیے کسی ایک پہلو پر ٹک نہ سکا۔ کبھی مولانا کے روزِ خطابت، جوشِ بیان اور حسنِ بیان پر زور دیتا ہے۔ کبھی اسلام اور سیاسی رویے اور پارٹی پر، کبھی ادھر اُدھر کی باتوں پر ـــــ ایک عجیب بات ان کے قلم سے نکلی۔ قرآن، کانگریس، انگریز، مسلمان اور بزدلی وغیرہ کے ضمن میں مولانا کے اقتباسات پے در پے نقل کرتے ہوئے مقالہ نگار اس نتیجے پر پہنچتے ہیں:

"... انھوں نے جو راستہ اختیار کیا، اس کی سچائی پر ان کا ضمیر گواہ تھا۔ اسی لیے وہ آخری گھڑی تک اُسے چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ ان کا واسطہ جن لوگوں سے تھا وہ کچھ اور عقیدہ رکھتے تھے۔ ابنائے وطن چانکیہ اور میکاولی کی ہدایت کے پیشِ نظر قدم اٹھانے کے قائل تھے۔ اسی لیے مولانا کے خواب چکنا چور ہوگئے۔۔۔"

مولانا اور سیاسی داؤ پیچ

مولانا کا واسطہ جن "ابنائے وطن" سے تھا وہ اُن پر اور یہ ان پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ مولانا دھوکے میں نہیں تھے۔ انھوں نے نہ صرف "ابنائے وطن" کو اپنایا بلکہ ان سے محبت اور بڑی سے بڑی عزت بھی پائی "خواب چکنا چور" ہوئے فرزندانِ توحید کی اس ناعاقبت اندیش لیڈرشپ کے ہاتھوں جو کروڑوں ہم مذہبوں کو خدا کے حوالے کر کے سدھار گئی۔ رہی قدیم سیاسی مشیر کوٹلیا (چانکیہ، تین سو سال قبل مسیح) کی سیاسی حکمت عملی، خود جواہر لال نے اسے اتنا بیا تھا کہ وہ اس کے نکتہ چیں اور منکر ہوگئے تھے اور اسی فرضی نام سے اپنی شناخت اور تجزیے کا یادگار مضمون بھی لکھا تھا۔ اطالوی سیاست داں میکا (میکیا) ولی (وفات ۱۵۲۷ء) نے حکمت عملی اور سیاسی داؤ پیچ کے جو اصول تجویز کیے ہیں، جن لوگوں نے ان کا مطالعہ کیا اور کانگریس پارٹی کے چالیس برس (۱۹۱۹ء تا ۱۹۵۸ء) کو بھی جانچا ہوگا وہ بے چون و چرا مان لیں گے کہ صداقت پسندی اور اخلاقی جرات کے باوجود مولانا نے کئی موقعوں پر میکیاولی کے مطابق "شطرنجی مہرے" اٹھائے بٹھائے ہیں۔ پنجاب میں اقلیتی پارٹی کانگریس کے سپورٹ سے جب مولانا نے "یونی نیسٹ" ٹولے کو مسلم لیگ کے مقابل جمائے رکھنے کا خفیہ معاہدہ خضر حیات ٹوانہ سے کیا تھا (۱۹۴۶ء) جواہر لال اصولاً اس داؤ پیچ کے خلاف تھے مگر مولانا اپنی اس کامیاب چال پر نازاں رہے۔ خود پارٹی کی مسندِ صدارت کے سلسلے میں ایسے کئی مواقع آئے جب مولانا نے سیاسی داؤ پیچ میں کبھی چانکیہ اور کبھی میکیاولی کی ہمسری کا ثبوت دیا۔ سبھاش چندر بوس کی جیت کو ہار میں یا سبکدوشی میں بدلنے کے جو اندرخانہ جتن (۱۹۳۷ء تا ۱۹۳۸ء) ہوئے اس میں مولانا کی سیاسی نباضی گاندھی جی کے دل کی دھڑکن بن گئی تھی ـــــ اور جواہر لال دم بخود تھے تقسیم سے ذرا قبل سردار پٹیل کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کے توڑ پر جواہر کو کانگریس کا صدر نامزد کرنا اور اس کے لیے پہلے سے اسٹیج تیار رکھنا مولانا کا میکیاولین کارنامہ تھا۔ پھر وہ ایک سیاسی ماہرِ فن کی حیثیت سے برحق بھی تھے، کامیاب بھی۔ البتہ تقسیم کے ساتھ خواب صرف مولانا کے نہیں، لاکھوں کروڑوں کے، پوری قومی آزادی کی تحریک کے خواب چکنا چور ہوئے۔ "ابنائے وطن" اور خود مولانا بھی ایک بے ہتھیار اور پھسپھسی قوم کو قومی آزادی کی منزل تک لے جانے کے لیے کیا چانکیہ، کیا نظام الملک طوسی، کیا میکیاولی ہر ممکن تدبیر اختیار کرنے کے حق میں تھے۔ مقصد میں دل و جان سے شریک ہونے والوں میں یک دلی کے باوجود اگر طریق کار یا داؤ پیچ کا اختلاف ہو جائے یا پتنگوں کا پیچ لڑ جائے تو اسے "اور عقیدہ" یا دھوکہ نہیں کہتے۔ ضمیر حسن دہلوی کا غالباً یہ میدان نہیں ورنہ ایسی بات نہ کہتے۔

بت پرستی اور خدا پرستی

اعجاز علی ارشد نے آزاد کا بحیثیت مفکر جائزہ لینا چاہا، لیکن تمہید کے صفحے کے بعد صرف دو ورق... مصنف کے خود نوشت ہیں۔ ان میں آزاد جیسے جینیس کے گوناگوں افکار کا جائزہ لینا بھلا کس کے بس کا تھا۔ مقالہ ابھی اٹھان کے بعد تشنہ رہا۔ البتہ چند نکات جن پر مقالہ نگار کی نظر گئی ہے وہ آئندہ اس موضوع پر وسیع مطالعے اور تفصیلی مقالات کا باب کھولنے میں مفید ہوں گے۔ "مثلاً اجتہاد فی المسائل" "تجدید دین و شریعت" اثباتِ صفات و نفی صفات، فکر و تجسیم ـــــــ

"... ہندوستان کے فلسفۂ ویدانت نے اور اس کے بعد بودھ مذہب کے حکما نے نفی صفات کا مسلک اختیار کیا اور تشخص بلکہ تجسیم تک کی لوگوں کو اجازت دینی پڑی۔ کیوں کہ انھوں نے محسوس کیا کہ غیر شخصی تصور سے خدا پرستی کی پیاس بجھ نہیں سکتی ـــــــ ویدانت کے توحید وجودی کا مسلک اور بودھ حکما کے سلب و نفی کا تصور فلسفے کا ایک مذہب بن گیا لیکن انسان کا عملی مذہب نہ بن سکا۔ عملی مذہب کے لیے

پر مقالے لکھنا۔ اسی چاٹ یا خصلت کا اظہار ہے جو عموماً ہماری تمام تقریبوں، تہواروں جلسوں، جلوسوں سیمیناروں پر بالآخر مشاعرے کی مہر لگاتی رہی ہے۔

شاعری اور شاعرانہ نثر

مولانا کی شاعری کا تو، ضرورت بے ضرورت اوروں نے اپنے مقالوں میں تذکرہ کر ہی دیا تھا ــــــ اور اس کی اہمیت ضمناً تذکرے سے زیادہ ہے بھی نہیں۔ مولانا نے اپنے مضامین اور خطوط میں جا بجا اتنے شعر سجا دیے ہیں کہ معمولی قسم کا پڑھنے والا بھی بے اختیار ان کی اعلا درجے کی شاعرانہ صلاحیت کا قائل ہو جائے گا۔ حیرت ہے کہ اس مُسلّمہ حقیقت کے باوجود عزیز محترم آزاد نے یہ کیسے لکھ دیا:

"... اُردو میں ایسے بہت سے نثر نگار ہیں جن کی نثر شاعرانہ انداز کی حامل ہے لیکن ان کا شعری ذوق مشکوک ہے بلکہ بعض صورتوں میں تو معدوم ہے..."

ممکن ہے آزاد صاحب کسی خاص معاصر کو ذہن میں رکھے ہوئے ہوں۔ لیکن اگر انھیں چیلنج کر دیا جائے کہ "ایسے بہت سے نثر نگار" کے بجائے سو برس کے دوران پانچ سات نام ہی گنوا دیجیے تو جواب دیتے بن نہ پڑے۔ ایسا ہوا نہیں کرتا۔ جن لوگوں کا شعری ذوق معدوم تو کیا "مشکوک" بھی ہو وہ شاعرانہ نثر لکھ ہی نہیں سکتے۔ اور ویسے بھی نثر کے لیے "شاعرانہ" ہونا کوئی بڑی صنعت نہیں۔ کہیں کسی موقع پر ہنر ہے اور کہیں عیب۔ شاعری کا ذوق منجھا ہوا ہو، طبیعت شعر گوئی کی رسیا رہ چکی ہو، موزونیت کی جانب آپ سے آپ جھکی پڑتی ہو... یادداشت کی کیاریوں میں جابجا اشعار کی چمن بندی سے قدم اور دامن سنبھال کر نثر کی راہ طے کی جائے۔ تب "شاعرانہ نثر" یا وہ نثر لکھی جاتی ہے جس میں شعر کی مہک اور لذت رچی بسی ہو ــــــ شاعری کے اعلا ذوق سے ایک درجہ بھی کوئی محروم ہو تو نثر کو شعریت چھو کر نہیں گذرتی۔

پروفیسر آزاد سے اس موضوع پر انصاف کی امید تھی، انھوں نے بار بار کہی ہوئی باتیں جوڑ جاڑ کر رکھ دیں اور ان پر اپنا تبصرہ بڑھایا بھی تو ــــــ یہ!

سطحِ دریا پر بُلبُلے

پروفیسر ظہیر صدیقی نے مضمون دبستانِ

... CSIR کی اسٹاف یونین میں دلی کلچرل سوسائٹی کی امیر خسرو کے مزار پر مولانا کا بے تکلف تشریف لانا اور ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھے رہ جانا نہ صرف ان کی کم آمیزی کو مشروط قرار دیتا ہے بلکہ مولانا کی مشفقانہ عظمت سے بھی مانوس کرتا ہے۔ مولانا واقعی اندر سے ایسے ہی تھے...

شبلی اور جمالیاتی اقدار کے رشتے سے شروع کیا۔ بات میں وزن تھا، مگر دوسرے ہی پیراگراف کی یہ عبارت ملاحظہ ہو:

"مولانا ــــــ کی شخصیت اور ادبی افکار کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ وہ ایک ایسا بے کنار سمندر ہیں جس کی آغوش میں معلوم نہیں کہ کتنے دریاؤں نے روانی سیکھی۔ ادب، سیاست، مذہب، سماجیات، تنقید ــــــ یہ سب ان کے سمندر کی لہریں ہیں...."

"محبِ جمال، ابوالکلام کی جمالیاتی اقدار پر" سمندر کی آغوش میں دریا کا روانی سیکھنا" اور وہ بھی کتنے دریاؤں کا!! اس طرح کی عبارتیں دیکھتا ہوں سر دھنتا ہوں۔ سمٹتا ہے۔ یہ مختصر مقالہ اس گھیر دار جملے پر:

"یہ بات بھی اہم ہے کہ جن شعرا سے اُن (ابوالکلام) کو ابتدا سے لگاؤ رہا۔ وہ جذبات اور احساسات اور جمالیات کے شاعر تھے۔ میری مراد نظیری، عرفی، غنی، میر، غالب اور مومن سے ہے۔"

غور کا مقام ہے، جذبات + احساسات + جمالیات کے شاعر تو یہ تھے اور ان صفات کے بغیر جو صاحبان شاعری کر گئے، انھیں آپ اطمینان سے مہینوں گنتے رہیے۔ دوسرا غور طلب نکتہ: غنی اور غالب میں، عرفی اور مومن میں اور نوٹ کیجیے کہ فیضی اور میر میں شعر گوئی کے سوا کوئی قدر مشترک نہیں۔ انھیں "جذبات + احساسات + جمالیات" کی دوڑ میں یکجا کیسے پھنسایا گیا؟ پروفیسر موصوف نے مومن کو واقعی خوب چھانا ہو گا کہ ان میں تینوں صفات (جذبات + احساسات + جمالیات) مل گئیں۔ باقی کے جو تین صدیوں اور مختلف طبیعتوں اور کیفیتوں کے شاعر گذرے ہیں، ان سے یہاں درگذر ہی مناسب تھا۔

وہی مفروضہ تقریر

ضمیر حسن دہلوی، جمنا میں دُھلی شگفتہ اور بامعنی چٹ پٹی نثر والے قلمکار ہیں اور غیر سیاسی موضوعات پر قابلِ قدر مضامین لکھ چکے ہیں۔ مگر یہاں "آزاد کی شعلہ نوائیاں" عنوان لے کر وہ طے نہیں کر پاتے کہ ابوالکلام کی شخصیت کے کس پہلو سے سروکار رکھنا ہے۔ آزاد کی اس فرضی تقریر کا اقتباس جسے آغا شورش کاشمیری نے شائع کر کے پھیلا دیا تھا۔ جامع مسجد دہلی کی اس تاریخی تقریر ۱۹۴۸

علوم و معارف کے بیان کے لیے وہ ایسا اسلوب اپنا سکتے ہیں جو خاص پسند ہونے کے ساتھ ساتھ عام فہمی (فہم ؟) سے قریب ترین ہو۔ مولانا کی صحافت کے چوتھے دور میں بھی یہ احساس بیدار نظر آتا ہے۔۔۔" اچھا ہوتا اگر زیدی صاحب یہ احساس مولانا کی صحافت کا مطالعہ کرنے والوں میں بیدار کر دیتے۔ اس پہلو سے پورا باب تشنہ رہ گیا۔

زیدی صاحب مستقلاً ادب، صحافت اور قومی تحریک سے وابستہ رہے ہیں، پھر انھوں نے وہ فاش غلطی کیوں کی کہ ابوالکلام کی اس مفروضہ تقریر (جامع مسجد دہلی ۱۹۴۸ء) کا طویل اقتباس یہاں سجا لیا جو حاضرین نے سنی تک نہیں؟ محققوں سے کم از کم ایسی بے پروائی کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

مولانا آزاد اور سرسیّد

اس مجموعۂ مقالات کا ایک موضوع ایسا ہے جس کے ساتھ علی گڑھ والوں نے کبھی پوری طرح انصاف نہیں کیا (یہ لکھتے وقت رشید احمد صدیقی، سجاد انصاری، اور شیخ محمد اکرام، میری نظر میں ہیں)، عین ممکن تھا کہ اب ان کلاسیکی بزرگوں کے بعد کوئی نیا بیدار مغز علیگ اس تعلق کو انصاف کی ترازو میں تولے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری نے، جو علی گڈھ میں ہی برسرِ کار ہیں، یہ موضوع اپنایا اور افراط و تفریط میں اپنے بڑوں کو پیچھے چھوڑ گئے۔ بیشتر تو مولانا کی تحریروں کے اقتباس ہی ہیں، مگر جہاں نو وارد ذی علم مصنف نے نتائج پیش کیے ہیں وہاں ہماری عقل گم ہو گئی کہ اللہ اکبر، آج سو برس کے بعد بھی علی گڑھ کے بعض فرزند ایسی ذہن کی پرورش کر سکتے ہیں۔

ملاحظہ ہو :

"۔۔۔ لیکن زیادہ دیر تک مولانا سرسیّد کے ساتھ نہ چل سکے۔ جلد ہی ان پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ سرسیّد کا دکھایا ہوا راستہ اسلام کی طرف نہیں، الحاد کی طرف لے جاتا ہے۔" (ص ۲۴۳)

—— مگر مولانا نے اوّل تو سرسیّد کی عقلیت پسند اصلاحی تحریک کو الحاد کی جانب لے جانے والی کہا نہیں —— پھر یہ کہ مولانا عقلیت (Scientific Approach) سے بیزار نہیں تھے۔ اس کی اہمیت مانتے تھے —— البتہ اسی کے ساتھ (امام غزالی کی طرح) وجدان کی روشنی، رہنمائی کے قائل ہو گئے تھے۔

پھر آگے چل کر ضیاء الدین انصاری لکھتے ہیں :

"۔۔۔ سرسیّد کے وہ مذہبی عقائد جو اسلام کے بنیادی تصوّرات کے خلاف جاتے ہیں اور جن کی بنا پر انھیں کفر و الحاد کے فتووں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان میں سے چند یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔۔۔۔"

تو گویا یہ ہیں وہ عقائد جو "اسلام کے بنیادی تصورات کے خلاف" جاتے ہیں۔ ضیاء الدین صاحب نے سرسید کے عقائد سے یہاں بارہ نکات گنائے ہیں۔ ان میں یہ نکتہ بھی شامل ہے :

"۔۔۔ حضورِ اکرم صلعم کو معراج عالمِ خواب میں ہوئی —— اس کی حیثیت ایک خواب سے زیادہ نہیں۔۔۔"

یہ محض سرسید کے عقیدے کی بات نہیں۔ قرونِ اولیٰ کے فوراً بعد، یونانی اور ہندی فلسفے کے عربی تراجم کا ریلا آنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی دانش ور نسلوں نے پے در پے معراجِ جسمانی کے بجائے معراجِ روحانی پر زور دینا شروع کر دیا تھا۔ یہ سلسلہ علمائے اسلام متکلّمین اور متاخرین مفسّرین سے ہوتا ہوا عہدِ اکبری (سولھویں صدی) میں تقریباً خواص کا مذہب ہو گیا تھا، نظیری نیشاپوری احمد آباد میں بیٹھا ہوا لکھتا ہے :

نزدِ تو جبرئیل وحی آوُرد
عقل برقع زِ رُخ کشود اینجا

معراجِ روحانی و جسمانی، وحی و الہام یہ اسلام کے بنیادی عقائد نہیں، نہ ان کا ارکانِ دین میں شمار ہے۔ اسی طرح جنت و جہنّم کے متعلّق یہ تصوّر کہ یہ احوال ہیں، مقامات نہیں، گزشتہ بارہ صدیوں میں بڑے بڑے مسلم دانشوروں کا عقیدہ رہا ہے —— "نہ اسلام کے بنیادی عقائد" سے اسے سروکار ہے، نہ اس کے ماننے نہ ماننے یا مشروط ماننے والے الحاد اور کفر میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ پھر مصنّف مقالہ نگار نے یہ لکھنے کی جرأت کیسے کی ؟

"۔۔۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ سرسیّد نے اپنے مذہبی عقائد کی بنیاد مُسلّمات سے انکار پر رکھی جو اسلام کی حقیقی روح کے سراسر خلاف تھی۔۔۔"

(ص ۲۴۵)

ذہنی کاوش، عقلیت اور عقائد کی چھان بین ایک "بنیادی عقیدہ" تھا، سرسیّد اور ان کے حامیوں کا اور علی گڈھ اس کا مرکز۔ "مُسلّمات" کیا ہیں ؟ اگر سرسیّد کے عقائد کو مُسلّمات کے خلاف فرض کر لیا جائے تو عالمِ اسلام ہُو کا عالم ہو جائے گا۔ کانٹوں اور اونٹوں بھرا جنگل اور بس!

دانشورانہ اختلاف کو بلکہ ان اختلافات کے حامیوں کو جہنّم کی بھٹّی میں جھونکنا پڑے یا بو علی سینا اور ابو نصر فارابی سے لے کر علّامہ اقبال تک کوئی نہیں بچنے والا (غور سے ملاحظہ ہو "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" اور اس کی اسپرٹ)

ضیاء الدین انصاری نے آزاد و سرسیّد کے موازنے یا باہمی رشتے کی تشریح کرتے ہوئے انھی سرسیّد کو جی بھر کے مطعون کر دیا ہے جن کی تحریروں اور خیالات کو ابوالکلام ایک زمانے تک آنکھوں سے لگاتے



اصنام پرستی اختیار کرنی پڑی . . . .

بت پرستی اور خدا پرستی کے تعلق سے یہ وہی لائن ہے جو ابوریحان بیرونی سے لے کر ابوالکلام تک نو صدیاں پار کرآئی ہے اور گھوم پھر کر وحدتِ ادیان کی طرف لے جاتی ہے۔ ارشد صاحب نے نہیں لکھا لیکن بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ ابوالکلام خوب سوچ سمجھ کر وحدتِ ادیان کے قائل تھے۔ یہ بھی ایک وجہ تھی کہ انھیں وطن، ابنائے وطن، اسلام اور انسانی صفات کی آزادی خود اپنے وجود کی بنیادی تمنّا اور اپنے ارمانوں کا مرکزی نقطہ نظر آئی ——— اور یہ سب ایک ہی سلسلۂ فکر کی کڑیاں تھیں۔

ابوالکلام کو نہ اپنے شاعر ہونے یا کہلانے کی للک تھی۔ نہ محض مفکر منوانے کی اُمنگ ——— مگر یہ خلیق انجم کو کیا ہوا کہ اس مقالے کو انھوں نے باب شاعری میں ڈال دیا۔ پنجابی کی پُرانی مثل ہے کہ جو تیرے تن کو لگ گیا، وہ تیرا، باقی بچا سو احمد شاہ کا (یعنی احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ لگے گا) یہاں بھی پانچ میں سے تین مقالے، جو کہیں اور نہ کھپ سکے وہ احمد شاہ کے ہاتھ لگے اور شاعری کی زنبیل میں ڈال دیے گئے۔

میں اور ابوالکلام

ایک ہی گلزار زتشی دہلوی ——— کہ ان کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ ابوالکلام جیسی شخصیت پر قلم اٹھائیں اور اس میں اپنے احباب اور بزرگوں کا، اساتذۂ دہلی کا، اپنے کارناموں کا ذکر نہ نکال بیٹھیں، بھلا یہاں کیا موقع تھا اس ذکر کا کہ:

"... میری خواہش تھی کہ پنڈت نہرو اور مولانا آزاد کو اپنی وہ نظم جس کا عنوان "امن عالم یا نغمۂ انسانیت" تھا کہ جس پر مجھے دنیا کا دوسرا سب سے بڑا انعام و اعزاز دیا گیا تھا، سناؤں . . . ."

گلزار دہلوی کے مضمون سے پھر بھی ذاتی زندگی کی چند خوشگوار جھلکیاں اور برتاؤ کی وہ نرمیاں مل جاتی ہیں جن کا اوروں کے ہاں ذکر نہیں کیا۔

"... فروری ۱۹۵۸ء کی تاریخی اُردو کانفرنس کے موقع پر جب عصرانہ چائے کا وقت آیا تو اس نیاز مند سے مولانا نے حسبِ عادت قیمے کے سموسے، جو وہ رغبت سے نوش فرماتے تھے، فراہم کرنے کے لیے حکم دیا نیاز مند نے کشمیری ریسٹورنٹ چاندنی چوک سے تازہ اصلی گھی کے چار بڑے بڑے سموسے تیار کروا کر اسٹیج پر حاضر کیے جسے مولانا نے نہایت پسندیدگی اور رغبت سے ملاحظہ فرمایا۔" آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مولانا نے قیمہ بھرے سموسوں کو ملاحظہ فرمایا ؟

اسی طرح CSIR کی اسٹاف یونین میں، دلّی کلچرل سوسائٹی میں، امیر خسرو کے مزار پر مولانا کا بے تکلف تشریف لانا اور ڈیڑھ دو گھنٹے بیٹھے رہ جانا نہ صرف ان کی کم آمیزی کو مشروط قرار دیتا ہے بلکہ مولانا کی شگفتہ فطرت سے بھی مانوس کرتا ہے۔ مولانا واقعی اندر سے ایسے ہی تھے جیسے گلزار دہلوی نے دکھایا ہے۔ چاہتے اور خود کو ذرا سی آڑ میں رکھتے تو اس مقالے کو اور بھی مالا مال کرسکتے تھے۔ مگر کس دن کے لیے؟ ابوالکلام جیسا پس منظر ہمیشہ تو میسّر نہیں آتا۔

گلزار دہلوی کا مقالہ تخت، دیوان اور مونڈھوں والے ڈرائنگ روم کی پچھلی داستان کا مزا دیتا ہے۔ علمی مذاکرے میں نہیں سمجھتا۔

صحافت اور ابوالکلام

زیرِ تبصرہ کتاب کے چھ خانے ہیں، ان میں لازماً صحافت کو نمایاں ہونا چاہیے تھا۔ اس باب میں چار مقالے ہیں۔ مقالہ نگاروں کا اردو صحافت سے رشتہ رہا ہے۔ انور علی دہلوی اور رضوان احمد کا تو اب بھی ہے۔ انور دہلوی نے "ادبی صحافت اور مولانا آزاد" موضوع چُنا۔

ضرورت تھی کہ اس اختلافی موضوع پر ادب اور صحافت کے باہمی فرق اور رشتے پر روشنی ڈال کر مولانا کے اس رویّے کو واضح کیا جاتا کہ وہ بنیادی طور پر ایک انقلابی ادیب اور خطیب ہوتے ہوئے اُردو صحافت کو ادب کی طرف نہیں لائے بلکہ ادبی حسن اور چاشنی کو صحافت کے مقصدی کالموں میں برابر گھولتے گئے اور یوں دشوار اور پُرپیچ عبارتیں اپنا وقار کھوئے بغیر رفتہ رفتہ آسان اور شگفتہ اور عام فہم ہوتی گئیں مولانا خیال کو نازک، باریک پیچدار خیال کو قریب الفہم دلکش اور سلیس بنانے کے لیے اپنے مسودے اس قدر کاٹتے پیٹتے تھے کہ متن کا قیمہ بن جاتا تھا "الہلال" کے دورِ اوّل کی عبارت، پھر "تذکرہ" کی عربیت... اور آخر میں پیغام میں مولانا کے مضامین اور آخری دَور کے خطبات کی زبان اور عام اپیل کو دیکھیے تو یہ فرق، بلکہ یہ فنّی سفر صاف نظر آجائے گا۔ علی جواد زیدی سے امید تھی کہ وہ اپنے وسیع مطالعے گوناگوں تجربے اور تحقیقی ذوق کی بنا پر یہ نکتہ مولانا کی صحافت کے تعلق سے ابھاریں گے۔ (خصوصاً اس لیے بھی کہ ہمارے کم سواد معاصرین کو، جو عبارت مغلق کر کے علمیت کی شان جتاتے ہیں۔ ابوالکلام کی روز افزوں بصیرت سے یہ سبق سیکھنے کو ملے)

علی جواد زیدی صاحب نے اس نکتے کا سرا تھام تو لیا:

"... مولانا کی نثر کی بلند آہنگی اور جوش جو "الہلال" میں شروع شروع میں نظر آیا اور جو ایک متوازن روانی سے "تذکرہ" میں بھی دیکھنے کو ملا، وہ اس بحرانی دور کی پیداوار تھا . . . "ترجمان القرآن" سے یہ بات ظاہر ہونے لگی کہ مولانا صاف سلیس، باوقار مگر آہستہ روی کے انداز کی نثر پر بھی اتنے ہی قادر ہیں اور

تھے، لیکن مولانا کی نسبتاً آزاد خیالی اور مذہبی وسیع النظری انھیں قابلِ تعریف معلوم ہوئی۔ مثلاً یہ خیال کہ :

زرتشت اپنے وقت کا نبی تھا۔

یوں تو انھوں نے نجوم، رمل، جفر، طب اور شاید (؟) موسیقی کی بھی باضابطہ بھی تعلیم پائی لیکن ... ان علوم میں مہارت تامہ حاصل ہوئی جن کا دروازہ درس گاہِ الٰہی سے ان کے لیے کھلا تھا۔ ان کے اکتسابی علم پر ان کا وہبی علم غالب رہا ....

امام غزالی کی (تصنیف) "تہافتہ الفلاسفہ" کا بھی ترجمہ کرنے کی کوشش کی لیکن اس کو بے سود سمجھ کر چھوڑ دیا۔

مولانا صباح الدین نے یہ بیان ضمناً دیا ہے مگر ہمارے نزدیک اس کی بڑی اہمیت ہے "تہافتہ الفلاسفہ" امام غزالی کے اُس دور کی تصنیف ہے جب وہ اپنے عہد کا سارا متداول فلسفہ پی چکنے کے بعد فلسفے کی اہمیت اور خود عقلیت (Rationalism or Reason) سے پھر گئے تھے صوفیا میں (خصوصاً مغرب میں ایمانوئیل کانٹ کے پیرووں نے) اس کتاب کو بڑی اہمیت دی۔ عقل و وجدان کے معرکے اس کی روشنی میں گرم ہوئے۔ ہم تو یہاں تک کہنے کو تیار ہیں کہ انیسویں صدی میں آخری بار جب فلسفہ اور قوت ارادی یا خودی کی بحث چھڑی، آمنے سامنے دو تصانیف سامنے آئیں Poverty of Philosophy اور Philosophy of Poverty تو ایک نے عینیت پسندوں کا، دوسری نے سائنسی مادیت پسندوں کا ساتھ دیا۔ یہ بحث امام غزالیؒ کی تہافتہ الفلاسفہ سے چلی آرہی تھی۔ ابوالکلام بھی اس عہد آفریں تصنیف سے ضرور متاثر ہوئے ہوں گے۔ مگر جب اس کام کو اس تھ میں لیا ترجمہ کرنے کے خیال سے، تو فلسفہ یا عقلیت کی تذلیل انھیں گوارا نہ ہوئی کام ادھورا چھوڑ دیا۔

ایسی اور کئی مثالیں یہاں مل جاتی ہیں جن سے قطعی ثبوت ملتے ہیں کہ ابوالکلام غیر مقلد تو خیر تھے ہی، لیکن اس کے علاوہ مذہب اسلام کے ان عقیدوں اور فریضوں کو خلاصہ سہل کر کے اپنا لیا تھا جو اسے دینِ فطرت منواتے ہیں اور ان پر سیاسی مخالفین کی طرح مذہبی ٹھیکہ داروں نے یہ گرفت کی کہ ______ "وہ (ابوالکلام) صرف ایمان باللہ اور بالآخرت کو کافی سمجھتے ہیں، ایمان بالرسول کے قائل نہیں ..." (ص۔ ۳۱۰)

ایک مقالہ جسے تحقیقی اعتبار حاصل ہے لیکن صرف "ترجمان القرآن" کے اسلوب تک محدود رہا۔ وہ لکھنؤ کے کاظم علی خاں کا ہے جو ادبی تصانیف کے سرچشموں کا جائزہ لینے میں شہرت پا چکے ہیں، چناں چہ یہاں بھی انھوں نے اپنے موضوع کو اسی رخ سے دیکھا :

"... اس کتاب میں آزاد نے اس سادہ و پُراثر اسلوب نگارش سے کام لیا ہے جو آیات قرآنی سے سادگی میں ہم آہنگ محسوس ہوتا ہے ... اسلوب آزاد میں سہل نگاری کا رجحان "ترجمان القرآن" میں پہلی بار بھرپور طور پر نمودار ہوتا ہے .... اس کی وجہ بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ آزاد قرآن فہمی کو عام بنانے کے لیے زیادہ سے زیادہ صاف، سلیس اور سہل اسلوب کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ بعد کو اسلوب کی اسی سلاست نے "غبارِ خاطر" کے اوراق کو بھی حسن عطا کیا ..." (ص۔ ۳۲۳)

"محسوس ہوتا ہے" اور "بظاہر" کے احتیاطی الفاظ مقالہ نگار نے جس مصلحت سے بھی استعمال کیے ہوں تاہم بلا شبہ "ترجمان القرآن" مولانا کے بہترین تصنیفی انہماک اور ذہنی کاوش کا وہ حاصل ہے جس سے مصنف کا فکری اور فنی ارتقا صاف نظر آتا ہے۔ ترجمان القرآن میں قرآن فہمی (بلکہ تفہیم) کی خاطر مولانا نے جو اسلوب اختیار کیا وہ محض اسلوب نہیں، قرآن کی سادگی اور قوت، سلاست اور صلابت کا ایسا امتزاج ہے جس کے اثرات مقالہ نگار کاظم علی خاں کو "غبارِ خاطر" کے خطوط کی عبارت میں بھی نظر آئے اور انھوں نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے۔ اس مقالے کو تمہید قرار دیا جا سکتا ہے، پروفیسر رضی الدین کے باوقار اور پُر مغز مقالے کی

آزادیِ فکر

رضی الدین احمد نے "نقدِ ابوالکلام" ایک ضخیم تحقیقی اور علمی تصنیف دے کر گویا ابوالکلام کا ہر سمت سے احاطہ یا مطالعہ کیا ہے۔ وہ "ترجمان القرآن" کی اصل روح کو چھو لیتے ہیں یہ کہہ کر کہ "ابوالکلام نے تعقل اور تفکر کی جس راہ کو حقیقت شناسی قرار دیا ہے، یہ فکرِ اسلامی کی اساس ہے" اور پھر

"ابوالکلام نے آزادیِ فکر کو اسلامی فکر کی اساس قرار دیا ہے، اور یہ بھی ان کی عقلیت کا ایک وسیع باب ہے ..." (ص۔ ۳۴۶-۷)

تفکر، تعقل، غور و فکر پر مولانا نے قرآن کی تفہیم کرتے ہوئے جو بار بار زور دیا اور کہا کہ :

"... انسان کے لیے حقیقت شناسی کی راہ یہی ہے کہ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور وجود کے باہر جو کچھ محسوس کر سکتا ہے اس میں تفکر و تدبر کرے چنانچہ قرآن کی کوئی سورت اور سورت کا کوئی حصہ نہیں جو تفکر و تعقل کی دعوت سے خالی ہو ..." (ص۔ ۴۷، ترجمان)

عقلیت پر یہی اصرار ہے جو سرسید کی پوری تحریک کی جان تھا اور مولانا کبھی اس سے منکر نہیں ہوئے۔ لیکن ایک مقام ان کے ذہنی سفر میں آتا ہے، جب وہ تعقل کو صاف صاف آخری راہ دیکھتے ہیں، منزل نہیں اور اس کا اعلان بھی کرتے ہیں۔ یہاں وہ ابن تیمیہ

رہے اور کبھی ان سے پوری طرح منحرف نہیں ہوتے۔ پھر ضیاء الدین صاحب فرماتے ہیں:

"۔۔۔ وہ (سرسید) عقل پرستی کے چکر میں پڑ کر روحانیت اور خوش عقیدگی سے بہت دور چلے گئے اور ایسی بہت سی باتوں سے انکار کر بیٹھے جن کا تعلق محض روحانیت اور خوش اعتقادی سے تھا۔۔۔"

ضیاء الدین صاحب نے "خوش اعتقادی" کو جو کم و بیش مترادف ہے ضعیف الاعتقادی کا، خالص روحانیت پر اعتقاد شمار کیا ہے۔ خود "خالص روحانیت" کیا شے ہے؟ نہ ہم بتا سکتے ہیں۔ نہ علی گڑھ کا کوئی وہ فرزند جو سرسید کے ذہنی تجدیدی کارنامے میں پل کر اس سے منحرف ہو چکا ہو۔ سرسید کے عقائد سے ہمیں یہاں بحث نہیں (نہ یہ ہمارے تبصرے کا اصل پہلو ہے) مگر نوجوان اہلِ علم کو کم از کم اتنی وارننگ دینا بے محل نہ ہوگا کہ "اسلام کے بنیادی تصورات اور مسلمہ عقائد" کا لفظ زبان پر لانے سے پہلے مولانا ابوالکلام کے "ترجمان القرآن" ترجمہ مع حاشیہ ضرور پڑھ لینا چاہیے۔

میں نے آزاد کو دیکھا

پانچ سو صفحات کے اس مجموعے کے وہ چار مضامین جو خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں بالترتیب یوں ہیں۔

۱۔ مولانا کے پرائیویٹ سکریٹری مرزا مسعود بیگ سے انٹرویو (ڈاکٹر صلاح الدین)

۲۔ مولانا آزاد کی مذہبی فکر (صباح الدین عبدالرحمٰن)

۳۔ اردو نثر کی تاریخ میں۔۔۔۔ (صدیق الرحمٰن قدوائی)

۴۔ انشائیات ابوالکلام کا اجمالی جائزہ (پروفیسر رضی الدین)

ان چاروں کے علاوہ پروفیسر عبدالمغنی (پٹنہ) نے "آزاد اور نہرو" کے موازناتی مقابلے میں اپنا معیار برقرار رکھا ہے اور اس کھلے سوال کا تسلی بخش جواب بھی دے دیا ہے کہ:

"آزاد کی طویل جد و جہد کے بعد حصولِ اقتدار کے وقت آزاد نے نہرو کے لیے جگہ کیوں خالی کی؟"

جواب یہ کہ: خود وزیرِ اعظم بننے کے بجائے اکثریت کے ایک فرد کو وزیرِ اعظم بننے کا موقع دینا پسند کیا۔ مولانا کے خیال میں کانگریس کے دوسرے سب رہنماؤں سے زیادہ روشن خیال تھا۔۔۔۔

قومی تحریک کا اصل مثلث

پروفیسر عبدالمغنی انگریزی ادبیات کے پروفیسر ہیں۔ اقبالیات اور اس سے متعلقہ موضوع پر وسیع نظر اور تصنیفی کارنامے رکھتے ہیں لیکن محاکمے کے وقت مولویانہ شدت اختیار کر لیتے ہیں اور فتویٰ بلکہ فتاویٰ صادر کرتے ہیں۔ یہاں بھی ایسے چند جملے آ گئے ہیں۔

"۔۔۔ نہرو اپنے معلوم و معروف میلانات کے سبب تنہا اتنی متوازن قومی معاشی اور بین الاقوامی پالیسیاں مرتب نہیں کر سکتے تھے ۔۔۔ ایسی پیچیدہ پالیسیوں کی ترتیب میں انھیں گاندھی جی کے سادہ ذہن سے کوئی قطعی رہنمائی نہیں مل سکتی تھی۔ لہٰذا۔۔۔۔"

ہم نہیں کہہ سکتے کہ مقالے کے موضوع سے انصاف کی خاطر یہ قیاسی فیصلہ درج ہوا یا پروفیسر مغنی صاحب اس مثلث (گاندھی + نہرو + آزاد) کے تینوں ضلعوں اور زاویوں کو متوازن رکھنے میں جلدی کر گئے۔ اگر مثلث کی اقلیدسی تھیورم درست ہو تو اس میں زاویۂ قائمہ کا درجہ گاندھی جی کو حاصل تھا اور حاصل ہے۔ یعنی ۹۰ ڈگری۔ باقی میں نہرو اور آزاد اگر برابر بیٹھتے ہوں تب بھی یہ نہ بھولنا چاہیے کہ نہرو نہ صرف دانشوری اور علمی باخبری میں ہیں بلکہ عملی سیاست اور قبولِ عام کی اقبال مندی میں بھی ہر ایک زندہ نیتا سے بہت آگے تھے۔

آخری دو پیراگراف جلدی جلدی دامن سمیٹنے کا سا انداز رکھتے ہیں ـــــــ مگر ہم ان کے احسان مند رہیں گے کہ آزاد و نہرو کے تقابلی مطالعے یا باہمی توازن کے تعلق سے ہمیں آگے تک سوچنے اور جداگانہ مقالہ لکھنے پر اکسایا ہے۔

احمد سعید ملیح آبادی نے مولانا کا کئی زاویوں سے جائزہ لیا اور وہ نکتہ نمایاں کر دیا ہے جسے علی جواد زیدی کے مقالے (صحافت) میں ابھرنا چاہیے تھا:

"۔۔۔ مولانا نے اوائل عمر میں جو زبان لکھی وہ حد درجہ دشوار ہے۔ جسے آج اور کل کے زمانے میں نئی نسل کے لیے صحیح تلفظ کے ساتھ پڑھنا اور سمجھنا کافی دشوار ہوگا۔ کیوں کہ اردو تعلیم میں کمی آتی جا رہی ہے۔ مولانا اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ آسان اور سلیس اردو لکھی جانی چاہیے۔ (ص ۳۶۶)

۱۹۲۰ء میں جب مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی نے "پیغام" ویکلی جاری کیا تو مقصد میں بھی مولانا ابوالکلام کی تحریروں کی اشاعت شامل تھی۔ مگر یہاں نہ وہ "الہلال" کا سا جاہ و جلال تھا۔ نہ شان و شکوہ ۱۹۱۲ ـــــ ۱۴ء کی جگہ اب وہ شہسوارِ صحافت آزاد سامنے آیا جو بات کو مختصر اور سادہ عام فہم انداز میں کہنے لگا تھا۔

مولانا کی مذہبی فکر

صباح الدین عبدالرحمٰن (مرحوم) خود ایک قدامت پسند عالم تھے، ندوۃ العلماء کا آخری چراغ تھے۔ دبنگ تھے، بے لاگ اور علمی معاملات میں بے مروّت

لیے مولانا کی تحریروں سے مثالیں فراہم نہیں کیں تاہم نتیجہ یہ نکالا ہے کہ جس ادبی اسلوب کی بنیاد مولانا کے قلم نے ڈالی وہ انہی کے ساتھ رخصت ہوگیا۔ وجہ یہ کہ ان کی اپنی شخصیت کی گہری چھاپ اور وہ فضا جس میں یہ اسلوب پروان چڑھا ــــــــ دونوں اب دہرائے نہ جاسکیں گے . . .

ہمیں اس اندازے سے اتّفاق ہے مگر ایک ترمیم کے ساتھ اور ترمیم یہ کہ نہ تو مولانا کی شخصیت ایک محدود دائرے میں بنیچ نہ ان کا اسلوب اوّل تا آخر ایک سا رہا۔ ان میں رفتار اور ارتقا کا جو احساس ہوتا ہے وہی ارتقائی عمل آج بھی جاری ہے۔ اور مولانا کی دین بدلے ہوئے حالات میں مختلف شخصیتوں اور حیثیتوں کے ساتھ بدلے ہوئے روپ میں ہمارے ساتھ رہے گی۔

اور امام غزالی دونوں کی راہ اپنا لیتے ہیں۔ عقلیت کو 'چراغِ راہ' ماننے والے اور عمر بھر اس چراغ کو سیاسی اور سماجی فانوسوں میں سنبھال کر لے چلنے والے ابوالکلام کے ہاں ایک اور پہلو، نہایت اہم پہلو، بلکہ ان کی خلوت نشین شخصیت کی کنجی وہ ہے جسے رضی الدین احمد نے اپنی پہلے کی تصنیف میں مقالوں میں اور خصوصاً اس مقالے میں ابھارا ہے ـــــــ ابوالکلام کی حسن پسندی' ذوق کی نفاست' طبیعت کی لطافت اور جمال کو ہر پہلو' ہر ایک رنگ میں داد دینے کی سکت اور صلاحیت خود مقالہ نگار کے الفاظ میں :

" عقلیت' خطابت اور صحافت کے ساتھ ساتھ ابوالکلام کے طرز اور شخصیت نے جو چیز یادگار چھوڑی ہے۔۔ وہ ایک جمالیاتی قوت کا احساس اور اظہار ہے۔ ابوالکلام کے طرز اور طبیعت میں حسن کا نشہ اور سچائی کا نغمہ ایک جان دو قالب نظر آتے ہیں۔ ابوالکلام کا یہ نغمہ اور نشہ اسی ذہنی خفتگی اور غلامی کے خلاف ایک شدید ردِ عمل بن گیا ہے جو اردو ادب میں خصوصاً شاعری میں چھایا ہوا تھا۔"

ایک اور مقام پر :

" ابوالکلام کے ہاں حق ہے مگر جمالیات نے حق کی کڑواہٹ کو حلاوت سے بدل دیا ہے۔۔۔"

پروفیسر موصوف نے اسی لہجے سے اپنے الفاظ تقدیم و تاخیر کر کے دہرائے گئے ہیں' یہاں تک کہ وہ آخر میں اس خلاصے پر پہنچتے ہیں :

" ۔۔۔ انشائیات ابوالکلام کے اجزا میں جس دوئی کی وحدت ہے' اسی دوئی کی وحدت ابوالکلام کی شخصیت میں بھی ہے۔ یہ حق پسندی اور حسن پرستی سے عبارت ہے۔ اور اس کی عظمت میں یہ دونوں اجزا ایک دوسرے سے اس طرح جڑے ہوتے ہیں جس طرح دریا کے دو کنارے۔ ان دونوں کناروں کو جوڑنے والی شخصیت میں جو عظمت اور وسعت ہے وہ ابوالکلام کا مقدر اور منصب بنی۔۔۔

(ص۔ ۳۵۹)

اس مقالے سے' جو دراصل ہزار صفحے کی پوری تصنیف کا لبِّ لباب ہے' اس کے باوجود تکرار' خیال و الفاظ سے محفوظ نہ رہ سکا) ابوالکلام کی شخصیت اور فن میں رفتہ رفتہ تین صفات ابھر آتی ہیں۔ اور ان کا ظہور ایک ارتقائی لائن پر نظر آتا ہے :

حق کی جستجو میں عقلیت کی روشنی۔

آزادی پسندی۔

حسن پرستی یا گہرا جمالیاتی شعور

اگر ہم ان کے ذہنی سفر میں ان تینوں کو زادِ راہ مان لیں تو ستر برس کی بھر پور زندگی کے کئی اسرار ہم پر کھل جائیں گے اور ابوالکلام کا باہمہ اور بے ہمہ زندگی کرنا' اپنے خیالات پر اصرار اور قوتِ برداشت اور قوتِ اظہار ـــــــ دونوں کی شدت میں توازن و تناسب کا رمز ہم پر آشکار ہو جائے گا۔ ابوالکلام ہمارے لیے اجنبی یا بہت دور کی کوئی ہستی نہ رہ جائیں گے بلکہ ان سے بہت کچھ سیکھنے کو ملے گا اور ان کی ہمہ وقت قربت کا احساس ہوگا۔ مثلاً یہی کہ :

ایک طرف تو وہ منٹ منٹ کے حساب سے وقت کے پابند ہیں۔ دفتر کے چوکیداروں سے بڑھ کر دفتری پابندی میں چوکس ـــــــ اور دوسری طرف وہ شام کے آٹھ بجے کے بعد اور صبح ۹ بجے سے پیشتر کے دوران اپنے معمولات میں کسی قسم کی دخل اندازی یا اونچ نیچ کے روادار نہیں۔

اُردو نثر میں

۲۶ مقالات کے اس مجموعے میں دوسرا نہایت بیش قیمت اور پُر مغز' مدلل مضمون ڈاکٹر صدیق الرحمٰن قدوائی کا ہے۔ کل آٹھ صفحے' لیکن اپنے موضوع " اردو نثر کی تاریخ میں مولانا ابوالکلام کا عہد " سے پورا انصاف کرنے والے۔ یہ مقالہ ایک نہایت فکر انگیز جملے سے شروع ہوتا ہے۔

" ادبی نقطۂ نظر سے مولانا آزاد کے دور کا ایک سرا علی گڑھ تحریک سے ملتا ہے اور اس کے دوسرے سرے پر ترقی پسند تحریک ہے۔۔۔"

یہ پورا مقالہ اسی ایک جملے کی تفسیر ہے۔ کیا نکتے کی بات ڈاکٹر قدوائی نے کہی کہ :

" ۔۔۔ انانیت صرف سیاسی رہنماؤں میں نہیں' سارے ادیبوں میں پائی جاتی ہے' اور شاید بجا طور پر مولانا آزاد ان میں سب سے آگے ہیں۔ ترجمان القرآن جیسی کتاب کا لکھنے والا اپنے ذہن' اپنے علم اور اپنی قوتِ بیان پر غیر معمولی اعتماد کیے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔۔ ہر ہجوم میں' خصوصاً مخالفوں کے ہجوم میں تنہا کھڑا رہنا شاید ان کی انا کو کچھ زیادہ ہی تسکین پہنچاتا تھا۔ " غبارِ خاطر " کے خطوط کا ہر لفظ اس بات پر اصرار ہے کہ میں وہ نہیں ہوں جیسے دوسرے ہوتے ہیں۔ اسے وہ ہر طرح منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ استدلال کے ذریعے بھی اور اسلوب سے بھی۔"

ایک اور بات' جو مغربی نثر کے رسیاؤں کو مولانا کی تحریروں میں کھلتی ہے۔ صدیق الرحمٰن صاحب اسے ہنر قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

" ۔۔۔ اشعار کی بھرمار نے ان کی نثر کو اگرچہ جا بجا چھلنی کر دیا ہے مگر اس میں بھی شک نہیں کہ وہ اشعار بھی اکثر کھل اٹھتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے وہ مولانا کی نثر میں آنے سے پہلے اپنے معانی کی تلاش میں تھے۔۔۔" (ص ۳۲۴)

قدوائی صاحب نے اپنے بیانات اور اندازوں کے



سب سے بڑی خدمت

میرے خیال میں مولانا نے جو ایک سب سے بڑی خدمت کی وہ یہ ہے کہ ہر مذہب کے آدمی کو اُنھوں نے یہ جتایا کہ مذہب کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو تفریق پیدا کرتی ہے۔ ایک مذہب کی حیثیت ہوتی ہے جو لوگوں کو الگ الگ کرتی ہے، جو لوگوں میں نفرت پیدا کرتی ہے۔ وہ مذہب جھوٹا مذہب ہے۔ اُنھوں نے یہ بتلایا کہ مذہب کی روح ملانے والی روح ہے۔ مذہب کی روح ایک دوسرے کو پہچاننے والی روح ہے۔ مذہب کی روح خدمت کی روح ہے۔ مذہب کی روح دوسروں کے لیے اپنے کو مٹانے کی روح ہے۔ مذہب کی روح وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ ساری زندگی کی وحدت کو ماننے کی روح ہے۔ اور یہ ایک ایسا سبق ہے جو تمام مذہبی جماعتوں اور تمام اُن لوگوں کو سیکھنا چاہیے جو چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں بنانا چاہتے ہیں۔ زبان کے اوپر یا صوبے کے اوپر یا کسی ذات پات کے اوپر یا کسی مذہب کے اوپر ٹکڑیاں بنا کر ہماری زندگی کی وحدت کو مٹانا چاہتے ہیں۔ ہمارے ملک میں اس وقت جو سب سے بڑا مرض ہے وہ یہ کہ ہمارے پاس جو چھوٹی چھوٹی وفاداریاں ہیں، تنگ وفاداریاں ہیں وہ زیادہ قوی ہیں۔ ہم چھوٹے چھوٹے گروہوں سے زیادہ وابستہ ہیں اور بڑے گروہ کو پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ اپنی چھوٹی وفاداریوں کو اس بڑی وفاداری کا تابع کریں۔ کوئی ضرورت نہیں ہے کہ چھوٹی وفاداریاں توڑدی جائیں۔ کسی کو یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ سکھ نہ رہے، مسلمان نہ رہے، ہندو نہ رہے یا پارسی نہ رہے۔ لیکن اس کو پہلے اپنے دیس کا پھر تمام انسانیت کا خادم بننا چاہیے، تب وہ سچا مسلمان ہے، تب وہ سچا ہندو ہے، تب وہ سچا عیسائی ہے، تب وہ سچا پارسی ہے، تب وہ سچا سکھ ہے۔ یہ سبق مولانا کی زندگی سے جیسا روشن طور پہ ہمیں ملتا ہے اور یہ سبق جس طرح ہمارے واسطے آج کی زندگی میں اور ہماری قومی زندگی میں ضروری ہے۔ اس کے اعتبار سے ہم سمجھتے ہیں کہ آج کا دن ہمارے لیے یہ عہد کرنے کا دن ہے کہ ہم اس روح کو، مذہب کی سچی روح کو اپنی قومی زندگی میں کارفرما کریں۔

—— ڈاکٹر ذاکر حسین

(مولانا آزاد کے تعزیتی جلسے سے خطاب)

مجموعۂ اوصاف

باضابطہ تعلیم اور اصطلاحی تدریس تو مولانا کی بھی بعض اور مشاہیر ماضی وحال کی طرح کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔ لیکن خدا معلوم کتنے علوم اور متعدد فنون کے خزانے دماغ میں جمع ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت مستحضر۔ طب ہو کہ الٰہیات، فقہ ہو یا کلام، شعر و ادب ہو یا موسیقی، تاریخ ہو کہ سیاسیات جس فن سے متعلق جو بھی موضوع ہو، بس گفتگو چھیڑنے کی دیر تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ سامنے کوئی معمولی واقف کار ہی نہیں، ماہر فن تقریر کر رہا ہے۔ اور تقریر بھی ایسی دل آویز و مربوط کہ فصاحت و بلاغت بلائیں لیتی جاتی ہے۔ غضب کا حافظہ تھا اور غضب کی خوش دماغی۔ اور زبانوں پر عبور تو اور بھی حیرت انگیز تھا۔ اپریل ۱۹۱۲ء میں جب سید رشید رضا مصری (المنار والے) لکھنؤ جلسۂ ندوہ کی صدارت کو تشریف لائے تو ان آنکھوں نے دیکھا کہ ان سے برجستہ اور بے تکلف عربی میں گفتگو کرنے والوں میں سب سے پیش پیش ابوالکلام ہی تھے۔ فارسی شعر میں ان کا تبحر دیکھ کر گمان یہ گزرتا تھا کہ اساتذۂ فارسی کے دیوان کے دیوان اس شخص نے نوکِ زبان کر لیے ہیں۔ اور اُردو کے لیے تو کچھ کہنا ہی تحصیل حاصل ہے۔ زبان مادری ہی، پھر بھی اس کے ہر گوشہ اور ہر پہلو پر اتنی وسیع اور جامع نظر رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ بڑے بڑے اس جامعیت کے معیار پر "فیل" ہی ثابت ہوتے ہیں۔ مستثنیٰ کسی حد تک بھی اگر کسی کی ذات رکھی جا سکتی ہے تو وہ ابوالکلام کی۔ اور اُردو کے تاریخ نگاروں کی محض کم بینی ہے کہ اُنھوں نے اپنی تاریخوں کو مولانا کے ذکر سے خالی رکھ چھوڑا ہے۔ تاریخ اُردو میں اُن کے نام کا ایک مستقل باب ہی نہیں بلکہ بہ حیثیت صاحبِ طرز انشا پرداز کے اُن کے نام کا باب، بابِ عالی شان بھی ہونا چاہیے۔ اُردو کو اُنھوں نے ایک مستقل اور بالکل نیا اسلوب بیان عطا کیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی اور اس اسلوب کا نباہنا اپنے بس ہی میں نہ پائے۔

—— عبدالماجد دریاآبادی

رئیسُ التّحریر

مولانا عجیب و غریب دماغی اہلیتیں لے کر پیدا ہوئے تھے جن کو زمانہ نے یا خود ان کی خلوت پسند طبیعت نے اُبھرنے کا موقع نہ دیا۔ وہ آج ہمیں صرف "الہلال" و "البلاغ" کے رئیس التحریر یا "تذکرہ" "ترجمان القرآن" اور "غبارِ خاطر" کے مصنف ہونے کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس صدی کے مجدد ہونے کی تمام صلاحیتیں اپنے اندر رکھتے تھے۔

مولانا کی فطری اہلیت و صلاحیت قدرت کا ایک سربند راز تھی جس کے بعض گوشے تو ہمارے سامنے آ گئے اور اکثر بے نقاب نہ ہو سکے۔ اس کا ایک سبب تو زمانے کے حالات تھے جنھوں نے ان



مولانا آزاد — چند ہم عصر اکابرین کی نظر میں

ایک رفیق کار

مولانا دُنیا سے بالکل مختلف اور نرالے سیاستدان تھے۔ آپ ایک کامیاب سیاست داں کے طبعی مزاج سے معرّیٰ تھے۔ جو ٹھوس اور بے حس ہو کر حملے کرنے اور حملے سُننے کے قابل ہو جاتا ہے۔ آپ کی افتادِ طبیعت سرتا پیر اس کے خلاف تھی۔ وہ بے حد شرمیلے اور خلوت پسند تھے اور مزید برآں اُن کے پہلو میں ایک بہت زیادہ حساس دل تھا۔ باوجود ایک موثر اور باوقار مقرر ہونے کے وہ شور و شغف اور ہنگامہ خیزیوں سے بہت گھبراتے تھے۔ اُن کو عوام میں تقریر کرنے کے لیے آمادہ کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ حق یہ ہے کہ اُن کی اصلی خصوصیت علم و فضل تھی۔ حالات کی نزاکت نے اُنھیں حرکت و گردش کی زندگی پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا کو دیکھ کر مجھے اکثر وہ فرانسیسی قاموسی یاد آجاتے تھے جو انقلابِ فرانس سے کچھ پہلے موجود تھے۔ تاریخِ اقوامِ ماضی میں اُن کا درک و بصیرت یقیناً حیرت انگیز ہے۔ اور پھر یہ وسیع علم اُن کے دماغ میں عجیب ضبط و ترتیب کے ساتھ موجود تھا۔ ان کا ذہن مدلّل، باضابطہ اور سلجھا ہوا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے منطق و فلسفہ کے کسی قدیم اسکول میں تعلیم حاصل کی ہے۔

اگر اس وقت خلوت پسندی اور شرمیلا پن اُن کی طبیعت کا خاصّہ نہ ہوتا، تو وہ مُلکی اور قومی کاموں میں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے۔ کیوں کہ اُن کے قلم میں ایک سحر اور اُن کے لبوں میں ایک اعجاز تھا، جو ہزاروں بے حس دلوں کو حرکتِ عمل کی طرف راغب کر سکتا تھا۔ ہم نے یہ اعجاز اور آواز پبلک میں بہت کم سُنی۔ اور بد قسمتی سے اُنھوں نے اپنے جادو نگار قلم سے بھی پہلے کی طرح دل آویزیاں اور رنگینیاں پیدا کرنی چھوڑ دی تھیں۔

مجھے ہمیشہ اُن کی تصنیفی زندگی سے بے اعتنائی پر افسوس ہوا ہے۔ کیوں کہ جو زبان وہ لکھتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ پُر معنی الفاظ سے مملو ہوتی تھی۔

شباب میں ہی اُنھوں نے نہ صرف ہندوستان بلکہ مغربی ایشیا عرب ممالک اور مصر سے خراجِ تحسین وصول کر لیا تھا۔ اور وہ محض اُن کے قلم کی بدولت تھا اور اب تک یہ حالت تھی کہ اگر ان عربی بولنے والے ممالک میں کوئی سیّاح ہندوستان سے جاتا ہے تو اُس سے ابوالکلام کے متعلق ضرور دریافت کیا جاتا ہے۔ اگر اُنھوں نے اپنا یہ جہادِ قلمی جاری رکھا ہوتا تو آج ہماری قوم کو صاف اور سلجھے ہوئے طرزِ فکر اور بنا بریں صحیح راہِ عمل کے تعین میں کس قدر گراں بہا تقویت نصیب ہوتی۔

یہ محض حالات کا تقاضہ تھا کہ وہ دوسرے فرائض اور ذمہ داریاں اپنے کاندھوں پر لینے کے لیے مجبور ہو گئے۔ اور اب یہ فیصلہ تاریخ کرے گی کہ اُنھوں نے یہ سب کچھ بہ وجوہ احسن ادا کیا لیکن ہم، جنھوں نے اُن کو بہت زیادہ قریب سے دیکھنے کی عزت حاصل کی ہے۔ تاریخ کے فیصلہ کے لیے زحمت کش انتظار کیوں ہوں؟ وہ ہمارے لیے اور ملک و قوم کے لیے قوتوں کا ایک محکم پہاڑ تھے۔ قطعِ نظر اس کے کہ کبھی ہم نے اُن کی رائے سے اختلاف کیا بالاتفاق ہمیشہ یہ بات ملحوظِ خاطر رکھتے رہے کہ اُن کی رائے ہمیشہ بہت زیادہ وقیع ہوتی ہے اور ہم آسانی سے اس سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ وہ رائے ایک ایسے آزمودہ کار اور صائب دماغ کی پیداوار ہوتی تھی جسے ماضی و حال کے علم و فضل اور غیر معمولی دانش و فراست سے نوازا گیا ہو اور یہ ہمہ گیر قوتیں بہت کم ہستیوں کا حصّہ ہوتی ہیں۔

بڑے آدمی پیدا ہوتے آئے ہیں اور پیدا ہوتے رہیں گے۔ لیکن مولانا جس خاص نوعیت کی عظمت کے مالک تھے وہ بھارت یا کسی اور جگہ نظر نہ آسکے گی۔ مولانا آزاد نے اسلام کی سب سے بڑی خدمت کی۔ جب کہ اُنھوں نے یہ کہا کہ اسلامی ممالک امپیریلزم کے نتیجہ سے تبھی بچائے جا سکتے ہیں جب بھارت آزاد ہوگا۔ مولانا ماضی کی عظمت اور حال کی عظمت کا دل پسند مجموعہ تھے۔ وہ پرانے زمانے کی عظمتیں، خصلتیں مثلاً رواداری، شفقت، مروّت، تحمل مزاجی بدرجۂ اتم رکھتے تھے۔

آج انسان چاند تک پہنچنے کا متمنّی ہے لیکن ہم میں تحمل مزاجی، مروّت اور رواداری کا زبردست فقدان ہے۔ مولانا اس کلچر کے نمائندہ تھے جو مختلف کلچروں کے آپس میں سموئے جانے سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ مولانا آزاد روشن فہم و فراست کے مالک تھے اور مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی حیران کُن صلاحیت رکھتے تھے۔

مولانا ہم سے جُدا ہو گئے ہیں لیکن ان کا پیغام زندہ ہے۔ اور یہ ماضی کی طرح ہمیں روشنی دیتا رہے گا۔

—— پنڈت جواہر لال نہرو

(انگریزی سے ترجمہ)

درجہ حاصل کرتے ہیں۔ کتابوں کے مطالعے اور غور و فکر میں انہماک عموماً قوتِ عمل پر ناخوش گوار اثر ڈالتا ہے۔ مولانا علم و عمل دونوں کے تاجدار تھے۔ انھیں دونوں دائروں میں سُلطانی کا تاج نصیب ہوا۔ اور آج فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ وہ علم میں بڑے تھے یا عمل میں۔ انھوں نے مدّت العمر قوم کو عزیمت کی دعوت دی۔ اور یہ دعوت خوش نما الفاظ، دل نشیں تحریرات یا پُرتاثیر خطابت تک محدود نہ تھی۔ بلکہ ایسے قلب کی گہرائیوں سے اُٹھی ہوئی دعوت تھی جس کے متحرک خون کا ہر قطرہ عزیمت کی حرارت سے مخمور تھا۔ انھوں نے جو اونچی سے اونچی بات کہی، اس پر اونچے سے اونچے عمل کا نمونہ پیش کیا۔ ایسے یگانہ افراد ہر فضا میں تربیت نہیں پاتے۔ اور ایسے گراں مایہ گوہر ہر خاک سے نہیں اٹھتے۔ غالب کیا خوب کہہ گیا ہے ؎

عمر ہا چرخ بہ گردد کہ جگر سوختہ
چوں من از دودۂ آتش نفساں برخیزد

—— مولانا غلام رسول مہر

روشن دماغ

قدرت نے اُنھیں ایسا روشن دماغ دیا تھا کہ وہ ہر مشکل سیاسی مسئلے کی گتھیوں کو سُلجھا دیتے تھے۔ اور ان کا ناخنِ تدبیر کامیابی کا راستہ کھول دیتا تھا۔ یہی حال دفتر کے ماحول کا تھا۔ ہم لوگ معاملے کی جُزئیات میں اُلجھتے، موافق اور مخالف دلیلوں کا فریب کھاتے۔ لیکن اُن کی نظر تفصیلات کو چیرتی ہوئی نفسِ معاملہ تک پہنچ جاتی۔ اور وہ واضح اور محکم فیصلہ صادر کر دیتے۔ اُن کا دل اتنا فراخ تھا کہ اس میں کسی قسم کے تعصب یا تنگ نظری کو بار حاصل نہ تھا۔ اس کے سارے ایوان انصاف پسندی اور انسان دوستی سے معمور تھے۔ اسی وجہ سے ان پر تمام اقلیتوں کو پورا پورا بھروسا تھا۔ اور وہ جانتے تھے کہ مولانا ان کے جائز حقوق کی حمایت کریں گے۔ میں نے ان کی زبان سے کسی شخص کی بُرائی میں سخت سے سخت لفظ یہ سُنا کہ "فلاں چھوٹے دل اور دماغ کا آدمی ہے"۔ یعنی ان کے ترازو میں دل اور دماغ کی تنگی انسان کی سب سے بڑی محرومی اور ذلّت تھی۔

—— غلام السیّدین

مردِ مجاہد

جس وقت مولانا آزاد ہندوستانی سیاست کے میدان میں داخل ہوئے تو نیم سیاسی شعور رکھنے والے مسلمانوں کی بڑی اکثریت کے سامنے سر سید کی پالیسی کے سوا کوئی اور راستہ نہ تھا یعنی برطانیہ سے تعاون اور ہندوؤں سے علیحدگی۔ جب مولانا آزاد نے واضح طور پر اس بات کی دعوت دی کہ قومی تحریک سے پورا پورا اتحاد اور تعاون کیا جائے۔ اور برطانوی شہنشاہیت کی طاقتوں کی پُرزور مخالفت کی جائے تو پہلے پہل لوگوں کو بڑا دھکا لگا اور پھر سرکردہ مُسلم سیاست دانوں کے بعض حلقے ناراض بھی ہوئے۔ اس وقت اہل الرائے مسلمانوں کی اکثریت کو مولانا آزاد کا یہ موقف سراسر ایک سیاسی بدعت دکھائی پڑا۔

مولانا آزاد چالیس سال سے زیادہ عرصے تک قومیت، ترقّی، آزادی اور جمہوریت کے تقاضوں کے حامی رہے۔ یہ بات بعض لوگوں کو کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ مولانا آزاد مذہبی علما کے خاندان سے تعلّق رکھتے تھے۔ اور ان کی پرورش اور تربیت اُن کی خاندانی روایات کے مطابق ہوئی تھی۔ چوں کہ مولانا آزاد مذہبیات کے زبردست عالم اور اسلامی حدیث و فقہ کے ماہر تھے اس لیے بعض لوگ مصلح اور قوم پرست کی حیثیت سے اُن کے رول کو کچھ غیر متوقع سمجھتے تھے۔ لیکن یہ کوئی عجیب و غریب بات نہ تھی۔ یہ بات انھیں لوگوں کے لیے تعجب خیز ہے جو اسلام کی روایات کو بھول گئے ہیں اور صرف انھیں عقائد پر نظر رکھتے ہیں جو اکثر انگریزوں نے ہندوستانی مسلمانوں سے وابستہ کر دیے ہیں۔ اسلام نے جس میں جمہوریت، آزادی اور عقلیت پر زور دیا گیا ہے۔ جواں سال مولانا آزاد کو اس وقت کی سیاسی غلامی، جاگیردارانہ طبقاتی درجہ بندی اور ذہنی ظلمت پسندی کے خلاف بغاوت پر اُبھارا چنانچہ وہ ملک و قوم کو سیاسی غلامی، جاگیرداری، خوشامد پسندی اور توہّم پرستی سے نجات دلانے کے لیے کھڑے ہوگئے۔ یہ ہمہ گیر آزادی کا جذبہ ہی تھا جو مولانا آزاد کو عزلت نشینی کی خانقاہ سے نکال کر سیاست کے میدانِ کارزار میں لے آیا۔

—— ہمایوں کبیر

غُبارِ خاطر

یوں تو پچھلی صدی سے اب تک اُردو میں خطوں کے کئی مجموعے شائع ہوئے لیکن پچھلی صدی میں غالبؔ کے خطوط (اُردوئے معلّٰی اور عودِ ہندی) اور موجودہ صدی میں مولانا آزاد کے مجموعۂ خطوط (غبارِ خاطر) کو طرّۂ امتیاز حاصل ہے۔ دونوں کا اندازِ نگارش جُدا لیکن دونوں نے بات میں بات پیدا کی ہے۔ مولانا کی زندگی غالبؔ سے کہیں زیادہ ہمہ گیر تھی۔ اس لیے اُن کے خطوط میں جو نکات اور مسائل پائے جاتے ہیں وہ غالبؔ کے ہاں نہیں۔ پھر بھی "غُبارِ خاطر" میں مولانا نے سیاسیات کے تذکرہ سے گریز کیا ہے۔ اگر کہیں اشارے ہیں تو اس انداز میں کہ مکتوب الیہ سمجھ جائے۔ غالبؔ کے خطوط مختلف دوستوں، محسنوں، شاعروں اور شاگردوں کے نام ہیں۔ مولانا کے خطوط ایک



کو اپنے ذوق کی پوری وسعت سے کام لینے کا موقع نہ دیا اور دوسرا سبب اُن کی فطری خلوت پسندی و کم آمیزی تھی۔ وہ نام نمود اور شہرت سے گریز کرتے تھے اور برتائے متانت و خودداری وہ بے تکلفی میں بھی اپنی "شانِ گراں مایگی" ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔

مولانا کا رجحان سیاست کی طرف کب اور کیوں کر ہوا اس کی صحیح تاریخ متعین کرنا مشکل ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی ابتدا اسی وقت ہوئی جب مصر کے جامعہ ازہر میں اُنھیں جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کی تحریکِ آزادی کے لٹریچر کے مطالعہ کا موقع ملا۔ اس کے بعد جب وہ ہندوستان آئے تو یہ چنگاری اپنے سینہ میں لے کر آئے اور پھر رفتہ رفتہ اس کی حدت و تیزی بڑھتی گئی اور آخر کار شعلۂ جوالہ بن کر "الہلال" کی صورت میں ہمارے سامنے آئی۔

ہم مولانا کے زمانِ صحافت کو تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک وہ جو مخزن، "اخبارِ وکیل" اور "لسان الصدق" سے تعلق رکھتا ہے۔ دوسرا دور "الہلال" کا اور تیسرا "البلاغ" کا۔ دورِ اول خالص علمی تھا، دوسرا سیاسی اور تیسرا مذہبی و اصلاحی اور ان تینوں زمانوں میں اُنھوں نے جو کچھ لکھا وہ اُن کی انفرادیت و انانیت کا بڑا زبردست مظاہرہ تھا۔ میں نے "انانیت" کا لفظ قصداً استعمال کیا ہے۔ کیوں کہ اُن تحریروں میں جو خود اعتمادی وکیفیتِ ایقان پائی جاتی تھی، وہ صرف لفظ "انانیت" ہی سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ جس میں منطقی چون و چرا اور استدلالی "این و آں" کی کوئی گنجائش نہیں۔

مولانا کے دینی و علمی مقالات کا فاضلانہ لب و لہجہ، سیاسی مضامین کا مجاہدانہ و قایدانہ انداز مذہبی افکار کا حکیمانہ اسلوب اور اسی کے ساتھ ان کی خطیبانہ بلند آہنگی عسکرانہ رجز خوانی، مردِ مجاہد کا سا اذعان و ایقان، کاہنوں کا سا وزن و وقار جس نے ہم کو نیا ولولۂ حیات، نیا جوشِ زندگی بخشا۔ اب کہاں؟

اِک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے

——— نیاز فتح پوری

فقر و فاقہ میں

سنہ ۱۹۲۳ء یا سنہ ۱۹۲۴ء کی بات ہے کہ مولانا نہایت مالی مصائب میں مبتلا تھے۔ میں تو گھر ہی کا آدمی تھا ہر وقت کا ساتھ تھا۔ دوپہر کا کھانا بھی ساتھ ہی ہوتا تھا اور مجھ سے گھر کی کوئی بات بھی چھپ نہیں سکتی تھی۔

دُنیا جانتی ہے کہ مولانا ازحد نفاست پسند اور عالی دماغ تھے۔ جو کچھ ہو بہتر سے بہتر ہو۔ اعلیٰ سے اعلیٰ ہو۔ سگریٹ کے عادی تھے۔ اور قیمتی سے قیمتی سگریٹ پیا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں سستے سے سستے، گھٹیا سے گھٹیا سگریٹ پر قانع تھے۔ یقیناً سخت ترین اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ آدمی کے لیے ہر مشکل آسان ہے مگر ذہنی کوفت کا جھیلنا آسان نہیں۔ وہ بڑے انسان ہی ہیں جو ذہنی اذیتوں اور دماغی کلفتوں میں بھی اپنے اعصاب پر قابو رکھتے ہیں اور اپنی اندرونی ویرانی کو ظاہر نہیں ہونے دیتے۔

مولانا نے آنکھ کھولی تو سونے کا چمچہ ہاتھ میں تھا۔ بہت بڑے پیر کے نورِ نظر تھے۔ دولت ہی دولت رہتی تھی۔ ایسے آدمیوں کے لیے فقر و فاقہ دوسروں سے کہیں زیادہ مصیبت اور ذہنی اذیت کا سبب بن جاتا ہے۔ مگر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ مولانا اس فقر و فاقہ میں بھی زیادہ سے زیادہ ہشاش بشاش رہتے تھے۔ کبھی ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا۔ کبھی جھنجھلاتے نہیں۔ بلکہ اُن خشک دنوں میں مولانا کی بشاشت اور ظرافت عروج پر پہنچ گئی تھی۔

——— عبدالرزاق ملیح آبادی

نادرِ روزگار شخصیت

یقیناً مولانا ایک نادرِ روزگار شخصیت کے مالک تھے اور ایسے گوناگوں اوصاف و محاسن کسی ایک وجود میں بہت ہی کم جمع ہوئے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے اتنے دائروں میں انتہائی بلند مقام حاصل کیا جن کا حصر مشکل ہے اور اُن میں سے کسی ایک دائرے میں ویسی بلندی حاصل کر لینا بڑے سے بڑے انسان کے لیے بھی دائمی فخر کا سامان ہو سکتا ہے۔ علم و فضل، حقایقِ دین، فلسفہ و حکمت، شعر و ادب، تصنیف و تالیف، تقریر و خطابت، اخبار نویسی و صحیفہ نگاری، سیاست و ملک داری غرض کون سا دائرہ اور کون سا حلقہ ہے جس میں ان کی یگانگی ابتدا ہی سے سب کے نزدیک ثابت و مسلّم نہ تھی۔ عربی، فارسی، انگریزی اور اُردو میں علوم کا شاید ہی کوئی قابلِ توجہ مطبوعہ یا مخطوطہ و کم یاب ذخیرہ ہو، جو اُن کی نظر سے نہ گزر چکا ہو اور اس ذخیرے کی ہر مستحقِ اعتنا شے اُن کے گنجینۂ حفظ و ضبط میں محفوظ نہ تھی۔ لوگوں نے مختلف کتابیں پڑھیں اور اُن کے وہ مطالب ذہن میں بٹھائے جو اُنھیں پسند آئے۔ مولانا کے حافظے میں نہ محض تمام مطالب ہی محفوظ تھے بلکہ مشہور مصنفوں کے اسلوب پر بھی حد درجہ گہری نظر تھی۔ جب اس موضوع پر گفتگو کرتے تو ایسے حقایق بیان فرماتے جو اس فن میں درجۂ اختصاص حاصل کرنے والوں کی زبان سے بھی بہت کم سنے گئے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جن لوگوں کو علم و نظر میں تاجداری و سُلطانی کا مرتبہ مل جاتا ہے وہ عمل اور عزیمت کے میدان میں کم تر ہی کوئی ممتاز



کہیں قرآن کی کسی تاریخی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے سائینٹفک طریقۂ استدلال کی ضرورت ہوتی ہے وہاں تحقیق و تدقیق اور بحث و نظر کا حق ادا کر دیتے ہیں۔ چناں چہ قرآن میں ذوالقرنین نامی جس شخصیت کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں کافی اختلاف ہے کہ یہ کون شخص تھا؟ اکثر مفسرین کا رجحان یہ ہے کہ ذوالقرنین سے مراد سکندر مقدونی ہے۔ لیکن مولانا نے ان تمام آرا کے برخلاف بڑی تحقیق اور کاوش کے بعد آثارِ قدیمہ انکشافاتِ جدیدہ اور پھر خود قرآن کے بیان کی روشنی میں یہ ثابت کیا ہے کہ اس سے مراد ایران کا عظیم المرتبت بادشاہ کیخسرو ہے۔ مولانا نے اس بحث میں ایک بلند پایہ مؤرخ کا رول ادا کیا ہے۔ اسی طرح خدا کی ذات و صفات پر سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں جو کلام کیا ہے وہ جس طرح انسانی فطرت و وجدان کو اپیل کرتا ہے فلسفہ کے طلبا اور علما کو بھی متاثر کرتا ہے۔ مولانا قرآن کی اصل فطریت اور سادگی اور اس کی وجدانیت کے ساتھ فلسفے و سائنس کا پیوند اس خوش اسلوبی کے ساتھ لگاتے ہیں کہ وضعیت کا رنگ غالب نہیں ہونے پاتا اور وجدان کی بیداری کے ساتھ عقل کی تسکین کا بھی سامان ہوتا رہتا ہے۔

—— سعید احمد اکبر آبادی

تذکرہ

تذکرہ دو جلدوں میں لکھا جانے والا تھا۔ مرزا فضل الدین کی اصل متن کی قطع برید اور طویل حاشیوں کی کاٹ چھانٹ بھی اس کو مختصر نہ کر سکی۔ لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ دوسری جلد کا شائع ہونا بہت بعید ہے تو انھوں نے خود نوشت سوانح عمری کا مقالہ پہلی جلد کے ضمیمہ کے طور پر شامل کر دیا۔ کوئی کتاب مشکل ناشر کی خواہش کے اس قدر خلاف ہو سکتی ہے جتنا تذکرہ ہے اور ایسا بھی شاذ ہی ممکن ہے کہ کوئی مصنف جس نے اپنے تخیل اور قلم کو آزاد رکھا ہو اور ترتیب اور تعلیل استدلال کا لحاظ چھوڑ دیا ہو۔ اس طرح ناشر کے دام میں آ گیا ہو کہ وہ مسودہ پر نظر ثانی نہ کر سکے۔ حوالوں کی جانچ نہ کر سکے۔ اور پروف بھی نہ پڑھ سکے۔ جب دو ثلث کتاب چھپ گئی تو مولانا کو اطلاع کی گئی کہ کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے بے اعتنائی سے کہا "لوگوں نے اپنی دل جمعی اور فراغِ خاطر کی یادگاریں چھوڑی ہیں۔ اپنی پریشان خاطری اور پراگندگیٔ طبع کی بھی ایک یادگار رہے تو بہتر ہے۔" یہ غیر محدود آمدی ہے جس نے تذکرہ کو اشتعال کا ایسا موثر بیان اور مذہبی اور اخلاقی مسائل کا اس قدر پُرجوش مذاکرہ بنا دیا ہے اور یہ اسی سبب سے ہے کہ اس سے مولانا آزاد کی شخصیت واقعی طور پر اس قدر منعکس ہوتی ہے کہ کسی صحیح سے صحیح سوانح عمری سے بھی ظاہر نہیں ہو سکتی۔ تذکرہ واقعی موضوع نہیں ہے وہ حمایتِ حق ہے جس کی تکمیل کے لیے متبحر علم و فضل اور الفاظ پر پُر زور اقتدار اور غیر معمولی قدرت کے طرز بیان سے کارفرمائی کی گئی ہے۔ مولانا آزاد اس سے بھی واقف ہیں کہ کن بیانات کی کمی کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ وہ بالارادہ ہیں۔ اور ان کا مقصد ان کے موضوع کی زیادہ موثر وضاحت ہے۔ اُن کو اس کا بھی یقین ہوگا کہ بیانات میں جو غلو انھوں نے اپنے ذوق سے کیا ہے وہ اک دل آویزی ہے اور ناظرین کو مسحور کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔

تذکرہ کہاں سے شروع ہوتا ہے؟ ابتدا میں یہاں مولانا آزاد اپنے خاندان کا مختصر ذکر کرتے ہیں اور اس استدلال پر ختم کرتے ہیں کہ خاندان سے آدمی نہیں بنتا۔ اور آخر میں تتمہ میں وہ اپنی سوانح عمری لکھتے ہیں۔ فی الحقیقت تذکرہ کو کما حقہ سمجھنا ممکن نہیں جب تک کہ اس کو اختتام سے شروع نہ کیا جائے۔ اس سے نہ صرف ان کا اندازِ فکر واضح ہوگا بلکہ ان کا زورِ بیان، روانی، ان کی اشاریت ان کی اُردو زبان کے زمین و آسمان کی خداوندی بھی۔ وہ صرف ادبی اکتساب ہی نہیں ہے بلکہ وہ روحانی قوت ہے اور اس تجلی کا نتیجہ ہے جو اس دُنیا کی روشنی سے نہیں ہے۔ تذکرہ عمیق روحانی کیفیتِ مزاج کی تخلیق ہے اور اسی کیفیتِ مزاج کے اثر میں پڑھا جانا چاہیے۔

—— پروفیسر محمد مجیب

اُردو اکادمی کی زیرِ طبع کتابیں

۱۔ آثار الصنادید — مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم
۲۔ مصنفین و شعراء کی ڈائرکٹری — مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، جناب عبداللطیف اعظمی
۳۔ انتخاب مضامین مرزا فرحت اللہ بیگ — مرتبہ ڈاکٹر اسلم پرویز
۴۔ نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس — مرتبہ سید شریف الحسن نقوی
۵۔ ڈاکٹر ذاکر حسین حیات اور کارنامے — مرتبہ ڈاکٹر کامل قریشی
۶۔ اردو شاعری میں ہندی اصناف — مرتبہ پروفیسر گوپی چند نارنگ
۷۔ اردو مرثیہ — مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی
۸۔ واقعات دارالحکومت دہلی (جلد اول، دوم اور سوم) — مصنف مولوی بشیر الدین احمد
۹۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو افسانہ — مرتبہ پروفیسر قمر رئیس
۱۰۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل — مرتبہ پروفیسر عنوان چشتی
۱۱۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو نظم — مرتبہ ڈاکٹر عتیق اللہ
۱۲۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تحقیق — مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی
۱۳۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو تنقید — مرتبہ ڈاکٹر شارب ردولوی
۱۴۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو ڈرامہ — مرتبہ جناب جوتی سروپ ترا
۱۵۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو خاکہ — مرتبہ پروفیسر سید حسنی
۱۶۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو انشائیہ — مرتبہ ڈاکٹر نصیر احمد خاں
۱۷۔ آزادی کے بعد دہلی میں اردو طنز و مزاح — مرتبہ پروفیسر ... حسنی



ہی ہستی کے نام یعنی صدر یار جنگ مکتوب ایہ ہیں۔ جناب نے گرمیٔ تحریر لکھے مولانا کے بیشتر خطوط جن پر "غبار خاطر" مشتمل ہے، قلعہ احمد نگر کی نظر بندی کے زمانے کے لکھے ہوئے ہیں۔ یہ بھی ایک بڑا نکتہ ہے۔ یہ خطوط مکتوب الیہ تک پہنچتے نہیں تھے لیکن مولانا کے دل کی تسلی ہو جاتی تھی۔ گویا ان کی نوعیت میگھ دوت سے ملتی ہے جہاں ایک گندھرپ بادلوں سے مخاطب ہوکر اپنے دل کے جذبات بیان کر رہا ہے۔

——— گوپی ناتھ امن

انڈیا وِنس فریڈم

مولانا ابوالکلام آزاد کی اس کتاب میں جتنی باتیں لکھی ہیں ان میں سے بیشتر پہلے بھی کچھ لوگوں نے کہی تھیں، لیکن ان کی کوئی اہمیت نہ تھی اور مستقبل کا مورخ غالباً اُن کو نظرانداز کرتا۔ لیکن مولانا مرحوم نے جو باتیں قلم بند کی ہیں اور اُن کے بیانات دستاویزی حیثیت رکھتے ہیں اس لیے بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب سے تیس چالیس سال بعد جب سرکاری ریکارڈ ریسرچ کے لیے کھولے جائیں گے تو مولانا کی یہ کتاب محققین کو تحقیق کی نئی راہیں دکھلائے گی اور یہی اُن کی کتاب کا بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔

——— عتیق صدیقی

ترجمانُ القرآن

مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو ادب کے چمن میں حسن انشا دبیان کے جو پھول کھلائے ہیں، یوں تو وہ سب ہی سدا بہار ہیں۔ لیکن مستقل تصنیف کی حیثیت سے قرآن مجید کی تفسیر "ترجمان القرآن" مولانا کی تمام علمی وادبی تحریروں میں شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ قلم کی توانائی، اجتہادِ فکر، وسعت نظر و مطالعہ اور جذبہ تحقیق و تدقیق۔ مولانا کی یہ وہ خصوصیات ہیں جو اُن کی ہر علمی اور ادبی تحریر میں نظر آتی ہیں لیکن مولانا کی یہ خصوصیات اس کتاب میں جا بجا نمایاں ہیں اور اسی بنا پر اُردو زبان کے علمی ذخیرے میں اس کو امتیازی مقام حاصل ہے۔

عربی، فارسی اور اُردو میں سینکڑوں تفسیریں لکھی جا چکی ہیں لیکن ان کا عام رنگ یہ ہے کہ ایک آیت کی تشریح و توضیح میں یا اس سے مستخرج احکام کے بارے میں متقدمین مفسرین کے جو مختلف اقوال منقول ہیں اُن سب کو نقل کرتے چلے جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان اقوال میں سے ہر ایک کی دلیل بھی بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ارباب علم ان سے استفادہ کریں تو کریں لیکن عام لوگوں کا دماغ ان میں اُلجھ کر رہ جاتا ہے۔ اور قرآن کا جو مقصد ہے یعنی کسی حقیقت کو ذہن نشین کر کے اس کا یقین پیدا کر دینا وہ حاصل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ہر مفسر کوشش کرتا ہے کہ وہ فقہ یا علم الکلام کے جس مسلک سے تعلق رکھتا ہے اس کو قرآن کی آیات سے ثابت کرے اور دوسرے مسلک کے لوگوں کی تردید میں ان سے استدلال کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کی تفسیر میں تاویل و توجیہہ کا ایک ایسا باب کُھل جاتا ہے کہ قرآن کی عمومیت، اس کی جامعیت اور اس کی بے قید و بند تعلیمات محدود ہو کر رہ جاتی ہیں اور قرآن فقہی اور کلامی بحثوں کا میدان بن جاتا ہے۔ مولانا نے اس عام روش کے خلاف بالکل ایک نیا طریقہ اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے جو قرآن کی عمومیت کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ مولانا عربی زبان اور اس کے اسالیب بیان، صحابہ کرام کے اقوال اور قدما مفسرین کی تشریحات و توضیحات کی روشنی میں کامل غور و خوض کے بعد قرآن کی آیت کا ایک مطلب معیّن کر لیتے ہیں اور اس کو کمال قوت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن میں اضطراب و تشویش کی کوئی کیفیت پیدا نہیں ہوتی اور قرآن کے حقائق و مطالب دل میں اُترتے چلے جاتے ہیں۔

عام تفسیروں کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں بقول مولانا کے "وضعیت" پائی جاتی ہے۔ اس سے مُراد یہ ہے کہ زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ جو علوم و فنون پیدا ہوتے رہے اور عام انسانی افکار و خیالات پر اُن کی گرفت مضبوط ہوتی رہی۔ قُرآن کی تفسیر میں بھی اس کے اثرات نمایاں ہوتے رہے۔ چناں چہ امام فخرالدین رازی کی مشہور تفسیر کبیر کی نسبت کہنا پڑا کہ اس میں منطق، فلسفہ و حکمت، علم الکلام وغیرہ سب کچھ ہے مگر قرآن نہیں ہے، ہمارے زمانے میں اس کی سب سے بڑی مثال مصر کے علامہ جوہر طنطاوی کی ضخیم تفسیر "جواہرالقرآن" ہے جس نے قرآن کو سائنس کے علوم و فنون کا ایک ذخیرہ بنا دیا ہے۔ ظاہر ہے یہ وضعیت یا صناعیت قرآن کی اس سادگی اور فطریت کے بالکل خلاف ہے جو اس کی ہر ہر آیت میں نمایاں ہے۔ قرآن اگرچہ عقل کو نظرانداز نہیں کرتا لیکن اس کا عام طریقہ استدلال وجدانی ہوتا ہے جس کو ہر شخص خواہ عالم ہو یا جاہل محسوس کرتا ہے اور اسی وجدانیت کے ذریعے ہدایت اور اصلاح کا مقصد حاصل ہو سکتا ہے جس کے لیے دُنیا میں پیغمبر آتے رہے اور جس کے لیے خود قرآن کا نزول ہوا۔ اس سلسلے میں مولانا کا کمال یہ ہے کہ ایک طرف تو اس فطریت اور سادگی کا سر رشتہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جو قرآن کے اسلوبِ بیان کی نمایاں خصوصیت ہے اور دوسری جانب جہاں



○

خلافت کا زمانہ ہے مری چشمِ تصوّر میں
وہ گاندھی جی کا رستہ اور تیری حوصلہ مندی
مجھے اقبال کا آج ایک مصرع یاد آتا ہے
"کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالے کی حنا بندی"

○

تجھے زنداں میں جتنی بار بھی افرنگ نے ڈالا
تو اُتنی بار نکلا کامراں اِس آزمائش سے
تو سونا تھا کہ اس کو ڈالتے ہیں جب کُٹھالی میں
تو کندن بن کے ہی باہر نکلتا ہے وہ آتش سے

○

تجھے مذہب میں دیکھیں ہم کہ دُنیائے سیاست میں
ہر اک ماحول میں ہے جلوہ فرما تیری تابانی
ادھر ہیں معرکوں سے کچھ فزوں قربانیاں تیری
ادھر اک معجزے سے کم نہیں تفسیرِ قرآنی

○

قیامت کے فسادوں میں گھرا جب شہرِ کلکتہ
تو اپنی جاں ہتھیلی پر لیے میداں میں آیا
بچایا ہندوؤں کو بھی مسلمانوں کو بھی تو نے
خدا کی رحمتوں کا تیری تربت پر رہے سایا

○

ہر اک سو جنگ کے بادل گرجتے تھے، برستے تھے
ملی تجھ کو صدارت کانگرس کی اُس زمانے میں
ترے اُس دور کے زرّیں کاموں کا بیاں کیا ہو
متاعِ بے بہا ہیں وہ سیاست کے خزانے میں

○

ہُوا یہ ملک جب آزاد، تیری ہی فراست نے
جو تھے گنتی سے باہر عقدۂ دُشوار، سُلجھائے
ترا ہندوستاں احساں بُھلا سکتا نہیں تیرے
تری قربانیوں سے جس نے اونچے مرتبے پائے

○

جمال الدّین کی خاکِ پاک پر رحمت کا مینہ برسے
کہ جس کے خانداں پر علم بھی نازاں فقیری بھی
لٹائی جس نے دولت بے نیازی کی، تصوّف کی
جُھکی جس کے قدم پر بادشاہی بھی، امیری بھی

○

اِسی معدن نے تجھ سا قیمتی گوہر ہمیں بخشا
اِسی کے فیض سے تجھ سی ملی ایمان کی دولت
اسی نے ہم کو آزادی کی نعمت سے کیا واقف
اسی سے پائی اہلِ شوق نے عرفان کی دولت

○

وہ خیرالدّین جس کو چشمۂ صدق و صفا کہیے
وہ جس پر علم بھی، تحریر بھی، تقریر بھی نازاں
وہ جس کے حسنِ معنی آفرینی کی تجلّی پر
ضیائے ماہ بھی، خورشید کی تنویر بھی نازاں

○

اسی نے ہم کو بخشا ہے گلِ خوش رنگ تجھ ایسا
چمک اُٹّھا ہے جس کے دم سے سارا بوستاں اپنا
اسی نے ہی دیا ہے پیکرِ علم و عمل تجھ سا
کہ جس کی ذات پر نازاں ہے کُل ہندوستاں اپنا



ابوالکلام آزاد

○

ابھی انگریز کو حاصل تھی گاندھی جی کی ہمدردی
وطن میں گونجتا تھا جب ترا نعرہ بغاوت کا
ابھی تھی منزلوں پیچھے سیاست اُس مجاہد کی
جسے ہونا تھا اِک دن ہمنوا تیری سیاست کا

○

رہیں یک جان و دو قالب کی صورت ہندو و مُسلم
نصیحت جو صدی کی ابتدا میں تو نے فرمائی
اِسے سمجھے ہوں یا سمجھے نہ ہوں اہلِ وطن لیکن
حقیقت تھی کہ پھر پھر کر ہمیشہ سامنے آئی

○

اگر تیری نصیحت پر عمل کرتے وطن والے
تو یہ ہندوستاں، تیرا وطن، کچھ اور ہی ہوتا
اگر تیری نوا کچھ اس چمن پر کارگر ہوتی
تو مجھ کو ہے یقیں رنگِ چمن کچھ اور ہی ہوتا

○

ترے افکار کی تعریف ہم کرتے رہے لیکن
حقیقت ہے کہ تیرے درد کو ہم نے نہ پہچانا
جو تیری رُوح میں آباد تھی اِک کرب کی دُنیا
اُسے ہم نے نہ کچھ دیکھا، نہ کچھ سمجھا، نہ کچھ جانا

○

ترا پیغامِ دل لے کر ترا پیغامِ جاں لے کر
لسان الصدق آیا، الہلال و البلاغ آئے
تجلّی سے مگر آنکھیں رکھیں کچھ بند ہی ہم نے
اگرچہ نور برساتے کئی روشن چراغ آئے

○

تری ہستی عبارت تھی روایت سے، درایت سے
نگاہوں میں تری دیروز بھی تھا اور فردا بھی
ترا اِک ہاتھ مستقبل پہ تھا اِک ہاتھ ماضی پر
کہ آئینہ تھا تجھ پر دورِ تازہ بھی، گذشتہ بھی

○

وہ پہلی جنگ کے دوران میں زورِ قلم تیرا
کہ جس سے لرزہ بر اندام تھا ایوانِ سلطانی
وہ تحریریں تری تھیں یا صداقت کی تھیں شمشیریں
نہ ٹھہری رو برو جن کے فرنگی فتنہ سامانی

○

ادھر ڈالا تجھے زنداں میں افرنگی سیاست نے
ادھر تیرے قلم کی نوک پر وہ تذکرہ آیا
جسے اس دور میں تحریر کا اِک معجزہ کہیے
ادب نے بھی، سیاست نے بھی جس سے مرتبہ پایا

جگن ناتھ آزاد
اے-۲۵، گورنمنٹ کوارٹرس، گاندھی نگر، جموں توی
(جموں و کشمیر) ۱۸۰۰۰۴



امیرِ کارواں

وہ دن اب یاد آتے ہیں وطن تھا جب غلام اپنا ۔ کہ جب آزاد قوموں میں نہ تھا کوئی مقام اپنا
تھے دل سینوں میں لیکن ہر لگن سوئی ہوئی سی تھی ۔ چمن تو تھا مگر رُوحِ چمن سوئی ہوئی سی تھی
گلستانِ وطن میں بس خزاں کے ہیرے پھیرے تھے ۔ غلامی ہی غلامی تھی اندھیرے ہی اندھیرے تھے
یہ عالم تھا کہ اک دیوانۂ آزادیٔ کامل ۔ جسے آزاد کہتے ہیں بڑھا وہ جانبِ منزل
جو تھے غفلت میں غرق اُن کو صدا دیتا ہوا اٹھا ۔ کہ وہ غیرت کے شعلوں کو ہوا دیتا ہوا اٹھا
جو تھے جذبات پژمردہ جوانی بخش دی اُن کو ۔ جو تھے ٹھہرے ہوئے دھارے روانی بخش دی اُن کو
خطیب ایسا کہ اندازِ خطابت رشک کرتا تھا ۔ جو سُن لیتا تھا اُس کو دم ہمیشہ اُس کا بھرتا تھا
مسائل کچھ بھی ہوں لیکن زباں جب کھولتا تھا وہ ۔ تو یہ محسوس ہوتا تھا کہ گوہر رولتا تھا وہ
مُدبّر وہ کہ دُنیا میں ہر اک سو دھوم تھی اُس کی ۔ مُفکّر وہ کہ خود فکرِ رسا محکوم تھی اُس کی
قلم اُس نے اُٹھایا جب پئے تشریحِ قرآنی ۔ اُبھر کر آگئے نظروں میں سب انوارِ یزدانی
وطن کے چہرۂ تاباں پہ جب رنگِ جلال آیا ۔ پیامِ انقلابِ قوم لے کر "الہلال" آیا
کہا اُس نے وطن والوں سے اب ہشیار ہو جاؤ ۔ نیا سورج اُبھرنے والا ہے بیدار ہو جاؤ
مگر پیغام اُس کے ساتھ ہی یہ بھی دیا اُس نے ۔ برائے اتحادِ باہمی یوں بھی کہا اُس نے
اگر کوئی فرشتہ آسمانوں سے اُتر آئے ۔ قطب مینار سے پھر وہ اگر اعلان فرمائے
کہ آزادی ابھی دے دوں تمھیں ہندوستاں والو ۔ اگر تم اتحادِ باہمی کو ختم کر ڈالو
تو میں یہ شرط ٹھکرا دوں گا، بربادی نہیں لوں گا ۔ جو کھو کر اتحاد آئے وہ آزادی نہیں لوں گا
کبھی وہ اس طرح گرجا کہ اے عشرت کے متوالو ۔ خدا کے واسطے اب جاگ اٹھو آنکھوں کو مل ڈالو
سفینے قوم کے نذرِ تلاطم کر دیے تم نے ۔ ورق تاریخ کے آخر کہاں گُم کر دیے تم نے
عرب کے ریگ زاروں سے کبھی ایران سے آئے ۔ تمھارے قافلے اس ملک میں کس شان سے آئے
لبوں پر آدمیّت کے ترانے لے کر آئے تھے ۔ وہ اپنے ساتھ اخوّت کے خزانے لے کر آئے تھے
وہ جب ظلمت کدوں کے نام پیغامِ عمل لائے ۔ اُجالے اس طرح اُمڈے کہ جیسے دن نکل آئے
اسی بھارت کی دھرتی پر اسی دہلی کی منزل پر ۔ وضو کرنے رُکے تھے وہ اسی جمنا کے ساحل پر
اسی جمنا کو لیکن چھوڑ کر تم بھاگے جاتے ہو ۔ خود اپنی عظمتوں کو اپنے ہاتھوں سے مٹاتے ہو
تمھیں تو تھے جو طوفانوں کے رُخ کو موڑ دیتے تھے ۔ تمھارے واسطے رستہ سمندر چھوڑ دیتے تھے
وطن آواز دیتا ہے وطن کی شان بن جاؤ ۔ اٹھو اٹھ کر نئی تاریخ کا عنوان بن جاؤ
یہ دُنیا جب بھی چھڑ جائے گا اُس کا ذکر روئے گی ۔ ہزاروں سال اُسے تاریخِ علم و فکر روئے گی

جواہر لال کے لفظوں میں بحرِ بے کراں ہے وہ
جو بھارت کا رواں ہے تو امیرِ کارواں ہے وہ

راہی شہابی
ایف - ۹۲۵، گاندھی نگر، جے پور ۳۰۲۰۱۵ (راجستھان)

نذرِ عقیدت

وائے بر حالِ سیہ بختیِ بھارت اے قوم   تجھ سے وہ مردِ مجاہد ہوا رخصت اے قوم
تھی زمانے کو ابھی جس کی ضرورت اے قوم

وہ مفکّر، وہ مدبّر، وہ امام الاحرار   وہ وسیع النظر و ارفع و اعلیٰ کردار
عمل و عزم میں جس کے تھا ہمالہ کا وقار

عالمِ دیں بھی تھا، دانائے سیاست بھی تھا   قلزمِ دانش و اخلاص و صداقت بھی تھا
مادرِ ہند کی آنکھوں کی بصارت بھی تھا

جو سمجھتا تھا زمانے کی سیاست کا مزاج   جس نے دشمن سے بھی حاصل کیا تحسیں کا خراج
جس کا ہر نقشِ قدم، شمعِ ہدایت ہے آج

جس نے اک جام کے طالب کو بھرا خم بخشا   جس نے ہر قطرۂ ادراک کو قلزم بخشا
جس نے سوئی ہوئی موجوں کو تلاطم بخشا

حیف وہ رندِ خراباتِ تدبّر نہ رہا   حیف وہ گوہرِ دریائے تبحّر نہ رہا
جس نے بخشا نئے بھارت کا تصوّر نہ رہا

اُٹھ گیا بزم سے وہ ساقیِ میخانہ بدوش   جس کی ہر جُنبشِ لب روح کا پیغامِ سروش
جس کے جذبات میں طوفاں کے عزائم کا خروش

نبضِ تہذیب کی رفتار کا محرم نہ رہا   ماضی و حال کی قدروں کا وہ سنگم نہ رہا
دلِ ستاروں کے بجھے، نیّرِ اعظم نہ رہا

وہ تو باقی نہ رہا، اس کی مگر یاد رہے   ہر قدم پیشِ نظر اُسوۂ آزاد رہے
میکدہ اس کی روایات کا آباد رہے

[یہ نظم مولانا ابوالکلام آزاد کے سانحۂ وفات سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی اور پٹنہ ریڈیو سے ۲۷، فروری ۱۹۵۸ء کو نشر کی گئی]

رضا نقوی واہی

۵/۱۰، گردنی باغ، پٹنہ (بہار)

آئینۂ ذات و صفات

مولانا کی منتخب تحریریں



نذرِ عقیدت

فضائے ہند پہ جب اِک خزاں مسلّط تھی
نویدِ عشرتِ فصلِ بہار دی تُو نے
تھی تیرے سینے میں بہبودیِ چمن کی لگن
اِک اِک شگوفے کی قسمت سنوار دی تُو نے

جو راہ منزلِ وہم و گماں کو جاتی تھی
بنا دیا اُسی جادے کو مُعتبر تُو نے
پِرو کے ایک ہی دھاگے میں رنگ رنگ کے پھول
کیا نِفاق کے جذبے کو بے اثر تُو نے

تری زبان کا جادو "غبارِ خاطر" ہے
ترے قلم کا ہے اعجاز "الہلال" ترا
مؤثر ایسا تھا تیرا طریقۂ اظہار
کوئی جواب نہیں تھا تِری خطابت کا

گناہ ٹھہرا تھا جس وقت ذکرِ آزادی
کہی بہ بانگِ دہل تو نے انقلاب کی بات
بڑھائی ملک میں یوں تو نے اتّحاد کی لَو
کہ جس کے خوف سے تھرّا اٹھی غلامی کی رات

مہدی پرتاپ گڑھی

معرفت ایگزیکیٹو انجینئر، اری گیشن ڈویژن، پرتاپ گڑھ (یو۔پی)



زاداللہ شرفاً وکرامۃ۔ محلہ قدوہ متصل باب السلام :

بلاد بها تمت علیٰ تمائمی
و اول ارض مس جلدی ترابها!

اس وقت کہ ۱۳۳۵ھ قریب الاختتام ہے قافلۂ برق رفتارِ عمر منزلِ ثلاثین تک پہنچ چکا :

یقولون هل بعد الثلاثین ملعبًا؟
فقلت : وهل قبل الثلاثین ملعباً؟

قریب ہے کہ چشم زدن میں یہ منزل بھی پیچھے رہ جائے، اور آگے کا حال کچھ معلوم نہیں :

کس نمی گویدم از منزلِ آخر خبرے
صد بیابان بگزشت و دگرے در پیش است

جتنی زندگی گزر چکی ہے، اگر دن موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں، اور جو کچھ سامنے ہے، وہ بھی جلوہ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ قلم درماندہ تذکرہ و نگارش سے عاجز، اور فکر گم گشتہ حیرانِ اظہار و تعبیر۔ اپنی سرگزشت و رُوداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں؟ ایک نمودِ غبار و جلوۂ سراب کی تاریخ حیات قلم بند ہو تو کیوں کر ہو؟ دریا میں حباب تیرتے ہیں۔ ہوا میں غبار اڑتا ہے۔ طوفان نے درخت گرا دیے۔ سیلاب نے عمارتیں بہا دیں۔ عنکبوت نے اپنی پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی، مرغ آشیاں پرست نے کونے کونے سے چن چن کر تنکے جمع کیے۔ خرمن و برق کا معاملہ۔ آتش و خس کا افسانہ، ان سب کی سرگزشتیں لکھی جا سکتی ہیں، تو لکھ لیجیے۔ میری پوری سوانح عمری بھی انہی میں مل جائے گی۔ نصف افسانۂ امید اور نصف ماتمِ یاس!:

عاشق نہ شدی، محنتِ الفت نہ کشیدی
کس پیش تو غم نامۂ ہجراں چہ کشاید

پہلے مجسم امید تھا، اب سرتا سر حسرت ہوں:

مختصر حالِ چشم و دل یہ ہے
اس کو آرام اُس کو خواب نہیں

اس پر بھی اگر داستان سرائی کا شوق ہو تو ان پورے تیس برسوں کی سرگزشت سن لیجیے۔ حکایت برق و خرمن کوئی افسانۂ دراز نہیں جس کے لیے پوری رات آنکھوں میں کاٹنی پڑے۔ صرف ایک نالۂ گرم اور آہِ سرد میں پوری حکایت ختم ہے :

ہمسایہ شنید نالہ ام، گفت
"خاقانی را دگر شب آمد!"

ایک صبحِ امید تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئی :

ہم چو عیدے کہ در ایام بہار آمد و رفت!

ایک شام مایوسی تھی جس کی تاریکی کو امید کا کوئی چراغ روشن نہ کر سکا :

بجھا ہے دل جب سے مجھ حزیں کا، چراغ جلتا نہیں کہیں کا!

یا امید و حسرت کے دو دن، ایک ہوسِ تعمیر میں صرف ہوا، ایک ماتمِ تخریب میں۔ ایک دن تنکے چنتے رہے، دوسرے دن دیکھا، تو راکھ کا ڈھیر تھا۔ جس پر خوب جی بھر کے آنسو بہائے :

دریں چمن کہ بہار و خزاں ہم آغوش است
زمانہ جام بدست و جنازہ بر دوش است!

ابوطالب کلیم نے چار مصرعوں میں پوری سوانح عمری لکھ دی :

بدنامیِ حیات دو روزے نہ بود بیش
آنہم کلیم! با تو چہ گویم، چساں گزشت؟
یک روز صرف بستنِ دل شد باین و آں
روزِ دگر بکندنِ دل زین و آں گزشت؟

اور دراصل اس شعبدہ گاہ ہستی کی بڑی سے بڑی مہلتوں کا بھی یہی حال ہے۔ لَمْ يَلْبَثُوٓا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا اور قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ! کلیم کو معلوم نہ تھا کہ اس سے پہلے یہی مضمون زیادہ ایجاز (و) بلاغت کے ساتھ کہا جا چکا ہے :

ومن یساعدنا الوصال ودهرنا
یومان یوم نوی و یوم صدود!

عہدِ طفلی ایک خوابِ عیش تھا :

حیف صد حیف کہ ما زود خبردار شدیم!

آنکھیں کھلیں تو عہدِ شباب کی صبح ہو چکی تھی، اور خواہشوں اور ولولوں کی شبنم سے خارستانِ ہستی کا ایک ایک کانٹا پھولوں کی طرح شاداب تھا۔ اپنی طرف دیکھا، تو پہلو میں دل کی جگہ سیماب کو پایا۔ دنیا پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا کہ اس صبحِ فریب کے لیے نہ تو سوز و تپش کی دوپہر ہے، نہ ناامیدی و ناکامی کی شام۔ یہ سارا شہرستانِ امید اور نگارخانۂ نظر فریب صرف ایک ہمارے ہی دیدہ و دل کی کام جوئیوں کے لیے بنا ہے، اور گویا گوشہ گوشہ اور ذرہ ذرہ ہماری ہوسناکیوں کے لیے چشم براہ ہے۔ جس طرف کان لگایا، یہی صدا سنائی دی۔ معلوم نہیں اپنی ہی گنبدِ غفلت اور ہنگامۂ ہوس کی گونج تھی، یا نوگرفتارانِ طلسمِ شباب کی ہوش ربائیوں کے لیے خود سازِ ہستی کا نوائے فریب ہی یہی ہے :

شہریست پر ز خوباں، وز ہر طرف نگارے
یاراں صلائے عام ست گر می کنید کارے!

غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، مستی و سرگرانی نے جام بھرے، جنونِ شباب نے ہاتھ پکڑا، اور ولولوں اور ہوسوں نے جو راہ دکھلائی، دل کی خود فروشیوں نے اسی کو منزلِ مقصود سمجھا۔ ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی، لیکن پھر اُس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا، راہ ہے تو یہی راہ ہے اور وقت ہے تو اسی کا :

ساقیا! مرنج از من، عالم جوانی ماست!

جس طرف نظر اٹھائی، ایک صنم آبادِ الفت و



مولانا کے خود نوشت سوانحی اشارے

("تذکرہ" کا ایک باب)

گفتی کہ چرا حالِ دلِ زار نہ گوئی؟
من خود کنم آغاز، بہ پایاں کہ رساند؟

ان اوراقِ پریشاں کی تالیف کا باعث ایک دوستِ عزیز کا اصرار تھا۔ اب وہ مُصر ہیں کہ خود اپنے حالات بھی قلم بند کروں۔ اس تمام داستان سرائی کے اہتمام سے ان کا اصلی مقصد یہی تھا۔ ہرچند معذرت کی مگر مسموع نہ ہوئی۔ ناچار تعمیلِ فرمائش کے لیے مستعد ہونا پڑا۔ کئی سو صفحے روشن دلانِ سلف کے تذکرۂ آثار و مناقب سے نورانی ہو چکے ہیں۔ اب دو چار صفحے اپنی سیہ رویوں اور سیہ بختیوں کے سوادِ تحریر سے بھی سیاہ کرتا ہوں کہ تعرف الاشیاء باضدادھا!

درمجلسِ وصالش خُمہا کشیدہ مرداں
چوں دورِ خسرو آمد، مے در سبو نماندہ

یہ غریب الدیارِ عہد و ناآشنائے عصر و بیگانۂ خویش و نمک پروردۂ ریش، معمورۂ تمنا و خرابۂ حسرت کہ موسوم بہ احمد و مدعو بابی الکلام ہے۔ ۱۸۸۸ء مطابق ذوالحجہ ۱۳۰۵ھ میں ہستیٔ عدم سے اس عدم ہستی نما میں وارد ہوا، اور تہمتِ حیات سے متہم۔ الناس نیام، اذا ماتوا انتبھوا۔

شورے شد و از خوابِ عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی است شبِ فتنہ، غنودیم

والدِ مرحوم نے تاریخی نام "فیروز بخت" رکھا تھا، اور مصرعۂ ذیل سے ہجری سال کا استخراج کیا تھا:

"جواں بخت و جواں طالع، جواں باد!"

سبحان اللہ، بخت کی فیروزی و طالع کی ارجمندی! نیمۂ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی و درماندگی میں بسر ہو چکی۔ نیمۂ عمر جو شاید باقی ہے، دم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزلِ مقصود کا پتہ ہے، نہ شاہراہِ منزل پر قدم۔ جب پاؤں میں تیزی اور ہمت میں جوانی تھی، تو رہ نوردی و منزل طلبی کا دروازہ کھلا۔ اب پامالیوں اور افتادگیوں سے نہ قدم میں پامردی رہی نہ ہمت میں کارفرمائی، تو طلب نے آنکھیں کھولیں اور غفلت نے کروٹ لی۔ راہ دُور اور نشانِ منزل گم، کیسۂ زاد خالی اور سر و سامانِ کار ناپید۔ وقت جا چکا، اور ہر آن و ہر لمحہ کاروانِ مقصود سے دوری اور منزلِ مراد سے مہجوری بڑھتی گئی۔ اب قدم کی تیزی اور ہمت کی چستی واپس بھی مل جائے، پھر بھی وہ دولتِ وقت کب واپس مل سکتی ہے، جو لُٹ چکی۔ اور وہ قافلۂ امید کب پس ماندگانِ غفلت کی خاطر لوٹ سکتا ہے جو جا چکا!:

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد!

ساری فیروز بختی و جواں طالعی کا معاملہ آج نہیں کل فیصل ہونے والا ہے یَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَ تَسْوَدُّ وُجُوهٌ۔ اصلی فیروزمندی وہاں کی فیروزمندی ہے، اور جواں بخت وہی ہے جو اس آنے والے دن کی آزمائش میں پورا اترے۔ لِكُلِّ امْرِئٍ مِنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ! اگر وہاں رَوْحٌ وَ رَيْحَانٌ وَ جَنَّتُ نَعِيمٍ اور فَوْزٌ عَظِيمٌ کی فیروزی و کامرانی ہاتھ آئی، تو پھر بخت بختِ ارجمند ہے اور طالع طالعِ بلند۔ لیکن اگر وُجُوهٌ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اور لَا بُشْرَىٰ يَوْمَئِذٍ لِلْمُجْرِمِينَ کی رسوائی و مایوسی ملی، تو پھر نہ اس حرماں نصیبی کے لیے کبھی امید ہے، نہ اس ماتمِ حسرت کے لیے کبھی خاتمہ۔ بختِ اسکندری و تختِ جمشیدی بھی ہاتھ آئے، تو لے کر کیا کیجیے!:

گر بدانم کہ وصالِ تو بدیں دست دہد
دل و دیں را ہمہ در بازم و توقیر کنم!

آبائی وطن دہلی مرحوم ہے:

سلام علی نجد و من حل بالنجد

مگر وطنِ مادری سرزمینِ مطہر طیبہ و دار الہجرت سید الکونین و شہرستانِ نبوت و وحی ہے، قبلۂ عبادت گزارانِ عشق، و کعبۂ نیاز مندانِ شوق۔ علی صاحبہا الصلوٰۃ والتحیہ:

دارم دلے گرداں، کہ من قبلہ نمامی خوانمش
رُو سُوئے ابرویش کند، ہرچند می گردانمش

اور وطنِ حقیقی کی نسبت کیا کہیے کہ بحکم کن فی الدنیا کأنك غریب ہم سب غربت سرائے ارضی کے آوارہ و مسافر۔ تمام مسافرانِ ہستی ایک ہی قافلۂ غربت کے رہ سپار۔ سب کو ایک ہی مستقر و موطن درپیش۔ البتہ کسی کے لیے سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَ مُقَامًا میں داخل، اور کسی خوش نصیب کے لیے حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَ مُقَامًا:

ابرح ما یکون الشوق یوما
اذا دنت الخیام من الخیام

مولد و منشاءِ طفولیت وادی غیر ذی زرع عند بیت اللہ المحرم ہے۔ یعنی مکۂ معظمہ



به دور گردی من از غرور می خندد
حریفِ سخت کمانے کہ در کمیں دارم

ناگہاں جاذبۂ توفیقِ الٰہی پردۂ عشقِ مجاز میں نمودار ہوا۔ اور ہوس پرستیوں کی آوارگیوں نے خودبخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ آگ لگتی ہے تو رفتہ رفتہ شعلے بھڑکتے ہیں۔ سیلاب آتا ہے، تو بتدریج پھیلتا ہے۔ یہ تو ایک بجلی تھی جو آناً فاناً نمودار ہوئی، چمکی اور دیکھا تو خاک کا ڈھیر تھا:

می گزشتم زغم آسودہ کہ ناگہ زکمیں
عالم آشوب نگاہے سرِ راہم بگرفت

اصل میں منزلیں تین ہی ہیں۔ ہوس، عشق، حقیقت:

حاصلِ عمرم سہ سخن بیش نیست
خام بُدم، پختہ شدم، سوختم

اور یہاں عشق سے مراد عشقِ محدود و ناقص یعنی مجاز ہے، نہ کہ علی الاطلاق، کیونکہ اس اعتبار سے تو اوّل و آخر جو کچھ ہوا ہے، عشق ہی ہے۔ تمام کائناتِ ہستی میں بجز اس کے ہے اور کون؟ آسمانوں کا ستون ہے، تو یہی ہے، زمین کا مدار و محور قائم ہے، تو اسی کے دم سے۔ دنیا میں جس قدر ظاہر ہے یہی ہے، جس قدر باطن ہے، اس کے سوا کچھ نہیں۔ یہ دوسری بات ہے، کہ ہماری نگاہِ وحدت ناآشنا نے ایک ہی حقیقت کو طرح طرح کے ناموں سے موسوم کر دیا ہو۔ کہتے ہی پردے ہیں، جو اسی کج نظری و کثرت بینی نے جمالِ حقیقتِ یگانہ و یک رنگ پر ڈال رکھے ہیں، ورنہ:

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں
ہر کجا می نگری، انجمنے ساختہ اند

بلاشبہ یہ بھی لغزش تھی۔ لیکن اس لغزش کو کیا کہوگے، جو محبوب کے قدموں پر گرا دے؟ مقصود تو ساری باتوں سے اس تک پہنچنا ہے۔ اگر لغزش و مستی ہی رہ نما بن جائے، تو پھر کیوں نہ ہزار استقامتیں اس پر قربان ہوں! لاکھوں ہشیاریاں اس پر نچھاور:

گر طمع خواہد زمن سلطانِ دیں
خاک بر فرقِ قناعت بعد ازیں!

اصل یہ ہے کہ اس راہ کی کامیابی کا سارا دار و مدار قطع و وصل اور شکستگی و پیوستگی پر ہے، اور قرب ایک منزل ہے جس تک پہنچنے کی راہ بُعد ہی میں سے ہو کر نکلی ہے۔ یعنی ایک سے ملنے کے لیے سب کو چھوڑنا اور ایک سے جُڑنے کے لیے سب سے کٹنا۔ اس دروازہ کا کھلنا اس پر موقوف ہے کہ وہ تمام دروازے بند کر دیے جائیں جو پہلے کھول لیے گئے تھے:

در قبولِ نظرِ عشق ہزاراں شرط ست
اول از عافیتِ رفتہ ندامت باشد

انسان کی محبوبات و مالوفات کے اٹکاؤ ایک نہیں بیشمار ہیں۔ اس کی گردن (میں) الفتوں کی طوق کا بوجھ ہے۔ اس کے پاؤں علائق کی زنجیروں سے گراں بار، اس کا دل چاروں طرف سے صدہا قسم کی کششوں کا نشانہ، ہر زنجیر کے بندھن پر مرتا اور ہر علاقہ کی الفت میں اسیر رہنا چاہتا ہے:

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا۔ تو اب اصلی کام یہ ہوا کہ یہ ساری بندشیں کٹیں اور پرستشِ ماسوی اللہ کی ساری زنجیریں ٹوٹیں۔ اس کے لیے صرف دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو ایسا کوئی طاقتور ہاتھ آمادۂ عقیدہ کشائی ہو کہ گن گن (کر) ایک ایک گرہ کھول دے۔ ایک کے بعد ایک ساری زنجیریں کھلتی جائیں۔ یا پھر ایک تلوار چمکے، جس کا ایک ہی بھرپور ہاتھ چشم زدن میں ساری بندشوں اور زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دے۔ نہ ناخنِ گرہ کشا کی منّت پذیری، نہ زنجیروں کی حلقہ شماری کی انتظاری۔ ایک سوکھی لکڑی کے جلانے کے لیے ہزاروں تدبیریں کیجیے جب کہیں آگ سے دھواں اٹھے۔ لیکن معلوم ہے کہ ہزاروں آشیانوں اور خرمنوں کے لیے بجلی کی ایک ہی نظرِ شعلہ بار کافی ہوتی ہے:

گفتم چگونہ می کُشی و زندہ می کنی
از یک نگاہ کُشت، جوابے دگر نداد

قطعِ علائق اور دفعِ موانع کی جتنی راہیں سعی و ہمت اور طلب و جستجو سے پیدا کی جاتی ہیں، سب پہلی صورت میں داخل ہیں۔ اور دوسری صورت جذب و عشق کی ہے۔ یہ قوت فرشتۂ عشق کے سوا اور کسی کے ہاتھ میں نہیں کہ ہزاروں نشتروں کا کام ایک ہی وار میں پورا کر دے:

دمِ شمشیر بود رہگزرِ عشق، ولے
ہر کہ ایں رہ نہ رود، پے بدرِ دل نہ برد

اسی لیے عرفائے طریق نے کہا: عشق کی بری سے بری گرفتاری بھی بیدردی و بےسوزی کی آزادی سے ہزار درجہ بہتر ہے، اور اس راہ کی ناکامی بھی کم از فتح و فیروز مندی نہیں:

رہ رواں راخستگی راہ نیست
عشق ہم راہ ست وہم خود منزل ست

گو اس کی گرفتاری بھی گرفتاری اور اٹکاؤ بھی اٹکاؤ ہے، لیکن بہرحال یہی نفع کتنا بڑا نفع ہے۔ اس کی بدولت کام بہت آسان و مختصر ہو جاتا ہے اور آنے والی منزل کے سارے کاموں کی مشق پہلے ہی سے ہو جاتی ہے۔ پہلے سوز زنجیروں کو توڑتا تھا،



پرستش نظر آیا، جس میں مندروں اور موتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر مندر جبینِ نیاز کا طالب، ہر مورتی دل فروشی و جاں سپاری کے لیے وبالِ ہوش۔ ہر جلوہ برقِ تمکین و اختیار۔ ہر نگاہ بلائے صبر و قرار:

الفراق اے صبر و تمکیں! الوداع اے عقل و دیں

جس راہ میں قدم اٹھایا، زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا۔ جس گوشے میں پناہ لی وہی زندانِ ہوش و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو، تو ذکر کیجیے۔ ایک زنجیر ہو، تو اس کی کڑیاں گنیے۔ دل ایک تھا، مگر تیر ہزاروں ہاتھوں میں تھے۔ نظر ایک تھی، مگر جلووں سے تمام عالم معمور تھا۔ ہر کشش نے اپنا تیر چلایا۔ ہر رہزن نے اپنی کمند پھینکی۔ ہر فسوں ساز نے اپنا افسونِ محبت پھونکا۔ ہر جلوۂ ہوش ربا نے صرف اپنے ہی دامِ الفت میں اسیر اور اپنی ہی فتراکِ اسیری کا نخچیر رکھنا چاہا:

وائے بر صیدے کہ یک باشد و صیادے چند!

یہ بات نہ تھی کہ امتیاز نے بالکل ساتھ چھوڑ دیا ہو اور دیدۂ اعتبار یک لخت کور ہو۔ برق نے بارہا چشمک کی، ستاروں نے بھی کبھی کبھی پردۂ شب کی اوٹ سے جھانکا، لیکن رات کی تاریکی اور طوفان کی تیرگی ایسی نہ تھی جو ان چنگاریوں سے روشن ہو جاتی۔ وہ برابر بڑھتی ہی گئی:

فرصتِ رفتہ و حسرتِ فشردہ پائے
کار از دوا گزشتہ و افسوں نہ کردہ کس

کبھی سرو کی بلند قامتی پر رشک آیا، تو سر بلندی و سرفرازی کے لیے دل خون ہوا۔ کبھی سبزۂ پامالی کی خاکساری و افتادگی پر نظر پڑ گئی، تو اپنے پندار و خود پرستی پر شرم آئی۔ کبھی بادِ صبا کی روش پسند آئی، تو اقامت گزینی سے وحشت ہوئی۔ آوارگی و رہ نوردی کی دل میں ہوا سمائی۔ کبھی آبِ رواں کی بے قیدی و بے تعینی اس طرح جی کو بھائی کہ پابندیوں اور گرفتاریوں پر آنکھوں نے آنسوؤں اور دل نے زخموں کے ساتھ ماتم کیا۔ پھولوں کو جب کبھی مسکراتے دیکھا، تو اپنی آنکھوں نے بھی رونے میں کمی نہ کی؛ اور درختوں کو جب کبھی جنبش ہوئی، شاخوں نے جھوم جھوم کر وجد کیا، تو اپنی سنگینی و بے حسی بھی ضرور یاد آ گئی۔ غرض کہ نہ تو اسباب میں کمی تھی اور نہ استعداد بالکل مفقود تھی۔ بجلیاں کوندتی رہیں۔ بادل گرجتے رہے لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا انتظار کر رہی تھی:

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی ورنہ سدا
درِ قبول تو اس آرزو میں باز رہا!

بہتر یہ ہے کہ صاف صاف ہی کہہ دیا جائے:

ہاں! بانگِ بلند ست ایں، پوشیدہ نمی گویم!

گمراہیِ عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہیِ اعتقاد کی الحاد۔ سو فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامۂ اعمال خالی رہا ہو، اور فسق خود بھی ایک کامل قسم کا عملی الحاد ہے:

چو پرسش گنہم روزِ حشر خواہد شد
تمسکاتِ گناہانِ خلق پارہ کنند!

قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے، بہتر ہے کہ خود آپ ہی اپنے لیے شاہد بن جائیں: اِقْرَاْ کِتَابَکَ کَفٰی بِنَفْسِکَ الْیَوْمَ عَلَیْکَ حَسِیْبًا۔ اور ہم شہادت دیں یا نہ دیں، خود ہمارا وجود ہی سرتاپا شہادت ہے۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ وَّلَوْ اَلْقٰی مَعَاذِیْرَہٗ۔ ہاتھ پاؤں کی شہادت پر تعجب کیوں ہو! جب اس دنیا ہی میں دیکھ رہے ہیں کہ اس کا ہر لمحہ یوم الاشہاد کا حکم رکھتا ہے، اور خود ہمارا قرینِ بغل ہی دم بدم شہادت دے رہا ہے: لَآ اُقْسِمُ بِیَوْمِ الْقِیٰمَۃِ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَۃِ۔ البتہ ساری ہلاکت اس میں ہے کہ ہنگامۂ غفلت و خود فراموشی میں نفسِ لوّامہ کی صدائے شہادت بہت کم کانوں تک پہنچتی ہے۔ اور پہنچتی ہے، تو خود ہمارے ہی ہاتھ سرشاری و بدمستی کے نقّاروں پر اس زور سے پڑ رہے ہیں کہ ان کے شور و غل میں یہ سرگوشیِ ملامت کب کام دے سکتی ہے! اِلّا یہ کہ صَیْحَۃً وَّاحِدَۃً فَاِذَا ھُمْ خَامِدُوْنَ! کی گھڑی سر پر آ جائے:

گوشت از بارِ در گراں شدہ است
نشنوی نالہ و فغانِ مرا!

لیکن دنیا کی ساری سچائیوں اور یقینیوں سے بڑھ کر یہ حقیقت ہے کہ:

کارسازِ ما بفکرِ کارِ ما
فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما!

اور اس راہ کی نیرنگیوں کا کچھ عجب حال ہے:

کہ علم بے خبر افتاد و عقل بے حس شد!

ہر چند راہ ایک ہی ہے، لیکن کرشمے بے شمار ہیں۔ اور گو ہوش سب کھوتے ہیں مگر ایک ہی جلوے سے نہیں:

اے ترا با ہر دلے رازے دگر!
ہر گدا را بر درت نازے دگر!

کوئی پکارتا ہے اور دروازہ نہیں کھلتا۔ کوئی بھاگتا ہے اور اس پر کمند پھینکے جاتے ہیں۔ قانونِ طلب و سعی سے انکار نہیں، لیکن اگر وہ بے طلب دینا چاہے، تو اس کا ہاتھ پکڑنے والا کون ہے؟ "ان لربکم فی ایام دھرکم نفحات۔ الا فتعرضوا لھا۔"

کارِ زلفِ تست مشک افشانی، اما عاشقاں
مصلحت را تہمتے بر آہوئے چیں بستہ اند!

غرض کہ اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا۔ لیکن ادھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ دوسرا ہی ہو چکا تھا:



بے قیدی و بے وضعی کی آزادی ہے، اس میں ضبط و احتیاط کی پابندی:

اے وضعِ احتیاط! یہ فصلِ بہار ہے
گلبانگِ شوقِ زمزمہ سنجِ فغاں نہ ہو

اور معلوم ہے کہ شعلوں کی طرح بھڑکنا آسان ہے مگر تنور کی طرح اندر ہی اندر سُلگنا اور حفظ و ضبط کے سارے آداب و شرائط سے عہدہ برآ ہونا مشکل ہے:

عریاں تنی خوش ست، ولے زیب دیگر ست
دامانِ چاک و گریباں دریدہ را

اگر یہ سچ ہے تو پھر نہ مجنوں کی دشت پیمائیوں پر رشک آتا ہے، نہ فرہاد کی شورش و کوہ کنی پر! اگر کسی نے عمر بھر دشت و صحرا میں نالہ و زاری کی ہو، تو کی ہو۔ یہاں ایک ایک گھڑی، ایک ایک لمحہ ایسا گزر چکا ہے کہ سینکڑوں آہیں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئی ہیں ہزاروں شورشیں سینہ کے اندر ہی اندر جلی ہیں۔ آنسوؤں کو آنکھوں کی وسعت نہ ملی، تو دل کے گوشے ہی میں طوفان اٹھاتے رہے:

انداز جنوں کون سا ہم میں نہیں، مجنوں
پر تیری طرح عشق کو رسوا نہیں کرتے

اگرچہ اس معاملہ کا خاتمہ بظاہر ناکامی و مایوسی پر ہوا، لیکن فی الحقیقت فتح و مراد کی ساری شادمانی اسی ناکامی میں پوشیدہ تھی۔ اسی ناکامی نے بالآخر کامیابی کی راہ کھولی۔ اسی مایوسی سے امید کا دروازہ کھلا۔ جو تاریکی اپنی سیہ بختیوں کی رات نظر آتی تھی، وہی صبحِ مقصود کے طلعتِ جہاں تاب کا نقاب ثابت ہوئی۔ گو قدم بُت کدہ کی راہ پر تھے، مگر غبارِ مجاز دور ہوا، تو کعبۂ حقیقت سامنے تھا: يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَيُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَكَذَٰلِكَ تُخْرَجُونَ!

کفر آوردم و در عشقِ تو ایماں بُردم

سارا کام پہلے سے ہو چکا تھا۔ چولھا مدتوں سے گرم تھا۔ ہوس بازیوں نے چنگاریوں کا کام دیا تھا۔ عشق نے شعلے بھڑکاتے تھے۔ صرف اتنی بات باقی رہ گئی تھی کہ ایک دیگ اتار کر دوسری چڑھا دی جائے۔

یہ کام عشق کی امیدوں سے نہ ہو سکا، تو کیا مضائقہ! عشق کی مایوسیوں نے تو پورا کر دیا:

آں نافہ مراد کہ می خواستم ز غیب
در چینِ زلفِ آں بُتِ مشکیں کلالہ بود

مولانا آزاد کی سیرت کا ایک پہلو

مولانا ابوالکلام مرحوم کی ترجمان القرآن پڑھنے والوں کو یاد ہوگا کہ سورۃ الکہف میں، جہاں ذوالقرنین کا ذکر ہے، مولانا نے اس کا مصداق فارس (میڈیا) کے تاریخی شہنشاہ خورس یا سائرس اوّل کو قرار دیا تھا، اور اس کے بسط و تشریح میں ایک فوٹو بھی ایک سنگین مجسمہ کا لے کر سرِ شاہ مذکور کا لگا دیا تھا۔ قدیم طرز کے علماء تفسیرِ قرآن میں انسانی فوٹو (خواہ وہ کسی مقصد سے بھی ہو) دیکھ کر نہایت برہم ہوئے۔ اور پنجاب یا سندھ کی بہاء الدین کے ایک صاحب نے حضرت مولانا تھانوی سے اس کے متعلق استفتاء بھی کر دیا۔ مولانا نے چار دوسرے علماء کے تائیدی دستخطوں کے ساتھ اس کا جواب بہت مفصل کئی صفحوں میں دیا اور حدیث و فقہ کی روشنی میں اس عمل کو سر تا سر ناجائز بتایا۔ اور پھر اس فتوے کو ایک عنوان دے کر "تقدیس القرآن المنیر عن تدنیس التصاویر" کے نام سے ایک مستقل رسالہ کی صورت میں شائع کر دیا۔ یہ ذکر ۱۳۵۵ھ مطابق ۱۹۳۶ء کا ہے ـــــ فتوے شائع ہونے کے بعد پھر کیا ہوا؟ یہی ہوا ہوگا کہ اُدھر سے بھی جواب نکلا ہوگا۔ تائید کرنے والے فریقین کے پیدا ہو گئے ہوں گے اور ایک مستقل ہنگامہ مناظرہ کا قائم ہو گیا ہوگا۔ اہلِ قلم میں اپنی ہار ماننا کون ہے اور کون فریق ایسا ہے جو کچھ نہ کچھ دلائل اپنی موافقت میں نہ رکھتا ہو۔ پھر مولانا ابوالکلام جیسے زبردست وحیدِ عصر صاحبِ قلم کے لیے جواب دشوار ہی کیا تھا۔

لیکن نہیں یہ کچھ بھی نہ ہوا۔ مولانا ابوالکلام نے یہی نہیں کیا کہ آئندہ ایڈیشن سے تصویر کے نکال دینے کا اقرار کیا ہو، بلکہ شائع کر دیا کہ خود اسی ایڈیشن کے باقی ماندہ نسخوں سے وہ تصویر نکال دی جائے! اور اس طرح ملت کو ایک فتنہ میں پڑنے اور مناقشہ و مجادلہ کی گرم بازاری سے بال بال بچا لیا۔ اس سلامتِ شرافت اور عدمِ خود نمائی کی مثالیں اس بیسویں صدی عیسوی میں اگر معدوم نہیں تو کالعدم تو ضرور ہی ہیں۔ حضرت تھانوی اس سے خود بھی متاثر ہوئے بغیر نہ ہوتے اور مستفتین کو جو خط لکھا اس میں کس مسرت کے ساتھ یہ چھپے ہوئے الفاظ موجود ہیں:

"ماشاء اللہ تعالیٰ یہ آپ کے خلوص کا ثمرہ اور ان کے سلامتِ قلب کی دلیل ہے۔ دونوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعائے مزید کرتا ہوں۔"

رفعِ شر کی یہ مثال ملت کے لیے سبق آموز ہے اور اس قابل ضرور ہے کہ مولانا ابوالکلام کی سوانح عمری میں اسے عزت کے ساتھ جگہ دی جائے۔

مولانا عبدالماجد دریابادی، صدق، ۳۱ مارچ ۱۹۶۱ء

تو اس کی بدولت اب صرف ایک ہی زنجیر سے چھوٹنے کا معاملہ باقی رہ گیا۔ پہلے ہزاروں چوکھٹوں کی جبہہ سائیوں سے پیشانی داغدار تھی۔ کس کس داغ کو مٹاتے کن کن پرستشگاہوں کو ڈھاتے! اب خود بخود سب مٹ گئے۔ صرف ایک ہی چوکھٹ کا نشانِ سجدہ رہ گیا۔ اور اصلی کام بھی یہی تھا کہ پیشانی ایک ہے تو سجدہ گاہ بھی ایک ہی ہو۔ جب یہاں تک معاملہ پہنچ گیا اور ایک کے لیے سب کو چھوڑنے کا سبق مل گیا تو اس ایک کو بھی مسجودِ حقیقی کی خاطر چھوڑنا کیا مشکل ہے! ممکن ہے کہ ایک جھٹکے میں یہ رشتۂ آخری بھی ٹوٹ جائے، اور پھر اس آزر کدۂ ہزار پرستش سے خلیل وار صدا ے: إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ بلند ہو:

بیفشاں زلف و صوفی را بیازی و برقص آور
کہ از ہر رقعۂ دلقش ہزاراں بت بیفشانی

یہی وجہ ہے کہ اس سفر کی سب سے اقرب راہ منزلِ مجاز ہی سے ہو کر نکلی ہے:

بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما!

اور بعض صورتوں میں تو بغیر اس کے چارہ ہی نہیں۔ گو وہ خود بھی مرض ہے، لیکن ہزاروں بیماریوں کا علاج بھی اس کے سوا کوئی نہیں:

گرچہ آشفتگیِ کارِ من از زلفِ تو بود
حل ایں عقدہ ہم از روئے نگار آخر شد

مانا کہ گرفتاریِ عشق کی یہ ایک زنجیر بھی پابندیوں کی ہزاروں زنجیروں سے بوجھل ہوتی ہے اور اس کی ترکش میں پہلا تیر پانوؤں ہی پر لگتا ہے۔ وحشی کرمانی نے خوب کہا ہے:

عشق چوں بر سرِ کس حملۂ بیداد آرد
اولش قوت بگریختن از پا برود

لیکن عجب نہیں کہ کسی کے بامِ بلند تک پہنچنے کے لیے یہی زنجیر کمند کا کام دے جائے۔ کتنے ہی راہ کے خوش قسمت ہیں جن سے سیڑھیوں کا ایک ایک زینہ نہیں گنوایا گیا۔ کمندِ عشق نے ایک ہی جست میں قصرِ مطلوب تک پہنچا دیا:

تو دقطعِ منازل ہا مکن و یک لغزشِ پاے!

اور یہ تو منزلِ عشق کے معاملات ہیں۔

تجربہ کارانِ راہ کا فیصلہ تو یہ ہے کہ اگر رندی و ہوس پرستی کی منزل میں بھی کچھ دیر کے لیے دم لے لیا جائے تو فائدہ سے خالی نہیں۔ کتنی ہی شاہراہیں ہیں جو اسی خارزار سے نکلی ہیں:

کعبہ را ویراں مکن اے عشق! کانجا یک نفس
گہ گہے پسماندگانِ راہ منزل می کنند

البتہ یاد رہے کہ سفر کی کامیابی نہ تو منزلوں پر موقوف ہے، نہ مختلف راہوں پر۔ راہ کوئی ہو، قدم میں حرکت اور ہمت میں اقدام ہے، تو کبھی نہ کبھی منزلِ مقصود تک پہنچ ہی جاؤ گے۔ خواہ راہ میں ہر درخت کے سایے تلے دم لو، خواہ ہر سرائے میں کمر کھولو۔ لیکن ساری نامرادی و بے حاصلی اس کے لیے ہے جس کے لیے راہ و منازل کے تماشے اس طرح دامن گیر ہو گئے کہ وہیں ہمیشہ کے لیے بستر جما دیا:

ہوگا کسی دیوار کے سایے کے تلے میر
کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

ہوس و عشق پر کیا موقوف ہے۔ کوئی درمیانی منزل ہو، اگر قدم آگے بڑھنے سے رک گئے تو پھر وہی منزل بت ہے اور رہرو اس کا پرستار۔ تسبیح آرائی و دلق پوشی ہی کی منزل کیوں نہ ہو۔ من شغلك عن الله فهو صنمك۔ کامیابی چلتے رہنے اور بڑھتے جانے کا نام ہے کہ:

ٹک دیکھ لیا، دل شاد کیا، خوش کام ہوئے، اور چل نکلے

اور نامرادی نہیں ہے مگر اٹکنے اور رہ جانے میں:

یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد

مطلوب اس راہ میں منازل و مراحل ہیں نہ کہ موانع و مہالک۔ اگر جاذبۂ توفیقِ الٰہی دست گیر رہے، تو موانع، وسائل بن سکتے ہیں اور قریب ہے کہ بہتر سے بہتر وسائل محرومانِ راہ کے لیے موانع و مہالک کے حکم میں داخل ہو جائیں:

من لم يكن للوصال اهلاً
فكل طاعاته ذنوب!

چنانچہ الحمد للہ کہ اس منزل کے وقفے نے بھی زیادہ طول نہ کھینچا۔ ایک سال پانچ ماہ کے اندر اس کوچے کے بھی تمام رسم و راہ ایک ایک کر کے دیکھ ڈالے، کوئی گوشہ، کوئی مقام باقی نہ چھوڑا۔ نہ مجنوں سے ہم عنانی کا سودا ہے، نہ فرہاد سے مقابلے کا دعویٰ۔ نہ یہ کہ:

شمہ از داستانِ عشقِ شور انگیز ماست
ایں حکایتہا کہ از فرہاد و شیریں کردہ اند

البتہ یہ ضرور ہے کہ شیوۂ عشق و عاشقی و آشفتگی و جاں ہشیاری کی جتنی باتیں سننے میں آتیں، وہ سب کر کے دیکھ لیں۔ اور اس راہ کا کوئی حال و معاملہ ایسا نہیں رہا جو کسی کی زبان پر ہو اور اپنے اوپر نہ گزر چکا ہو:

کچھ قمریوں کو یاد ہیں، کچھ بلبلوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے مری داستاں کے ہیں

اس راہ کے رسم و آئین اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن ہر رہرو کو دو مسلکوں میں سے ایک مسلک ضرور اختیار کرنا پڑتا ہے: یا قمری و بلبل کی آوارگی و شورش، یا شمع کی خاموشی و سوزش:

وللناس فی ما یعشقون مذاہب

اور تجربہ کاران طریق جانتے ہیں کہ دوسری راہ پہلے سے کہیں زیادہ نازک اور کٹھن ہے۔ اس میں

عدالت کے سامنے کھڑی نہ کی گئی ہو۔ بلاشبہ زمانے کے انقلاب سے عہدِ قدیم کی بہت سی برائیاں مِٹ گئیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک رومی عدالتیں اور ازمنہ متوسط (مڈل ایجز) کی پُر اسرار "انکوبزیشن" وجود نہیں رکھتی۔ لیکن میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں۔ کہ جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے۔ ان سے بھی ہمارے زمانے کو نجات مل گئی ہے۔ وہ عمارتیں تو ور گرادی گئیں جن کے اندر خوفناک اسرار بند تھے، لیکن ان دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خودغرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں۔

ایک عجیب مگر عظیم الشان جگہ

عدالت کی ناانصافیوں کی فہرست بڑی ہی طولانی ہے۔ تاریخ آج تک اس کے ماتم سے فارغ نہ ہوسکی۔ ہم اس میں حضرت مسیح جیسے پاک انسان کو دیکھتے ہیں۔ جو اپنے عہد کی اجنبی عدالت کے سامنے چوروں کے ساتھ کھڑے کیے گئے۔ ہم کو اس میں سقراط نظر آتا ہے۔ جس کو صرف اس لیے زہر کا پیالہ پینا پڑا کہ وہ اپنے ملک کا سب سے زیادہ سچا انسان تھا۔ ہم کو اس میں فلورنس کے فداکارِ حقیقت گلیلیو کا نام بھی ملتا ہے، جو اپنی معلومات و مشاہدات کو اس لیے جھٹلا نہ سکا کہ وقت کی عدالت کے نزدیک ان کا اظہار جرم تھا۔ میں نے حضرت مسیح کو انسان کہا۔ کیونکہ میرے اعتقاد میں وہ ایک مقدس انسان تھے۔ جو نیکی اور محبت کا آسمانی پیام لے کر آئے تھے۔ لیکن کروڑوں انسانوں کے اعتقاد میں تو وہ اس سے بھی بڑھ کر ہیں تاہم یہ مجرموں کا کٹہرا کیسی عجیب مگر عظیم الشان جگہ ہے جہاں سب سے اچھے اور سب سے بُرے دونوں طرح کے آدمی کھڑے کیے جاتے ہیں۔ اتنی بڑی ہستی کے لیے بھی یہ ناموزوں جگہ نہیں۔

حمد و شکر

اس جگہ کی عظیم اشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصّہ میں آئی ہے، تو بے اختیار میری روح خدا کے لیے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لیے قابلِ رشک ہوں۔ ان کو اپنی خواب گاہِ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے! کاش! غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک ہی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لیے دعائیں مانگتے۔

میں بیان کیوں دیتا ہوں

بہرحال میرا ارادہ نہ تھا کہ بیان دوں لیکن ۶ جنوری کو جب میرا مقدمہ پیش ہوا تو میں نے دیکھا، کہ گورنمنٹ مجھے سزا دلانے کے معاملے میں نہایت عاجز اور پریشان ہو رہی ہے حالاں کہ میں ایسا شخص ہوں جس کو اس کی خواہش اور خیال کے مطابق سب سے پہلے اور سب سے زیادہ سزا ملنی چاہیے۔

پہلے میرے خلاف ۱۷-۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کا دعوا کیا گیا تھا لیکن جب اس کا ویسا ثبوت بھی بہم نہ ہوسکا، جیسا آج کل اثباتِ جرم کے لیے کافی تصور کیا جاتا ہے، تو مجبوراً واپس لے لی گئی۔ اب ۱۲۴- الف کا مقدمہ چلایا گیا ہے لیکن بدقسمتی سے یہ بھی مقصد برآری کے لیے کافی نہیں۔ کیونکہ جو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ وہ ان بہت سی باتوں سے خالی ہیں۔ جو میں اپنی تقریروں اور تحریروں میں ہمیشہ کہتا رہا ہوں اور وہ شاید گورنمنٹ کے لیے زیادہ کارآمد ہوتیں۔

یہ دیکھ کر میری رائے بدل گئی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو سبب بیان نہ دینے کا تھا وہی اب متقاضی ہے کہ خاموش نہ رہوں اور جس بات کو گورنمنٹ باوجود جاننے کے دکھلا نہیں سکتی، اسے خود کامل اقرار کے ساتھ اپنے قلم سے لکھ دوں۔ میں جانتا ہوں کہ قانونِ عدالت کی رُو سے یہ میرے فرائض میں داخل نہیں ہے۔ میری جانب سے پراسیکیوشن کے لیے یہی بہت بڑی مدد ہے کہ میں نے ڈیفنس نہیں کیا۔ لیکن حقیقت کا قانون عدالتی قواعد کی حیلہ جوئیوں کا پابند نہیں ہے۔ یقیناً یہ سچائی کے خلاف ہوگا۔ ایک بات صرف اس لیے پوشیدہ رہنے دی جائے کہ مخالف اپنی عاجزی کی وجہ سے ثابت نہ کرسکا۔

اقرارِ "جرم"

۱۔ ہندستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے۔ جیسا اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں۔ قدرتی طور پر یہ اقتدار قومی بیداری کے نشو و نما اور آزادی اور انصاف کی جد و جہد کو مبغوض رکھتا ہے کیونکہ اس کا لازمی نتیجہ اس کی غیر منصفانہ طاقت کا زوال ہے اور کوئی وجود اپنا زوال پسند نہیں کرسکتا۔ اگرچہ



قولِ فیصل

یہ بدمستی سے دگر متہم ساز دمرا ساقی
ہنوز از بادہ، پارینہ ام پیمانہ بردارد

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَحْدَہٗ

میرا ارادہ نہ تھا کہ کوئی تقریری یا تحریری بیان یہاں پیش کروں۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہمارے لیے نہ تو کسی طرح کی امید ہے نہ طلب ہے نہ شکایت ہے یہ ایک موڑ ہے جس کو گزرے بغیر منزلِ مقصود تک نہیں پہنچ سکتے۔ اس لیے تھوڑی دیر کے لیے اپنی مرضی کے خلاف دم لے لینا پڑتا ہے۔ یہ نہ ہوتا تو ہم سیدھے جیل چلے جاتے۔

یہی وجہ ہے کہ گزشتہ دو سال کے اندر میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی کہ کوئی نان کوآپریٹر کسی طرح کا بھی حصہ عدالت کی کارروائی میں لے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی، سنٹرل خلافت کمیٹی اور جمیعتہ العلماء ہند نے اگرچہ اس کی اجازت دے دی ہے کہ پبلک کی واقفیت کے لیے تحریری بیان دیا جا سکتا ہے لیکن ذاتی طور پر میں لوگوں کو یہی مشورہ دیتا رہا کہ خاموشی کو ترجیح ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جو شخص اس لیے بیان دیتا ہے کہ مجرم نہیں۔ اگرچہ اس کا مقصد پبلک کی واقفیت ہو۔ تاہم وہ اشتباہ سے محفوظ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اپنے بچاؤ کی ایک ہلکی سی خواہش اور رعایت حق کی ایک کمزور سی توقع اس کے اندر کام کر رہی ہو۔ حالانکہ نان کوآپریشن کی راہ بالکل قطعی اور یک سو ہے۔ وہ اس بارے میں اشتباہ بھی گوارا نہیں کر سکتی۔

کامل مایوسی اس لیے کامل تبدیلی کا عزم

"نان کوآپریشن" موجودہ حالت سے کامل مایوسی کا نتیجہ ہے اور اسی مایوسی سے کامل تبدیلی کا عزم پیدا ہوا ہے۔ ایک شخص جب گورنمنٹ سے نان کوآپریشن کرتا ہے تو گویا اعلان کرتا ہے کہ وہ گورنمنٹ کے انصاف اور حق پسندی سے مایوس ہو چکا۔ وہ اس کی غیر منصف طاقت کے جواز سے منکر ہے اور اس لیے تبدیلی کا خواہش مند ہے۔ پس جس چیز سے وہ اس درجہ مایوس ہو چکا کہ تبدیلی کے سوا کوئی چارہ نہیں دیکھتا۔ اس سے کیونکر امید کر سکتا ہے کہ ایک منصف اور قابل بقا طاقت کی طرح اس کے ساتھ انصاف کرے گی؟

اس اصولی حقیقت سے اگر قطع نظر کر لیا جائے۔ جب بھی موجودہ حالت میں بریت کی امید رکھنا ایک بے سود زحمت سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ گویا اپنی معلومات سے انکار ہوگا۔ گورنمنٹ کے سوا کوئی ذی حواس اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ بحالتِ موجودہ سرکاری عدالتوں سے انصاف کی کوئی امید نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسے اشخاص سے مرکب ہیں جو انصاف کرنا پسند نہیں کرتے۔ بلکہ اس لیے کہ ایسے نظام (سسٹم) پر مبنی ہیں جن میں رہ کر کوئی مجسٹریٹ ان ملزموں کے ساتھ انصاف نہیں کر سکتا۔ جن کے ساتھ خود گورنمنٹ انصاف کرنا پسند نہ کرتی ہو۔

میں یہاں واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ "نان کوآپریشن" کا خطاب صرف گورنمنٹ، گورنمنٹ کے سسٹم اور موجودہ حکومتی اور قومی اصولوں سے ہے، افراد و اشخاص سے نہیں ہے۔

عدالت گاہ ناانصافی کا قدیم ترین ذریعہ ہے

ہمارے اس دَور کے تمام حالات کی طرح یہ حالت بھی نئی نہیں ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جب کبھی حکمران طاقتوں نے آزادی اور حق کے مقابلے میں ہتھیار اٹھائے ہیں۔ تو عدالت گاہوں نے سب سے زیادہ آسان اور بے خطا ہتھیار کا کام دیا ہے۔ عدالت کا اختیار ایک طاقت ہے، اور وہ انصاف اور ناانصافی، دونوں کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔ منصف گورنمنٹ کے ہاتھ میں وہ عدل اور حق کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔ لیکن جابر اور مستبد حکومتوں کے لیے اس سے بڑھ کر انتقام اور ناانصافی کا کوئی آلہ بھی نہیں۔

تاریخِ عالم کی سب سے بڑی ناانصافیاں میدانِ جنگ کے بعد عدالت کے ایوانوں ہی میں ہوئی ہیں۔ دنیا کے مقدس بانیانِ مذہب سے لیکر سائنس کے محققین اور مکتشفین تک، کوئی پاک اور حق پسند جماعت نہیں ہے جو مجرموں کی طرح



کی مرکزیت میں صرف ہوا۔ یا ملک کے پیہم دوروں میں۔ اکثر ایسا ہوا کہ مہینے کے بعد چند دنوں کے لیے کلکتہ آیا اور بنگال پراونشل خلافت کمیٹی کے کاموں کی دیکھ بھال کرکے پھر چلا گیا۔ وسط نومبر سے بھی میں سفر میں تھا۔ ۱۶ر کو کلکتہ سے روانہ ہوا تاکہ جمعیۃ العلمار ہند کے سالانہ اجلاس لاہور میں شریک ہوں۔ وہاں مہاتما گاندھی کے تار سے بمبئی کی شورش کا حال معلوم ہوا۔ اور میں بمبئی چلا گیا۔ جنوری تک میرا ارادہ واپسی کا نہ تھا کیونکہ ۱۰ دسمبر کو جمعیۃ العلمار کا اسپیشل اجلاس بدایوں میں تھا۔ اس میں شرکت ضروری تھی۔ اس کے علاوہ مجھے تمام وقت انگورہ فنڈ کی فراہمی میں صرف کرنا تھا۔ لیکن یکایک گورنمنٹ بنگال کے تازہ جبر و تشدد اور ۸ر کے کمیونک کی اطلاع بمبئی میں ملی اور میرے لیے ناممکن ہوگیا کہ ایسی حالت میں کلکتہ سے باہر رہوں۔ میں نے مہاتما گاندھی سے مشورہ کیا۔ ان کی بھی یہی رائے ہوئی کہ مجھے تمام پروگرام ملتوی کرکے کلکتہ چلا جانا چاہیے۔ زیادہ خیال ہمیں اس بات کا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، گورنمنٹ کا جبر و تشدد لوگوں کو بے قابو کردے اور کوئی بات صبر و ضبط کے خلاف کر بیٹھیں۔ علی الخصوص جب کہ "سول گارڈ" کے قیام کی خبریں بھی آچکی تھیں اور اس بارے میں ہمیں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی تھی کہ یہ نئی اسلحہ بندی کن شریفانہ اور پر امن اغراض کے لیے وجود میں آئی ہے۔

میں پہلی دسمبر کو کلکتہ پہنچا۔ میں نے ظلم اور برداشت دونوں کے انتہائی مناظر اپنے سامنے پائے۔

میں نے دیکھا کہ ۱۷ نومبر کی یادگار ہڑتال سے بے بس ہوکر گورنمنٹ اس آدمی کی طرح ہوگئی ہے جو جوش اور غصہ میں آپے سے باہر ہوجائے اور غیظ و غضب کی کوئی حرکت بھی اس سے بعید نہ ہو۔ ۱۹۰۸ء کے کریمنل لاء امنڈمنٹ ایکٹ کے ماتحت قومی رضاکاروں کی تمام جماعتیں "مجمع خلافِ قانون" (ان لا فل) قرار دے دی گئی ہیں۔ پبلک اجتماعات یک قلم روک دیے ہیں۔ قانون صرف پولیس کی مرضی کا نام ہے۔ وہ "ان لا فل جماعت" تفتیش اور شبہ میں جو چاہے کرسکتی ہے حتیٰ کہ راہ چلتوں کی جان و آبرو بھی محفوظ نہیں۔ گورنمنٹ نے پہلے ۱۸ر نومبر کے کمیونک میں صرف سابق و موجودہ رضاکار جماعتوں کا ذکر کیا تھا۔ لیکن ۲۴ر کو دوسرا کمیونک جاری کرکے تمام آیندہ جماعتیں بھی خلاف قانون قرار دے دیں اور پولیس نے بلا امتیاز ہر شخص کو جو اس کے سامنے آگیا، گرفتار کرنا شروع کر دیا۔ کوئی بات بھی جس سے ۲۴ر کی ہڑتال کے رُکنے کا امکان ہو۔ پولیس اور پولیس سے بھی زیادہ "شریف قوم" سول گارڈ کے لیے ناجائز نہیں۔ سول گارڈ گویا قومی رضاکاروں کا جواب ہے۔ وہ بالکل نہتے ہونے پر بھی "جبر و تشدد" سے ہڑتال کرا دیتے تھے، یہ ریوالور سے مسلح ہونے پر بھی "امن و صلح" کے ذریعے ہڑتال روک دیں گے۔

اس کے مقابلے میں لوگوں نے بھی برداشت اور استقامت، دونوں کا گویا آخری عہد لیا ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو وہ اپنی راہ سے ہٹیں گے نہ تشدد کا مقابلہ کریں گے۔

ان حالات میں میرے لیے فرض کی راہ بالکل صاف اور یک سُو تھی۔ میں نے اپنے سامنے دو حقیقتیں بے نقاب دیکھیں۔ ایک یہ کہ گورنمنٹ کی تمام طاقت کلکتہ میں سمٹ آئی ہے۔ اس لیے فتح و شکست کا پہلا فیصلہ یہیں ہوگا۔ دوسری یہ کہ ہم کل تک پوری آزادی کے لیے جد و جہد کر رہے تھے۔ لیکن موجودہ حالت نے بتلا دیا کہ ہماری آزادی کی مبادیات تک محفوظ نہیں ہیں۔ آزادیٔ تقریر اور آزادیٔ تحریر و اجتماع انسان کے پیدائشی حقوق ہیں۔ ان کی پامالی مشہور فلاسفر مِل کی زبان میں انسانیت کے قتلِ عام سے کچھ ہی کم کہی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ پامالی بلا کسی جھجک کے علانیہ ہو رہی ہے۔ پس میں نے باہر کا تمام پروگرام منسوخ کر دیا اور فیصلہ کر لیا کہ اس وقت تک کلکتہ ہی میں رہوں گا۔ جب تک دو باتوں میں سے کوئی ایک بات ظہور میں نہ آجائے، یا گورنمنٹ اپنا کمیونک اور آرڈر واپس لے یا مجھے گرفتار کرلے۔

گورنمنٹ نے ۱۰ دسمبر کو مجھے گرفتار کر لیا۔ میں پورے اطمینان اور مسرت کے ساتھ جیل کی طرف روانہ ہوا۔ کیونکہ میں اپنے پیچھے ایک فتح مند میدان چھوڑ رہا تھا۔ میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ کلکتہ اور بنگال نے میری توقعات پوری کر دیں۔ وہ پہلے جس قدر پیچھے تھا۔ اتنا ہی آج سب سے آگے ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کامیابی کے لیے گورنمنٹ کی امداد کا ہمیں پوری طرح اعتراف کرنا چاہیے۔ اگر وہ ۱۷ نومبر کے بعد یہ طرزِ عمل اختیار نہ کرتی۔ تو فی الواقع ہمارے لیے آیندہ کاموں کے انتخاب میں چند در چند مشکلات تھیں۔ ہم ۲۲ر کو بمبئی میں انہی مشکلات پر باہم غور و خوض کر رہے تھے۔

دو حقیقتیں

حقیقت یہ ہے کہ ان گزشتہ ایام نے بیک وقت دونوں حقیقتیں صفحاتِ تاریخ کے لیے مہیا کر دیں۔ اگر ایک طرف گورنمنٹ کے چہرے سے ادّعا و نمائش کے تمام نقاب دُور ہوگئے، تو دوسری طرف



ازروئے انصاف کتنا ہی ضروری ہو۔ یہ گویا تنازعِ للبقاء STRUGGLE FOR EXISTENCE کی ایک جنگ ہوتی ہے۔ جس میں دونوں فریق اپنے اپنے فوائد کے لیے جد وجہد کرتے ہیں۔ قومی بیداری چاہتی ہے کہ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ کہا جاسکتا ہے کہ پہلے فریق کی طرح آخر الذکر بھی قابلِ ملامت نہیں۔ کیونکہ وہ بھی اپنے بچاؤ کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اس کا وجود انصاف کے خلاف واقع ہوا ہو۔ ہم طبیعت کی مقتضیات سے تو انکار نہیں کرسکتے۔ یہ واقعہ ہے کہ نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی بھی قابلِ ملامت ہو، لیکن زندگی کی خواہش قابلِ ملامت نہیں ہے۔

ہندوستان میں بھی یہ مقابلہ شروع ہوگیا ہے۔ اس لیے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہو، اور وہ ان لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق خیال کرے۔ جو انصاف کے نام سے اس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں، میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ ان لوگوں میں ہوں جنھوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لیے اپنی زندگی وقف کردی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۹۱۲ء میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی اور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے ان کا رُخ پھیر دیا۔ جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے مبتلا کر رکھا تھا۔ پس اگر گورنمنٹ مجھے اپنے خیال میں مجرم سمجھتی ہے اور اس لیے سزا دلانا چاہتی ہے تو میں پوری صاف دلی کے ساتھ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ کوئی خلاف توقع بات نہیں ہے جس کے لیے مجھے شکایت ہو۔

میں جانتا ہوں کہ گورنمنٹ فرشتہ کی طرح معصوم ہونے کا دعوا رکھتی ہے۔ کیونکہ اس نے خطاؤں کے اقرار سے ہمیشہ انکار کیا۔ لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اس نے مسیح ہونے کا کبھی دعوا نہیں کیا۔ پھر میں کیوں امید کروں کہ وہ اپنے مخالفوں کو پیار کرے گی؟ وہ تو وہی کرے گی جو کر رہی ہے اور جو ہمیشہ استبداد نے آزادی کے مقابلے میں کیا ہے۔ پس یہ ایک ایسا قدرتی معاملہ ہے جس میں دونوں فریق کے لیے شکوہ و شکایت کا کوئی موقع نہیں۔ دونوں کو اپنا اپنا کام کیے جانا چاہیے۔

گورنمنٹ بنگال اور میری گرفتاری

۲۔ میں یہ بھی ظاہر کردینا چاہتا ہوں کہ میرا معاملہ جو کچھ تھا، گورنمنٹ آف انڈیا سے تھا۔ وہ کسی خاص معین الزام کی بنا پر نہیں بلکہ موجودہ تحریک کی عام مشغولیت کی وجہ سے مجھے گرفتار کرسکتی تھی اور جیسا کہ قاعدہ ہے۔ گرفتاری کے لیے کوئی حیلہ پیدا کرلیتی، چنانچہ ملک میں عام طور پر خیال کیا جاتا تھا۔ کہ علی برادرز سے مجھے زیادہ مہلت دی گئی۔ مگر اب زیادہ عرصہ تک تغافل نہیں کیا جائے گا۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ گورنمنٹ بنگال کے سامنے اس وقت میرا معاملہ نہ تھا۔ نہ وہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلانا چاہتی تھی۔ اس دفعہ کے ثبوت میں جو تقریریں پیش کی گئی ہیں۔ وہ نصف سال پہلے کلکتہ میں کی گئی ہیں اور گورنمنٹ نے مقدمہ کی اجازت ۲۲ دسمبر کو دی ہے۔ یعنی میری گرفتاری سے بارہ دن بعد۔ اگر فی الواقع ان تقریروں میں سڈیشن تھا تو کیوں مجھے چھ ماہ تک گرفتار نہیں کیا گیا؟ اور اب گرفتار کیا بھی، تو گرفتاری کے بارہ دن بعد؟ ہر شخص ان دو واقعات سے صاف صاف سمجھ سکتا ہے کہ حقیقتِ حال کیا ہے؟ خصوصاً جب یہ تیسرا واقعہ بھی بڑھا دیا جائے۔ اس میں جو دفعہ ظاہر کی گئی وہ ۱۲۴ نہ تھی۔ ۱۷۔ ترمیم ضابطہ فوجداری تھی۔ پچیس دن کے بعد مجھ سے کہا جاتا ہے کہ وہ واپس لے لی گئی ہے۔

گرفتاری کا اصلی باعث

حقیقت یہ ہے کہ میری گرفتاری میں اس دفعہ کو دخل نہیں۔ یہ قطعی ہے کہ مجھے انہی حالات کے سلسلہ میں گرفتار کیا گیا جو ۱۷ نومبر کے بعد رونما ہوئے ہیں۔ اگر میں پہلی دسمبر کو کلکتہ نہ آتا۔ یا ۱۰ دسمبر سے پہلے باہر چلا جاتا۔ جس کی جلسۂ جمعیۃ العلماء بدایوں کی وجہ سے توقع تھی، تو گورنمنٹ بنگال مجھ سے تعرض نہ کرتی۔

۱۷ نومبر کے بعد دنیا کی تمام چیزوں میں سے جو چاہی جاسکتی ہے۔ وہ صرف یہ چاہتی تھی کہ ۲۴ نومبر کو جب پرنس کلکتہ پہنچیں تو ہڑتال نہ ہو اور جو جابرانہ وقتی ترمیم ضابطۂ فوجداری ۱۹۰۸ء کے نفاذ میں ہوگئی ہے وہ ایک دن کے لیے قبول کرلی جائے۔ وہ خیال کرتی تھی کہ میری اور مسٹر سی۔ آر داس کی موجودگی اس میں حارج ہے، اس لیے کچھ عرصہ کے تذبذب اور غور وفکر کے بعد ہم دونوں گرفتار کرلیے گئے۔ گرفتاری بلا وارنٹ کے ہوئی تھی لیکن جب دوسرے دن ضابطہ کی نمائش پوری کرنے کے لیے مجسٹریٹ جیل میں بھیجا گیا تو مسٹر داس کی طرح میری گرفتاری کے لیے بھی ۱۷۔۲ ترمیم ضابطہ فوجداری کے ماتحت وارنٹ پیش کیا گیا۔

میں گزشتہ دو سال کے اندر بہت کم کلکتہ میں رہ سکا ہوں۔ میرا تمام وقت زیادہ تر تحریک خلافت

نئی قانونی تشریحات

گورنمنٹ نے اس اطمینان سے پوری طرح کام لینے میں کوئی کوتاہی بھی نہیں کی ہے۔ نان کواپریٹرز کے مقدمات آج جس طرح چکائے جارہے ہیں۔ اس سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ "لا" اور "آرڈر" کے معنی بیوروکریٹک اصطلاح میں کیا ہیں؟ "لا" اور "آرڈر" کی طرح اب دعویٰ ثبوت، شہادت، تشخیص، "آئی ڈینٹی فائی" وغیرہ تمام عدالتی مصطلحات کے معانی میں بھی انقلاب ہوگیا ہے۔ گو نان کواپریٹرز کو جلد سزا دے دینے کے لیے ہر طرح کی بے قاعدگی اور قانون شکنی جائز ہے۔ حتیٰ کہ اس بات کی بھی تحقیق ضروری نہیں کہ جس انسان کے ملزم ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے کٹہرے کا ملزم وہی آدمی ہے بھی یا نہیں؟ ابھی اسی ہفتہ جوڑابگان کی عدالت سے ایک شخص "عبدالرحمٰن ہاشمی" کو اس بنا پر زور قانونی اور منطقی ثبوت پر چھ ماہ کی سزا دے دی گئی ہے کہ "اعظم ہاشم" نامی ایک خلافت والنٹیر دنیا میں وجود رکھتا ہے اور دونوں کے نام میں لفظ "ہاشم" مشترک ہے۔ خود میرے مقدمہ میں جو صریح بے ضابطگیاں کی گئی ہیں، ان کا ذکر لاحاصل سمجھ کر نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ وہی اس حقیقت کے لیے کافی تھیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک واقعہ کا ذکر کروں گا جو بے قاعدگی اور غلط بیانی دونوں کا مجموعہ ہے۔ مجھے دفعہ ۱۷۔ ترمیم ضابطہ فوجداری سے بری کردیا گیا۔ اور ۱۲۴۔ الف کے ماتحت وارنٹ حاصل کیا گیا۔ قاعدہ کی رو سے رہائی اور از سرِ نو گرفتاری، دونوں باتیں آنی چاہیے تھیں۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ ۱۲۴۔ کا کوئی وارنٹ مجھ پر تعمیل نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۰ جنوری تک مجھے اس کا علم بھی نہیں ہوا۔ لیکن میرے سامنے مسٹر گولڈی ڈپٹی کمشنر پولیس نے یہ حلفیہ شہادت دی ہے کہ اس نے پریذیڈنسی جیل میں مجھ پر وارنٹ سرو کیا ہے۔

یہ سچ ہے کہ نان کواپریٹر کسی طرح کا ڈیفنس نہیں کرتے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے کہ آدمی اپنے تمام کپڑے اتار ڈالے۔ اس لیے کہ شریف آدمی آنکھیں بند کرلیں گے۔ شریف آدمیوں نے تو سچ مچ آنکھیں بند کرلی ہیں، لیکن دنیا کی بند نہیں ہیں۔

قانون کا ڈرامہ

فی الحقیقت "لا" اور "آرڈر" کا ڈرامہ کھیلا جارہا ہے جسے ہم کامیڈی اور ٹریجڈی دونوں کہہ سکتے ہیں۔

وہ تماشا کی طرح مضحک بھی ہے اور مقتل کی طرح درد انگیز بھی۔ لیکن میں ٹریجڈی کہنا زیادہ پسند کروں گا۔ حسنِ اتفاق سے اس کا چیف ایکٹر انگلستان کا سابق جسٹس ہے۔

۵۔ پراسیکیوشن کی جانب سے میری دو تقریریں ثبوت میں پیش کی گئی ہیں۔ جو میں نے پہلی اور پندرھویں جولائی کو مرزاپارک کے جلسہ میں کی تھیں۔ اس زمانہ میں گورنمنٹ بنگال نے گرفتاریوں کی طرف پہلا قدم اٹھایا تھا اور چار مبلغینِ خلافت پر مقدمہ چلاکر سزائیں دلائی تھیں۔ میں اس وقت سفر سے بیمار واپس آیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ لوگوں میں بے حد جوش پھیلا ہوا ہے اور ہر طرح کے مظاہرے کے لیے لوگ بے قرار ہیں۔ چونکہ میرے خیال میں گرفتاریوں پر مظاہرہ کرنا نان کواپریشن کے اصول کے خلاف تھا۔ اس لیے میں نے ہڑتال اور جلوس یک قلم روک دیے۔ اس پر عوام کو شکایت ہوئی تو میں نے یہ جلسے منعقد کیے اور لوگوں کو صبر و تحمل کی نصیحت کرتے ہوئے سمجھایا کہ نان وائلینس، نان کواپریشن کے اصول میں یہ بات داخل ہے کہ گرفتاریوں پر صبر و سکون کے خلاف کوئی بات نہ کی جائے۔ اگر فی الواقع ان گرفتاریوں کا تمہارے دل میں درد ہے تو چاہیے کہ اصلی کام کرو اور بیرونی کپڑا ترک کرکے دیسی کاڑھا ہوا پہن لو۔

استغاثہ نے جو نقل پیش کی ہے، وہ نہایت ناقص، غلط اور مسخ شدہ صورت ہے اور محض بے جوڑ اور بعض مقامات بے معنی جملوں کا مجموعہ ہے، جیسا کہ اس کے پڑھنے سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ تاہم میں اس کے غلط اور بے ربط جملوں کو چھوڑ کر (کیونکہ اس کے اعتراف سے میرا ادبی ذوق ابا کرتا ہے) باقی وہ تمام حصہ تسلیم کرلیتا ہوں جس میں گورنمنٹ کی نسبت خیالات کا اظہار ہے یا پبلک سے گورنمنٹ کے خلاف جدوجہد کی اپیل کی گئی ہے۔

استغاثہ کی جانب سے صرف تقریریں پیش کردی گئی ہیں۔ یہ نہیں بتلایا ہے کہ ان کے کن جملوں کو وہ ثبوت میں پیش کرنا چاہتے ہیں؟ یا اس کے خیال میں مائی ڈیر برادران سے لے کر آخر تک سب ۱۲۴۔ الف ہے؟ میں نے بھی دریافت نہیں کیا کیونکہ دونوں صورتیں میرے لیے یکساں ہیں۔ تاہم ان نقول کو دیکھتا ہوں تو استغاثہ کے خیال کے مطابق زیادہ سے زیادہ قابلِ ذکر جملے حسبِ ذیل ہیں:

"ایسی گورنمنٹ ظالم ہے، جو
گورنمنٹ ناانصافی کے ساتھ قائم ہو،
ایسی گورنمنٹ کو یا تو انصاف کے آگے
جھکنا چاہیے یا دنیا سے مٹادینا چاہیے۔"

"اگر فی الحقیقت تمہارے دل
میں اپنے گرفتار بھائیوں کا درد ہے



ملکی طاقت بھی ایک سخت آزمائش میں پڑکر پوری طرح نمایاں ہوگئی۔ دنیانے دیکھ لیا ہے کہ اگر گورنمنٹ ہر طرح کے جبر و تشدد میں بالکل بے جھجک اور بے لگام ہے۔ تو ملک میں بھی صبر و برداشت کی طاقت روز افزوں نشوونما پارہی ہے جیسا کہ ہمیشہ انکار کیا گیا ہے۔ آج بھی اس کا موقع حاصل ہے کہ انکار کر دیا جائے۔ لیکن کل تاریخ کے لیے یہ ایک نہایت ہی عبرت انگیز داستان ہوگی۔ یہ مستقبل کی راہنمائی کرے گی۔ کہ کیونکر اخلاقی مدافعت مادی طاقت کے جارحانہ گھمنڈ کو شکست دے سکتی ہے اور یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ صرف برداشت اور قربانی کے ذریعہ خوں ریز اسلحہ کا مقابلہ کیا جائے؟ البتہ میں نہیں جانتا کہ ان دونوں فریقوں میں سے کس فریق کے اندر اس بڑے انسان کی تعلیم تلاش کی جائے۔ جو برائی کے مقابلے میں صبر و عفو کی تعلیم لے کر آیا تھا؟ گورنمنٹ میں یا ملک میں؟ میں خیال کرتا ہوں کہ بیورو کریسی کے حکام اس کے نام سے ناواقف نہ ہوں گے۔ اس کا نام "مسیح" تھا۔

گورنمنٹ کا فیصلہ اور شکست

۳۔ فلسفۂ تاریخ ہمیں بتلاتا ہے کہ نادانی اور عاقبت نااندیشی ہمیشہ زوال پذیر طاقتوں کی رفیق ہوتی ہے۔ گورنمنٹ نے خیال کیا کہ وہ جبر و تشدد سے تحریکِ خلافت و سوراج کو پامال کر دے گی اور ۲۴ کی ہڑتال رُک جائے گی اور اس نے والنٹیئر کورز کو خلافِ قانون قرار دیا اور بلا امتیاز تمام کارکن گرفتار کر لیے گئے۔ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ والنٹیئرز کی ممانعت اور کارکنوں کی گرفتاری کے بعد خلافت اور کانگریس کا نظام معطل ہو جائے گا۔ اور اس طرح خود بخود ہڑتال رک جائے گی۔ لیکن بہت جلد گورنمنٹ کو معلوم ہو گیا کہ جبر و تشدد جب قومی بیداری کے مقابلے میں نمایاں ہو تو وہ کوئی مہلک چیز نہیں ہوتی۔ نہ ہڑتال رک سکی، نہ خلافت اور کانگریس کمیٹیاں معطل ہوئیں اور نہ والنٹیئرز کا کام ایک دن کے لیے بھی بند ہوا۔ بلکہ ہماری غیر موجودگی میں یہ ساری چیزیں زیادہ طاقت اور غیر مسخر ہو گئیں۔ میں نے ۸ر دسمبر کو جو پیغام ملک کے نام لکھا تھا، اس میں گورنمنٹ بنگال کے لیے بھی یہ پیغام تھا:

> "میری اور مسٹر سی آر داس کی گرفتاری کے بعد کام زیادہ طاقت اور مستعدی کے ساتھ جاری رہے گا۔ اور ۲۴ کو ہڑتال اس سے زیادہ مکمل ہوگی، جس قدر ہماری موجودگی میں ہو سکتی تھی۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گورنمنٹ خود اپنے پسند کیے ہوئے میدان میں ہار گئی۔ اب وہ اپنی شرمندگی چھپانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے اور جن لوگوں کو گرفتار کر چکی ہے، انھیں کسی نہ کسی طرح سزا دلانا چاہتی ہے لیکن یہ بالکل بے سود ہے۔ طاقتور آدمی کو شکست دینے کے بعد زیادہ غصہ آتا ہے۔ لیکن کوئی شکست اس لیے فتح نہیں بن سکتی کہ ہم بہت زیادہ جھنجھلا سکتے ہیں۔

دفعہ ۱۲۴۔الف

غرضیکہ میری گرفتاری صریح طور پر انہی واقعات کا نتیجہ ہے اور اسی لیے دو ہفتہ تک میرے خلاف دفعہ ۱۷۔ ترمیم ضابطہ فوجداری ہی کا دعویٰ قائم رہا۔ لیکن جب اس بارے میں کوئی سہارا نہ ملا تو میرے پریس اور مکان کی تلاشی لی گئی تاکہ میری کوئی تحریر حاصل کرکے بنائے مقدمہ قرار دی جائے۔ جب وہاں سے بھی کوئی گوہرِ مراد ہاتھ نہ آیا تو مجبوراً سی۔ آئی۔ ڈی کے محفوظ ذخیرہ کی طرف توجہ کی گئی۔ یہ ذخیرہ ہمیشہ اس شریفانہ کام کے لیے مستعد رہتا ہے اور ضرورت مند کو کبھی مایوس نہیں کرتا۔ پس اس طرح بہ ہزار زحمت دفعہ ۱۲۴۔ الف کا دعویٰ تیار ہو گیا۔

اجتماعِ ضدّین

۴۔ یہ پریشانی گورنمنٹ کو خود اسی کی متناقض روش کی وجہ سے پیش آرہی ہے۔ ایک طرف تو وہ چاہتی ہے کہ شخصی حکمرانوں کی طرح بے دریغ جبر و تشدد کرے۔ دوسری طرف چاہتی ہے کہ نمائشی قانون و عدالت کی آڑ بھی قائم رہے۔ یہ دونوں باتیں متضاد ہیں۔ جمع نہیں ہو سکتیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس کی پریشانی و درماندگی روز بروز بڑھتی جاتی ہے۔ جو لوگ اس کے خیال میں سب سے زیادہ مستحقِ تعزیر ہیں انہی کو سزا دلانا اس کے لیے مشکل ہو گیا ہے۔ ابھی چند ہی مہینے گزرے ہیں کہ ہم کراچی میں گورنمنٹ کی سراسیمگی و درماندگی کا مضحکہ انگیز تماشا دیکھ رہے تھے جو سرکاری استغاثہ اسی دعویٰ اور اہتمام کے ساتھ شروع کیا گیا۔ اس سے خود گورنمنٹ کی پسندیدہ اور انتخاب کردہ جیوری بھی اتفاق نہ کرسکی۔

لطف یہ ہے کہ یہ مشکلات گورنمنٹ کو ایسی حالت میں پیش آرہی ہیں۔ جبکہ وہ جانتی ہے کہ نان کوآپریٹرز کی جانب سے ڈیفنس نہیں کیا جائے گا۔ اور سخت سے سخت غلط بیانی اور قانون شکنی کی حالت میں بھی پردہ دری اور شکست کا کوئی کھٹکا نہیں ہے۔

سیاہ کو سفید کہنے سے انکار کرتا ہوں۔

میں کم سے کم اور نرم سے نرم لفظ جو اس بارے میں بول سکتا ہوں، یہی ہے۔ ایسی ملفوظ صداقت جو اس سے کم ہو، میرے علم میں کوئی نہیں۔

میں یقیناً یہ کہتا رہا ہوں کہ ہمارے فرض کے سامنے دو ہی راہیں ہیں: گورنمنٹ نا انصافی اور حق تلفی سے باز آ جائے۔ اگر باز نہیں آ سکتی تو مٹا دی جائے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ یہ تو انسانی عقائد کی اتنی پرانی سچائی ہے کہ صرف پہاڑ اور سمندر ہی اس کے ہم عمر کہے جا سکتے ہیں۔ جو چیز بری ہے اسے یا تو درست ہو جانا چاہیے یا مٹ جانا چاہیے۔ تیسری بات کیا ہو سکتی ہے؟ جب کہ میں اس گورنمنٹ کی برائیوں پر یقین رکھتا ہوں، تو یقیناً یہ دعا نہیں مانگ سکتا، کہ درست بھی نہ ہو اور اس کی عمر بھی دراز ہو۔

میرا یہ اعتقاد کیوں

۸۔ میرا اور میرے کروڑوں ہم وطنوں کا یہ اعتقاد کیوں ہے؟ اس کے وجوہ و دلائل اب اس قدر آشکارا ہو چکے ہیں کہ ملٹن کے لفظوں میں کہا جا سکتا ہے: "سورج کے بعد دنیا کی ہر چیز سے زیادہ واضح اور محسوس"۔ محسوسات کے لیے ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ انکار نہ کرو۔ تاہم میں کہنا چاہتا ہوں کہ میرا یہ اعتقاد اس لیے ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اس لیے ہے کہ میں مسلمان ہوں، اس لیے ہے کہ میں انسان ہوں۔

شخصی اقتدار بالذات ظلم ہے

میرا اعتقاد ہے کہ آزاد رہنا ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے، کوئی انسان یا انسانوں کی گھڑی ہوئی بیوروکریسی یہ حق نہیں رکھتی کہ خدا کے بندوں کو اپنا محکوم بنائے۔ محکومی اور غلامی کے لیے کیسے ہی خوشنما نام کیوں نہ رکھ لیے جائیں، لیکن وہ غلامی ہی ہے اور خدا کی مرضی اور اس کے قانون کے خلاف ہے۔ پس میں موجودہ گورنمنٹ کو جائز حکومت تسلیم نہیں کرتا اور اپنا ملکی، مذہبی اور انسانی فرض سمجھتا ہوں کہ اس کی محکومی سے ملک و قوم کو نجات دلاؤں۔

"اصلاحات اور بتدریج توسیع اختیارات" کا مشہور مغالطہ میرے اس صاف اور قطعی اعتقاد میں کوئی غلط فہمی پیدا نہیں کر سکتا۔ آزادی انسان کا پیدائشی حق ہے اور کسی انسان کو اختیار نہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں حد بندی اور تقسیم کرے۔ یہ کہنا کہ کسی قوم کو اس کی آزادی بتدریج ملنی چاہیے۔ بعینہٖ ایسی ہی ہے جیسے کہا جائے کہ مالک کو اس کی جائیداد اور قرض دار کو اس کا قرض ٹکڑے ٹکڑے کر کے دینا چاہیے۔ میں تسلیم کرتا ہوں اگر مقروض سے ایک ہی دفعہ قرض واپس نہ مل سکے تو قرض دار کو یہی کرنا پڑے گا۔ کہ قسط کی صورت میں وصول کرے لیکن یہ ایک مجبوری کا سمجھوتہ ہوگا۔ اس سے یک دفعہ وصولی کا حق زائل نہیں ہو سکتا۔

"ریفارم" کی نسبت میں روس کے عظیم الشان لیوٹالسٹائی LESTALISTOY کے لفظوں میں کہوں گا: "اگر قیدیوں کو اپنے ووٹ سے اپنا جیلر منتخب کر لینے کا اختیار مل جائے تو اس سے وہ آزاد نہیں ہو جائیں گے۔"

میرے لیے اس کے اچھے برے کاموں کا سوال ایک ثانوی سوال ہے۔ پہلا سوال خود اس کے وجود کا ہے۔ میں ایسے حاکمانہ اقتدار کو بہ اعتبار اس کی خلقت ہی کے ناجائز یقین کرتا ہوں۔ اگر وہ تمام ناانصافیاں ظہور میں نہ آتیں جو اس کثرت سے واقع ہو چکی ہیں جب بھی میرے اعتقاد میں وہ ظلم تھا۔ کیونکہ اس کی ہستی ہی سب سے بڑی ناانصافی ہے اور اس کی برائی کے لیے اس قدر کافی ہے کہ وہ موجود ہو۔ اگر وہ اچھے کام کرے تو اس کی اچھائی تسلیم کر لی جائے گی۔ لیکن اس کا وجود ناجائز اور ناانصافی ہی رہے گا۔ اگر ایک شخص ہماری جائداد پر قابض ہو کر بہت اچھے اور نیک کام انجام دے تو اس کے کاموں کی خوبی کی وجہ سے اس کا قبضہ جائز نہیں ہو جا سکتا۔

برائی میں کم و کیفیت کے اعتبار سے تقسیم کی جا سکتی ہے لیکن حسن و قبح کے اعتبار سے اس کی ایک ہی قسم ہے۔ یعنی اس اعتبار سے تقسیم ہو سکتی ہے کہ وہ کتنی ہے اور کیسی ہے؟ اس اعتبار سے نہیں ہو سکتی کہ وہ اچھی ہے یا بری ہے؟ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "زیادہ بری چوری" اور "کم بری چوری"۔ لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ "اچھی چوری" اور "بری چوری"؟ پس میں بیوروکریسی کی اچھائی اور ناجائز ہونے کا کسی حال میں بھی تصور نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ فی نفسہٖ ایک ناجائز عمل ہے البتہ اس کی برائی کم اور زیادہ ہو سکتی ہے۔ لیکن ہندوستان کی بیوروکریسی تو اتنا بھی نہ کر سکی کہ اپنی خلقی برائی ہی پر قانع رہتی۔ جب اس کی خلقی برائی پر اس کی بے شمار عملی برائیوں کا بھی برابر اضافہ ہو رہا ہے تو پھر کیوں کر اس کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کے ظلم کا اعلان نہ کیا جائے؟

اسلام اور بیوروکریسی

۹۔ میں مسلمان ہوں اور بہ حیثیت مسلمان

تو تم میں سے ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ آج سوچ لے، کیا وہ اس بات کے لیے راضی ہے کہ جس جابرانہ قوت نے انھیں گرفتار کیا ہے وہ اس براعظم میں اسی طرح قائم رہے جس طرح ان کی گرفتاری کے وقت تھی؟"

"اگر تم ملک کو آزاد کرانا چاہتے ہو تو اس کا راستہ یہ ہے۔ کہ جن چالاک دشمنوں کے پاس خون ریزی کا بے شمار سامان موجود ہے انھیں رائی برابر بھی اس کے استعمال کا موقع نہ دو اور کامل امن و برداشت کے ساتھ کام کرو۔"

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جب تقریروں میں کوئی ایسی بات کہی جاتی ہے تو اس سے مقرر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اپنے بچاؤ کا سامان کرلے، ورنہ اس کی دلی خواہش یہ نہیں ہوتی۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو لوگ آج تمھارے لیے یہ کام کر رہے ہیں، تم میں سے کوئی آدمی بھی یہ ماننے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ کہ وہ جیل جانے یا نظر بند ہونے سے ڈرتے ہیں (پس) اگر وہ یہ کہتے ہیں کہ امن و نظم کے ساتھ کام کرنا چاہیے، تو ان کا مطلب یہ نہیں (ہوسکتا) کہ اس ظالمانہ گورنمنٹ کے ساتھ وفاداری کرنی چاہتے ہیں، جو گورنمنٹ اس کی طاقت اور اس کا تخت آج دنیا میں سب سے بڑا گنا جاتا ہے۔ یقیناً وہ اس گورنمنٹ کے وفادار نہیں ہوسکتے۔"

"وہ تو صرف اس لیے یہ کہتے ہیں کہ خود تمھاری کامیابی با امن رہنے پر موقوف ہے۔ تمھارے پاس وہ شیطانی ہتھیار نہیں ہیں، جن سے یہ گورنمنٹ مسلح ہے۔ تمھارے پاس صرف ایمان ہے، دل ہے، قربانی کی طاقت ہے۔ تم انہی طاقتوں سے (اصل میں "ہتھیاروں سے" ہوگا) کام لو۔ اگر تم چاہو کہ اسلحے کے ذریعہ فتح کرو، تو تم نہیں کرسکتے۔ آج امن و سکون سے بڑھ کر (تمھارے لیے) کوئی چیز نہیں۔"

"اگر تم صرف چند گھڑیوں کے لیے گورنمنٹ کو حیران کرنا چاہتے ہو تو اس کے لیے میرے پاس بہت سے نسخے ہیں۔ اگر خدانخواستہ میں اس گورنمنٹ کا استحکام چاہتا، تو وہ نسخے بتلا دیتا۔ (لیکن) میں تو ایسی جنگ چاہتا ہوں (جو) ایک ہی دن میں ختم نہ ہوجائے بلکہ فیصلے کے آخری دن تک (جاری رہے) اور جب فیصلے کی گھڑی آجائے، تو پھر یا تو یہ گورنمنٹ باقی نہ رہے، یا تیس کروڑ (انسان) باقی نہ رہیں۔"

جو الفاظ بریکٹ کے اندر ہیں۔ وہ تقریر کی پیش کردہ کاپیوں میں نہیں ہیں۔ لیکن عبارت کے معنی ہونے کے لیے ضروری ہیں۔ میں نے اس لیے تصحیح کردی کہ پراسیکیوشن کو استدلال میں مدد ملے۔ اگر اس مقصد کے لیے پوری تقریر کی تصحیح و تکمیل ضروری ہو تو میں اسی طرح کردینے کے لیے تیار ہوں۔

ان کے علاوہ دونوں تقریروں میں لوگوں کو نان کوآپریشن کی دعوت دی ہے، مطالباتِ خلافت اور سوراج کو دہرایا ہے، پنجاب کے مظالم کو وحشیانہ کہا ہے، لوگوں کو بتلایا ہے کہ جو گورنمنٹ جلیانوالہ باغ، امرتسر میں چند منٹوں کے اندر سینکڑوں انسانوں کو قتل کرڈالے اور اس کو جائز فعل بتلائے، اس سے ناانصافی کی کوئی بات بھی بعید نہیں۔

اقرار

۶- میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف اپنی دو موقعوں پر بلکہ گذشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لیے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں فرض کی تعمیل سے اس لیے باز نہیں رہ سکتا۔ کہ وہ ۱۲۴۔ الف کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں، ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اس کے بندوں کے آگے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں۔

موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے

۷- یقیناً میں نے کہا ہے: "موجودہ گورنمنٹ ظالم ہے۔" لیکن اگر میں یہ نہ کہوں تو اور کیا کہوں؟ میں نہیں جانتا کہ کیوں مجھ سے یہ توقع کی جائے کہ ایک چیز کو اس کے اصلی نام سے نہ پکاروں۔ میں



ٹھیک اسی طرح ہر مسلمان کا بھی وظیفہ (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اسے علم و یقین دیا گیا ہے۔ ہمیشہ اس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم و جور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر و تشدد کے ذریعہ اعلانِ حق کو روکا جائے۔ تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہو جانا گوارا کر لیا جائے۔ اور "دو اور دو" کو اس لیے چار نہ کہا جائے۔ کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو سچائی اور حقیقت ہمیشہ خطرے میں پڑ جائے اور حق کے ابھرنے اور قائم رہنے کی راہ باقی نہ رہے حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق کا محتاج ہے نہ اس لیے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے جسم پر کیا گزرتی ہے؟ وہ تو حقیقت ہے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج ملے اور اس وقت بھی حقیقت ہے جب اس کے اظہار سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا۔ آگ میں ٹھنڈک اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔

شہادت علی الناس

یہی وجہ ہے کہ اسلام کی کتاب شریعت (قرآن) میں مسلمانوں کو بتلایا گیا ہے کہ وہ خدا کی زمین میں "شاہد" ہیں۔ یعنی سچائی کی گواہی دینے والے ہیں۔ بہ حیثیت ایک قوم کے یہی ان کا قومی وظیفہ (نیشنل ڈیوٹی) ہے اور یہی ان کی قومی خصلت (نیشنل کیریکٹر) ہے جو ان کو تمام پچھلی اور آئندہ قوموں میں ممتاز کرتی ہے۔ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ۔ اسی طرح پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: انتم شهداء الله فى الارض۔ (بخاری) "تم خدا کی زمین پر خدا کی طرف سے سچائی کے گواہ ہو۔" پس ایک مسلمان جب تک مسلمان ہے۔ اس گواہی کے اعلان سے باز نہیں رہ سکتا۔

کتمانِ شہادت

اگر وہ باز رہے تو یہ قرآن کی اصطلاح میں "کتمانِ شہادت" ہے یعنی گواہی کو چھپانا۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں کو خدا کی پھٹکار کا سزاوار بتلایا ہے اور بار بار کہا ہے کہ اسی کتمانِ شہادت کی وجہ سے دنیا کی بڑی بڑی قومیں برباد و ہلاک ہو گئیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ (بقرہ) لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

اسی لیے اسلام کے واجبات و فرائض میں ایک اہم فرض "امر بالمعروف" اور "نہی عن المنکر" یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا۔ قرآن نے عقیدۂ توحید کے جن کاموں پر سب سے زیادہ زور دیا ہے۔ ان میں سے ایک کام یہ ہے۔ قرآن نے بتلایا ہے کہ مسلمانوں کی تمام قومی بڑائی کی بنیاد اسی کام پر ہے وہ سب سے بڑی اور اچھی قوم اس لیے ہیں کہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی کو روکتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو وہ اپنی ساری بڑائی کھو دیں۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ

قرآن سچے مسلمان کی پہچان یہ بتاتا ہے: "وہ حق کے اعلان میں کسی سے نہیں ڈرتے۔ نہ دنیا کی لالچ ان پر غالب آ سکتی ہے نہ کوئی خوف۔ وہ طمع بھی رکھتے تو صرف خدا سے اور ڈرتے بھی ہیں تو صرف خدا سے۔"

پیغمبر اسلامؐ کے بے شمار قولوں میں سے جو اس بارے میں ہیں ایک قول یہ ہے: "نیکی کا اعلان کرو، برائی کو روکو، اگر نہ کروگے تو ایسا ہوگا کہ نہایت برے لوگ تم پر حاکم ہو جائیں گے اور خدا کا عذاب تمھیں گھیر لے گا۔ تم دعائیں مانگو گے قبول نہ ہوں گی۔" (ترمذی و طبرانی عن حذیفہ وغیر)

لیکن یہ فرض کیونکر انجام دیا جائے تو اسلام نے تین مختلف حالتوں میں اس کے تین مختلف درجے بتلائے ہیں۔ چنانچہ پیغمبر اسلامؐ نے فرمایا: "تم میں سے جو شخص برائی کی بات دیکھے تو چاہیے اپنے ہاتھ سے درست کر دے۔ اگر اس کی طاقت نہ پائے تو زبان سے اعلان کرے، اگر اس کی بھی طاقت نہ پائے تو اپنے دل میں اس کو برا سمجھے۔ لیکن یہ آخری درجہ ایمان کی بڑی ہی کمزوری کا درجہ ہے۔" (مسلم)

ہندوستان میں ہمیں یہ استطاعت نہیں



ہونے کے بھی میرا مذہبی فرض یہی ہے۔

اسلام کسی ایسے اقتدار کو جائز تسلیم نہیں کرتا جو شخصی ہو۔ یا چند تنخواہ دار حاکموں کی بیورو کریسی ہو۔ وہ آزادی اور جمہوریت کا مکمل نظام ہے جو نوعِ انسانی کو اس کی چھینی ہوئی آزادی واپس دلانے کے لیے آیا تھا۔ یہ آزادی بادشاہوں، اجنبی حکومتوں، خودغرض مذہبی پیشواؤں اور سوسائٹی کی طاقتور جماعتوں نے غصب کر رکھی تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ حق طاقت اور قبضہ ہے۔ لیکن اسلام نے ظاہر ہوتے ہی اعلان کیا کہ حق طاقت نہیں ہے بلکہ خود حق ہے اور خدا کے سوا کسی انسان کو سزاوار نہیں کہ بندگانِ خدا کو اپنا محکوم اور غلام بنائے۔ اس نے امتیاز اور بالا دستی کے تمام قومی اور نسلی مراتب یک قلم مٹا دیے اور دنیا کو بتلا دیا کہ سب انسان درجے میں برابر ہیں۔ اور سب کے حقوق مساوی ہیں۔ نسل، قومیت، رنگ، معیارِ فضیلت نہیں ہے بلکہ صرف عمل ہے اور سب سے بڑا وہی ہے جس کے سب کام اچھے ہوں۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ (سورۂ حجرات)

اسلام ایک جمہوری نظام ہے

انسانی حقوق کا یہ وہ اعلان ہے جو انقلابِ فرانس سے گیارہ سو برس پہلے ہوا۔ یہ صرف اعلان ہی نہ تھا بلکہ ایک عملی نظام تھا جو مؤرخ گبن کے لفظوں میں "اپنی کوئی مثال نہیں رکھتا تھا۔" پیغمبرِ اسلام اور ان کے جانشینوں کی حکومت ایک مکمل جمہوریت تھی اور صرف قوم کی رائے نیابت اور انتخاب سے اس کی بناوٹ ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کی اصطلاح میں جیسے جامع اور عمدہ الفاظ اس مقصد کے لیے موجود ہیں شاید ہی دنیا کی کسی زبان میں پائے جائیں۔ اسلام نے "بادشاہ" کے اختیار اور شخصیت سے انکار کیا ہے۔ اور صرف ایک رئیسِ جمہوریت (پریزیڈنٹ آف ری پبلک) کا عہدہ قرار دیا ہے لیکن اس کے لیے بھی "خلیفہ" کا لقب تجویز کیا جس کے لغوی معنی نیابت کے ہیں۔ گویا اس کا اقتدار محض نیابت ہے۔ اس سے زیادہ کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اسی طرح قرآن نے نظامِ حکومت کے لیے "شوریٰ" کا لفظ استعمال کیا: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ؕ چنانچہ ایک پوری سورت اسی نام سے قرآن میں موجود ہے۔ "شوریٰ" کے معنی باہم مشورہ کے ہیں۔ یعنی جو کام کیا جائے۔ جماعت کے باہم رائے اور مشورے سے کیا جائے۔ شخصی رائے نہ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح نام جمہوری نظام کے لیے کیا ہو سکتا ہے۔؟

قومی اور مسلم بیورو کریسی ظلم ہے

جب اسلام مسلمانوں کا یہ فرض قرار دیتا ہے کہ وہ ایسی اسلامی حکومت کو بھی منصفانہ تسلیم نہ کریں جو قوم کی رائے اور انتخاب سے نہ ہو، تو پھر ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے لیے ایک اجنبی بیورو کریسی کیا حکم رکھتی ہے۔ اگر آج ہندوستان میں ایک خالص اسلامی حکومت قائم ہو جائے، مگر اس کا نظام بھی شخصی ہو یا چند حاکموں کی بیورو کریسی ہو تو بہ حیثیت مسلمان ہونے کے اس وقت بھی میرا فرض یہی ہوگا۔ کہ اس کو ظالم کہوں اور تبدیلی کا مطالبہ کروں۔ اسلام کے علمائے حق نے ہمیشہ جابر مسلمان بادشاہوں کے خلاف ایسا ہی اعلان و مطالبہ کیا ہے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ یہ نظام بعد کو قائم نہ رہ سکا۔ مشرقی رومی حکومت اور ایرانی شہنشاہی کے پُرشوکت انسانوں نے مسلمان حکمرانوں کو گمراہ کر دیا۔ اسلامی خلیفہ کی جگہ جو بسا اوقات پھٹے پرانے کپڑوں میں ایک عام فرد کی طرح ملبوس ہوتا تھا، انھوں نے قیصر و کسریٰ بننے کو ترجیح دی۔ تاہم تاریخ اسلام کا کوئی عہد بھی ایسے مسلمانوں سے خالی نہیں رہا جنھوں نے علانیہ حکامِ وقت کی استبداد و شخصیت کے خلاف احتجاج نہ کیا ہو اور ان تمام تکلیفوں کو خوشی خوشی نہ جھیل لیا ہو جو اس راہ میں پیش آتی ہیں۔

مسلمانوں کا قومی وظیفہ

ایک مسلمان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ حق کا اعلان نہ کرے اور ظلم کو ظلم نہ کہے، بالکل ایسی ہی بات ہے، جیسے یہ کہا جائے کہ وہ اسلامی زندگی سے دست بردار ہو جائے، اگر تم کسی آدمی سے اس مطالبہ کا حق نہیں رکھتے کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ دے تو یقیناً ایک مسلمان سے یہ مطالبہ بھی نہیں کر سکتے۔ کہ وہ ظلم کو ظلم نہ کہے کیونکہ دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔

یہ تو اسلامی زندگی کا وہ عنصر ہے جس کے الگ کر دینے کے بعد اس کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خصوصیت معدوم ہو جاتی ہے۔ اسلام نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی اس بات پر رکھی ہے کہ وہ دنیا میں سچائی اور حقیقت کے گواہ ہیں۔ ایک گواہ کا فرض ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ جانتا ہے بیان کرے۔

جمعہ کے مجمع میں جب خلیفہ منبر پر خطبہ کے لیے کھڑا ہوتا اور کہتا: "اَسْمَعُوْا وَ اَطِیْعُوْا — سنو اور اطاعت کرو" تو ایک شخص کھڑا ہو جاتا اور کہتا "نہ تو سنیں گے اور نہ اطاعت کریں گے۔ کیوں؟ اس لیے کہ تمھارے جسم پر جو جبہ ہے، وہ تمھارے حصہ کے کپڑے سے زیادہ کا بنا ہوا ہے اور یہ خیانت ہے۔" اس پر خلیفہ اپنے لڑکے سے گواہی دلاتا۔ وہ اعلان کرتا کہ میں نے اپنے حصہ کا کپڑا بھی اپنے باپ کو دے دیا تھا اس سے جبہ تیار ہوا۔

قوم کا یہ طرز عمل اس خلیفہ کے ساتھ تھا جس کی صولت و سطوت نے مصر اور ایران کا تخت اُلٹ دیا تھا۔ تاہم اسلامی حکومت میں کوئی دفعہ ۱۲۴-الف نہ تھی۔

دوسرا دور شخصی استبداد-AUTOCR-ACY کا تھا جس کی پہلی ضرب آزادیٔ رائے اور آزادیٔ تقریر ہی پر پڑتی ہے لیکن اس دور میں بھی زبانوں کی بے باکی اور دلوں کی بے خوفی اسی طرح سرگرم رہی اور قید خانے کی تاریک کوٹھریاں تازیانوں کی ضرب اور جلاد کی تیغ بھی انھیں روک نہ سکی۔ پیغمبر اسلام کے ساتھی (صحابۂ کرام) جب تک زندہ رہے وقت کے جابر بادشاہوں کے ظلم کا اعلان کرتے رہے اور برابر مطالبہ کرتے رہے کہ حکومت قوم کے مشورہ اور انتخاب سے ہونی چاہیے۔ جو لوگ ان کے تربیت یافتہ تھے (تابعین) ان کا اعلان بھی بعینہٖ یہی رہا کہ درست ہو جاؤ یا مٹ جاؤ۔ امام محمد غزالیؒ نے جن کو یورپ کے مؤرخین فلسفہ بھی (ALGAZEL) کے نام سے پہچانتے ہیں اور اب میڈیم کوریلی کے ناول (ARDOTH) کے دوسرے باب نے انگریزی علم و ادب کو بھی روشناس کر دیا ہے۔ صرف ان صحابہؓ اور تابعین کا ذکر کیا ہے جو خلیفہ ہشام بن عبدالملک کے زمانے تک موجود تھے اور جنھوں نے حکمرانوں کے مظالم کا اعلان کر کے ہمیشہ منصفانہ اور نیابتی گورنمنٹ کا مطالبہ کیا تھا۔ ان کی تعداد ۲۳ سے بھی زیادہ ہے۔

ہشام بن عبدالملک نے طاؤس یمانی کو بلایا۔ وہ آئے مگر اس کا نام لے کر سلام کیا —— "امیرالمومنین" یعنی قوم کا سردار نہ کہا جو مسلمان خلفاء کا لقب تھا۔ ہشام نے سبب پوچھا تو کہا قوم تیری حکومت سے راضی نہیں۔ اس لیے تجھے امیر کہنا جھوٹ ہے۔ ہشام نے کہا "نصیحت کیجیے"۔ فرمایا: "خدا سے ڈر کیونکہ تیرے ظلم سے زمین بھر گئی"۔

مالک بن دینار بصرہ کی جامع مسجد میں اعلان کرتے تھے "ان ظالم بادشاہوں کو خدا نے اپنے بندوں کا چرواہا بنایا تھا تاکہ ان کی رکھوالی کریں۔ پر انھوں نے بکریوں کا گوشت کھا لیا، بالوں کا کپڑا بُن کر پہن لیا۔ اور صرف ہڈیاں چھوڑ دیں۔"

سلیمان بن عبدالملک جیسے ہیبت ناک خلیفہ سے ابوحازم کہتے: "ان اباك قهروا الناس بالسيف واخذ الملك عنوة من غير مشورة من المسلمين ولا رضا منهم" (تیرے باپ داداوں نے تلوار کے زور سے لوگوں کو مقہور کیا۔ اور بلا قوم کی رائے اور انتخاب کے مالک بن بیٹھے۔) سلیمان نے کہا: "اب کیا کیا جائے؟" جواب دیا: "جن کا حق ہے انھیں لوٹا دے۔" کہا: "میرے لیے دعا کیجیے" خدایا! اگر سلیمان حق پر چلے تو اسے مہلت دے، لیکن اگر ظلم سے باز نہ آئے تو پھر تو ہے اور اس کی گردن۔"

سعید بن مسیبؒ بہت بڑے تابعی تھے۔ وہ علانیہ برسربازار حکام کے ظلم و جور کا اعلان کرتے اور کہتے: "کتوں کا پیٹ بھرتے ہو مگر انسانوں کو تم سے امان نہیں۔"

اس عہد کے بعد بھی مسلمان عالموں اور پیشواؤں کی حق گوئی کا یہی عالم رہا۔ منصور عباسی کے خوف و ہیبت سے گھر میں بیٹھے ہوئے لوگ کانپا کرتے تھے۔ سفیان ثوریؒ سے ایک بار اس نے کہا: "مجھ سے اپنی کوئی حاجت بیان کیجیے۔" انھوں نے جواب دیا: "اتق الله فقد ملات الارض ظلما وجورا۔" (خدا سے ڈر۔ زمین ظلم و جور سے بھر گئی ہے۔)

جب مشہور عباسی خلیفہ، ہارون الرشید تخت نشین ہوا (جس نے فرانس کے شارلیمین کو ایک عجیب گھڑی بطور تحفہ کے بھیجی تھی اور قیصر روم کو بقول گبن "اے کتے کے بچے" کے لقب سے خط لکھا تھا۔) تو اس نے انھی سفیان ثوریؒ کو اپنے ہاتھ سے اشتیاق ملاقات کا خط لکھ کر بھیجا۔ خط میں لکھا تھا کہ میں نے تخت نشینی کی خوشی میں بے شمار مال و دولت لوگوں میں تقسیم کی ہے۔ تم بھی مجھ سے آکر ملو۔ سفیان کوفہ کی مسجد میں ایک بڑے مجمع کے اندر بیٹھے تھے کہ یہ خط پہنچا۔ لیکن انھوں نے لینے سے انکار کر دیا اور کہا: "جس چیز کو ایک ظالم کے ہاتھ نے چھوا ہے، میں اسے چھونا نہیں چاہتا۔" جب پڑھ کر سنایا گیا۔ تو اس کی پشت پر جواب لکھوا دیا۔ "خدا کے مغرور بندے! ہارون کو جس کا ذوقِ ایمان سلب ہو چکا ہے، معلوم ہو! تو نے قوم کا مال بلا کسی حق کے اپنی تخت نشینی میں لٹایا اور اس کا حال لکھ کر اپنے گناہ پر مجھے اور میرے ساتھیوں کو بھی گواہ ٹھہرایا۔ پس ہم سب کل کو اللہ کے آگے اس کی گواہی دیں گے۔ اے ہارون! تو نے انصاف و حق سے



ہے کہ اپنے ہاتھ سے گورنمنٹ کی برائیاں دُور کردیں اس لیے ہم نے دوسرا درجہ اختیار کرلیا۔

ارکانِ اربعہ

قرآن نے مسلمانوں کی اسلامی زندگی کی بنیاد چار باتوں پر رکھی ہے۔ اور بتلایا ہے کہ ہر طرح کی انسانی ترقی اور کامیابی انہی کے ذریعہ حاصل ہوسکتی ہے۔ ایمان، عملِ صالح، توصیۂ حق، توصیۂ صبر۔

"توصیۂ حق کے معنی یہ ہیں کہ ہمیشہ حق اور سچائی کی ایک دوسرے کو وصیت کرنا۔" توصیۂ صبر" کے معنی یہ ہیں کہ ہر طرح کی مصیبتوں اور رکاوٹوں کو جھیل لینے کی وصیت کرنا۔ چونکہ حق کے اعلان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مصیبتیں پیش آئیں۔ اس لیے حق کے ساتھ صبر کی وصیت بھی ضروری تھی۔ تاکہ مصیبتیں اور رکاوٹیں جھیل لینے کے لیے تیار ہو جائے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۝

اسلامی توحید اور امر بالمعروف

اسلام کی بنیاد "عقیدۂ توحید" پر ہے اور توحید کا ضد "شرک" ہے، مقصود یہ ہے کہ خدا کو اس کی ذات اور صفات میں ایک ماننا۔ شرک کے معنی یہ ہیں کہ اس کی ذات اور صفتوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کرنا۔ پس سچائی کے اظہار میں بے خوفی اور بے باکی ایک مسلمان کی زندگی کا مایۂ خمیر ہے۔ توحید مسلمانوں کو سکھلاتی ہے کہ ڈرنے اور جھکنے کی سزاوار صرف خدا ہی کی عظمت و جبروت ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں جس سے ڈرنا چاہیے یا جس کے آگے جھکنا چاہیے۔ وہ یقین کرتے ہیں کہ خدا کے سوا کسی دوسری ہستی سے ڈرنا، خدا کے ساتھ اس کو شریک کرنا، اپنے دل کے خوف و اطاعت کا حق دار ماننا ہے۔ یہ بات توحید کے ساتھ اکٹھی نہیں ہوسکتی۔

اسی لیے اسلام تمام تر بے خوفی اور قربانی کی دعوت ہے۔ قرآن جا بجا کہتا ہے: "مسلمان وہ ہے جو خدا کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ہر حال میں سچی بات کہے۔" وَلَمْ یَخْشَ اِلَّا اللّٰہَ۔

پیغمبر اسلام نے فرمایا: "سب سے بہتر موت اس آدمی کی ہے جو کسی ظالم حکومت کے سامنے حق کا اظہار کرے اور اس کی پاداش میں قتل کیا جائے۔" (ابوداؤد) وہ جب کسی آدمی سے اسلام کا عہد و قرار لیتے تھے تو ایک اقرار یہ ہوتا تھا: "میں ہمیشہ حق کا اعلان کروں گا خواہ کہیں ہوں اور کسی حالت میں ہوں۔" (بخاری و مسلم)

اسی کا نتیجہ ہے کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں حق گوئی اور حق گوئی کے لیے قربانی کی ایسی مثالیں نہیں مل سکتیں، جن سے تاریخ اسلام کا ہر باب معمور ہے۔ اسلام کے عالموں، پیشواؤں، بزرگوں، مصنفوں کے تراجم — BIOGRAPHY — تمام تر اسی قربانی کی سرگزشت ہیں۔

جن مسلمانوں کے مذہبی فرائض میں یہ بات داخل ہے کہ موت قبول کرلیں مگر حق گوئی سے باز نہ آئیں۔ ان کے لیے دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ یقیناً کوئی بڑی ڈراؤنی چیز نہیں ہوسکتا جس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات برس کی قید ہے۔

اسلام میں کوئی دفعہ ۱۲۴ نہیں

تاریخِ اسلام کے دو دَور ہیں۔ پہلا دَور پیغمبر اسلام اور ان کے چار جانشینوں کا ہے۔ یہ دَور خالص اور کامل طور پر اسلامی نظام کا تھا۔ یعنی اسلامی جمہوریت (ری پبلک) اپنی اصلی صورت میں قائم تھی۔ ایرانی شاہنشاہی اور رومی امارت ARISTOCRACY کا کوئی اثر ابھی اسلامی مساواتِ عامہ DEMOCRACY پر نہیں پڑا تھا۔ اسلامی جمہوریہ کا خلیفہ خود بھی طبقۂ عوام (ڈیموکریٹ) کا ایک فرد ہوتا تھا اور ایک عام فردِ قوم کی طرح زندگی بسر کرتا تھا وہ دارالخلافت کے ایک خس پوش چھپّر میں رہتا اور چار چار پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتا۔ اسلام کے دارالخلافت میں امریکن ری پبلک کا کوئی قصرِ سفید (وائٹ ہاؤس) نہ تھا۔

دوسرا دَور شخصی حکمرانی اور شہنشاہی کا ہے۔ جو خاندانِ بنوامیہ سے شروع ہوا۔ اس دَور میں اسلامی جمہوریت درہم برہم ہوگئی۔ قوم کے انتخاب کی جگہ طاقت اور تسلط کا دَور شروع ہوگیا۔ شاہی خاندان سے طبقۂ امراء (ارسٹوکریٹ) کی بنیاد پڑی۔ اور اسلام کے گلیم پوش خلیفہ کی جگہ شہنشاہیت کا تاج و تخت نمودار ہوگیا۔

تاہم مسلمانوں کی زبانیں جس طرح پہلے دَور کی آزادی میں بے روک تھیں۔ اسی طرح دوسرے دَور کے جبر و استبداد میں بھی بے خوف رہیں۔ میں بتلانا چاہتا ہوں کہ تعزیراتِ ہند (پینل کوڈ) کی طرح اسلامی قانون میں کوئی دفعہ ۱۲۴۔ الف نہیں۔

پہلے دور کے مسلمانوں کی حق گوئی کا یہ حال تھا کہ دارالخلافت کی ایک بڑھیا عورت خلیفۂ وقت سے برسرِ عام کہہ سکتی تھی: "اگر تم انصاف نہ کرو گے تو تکلے کی طرح تمھارے بَل نکال دیں گے۔" لیکن وہ مقدمۂ بغاوت چلانے کی جگہ خدا کا شکر ادا کرتا کہ قوم میں ایسی راست باز زبانیں موجود ہیں۔ میں

ایک خود مسلمان حکمرانوں کا ہے۔ پہلے کے لیے اسلام کا حکم ہے کہ تلوار سے مقابلہ کیا جائے۔ دوسرے کے لیے حکم ہے کہ مقابلہ نہ کیا جائے لیکن "امر بالمعروف اور اعلانِ حق" جس قدر بھی امکان میں ہو، مسلمان کرتا رہے۔ پہلی صورت میں دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہونا پڑے گا۔ دوسری صورت میں ظالم حکمرانوں کے ہاتھوں طرح طرح کی اذیتیں اور سزائیں جھیلنی پڑیں گی۔ مسلمانوں کو دونوں حالتوں میں دونوں طرح کی قربانیاں کرنی چاہییں اور دونوں کا نتیجہ کامرانی و فتح مندی ہے۔ چنانچہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مسلمانوں نے دونوں طرح کی قربانیاں کیں۔ اجنبیوں کے مقابلے میں سرفروشی بھی کی اور اپنوں کے مقابلے میں صبر و استقامت بھی دکھلائی۔ پہلی صورتوں میں جس طرح ان کی "جنگی جدوجہد" کوئی مثال نہیں رکھتی۔ اسی طرح دوسری صورت میں ان کی "شہری جدوجہد" بھی عدیم النظیر ہے۔

ہندوستان میں آج مسلمانوں نے دوسری صورت اختیار کی ہے حالاں کہ مقابلہ ان کا پہلی حالت سے ہے۔ ان کے لیے "جنگی جدوجہد" کا وقت آ گیا تھا۔ لیکن انھوں نے "شہری جدوجہد" کو اختیار کیا۔ انھوں نے "نان وائلینس" رہنے کا فیصلہ کر کے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ ہتھیار سے مقابلہ نہ کریں گے۔ یعنی صرف وہی کریں گے جو انھیں مسلمان حکومتوں کے مقابلے میں کرنا چاہیے۔ بلاشبہ اس طرزِ عمل میں ہندوستان میں ایک خاص طرح کی حالت کو بھی دخل ہے لیکن گورنمنٹ کو سوچنا چاہیے کہ اس سے زیادہ بدبخت مسلمان اور کیا کر سکتے ہیں؟ حد ہو گئی کہ اجنبیوں کے ظلم کے مقابلے میں وہ بات کر رہے ہیں جو انھیں اپنوں کے مقابلے میں کرنی تھی۔

انقلابِ حال

میں سچ کہتا ہوں کہ مجھے اس کی رائی برابر بھی شکایت نہیں کہ سزا دلانے کے لیے مجھ پر مقدمہ چلایا گیا ہے۔ یہ بات تو بہرحال ہونی ہی تھی۔ لیکن حالات کا یہ انقلاب میرے لیے بڑا ہی درد انگیز ہے کہ ایک مسلمان سے کتمانِ شہادت کی توقع کی جاتی ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ ظلم کو صرف اس لیے ظلم نہ کہے کہ دفعہ ۱۲۴۔ الف کا مقدمہ چلایا جائے گا۔

مسلمانوں کو حق گوئی کا جو نمونہ ان کی قومی تاریخ دکھلاتی ہے وہ تو یہ ہے کہ ایک جابر حکمراں کے سامنے ایک بے پروا انسان کھڑا ہے۔ اس پر الزام یہی ہے کہ اس نے حکمراں کے ظلم کا اعلان کیا۔ اس کی پاداش میں اس کا ایک عضو کاٹا جا رہا ہے۔ لیکن جب تک زبان نہیں کٹ جاتی وہ یہی اعلان کرتی رہتی ہے کہ حکمراں ظالم ہے۔ یہ واقعہ خلیفہ عبدالملک کے زمانے کا ہے جس کی حکومت افریقہ سے سندھ تک پھیلی ہوئی تھی۔ تم دفعہ ۱۲۴۔ الف کو اس سزا کے ساتھ تول سکتے ہو۔

میں اس درد انگیز اور جانکاہ حقیقت سے انکار نہیں کرتا کہ اس انقلابِ حالت کے ذمہ دار خود مسلمان ہی ہیں۔ انھوں نے اسلامی زندگی کے تمام خصائص کھو دیے اور ان کی جگہ غلامانہ زندگی کے تمام رذائل قبول کر لیے۔ ان کی موجودہ حالت سے بڑھ کر دنیا میں اسلام کے لیے کوئی فتنہ نہیں۔ جب کہ میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں تو میرا دل شرمندگی کے غم سے پارہ پارہ ہو رہا ہے کہ اسی ہندوستان میں وہ مسلمان بھی موجود ہیں جو ایمانی کمزوری کی وجہ سے علانیہ ظلم کی پرستش کر رہے ہیں۔

آزادی یا موت

لیکن انسانوں کی بدعملی سے تعلیم کی حقیقت نہیں جھٹلائی جا سکتی۔ اسلام کی تعلیم اس کی کتاب میں موجود ہے۔ وہ کسی حال میں بھی جائز نہیں رکھتی کہ آزادی کھو کر مسلمان زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہیے یا آزاد رہنا چاہیے۔ تیسری راہ اسلام میں کوئی نہیں۔

اسی لیے میں نے آج سے بارہ سال پہلے "الہلال" کے ذریعہ مسلمانوں کو یاد دلایا تھا کہ آزادی کی راہ میں قربانی و جاں فروشی ان کا قدیم ورثہ ہے۔ ان کا اسلامی فرض یہ ہے کہ ہندستان کی تمام جماعتوں کو اس راہ میں پیچھے چھوڑ دیں۔ میری صدائیں بے کار نہ گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کر لیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں گے۔

مسئلہ خلافت و پنجاب

۱۰۔ میں یہاں گورنمنٹ کی ان ناانصافیوں کا افسانہ نہیں چھیڑوں گا جو "مسئلہ خلافت" اور "مظالم پنجاب" کا عالمگیر افسانہ ہیں۔ لیکن میں اقرار کروں گا کہ گزشتہ دو سال کے اندر کوئی صبح و شام مجھ پر ایسی نہیں گزری ہے کہ جس میں میں نے "خلافت" اور "پنجاب" کے لیے گورنمنٹ کے مظالم کا اعلان نہ کیا ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے جو گورنمنٹ اسلامی خلافت کو پامال کر رہی ہو اور مظالم پنجاب کے لیے کوئی تلافی اور شرمندگی نہ رکھتی ہو۔ ایسی گورنمنٹ کے لیے کسی ہندوستانی کے دل میں وفاداری نہیں ہو سکتی۔



کنارہ کیا۔ تو نے پسند کیا۔ کہ ظالم بنے اور ظالموں کی سرداری پائے۔ تیرے حاکم بندگانِ خدا کو ظلم و جور سے پامال کر رہے ہیں اور تو تختِ شاہی پر عیش و عشرت کر رہا ہے۔" ہارون نے جب یہ خط پڑھا تو بے اختیار رونے لگا اور کہا: "یہ خط ہمیشہ میرے ساتھ رہے گا۔"

مسلمان عالموں اور اماموں پر موقوف نہیں، اس عہد کا ہر عام فرد بھی اس اعلان میں بے خوف تھا۔ منصور عباسی ایک دن کعبہ کا طواف کر رہا تھا۔ آواز آئی کہ کوئی شخص دعا مانگ رہا ہے: "خدایا میں تیرے آگے فریاد کرتا ہوں، ظلم غالب آگیا ہے اور حق اور حقداروں کے درمیان روک بن گیا ہے۔" منصور نے اس شخص کو بلا کر پوچھا وہ کون ہے جس کا ظلم روک بن گیا ہے؟ کہا: "تیرا وجود اور تیری حکومت۔"

حجاج بن یوسف کا ظلم و ستم تاریخِ اسلام کا نہایت مشہور واقعہ ہے۔ لیکن اس کی بے پناہ تلوار بھی مسلمانوں کی حق گوئی پر غالب نہ آسکی۔ حطیط جب گرفتار ہو کر آیا۔ پوچھا: "اب میرے لیے کیا کہتے ہو؟" اس نے کہا: "تو خدا کی زمین پر اس کا سب سے بڑا دشمن ہے۔" پوچھا: "خلیفہ کے لیے کیا کہتے ہو؟" کہا: "اس کا جرم تجھ سے بھی زیادہ ہے۔ تیرا ظلم تو اس کے بے شمار ظلموں میں سے ایک ظلم ہے۔"

مامون الرشید کے عہد میں ایسے مسلمان موجود تھے جو پکار پکار کر برسرِ دربار کہتے: "یا ظالم! انا ظالم ان لم اقل لک یا ظالم! — "اے ظالم! میں ظالم ہوں اگر تجھے ظالم کہہ کر نہ پکاروں۔"

فتنۂ تاتار اور فتنۂ یورپ

یہ تو تاریخِ اسلام کے ابتدائی اوراق ہیں۔ لیکن اس عہد کے بعد بھی ہر دور کا یہی حال رہا۔ مسلمانوں کے لیے موجودہ عہد کا عالمگیر فتنہ کوئی پہلا واقعہ نہیں ہے۔ وہ ایک ایسے سیلاب میں ڈوب کر اچھل چکے ہیں جس طرح آج یورپ اور علی الخصوص انگلستان کے ظہور و تسلط سے تمام ایشیا اور اسلامی ممالک کی آزادی کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح پندرھویں صدی مسیحی میں بھی تاتاریوں کے وحشیانہ تسلط سے ظہور میں آیا تھا۔ یورپ کے فتنہ کا آخری نتیجہ عثمانی خلافت کی پامالی اور ایشیائے کوچک کا قتلِ عام ہے۔ تاتاری فتنہ کی آخری وحشت ناکی عباسی خلافت کا خاتمہ اور بغداد کا قتلِ عام تھا۔ تاتاری انسان نہیں تھے، درندے تھے۔ تاہم ہلاکو خاں، منکو خاں، اباقاآن خاں جیسے سفاکوں کے زمانے میں بھی وہ مسلمان موجود رہے جن کی زبانیں، اعلان میں ان کی تلواروں سے بھی زیادہ تیز تھیں۔ شیخ سعدی شیرازی نے (جن کی "گلستان" کا نام اس کورٹ نے بھی سنا ہوگا) ہلاکو خاں کے منھ پر اسے ظالم کہا۔ شمس الدین نیازی نے منکو خاں کے دربار میں اس کی ہلاکت کی دعا مانگی۔ شیخ الاسلام احمد بن تیمیہ نے اباقاآن پر برسرِ دربار لعنت بھیجی۔ تاتاریوں کے پاس بے دریغ قتل کر دینے کا قانون تھا۔ تاہم "تورۂ چنگیز خانی (قوانینِ چنگیز خاں) میں کوئی دفعہ ۱۲۴-الف نہ تھی۔

"حجاج" اور "ریڈنگ"

"ہم مسلمانوں کا جب اپنی قومی گورنمنٹوں کے ساتھ (جن کی اطاعت از روئے شرع ہم پر واجب ہے) ایسا سلوک رہا ہے تو پھر ایک اجنبی گورنمنٹ کے کارندے ہم سے کیا امید رکھتے ہیں؟ کیا ہندوستان کی "از روئے قانون قائم شدہ" گورنمنٹ ہمارے لیے اس گورنمنٹ سے بھی زیادہ محترم ہے جو "از روئے اسلام" واجب اطاعت ہے۔ کیا انگلستان کی بادشاہت اور لارڈ ریڈنگ کی نیابت، عبدالملک کی خلافت اور حجاج بن یوسف کی نیابت سے بھی ہمارے لیے زیادہ مقتدر ہو سکتی ہے؟ اگر ہم "اجنبی و غیر مسلم" اور "قومی و مسلم" کا عظیم الشان اور شرعی فرق بالکل نظر انداز کر دیں جب بھی ہم سے یہی امید کی جاسکتی ہے؟ کہ جو کچھ حجاج بن یوسف اور خالد قسری کی گورنمنٹوں کے لیے کہہ چکے ہیں، وہی "چیمسفورڈ اور ریڈنگ" کی گورنمنٹوں کے لیے بھی کہیں۔ ہم نے ان سے کہا تھا: "اِتَّقُوا اللّٰهَ فَقَدْ مَلَأْتَ الْأَرْضَ ظُلْمًا وَّجَوْرًا"۔ خدا سے ڈرو کیونکہ تمھارے ظلم سے زمین بھر گئی ہے یہی ہم آج بھی کہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنی کمزوری اور بے بسی کی وجہ سے آج ہندوستان میں جو کچھ کر رہے ہیں، وہ دراصل قومی حکمرانوں کے ظلم و جور کے لیے ہمیں بتلایا گیا تھا۔ نہ کہ ایک اجنبی قبضہ و تصرف کے مقابلہ میں۔ اگر برٹش گورنمنٹ کے ارکان اس حقیقت کو سمجھتے، تو انھیں تسلیم کرنا پڑتا کہ مسلمانوں کے نصائح اور درگذر کی حد ہو گئی ہے۔ اس سے زیادہ اسلام کو برطانیہ کے لیے نہیں چھوڑ سکتے۔

اسلام نے حکمرانوں کے ظلم کے مقابلے میں دو طرح کے طرزِ عمل کا حکم دیا ہے۔ کیونکہ حالتیں بھی دو مختلف ہیں۔ ایک ظلم اجنبی قبضہ و تسلط ہے۔

کو آزادی و حق طلبی کی تعلیم دے رہا ہوں بیری ۱۸ برس کی عمر تھی جب میں نے اس راہ میں تقریر و تحریر شروع کی۔ میں نے زندگی کا بہترین حصّہ یعنی عہدِ شباب صرف اسی مقصد کے عشق میں قربان کر دیا۔ میں اسی کی خاطر چار سال تک نظربند رہا۔ مگر نظربندی میں بھی میری ہر صبح و شام اسی کی تعلیم و تبلیغ میں بسر ہوئی۔ "رانچی" کے در و دیوار اس کی شہادت دے سکتے ہیں۔ جہاں میں نے نظربندی کا زمانہ بسر کیا ہے۔ یہ تو میری زندگی کا دائمی مقصد ہے۔ میں صرف اسی ایک کام کے لیے جی سکتا ہوں: إِنَّ صَلَاتِي وَنُسُكِي وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِي لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ

آخری اسلامی تحریک

۱۳۔ میں اس "جرم" سے کیوں انکار کر سکتا ہوں جب کہ میں ہندوستان کی اس آخری "اسلامی تحریک" کا داعی ہوں جس نے مسلمانانِ ہند کے پولیٹیکل مسلک میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا۔ اور بالآخر وہاں تک پہنچا دیا جہاں آج نظر آ رہے ہیں۔ یعنی ان میں سے ہر فرد میرے اس جرم میں شریک ہو گیا ہے۔ میں نے ۱۹۱۲ء میں اردو جرنل "الہلال" جاری کیا جو اس تحریک کا آرگن تھا اور جس کی اشاعت کا تمام تر مقصد وہی تھا جو اوپر ظاہر کر چکا ہوں۔ یہ امر واقع ہے کہ "الہلال" نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں بالکل ایک نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو بھائیوں کی پولیٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اس کی مخالفت کے لیے بیوروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے انھیں اس فریب میں مبتلا رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے، ہندوستان اگر آزاد ہو گیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہو جائے گی۔ مگر "الہلال" نے مسلمانوں کو تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بے خوف ہو کر ہندوؤں کے ساتھ مل جانے کی دعوت دی۔ اسی سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریکِ خلافت و سوراج ہے۔ بیوروکریسی ایک ایسی تحریک کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے پہلے "الہلال" کی ضمانت ضبط کی گئی۔ پھر جب "البلاغ" کے نام سے دوبارہ جاری کیا گیا تو ۱۹۱۶ء میں گورنمنٹ آف انڈیا نے مجھے نظربند کر دیا۔

میں بتلانا چاہتا ہوں کہ "الہلال" تمام تر "آزادی یا موت" کی دعوت تھی۔ اسلام کی مذہبی تعلیمات کے متعلق اس نے جس مسلک پر بحث و نظر کی بنیاد ڈالی۔ اس کا ذکر یہاں غیر ضروری ہے۔ صرف اس قدر اشارہ کروں گا کہ ہندوؤں میں آج مہاتما گاندھی مذہبی زندگی کی جو روح پیدا کر رہے ہیں "الہلال" اس کام سے ۱۹۱۴ء میں فارغ ہو چکا تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کی نئی اور طاقتور سرگرمی اسی وقت شروع ہوئی۔ جب دونوں میں مغربی تہذیب کی جگہ مذہبی تعلیم کی تحریکوں نے فروغ پا لیا۔

خلافت کانفرنس کلکتہ

۱۴۔ چار سال کے بعد پہلی جنوری ۱۹۲۰ء کو میں رہا کیا گیا۔ اس وقت سے گرفتاری کے لمحہ تک میرا تمام وقت انہی مقاصد کی اشاعت اور تبلیغ میں صرف ہوا ہے۔ ۲۸ اور ۲۹ فروری ۱۹۲۰ء کو اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں خلافت کانفرنس کا جلسہ ہوا تھا اور مسلمانوں نے مجبور ہو کر اپنا آخری اعلان کر دیا تھا۔

"اگر برٹش گورنمنٹ نے مطالباتِ خلافت کی اب بھی سماعت نہ کی تو مسلمان اپنے شرعی احکام سے مجبور ہو جائیں گے۔ کہ تمام وفادارانہ تعلقات منقطع کر لیں۔"

میں اس کانفرنس کا پریزیڈنٹ تھا۔

میں نے اس کے طولانی پریزیڈنشل ایڈریس میں وہ تمام امور بہ تفصیل بیان کر دیے تھے جو اس قدر ناقص شکل میں ان دو تقریروں کے اندر دکھلائے گئے ہیں۔

موالات اور فوجی ملازمت

میں نے اسی ایڈریس میں اس اسلامی حکم کی بھی تشریح کر دی تھی، جس کی بنا پر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ موجودہ حالت میں گورنمنٹ سے "ترکِ موالات" کریں۔ یعنی کوآپریشن اور اعانت سے ہاتھ کھینچ لیں۔ یہی "ترکِ موالات" ہے جو آگے چل کر "نان کوآپریشن" کی شکل میں نمودار ہوا اور مہاتما گاندھی جی نے اس کی سربراہی کی۔

اسی کانفرنس میں فوج کے متعلق وہ ریزولیوشن منظور ہوا تھا جس میں اسلامی قانون کے بموجب مسلمانوں کے لیے فوجی نوکری ناجائز بتلائی گئی تھی۔ کیونکہ گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ملکوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ کراچی کا مقدمہ اسی ریزولیوشن کی بنا پر



گورنمنٹ کی جگہ وہ ایک فریق محارب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس پر قائم رہیں گے۔ جب تک انھیں اپنا مذہب اور مذہب کے اٹل احکام عزیز ہیں۔

مسلمانوں کو یقین ہوگیا ہے کہ وہ حق و انصاف چاہتے ہیں تو اس کی راہ صرف ایک ہی ہے۔ سوراج کا حصول یعنی ایسی گورنمنٹ کا حصول جو ہندوستانیوں کی ہو، ہندوستان میں ہو اور ہندوستان کے لیے ہو۔

اگر ظلم نہیں تو کیا عدل ہے؟

۱۱۔ غرضکہ اس بارے میں میرا اقرار بالکل صاف اور واضح ہے موجودہ گورنمنٹ محض ایک ناجائز بیوروکریسی ہے۔ وہ کروڑوں انسانوں کی مرضی اور خواہش کے لیے محض نفی ہے۔ وہ ہمیشہ انصاف اور سچائی پر پرسٹیج کو ترجیح دیتی ہے۔ وہ جلیانوالہ باغ امرتسر کا وحشیانہ قتلِ عام جائز رکھتی ہے۔ وہ انسانوں کے لیے اس حکم میں کوئی ناانصافی نہیں مانتی۔ کہ چارپایوں کی طرح پیٹ کے بل چلائے جائیں، وہ بے گناہ لڑکوں کو صرف اس لیے تازیانے کی ضرب سے بے ہوش ہوجانے دیتی ہے کہ کیوں ایک بت کی طرح "یونین جیک" کو سلام نہیں کرتے؟ وہ تیس کروڑ انسانوں کی پیہم التجاؤں پر بھی اسلامی خلافت کی پامالی سے باز نہیں آتی، وہ اپنے تمام وعدوں کے توڑ دینے میں کوئی عیب نہیں سمجھتی، وہ سمرنا اور تھریس کو صریح نامنصفانہ طور پر یونانیوں کے حوالہ کردیتی ہے۔ اور پھر میں نے ۱۳ر دسمبر ۱۹۱۸ء کو (جب میں رانچی میں گورنمنٹ آف انڈیا کے حکم سے نظربند تھا) لارڈ چیمسفورڈ کو ایک مفصل چٹھی لکھی تھی۔ اس میں واضح کردیا تھا کہ خلافت اور جزیرۃ العرب کے بارے میں اسلامی احکام کیا ہیں؟ میں نے لکھا تھا کہ اگر برٹش گورنمنٹ اسلامی خلافت اور اسلامی ممالک پر خلافِ وعدہ منصرف ہوگئی۔ تو اسلامی قانون کی رو سے ہندوستانی مسلمان ایک انتہائی کشمکش میں مبتلا ہوجائیں گے۔ ان کے لیے صرف دو ہی راہیں رہ جائیں گی۔ یا اسلام کا ساتھ دیں یا برٹش گورنمنٹ کا۔ وہ مجبور ہونگے کہ اسلام کا ساتھ دیں۔

بالآخر وہی ہوا۔ گورنمنٹ صریح وعدہ خلافی سے باز رہی۔ اس وعدہ کا بھی ایفا ضروری نہ سمجھا گیا جو گورنمنٹ آف انڈیا نے ۲ر نومبر ۱۹۱۴ء کے اعلان میں کیا تھا اور وہ وعدہ بھی فریب وقت ثابت ہوا جو مسٹر لائیڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے ۵ر جنوری ۱۹۱۸ء کو ہاؤس آف کامنس کی تقریر میں کیا تھا۔ شریف آدمیوں کے لیے وعدہ خلافی عیب ہے۔ لیکن طاقتور حکومتوں کے لیے کوئی بات بھی عیب نہیں ہے۔

اس حالت نے مسلمانوں کے لیے آخری درجہ کی کشمکش پیدا کردی۔ اسلامی قانون کی رو سے کم از کم بات جو ان کے فرائض میں داخل تھی، یہ تھی کہ ایسی گورنمنٹ کی اعانت اور کوآپریشن سے ہاتھ کھینچ لیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ وہ اس وقت تک تمام اسلامی آبادی کے قتل و غارت کا تماشا دیکھتی ہے۔

انصاف کی پامالی میں اس کی جرأت اس حد تک اور دلیری بالکل بے باک ہے اور حقیقت کو جھٹلاتے ہوئے اس کے منہ میں کوئی لگام نہیں۔ سمرنا میں ۸۰ فیصدی مسلمانوں کی آبادی ہے، مگر وزیر اعظم بغیر کسی شرمندگی کے مسیحی آبادی کی کثرت کا اعلان کردیتا ہے۔ یونانی حکومت تمام اسلامی آبادی کو خون اور آگ کے سیلاب میں غرق کردیتی ہے لیکن وہ بے دھڑک ترکی مظالم کی داستانیں بیان کردیتا ہے۔ اور خود انگلستان کے بھیجے ہوئے امریکن کمیشن کی رپورٹ پوشیدہ کردی جاتی ہے۔

پھر نہ تو ان تمام مظالم و جرائم کے لیے اس کے پاس اعتراف ہے، نہ تلافی۔ بلکہ ملک کی جائز اور با امن جد وجہد کو پامال کرنے کے لیے ہر طرح کا جبر و تشدد شروع کردیا جاتا ہے اور سب کچھ کیا جاتا ہے جو گزشتہ ایک سال کے اندر ہوچکا ہے اور ۱۸ر نومبر سے اس وقت تک ملک کے ہر حصہ میں ہو رہا ہے۔ میں اگر ایسی گورنمنٹ کو "ظالم" اور "یا درست ہوجاؤ یا مٹ جاؤ" نہ کہوں تو کیا "عادل" اور "نہ درست ہو نہ مٹو" کہوں؟

کیا صرف اس لیے کہ ظالم طاقت ور ہے اور اس کے پاس جیل ہے اس کا حق دار ہوجاتا ہے کہ اس کا نام بدل دیا جائے؟ میں اٹلی کے نیک اور حریت پسند جوزف میزینی MAZZINI کی زبان میں کہوں گا: "ہم صرف اس لیے کہ تمھارے ساتھ عارضی طاقت ہے، تمھاری برائیوں سے انکار نہیں کر سکتے۔"

"جرم" کا قدیم اور ناقابلِ شمار ارتکاب

۱۲۔ میں نہایت متعجب ہوں کہ میرے خلاف صرف یہی دو ناتمام اور ناکافی تقریریں کیوں پیش کی گئیں؟ کیا ان ہزاروں صفحات سے جو میرے قلم سے نکل چکے ہیں اور ان بے شمار تقریروں سے جن کی صدائیں ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں گونج چکی ہیں۔ صرف یہی سرمایہ گورنمنٹ پہنچا سکی؟ میں اقرار کرتا ہوں کہ میری کوئی تقریر دو سال کے اندر ایسی نہیں ہوئی ہے جس میں یہ تمام باتیں میں نے بیان نہ کی ہوں۔ میں متصل بارہ سال سے اپنی قوم و ملک



ہیں۔ گرامر اور محاورہ دونوں سے انھیں یک قلم انکار ہے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ رپورٹر تقریر سمجھنے اور قلم بند کرنے سے عاجز تھا۔ اس لیے درمیان سے جملوں کے جملے چھوڑتا جاتا ہے اور تمام حروف ربط و تعلیل تو بالکل ہی حذف کر دیے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ تمام وہ الفاظ جن کی آواز یا اسپیلنگ (املا) میں ذرا سا بھی تشابہ ہے، بالکل ہی بدل گئے ہیں اور عبارت یا تو بے معنی ہو گئی ہے یا محرف۔

مثلاً میں نے یکم جولائی کی تقریر میں مشہور فرنچ شاعر اور ادیب وکٹر ہیوگو کا قول نقل کیا تھا:

"وہ آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو۔"

مختصر نویس نے "ظلم" کی جگہ "دھرم" لکھ دیا ہے جو صریح غلط اور بے موقع ہے البتہ اس کی آواز "ظلم" سے مشابہ ہے۔

اسی طرح ایک مقام پر ہے۔

"انھوں نے جیل خانے کی مصیبت کو برباد کیا ہے۔"

حالانکہ مصیبت کو برباد کرنے کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ غالباً میں نے "برداشت کیا ہے" کہا ہوگا۔ یعنی انھوں نے جیل کی مصیبت جھیل لی ہے۔ چونکہ دونوں لفظوں کی آواز ملتی جلتی ہے اور مختصر نویس خود فہم و امتیاز سے محروم ہے، اس لیے "برداشت" کی جگہ "برباد" لکھ گیا۔

اُردو مختصر نویسی

اصل یہ ہے کہ اردو مختصر نویسی کا قاعدہ اور مختصر نویس کی ناقابلیت دونوں ان نقائص کے لیے ذمہ دار ہیں۔

اردو مختصر نویسی کا قاعدہ ۱۹۰۵ء میں کرسچین کالج لکھنؤ کے دو پروفیسروں نے ایجاد کیا۔ جن میں سے ایک کا نام مرزا محمد ہادی بی اے ہے۔ میں اس وقت لکھنؤ ہی میں تھا، اس لیے مجھے ذاتی طور پر اس کے دیکھنے اور موجدوں سے گفتگو کرنے کا بار بار اتفاق ہوا۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے موجدوں نے انگریزی علامات کو بہت تھوڑے سے تغیر کے ساتھ منتقل کر لیا ہے لیکن وہ اردو حروف و املا کو پوری طرح محفوظ کر دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ خود انھیں بھی اس نقص کا ایک حد تک اعتراف تھا۔ لیکن وہ خیال کرتے تھے کہ مختصر نویس کی ذہنی قابلیت اور حافظہ و مناسبت سے اس کی تلافی ہو جائے گی۔ میں اپنے ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ تجربے سے ان کا خیال درست نہ نکلا۔

صوبجاتِ متحدہ کی گورنمنٹ نے ابتدائی تجربے کے لیے دو پولیس انسپکٹروں کو تعلیم دلائی تھی۔ انھوں نے سب سے پہلے آزمائشی طور پر جن پبلک تقریروں کو قلم بند کیا۔ میں غالباً بتانا چاہتا ہوں کہ وہ میری اور شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی مرحوم کی تقریریں تھیں۔ ہم دونوں نے انجمن اسلامیہ ہردوئی کے سالانہ جلسے میں لکچر دیے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نے فی منٹ ساٹھ لفظوں کی رفتار سے تقریر کی تھی اور میری تقریر فی منٹ ۸۰ سے ۹۰ تک تھی۔ جیسا کہ خود مختصر نویسوں نے ظاہر کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی تیز رفتار نہ تھی۔ تاہم جب انھوں نے اپنا کام مرتب کر کے دکھلایا تو بالکل ناقص اور غلط تھا۔ اس کے بعد بھی مجھے بارہا اپنی تقریروں کے قلم بند کرانے کا اتفاق ہوا لیکن ہمیشہ ایسا ہی نتیجہ نکلا۔ ابھی حال کی بات ہے کہ خلافت کانفرنس آگرہ میں میرا زبانی پریذیڈنشل ایڈریس ایک مشتاق مختصر نویس سید غلام حسن نے قلم بند کیا جو مدت تک یو۔ پی کے محکمہ سی آئی ڈی میں کام کرنے کے بعد مستعفی ہوا ہے لیکن جب لانگ ہینڈ میں مرتب کر کے مجھے دکھلایا گیا تو اس کا کوئی حصہ صحیح اور مکمل نہ تھا۔

یہ تو اصل قاعدہ کا نقص ہے۔ لیکن جب اس پر مختصر نویس کی نااہلیت کا بھی اضافہ ہو جائے تو پھر کوئی خرابی ایسی نہیں ہے جس سے انسانی تقریر مسخ نہ کی جا سکے۔ کلکتہ اور بنگال کی مخصوص حالت نے اس نقص کو اور زیادہ تر مصیبت بنا دیا ہے۔ یہاں کے دیسی اور یورپین افسر خود اردو زبان سے بالکل واقفیت نہیں رکھتے۔ حتیٰ کہ معمولی طور پر بول بھی نہیں سکتے۔ ان کے نزدیک ہر وہ آدمی جو انگریزی زبان سے کسی مختلف لہجہ میں آواز نکالے اردو اسکالر ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پولیس اور عدالت ان رپورٹروں اور مختصر نویسوں کو بطور سند کے استعمال کر رہی ہے، جن بیچاروں کی استعداد پر ہمیشہ ہم لوگ تمسخر کیا کرتے ہیں۔

میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کلکتہ کی پولیس اور عدالتوں میں ایک شخص بھی اردو زبان کے لیے قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ اگر یہاں اس حقیقت کا کچھ بھی احساس ہوتا تو صرف یہی بات بطور ایک عجیب واقعہ کے خیال کی جاتی۔ کہ میری تقریروں کے لیے پولیس اور سی آئی ڈی کے غریب رپورٹروں کی شہادت لی جا رہی ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ کم از کم یہ منظر ضرور میرے لیے تکلیف دہ ہے۔

مشرقی لٹریچر اور سرکاری وسائل علم

یہ کہنا ضروری نہیں کہ میں اپنے ڈیفنس کی غرض سے ان تنہا دقتوں کی بے اعتمادی ثابت نہیں

چلایا گیا۔ میں بار بار اخبارات اور تقریروں میں اعلان کر چکا ہوں۔ کہ یہ ریزولیوشن سب سے پہلے میں نے ہی تیار کیا تھا اور میری ہی صدارت میں تین دفعہ منظور ہوا۔ سب سے پہلے کلکتہ میں پھر بریلی اور لاہور میں۔ پس اس جرم کی تعزیر کا بھی پہلا حق دار میں ہی ہوں۔

میں نے اس ایڈریس کو مزید اضافہ کے بعد کتاب کی شکل میں بھی مرتب کیا۔ جو انگریزی ترجمہ کے ساتھ بار بار شائع ہو چکا ہے اور گویا میرے "جرائم" کا ایک تحریری ریکارڈ ہے۔

میری زندگی سرتاسر ۱۲۴۔ الف

۱۵۔ میں نے گذشتہ دو سال کے اندر تنہا اور مسٹر گاندھی کے ساتھ تمام ہندوستان کا بار بار دورہ کیا۔ کوئی شہر ایسا نہیں ہے جہاں میں نے خلافت، پنجاب سوراج اور نان کواپریشن پر بار بار تقریریں نہ کی ہوں اور وہ تمام باتیں نہ کہی ہوں جو میری ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔

دسمبر ۱۹۲۰ء میں انڈین نیشنل کانگرس کے ساتھ آل انڈیا خلافت کانفرنس کا بھی اجلاس ہوا۔ اپریل ۱۹۲۱ء میں جمعیتہ العلماء کا بریلی میں جلسہ ہوا۔ گزشتہ اکتوبر میں یو۔ پی پراونشل خلافت کانفرنس آگرہ میں منعقد ہوئی۔ نومبر میں آل انڈیا علماء کانفرنس کا لاہور میں اجلاس ہوا۔ ان تمام کانفرنسوں کا بھی میں ہی صدر تھا۔ لیکن ان میں بھی تمام مقررین نے جو کچھ کہا اور صدارتی تقریروں میں میں نے جو خیالات ظاہر کیے ان سب میں وہ تمام باتیں موجود تھیں، جو ان دو تقریروں میں دکھلائی گئی ہیں۔ بلکہ میں اقرار کرتا ہوں کہ ان سے بہت زیادہ قطعی و واضح خیالات ظاہر کیے گئے تھے۔

اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴۔ الف کا جرم ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ پہلی اور پندرھویں جولائی ہی کا ارتکاب کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ ۹ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقع اس کا شمار میرے لیے ناممکن ہو گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۲۴۔ الف کے اور کوئی کام نہیں کیا۔

نان وایلنس نان کواپریشن

۱۶۔ ہم نے آزادی اور حق طلبی کی اس جنگ میں "نان وایلنس نان کواپریشن" کی راہ اختیار کی ہے۔ ہمارے مقابلے میں طاقت اپنے تمام جبر و تشدد اور خون ریز وسائل کے ساتھ کھڑی ہے لیکن ہمارا اعتقاد صرف خدا پر ہے اور اپنی غیر مختتم قربانی اور غیر متزلزل استقامت پر۔ مہاتما گاندھی کی طرح میرا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ کسی حال میں بھی ہتھیار کا مقابلہ ہتھیار سے نہیں کرنا چاہیئے۔ اسلام نے جن حالتوں میں اس کی اجازت دی ہے میں اسے فطرتِ الٰہی اور عدل و اخلاق کے مطابق یقین کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی ہندوستان کی آزادی اور موجودہ جدوجہد کے لیے مہاتما گاندھی کے تمام دلائل سے متفق ہوں اور ان دلائل کی سچائی پر پورا اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یقین ہے کہ ہندوستان نان وایلنس جدوجہد کے ذریعہ فتح مند ہو گا اور اس کی فتح مندی اخلاقی و ایمانی فتح مندی کی یادگار مثال ہو گی۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ لوگوں کو با امن جدوجہد کی تلقین کی اور اسی کو کامیابی کی سب سے پہلی شرط قرار دیا۔ خود یہ تقریریں بھی اسی موضوع پر تھیں جیسا کہ پیش کردہ نقول سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ میں ان چند مسلمانوں میں سے ہوں جو بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اگر انھوں نے نہایت مضبوطی کے ساتھ مسلمانوں کو با امن جدوجہد پر قائم نہ رکھا ہوتا تو نہیں معلوم مسئلہ خلافت کی وجہ سے ان کا صبر آزما اضطراب کیسی خوفناک شکل اختیار کر لیتا؟ کم از کم ہندوستان کے ہر حصہ میں "مالی بار" کا منظر تو ضرور نظر آجاتا۔

سی آئی ڈی کے رپورٹر

۱۷۔ اب جبکہ میں ان دو تقریروں کے تمام ان حصوں کا اقرار کر چکا ہوں جن سے پراسیکیوشن استدلال کر سکتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں اگر چند الفاظ ان کی پیش کردہ صورت کی نسبت بھی کہہ دوں۔

سی آئی ڈی کے گواہوں نے بیان کیا ہے کہ میری تقریروں کے نوٹس بھی لیے گئے اور مختصر نویسی کے ذریعہ بھی قلم بند کی گئیں۔ جو کاپی داخل کی گئی ہے (اگزوبیٹ اے اور سی) وہ مختصر نویس کی مرتب کی ہوتی ہے۔ لیکن یہ میری تقریروں کی ایسی مسخ شدہ صورت ہے کہ اگر چند ناموں اور واقعات کی طرف اشارہ نہ ہوتا تو میرے لیے شناخت کرنا بھی بہت مشکل تھا۔ وہ بلاشبہ ایک چیز ہے جو دُور تک پھیلتی ہوئی چلی گئی ہے۔ لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا چیز ہے؟ محض بے جوڑ، بے تعلق، اور اکثر مقامات پر بے معنی جملے ہیں۔ جو بغیر کسی ربط اور سلسلہ کے صفحوں پر بکھیر دیے گئے



میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ تاریخ نے اس بارے میں انسانی ظلم و تعدی کے جو ہیبت ناک مناظر دکھلائے ہیں، ان کے مقابلے میں موجودہ جبر و تشدد کسی طرح بھی زیادہ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ کمی اس لیے ہے کہ ظلم زیادہ مکمل نہیں؟ مستقبل اس کو واضح کر دے گا۔

جس طرح اس کشمکش کا آغاز ہمیشہ یکساں طور پر ہوا ہے اسی طرح خاتمہ بھی ایک ہی طرح ہوا ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اگر ہمارا جذبۂ آزادی و حق طلبی سچا اور اٹل ثابت ہوا تو یہی گورنمنٹ جو آج ہمیں مجرم ٹھہرا رہی ہے، کل کو فتح مند محب الوطنوں کی طرح ہمارے استقبال پر مجبور ہوگی۔

بغاوت

۱۹۔ مجھ پر سڈیشن کا الزام عاید کیا گیا ہے لیکن مجھے "بغاوت" کے معنی سمجھ لینے دو۔ کیا "بغاوت" آزادی کی اس جدوجہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابلِ احترام حب الوطنی بھی ہے جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے لیکن آج ڈی ویرا اور گریفتھ کے لیے برطانیہ عظمیٰ کونسا لقب تجویز کرتی ہے۔

اسی آئرلینڈ کے پارنل PARNAL نے ایک مرتبہ کہا تھا: "ہمارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کرنا ہے۔

قانون "قضاء بالحق"

۲۰۔ میں مسلمان ہوں اور میرے یقین کے لیے وہ بس کرتا ہے جو میری کتاب شریعت نے بتلایا ہے۔ قرآن کہتا ہے: جس طرح مادہ اور اور اجسام میں انتخاب طبیعی NATURAL SELECTION اور بقاء اصلح SUPROVIS-UAL OF THE FITTEST کا قانون جاری ہے اور فطرت صرف اسی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو صحیح و اصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد اور اعمال میں بھی قانون کام کر رہا ہے۔ آخری فتح اسی عمل کی ہوتی ہے جو حق سچ ہو اور اس لیے باقی و قائم رہنے کا حق دار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور نا انصافی میں مقابلہ ہوگا تو آخر کی جیت انصاف ہی کے حصہ میں آئے گی۔

وَاَمَّا مَا يَنفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ كَذَٰلِكَ يَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ ط

زمین پر وہی چیز باقی رہے گی جو نافع ہو۔ غیر نافع چھانٹ دی جائے گی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کی اصطلاح میں سچائی کا نام "حق" ہے جس کے معنی ہی جم جانے اور ثابت ہو جانے کے ہیں اور جھوٹ اور بدی کا نام باطل ہے، جس کے معنے ہی مٹ جانے کے ہیں۔

اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا

باطل تو صرف اس لیے ہے کہ مٹ جائے۔

پس آج جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا فیصلہ کل ہوگا۔ انصاف باقی رہے گا۔ نا انصافی مٹا دی جائے گی۔ ہم مستقبل کے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں۔

البتہ یہ قدرتی بات ہے کہ بدلیوں کو دیکھ کر بارش کا انتظار کیا جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام نشانیاں قبول کر لی ہیں افسوس ان آنکھوں پر جو نشانیوں سے انکار کریں۔

میں نے انہی تقریروں میں جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں کہا تھا: "آزادی کا بیج کبھی بار آور نہیں ہو سکتا جب تک ظلم کے پانی سے اس کی آبیاری نہ ہو۔"

لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کر دی ہے۔

میں نے انہی تقریروں میں کہا تھا: "مبلغین کی گرفتاری پر مغموم کیوں ہو! اگر تم فی الحقیقت انصاف اور آزادی کے طلب گار ہو تو جیل جانے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ علی پور کا جیل اس طرح بھر جائے کہ اس کی کوٹھریوں میں چوروں کے لیے جگہ باقی نہ رہے۔"

فی الحقیقت جگہ باقی نہیں رہی ہے پریذیڈنسی اور سنٹرل جیل کا بڑا حصہ معمولی قیدیوں سے خالی کر دیا گیا۔ پھر بھی جگہ کافی نہ ہوئی۔ نیا جیل بنایا گیا۔ وہ بھی آناً فاناً بھر گیا۔ جگہ نکالنے کے لیے سینکڑوں قیدی رہا کر دیے گئے لیکن ان سے دوگنے نئے آ گئے۔ اب مزید نئے جیل بنائے جا رہے ہیں۔

سرکاری وکیل، پولیس اور مجسٹریٹ

۲۱۔ قبل اس کے کہ میں اپنا بیان ختم کروں، اپنے ہم وطن بھائیوں کی نسبت بھی ایک دو جملے کہوں گا جو اس مقدمہ میں میرے خلاف کام کر رہے ہیں۔ میں نے اوپر کہیں کہا ہے کہ سی آئی ڈی کا کام

کررہا ہوں۔ میں تو پورا پورا اقرار کرچکا ہوں مقصود صرف دو باتوں کا اظہار ہے۔

اولاً جو سرکاری مقدمات اردو تحریر و تقریر کی بنا پر چلائے جاتے ہیں، ان کے وسائل ثبوت کس درجہ ناکارہ اور ناقابل اعتماد ہیں؟

ثانیاً ہندوستان کی بیوروکریسی کی ناکامیابی اور ناموافقت، وہ ڈیڑھ سو برس حکومت کرکے بھی اس قابل نہیں ہوئی، کہ ہندوستانی زبانوں کے متعلق صحیح اور مستند ذرائع سے معلومات حاصل کرسکتی۔ مجھے یاد ہے کہ جب اکتوبر ۱۹۱۶ء میں نظر بند کیا گیا اور بہار گورنمنٹ کے حکام اور پولیس افسر (جن کو اردو زبان سے بمقابلہ بنگالی سے زیادہ تعلق ہے) تلاشی کے لیے آئے تو انھوں نے میری تمام کتابوں کو بھی ایک خوفناک لٹریچر سمجھ کر نہایت احتیاط کے ساتھ قبضہ میں کرلیا۔ یہ تمام کتابیں عربی اور فارسی زبانوں میں تھیں اور تاریخ، فقہ، فلسفہ کا معمولی مطبوعہ ذخیرہ تھا جو بازاروں میں فروخت ہوتا رہتا ہے۔ صرف ایک کتاب "مطالب عالیہ" نامی قلمی تھی۔ جو سب سے زیادہ پر اسرار سمجھی گئی۔ لطف یہ ہے کہ ان کی فہرست ڈپٹی کمشنر کی درخواست سے مجھے ہی مرتب کرنی پڑی۔ کیونکہ تفتیش جرائم کے اس پورے ڈپارٹمنٹ میں ایک شخص بھی اس قابل نہ تھا کہ کتابوں کے ٹائیٹل پیج کو صحت کے ساتھ پڑھ لیتا۔

میں نے نظر بندی کے زمانے میں چار سال تک اپنی ڈاک کے لیے خود ہی سنسر شپ کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ کیونکہ جو سرکاری افسر اس غرض سے مقرر کیا گیا تھا وہ اس قدر قابل آدمی تھا کہ اردو کے معمولی لکھے ہوئے خطوط بھی نہیں پڑھ سکتا تھا۔ وہ اکثر میری ڈاک صرف دستخط کرکے بھیج دیتا اور شب کو آکر مجھ سے اس کا ترجمہ لکھوا لیتا۔

جب کہ نظر بندی میں میں اپنی ڈاک کی خود ہی نگرانی کررہا تھا تو شملہ اور دہلی کے حکام اپنی کارفرمائی پر نہایت نازاں تھے اور سمجھتے تھے کہ انھوں نے اپنے ایک خطرناک دشمن کو بالکل مجبور اور معطل کردیا ہے۔

اس وقت بھی میرے قلمی مسودات کلکتہ پولیس کے قبضہ میں ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ خوفناک جرم تاریخ، تفسیر قرآن اور لٹریچر ہے۔

میں یہاں عربی داں اشخاص کی دلچسپی کے لیے ان کتابوں کے چند نام درج کردیتا ہوں جنھیں نہایت خوفناک سمجھ کر پولیس نے شملہ بھیجا تھا اور عرصہ تک سر چارلس کلیولینڈ کے حکم سے میری نظر بندی کے دیگر معاملات کی طرح ان کی بھی تحقیقات ہوتی رہی۔

فتح القدیر، شرح ہدایہ، طبقات الشافعیہ سبکی، ازالۃ الخفاء، کتاب الام، مدونہ امام مالک، مطالب عالیہ امام رازی، شرح حکمۃ الاشراق، شرح مسلم الثبوت، بحر العلوم، کتاب المستصفیٰ، کتاب اللمع۔

اصل یہ ہے کہ کسی جرم کے لیے جو لٹریچر سے تعلق رکھتا ہو، کوئی ایسی عدالت منصفانہ کارروائی نہیں کرسکتی جو ذاتی طور پر رائے قائم نہ کرسکے۔ یعنی خود اس بات سے واقف نہ ہو۔ لیکن موجودہ بیوروکریسی علاوہ بیوروکریسی ہونے کے غیر ملکی بھی ہے اس لیے ہر گوشہ میں اجنبی اقتدار کی غلامی کے نتائج کام کررہے ہیں۔ عدالتیں ہندوستان کی ہیں اور ہندوستانیوں کے لیے ہیں۔ لیکن ان کی زبان جزیرہ برطانیہ کی ہے اور اکثر حالتوں میں ایسے افراد سے مرکب ہیں۔ جو ملکی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں جانتے۔

یہی وجہ ہے کہ اب ہم اس گورنمنٹ سے اور کچھ نہیں چاہتے صرف یہ چاہتے ہیں کہ جس قدر بھی جلد ممکن ہو وہ اپنے سے بہتر اور حقدار کے لیے اپنی جگہ خالی کردے۔

موجودہ حالت قدرتی ہے

۱۸۔ میں جیسا کہ ابتدا میں لکھ چکا ہوں۔ خاتمہ سخن میں بھی دہراؤں گا۔ آج گورنمنٹ جو کچھ ہمارے ساتھ کررہی ہے وہ غیر معمولی بات نہیں ہے جس کے لیے خاص طور پر اسے ملامت کی جائے۔ قومی بیداری کے مقابلے میں مقاومت اور جبر و تشدد تمام قابض حکومتوں کے لیے طبیعت ثانیہ (سیکنڈ نیچر) کا حکم رکھتا ہے اور ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ ہماری خاطر انسانی طبیعت بدل جائے گی۔

یہ قدرتی کمزوری افراد اور جماعت دونوں میں یکساں طور پر نمود رکھتی ہے۔ دنیا میں کتنے آدمی ہیں جو اپنے قبضہ میں آئی ہوئی چیز صرف اس لیے لوٹا دیں گے کہ وہ اس کے حق دار نہیں! پھر ایک پورے براعظم کے لیے ایسی امید کیوں کر کی جاسکتی ہے؟ طاقت کبھی کسی بات کو صرف اس لیے نہیں مان لیتی کہ وہ معقول اور مدلل ہے۔ وہ خود طاقت کی نمود کا انتظار کرتی ہے اور جب وہ نمودار ہوجاتی ہے تو پھر ناواجب سے ناواجب مطالبہ کے آگے بھی جھک جاتی ہے۔ پس کشمکش اور انتظار ناگزیر ہے اور ایک ایسی قدرتی بات ہے جس کو بالکل دنیا کے معمولی کاموں کی طرح بلا کسی تعجب اور شکایت کے انجام پانا چاہیے۔



انڈین نیشنل کانگریس

(رام گڑھ، مارچ ۱۹۴۰ء)

دوستو! ۱۹۲۳ء میں آپ نے مجھے اس قومی مجلس کا صدر چُنا تھا۔ اب سترہ برس کے بعد دوسری مرتبہ آپ نے یہ عزت مجھے بخشی ہے۔ قوموں کی جدوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے۔ لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے کہ اب وقت کے پُرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس سترہ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دُور کا تھا۔ اور ضروری تھا کہ مختلف منزلوں سے گزرتے؛ ہم ہر منزل میں ٹھہرے، مگر رُکے کہیں نہیں۔ ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا، مگر ہمارا دل اٹکا کہیں بھی نہیں۔ ہمیں طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ پیش آئے، مگر حال میں ہماری نگاہ سامنے ہی کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں، مگر ہمیں اپنے فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں گزرا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر طاقتور رکاوٹیں کھڑی تھیں۔ ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے، نہ چل سکے ہوں، لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اگر ہم ۱۹۲۳ء اور ۱۹۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں، تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دُور ایک دُھندلا سا نشان دکھائی دے گا۔ ۱۹۲۲ء میں ہم اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے۔ مگر منزل ہم سے اتنی دُور تھی کہ اس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا۔ لیکن آج نظر اٹھایئے، اور سامنے کی طرف دیکھیے، نہ صرف منزل کا نشان صاف دکھائی دے رہا ہے، بلکہ خود منزل بھی دُور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے، ہماری جدوجہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں۔ آج واقعات کی تیز رفتاری نے جہاں ہمیں پچھلے نشانوں سے دُور، اور آخری منزل سے نزدیک کر دیا ہے، وہیں طرح طرح کی نئی نئی الجھنیں اور مشکلیں بھی پیدا کر دی ہیں، اور ایک بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارواں گزر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش اُن کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزلِ مقصود سے بالکل نزدیک کر دے۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں الجھا دے۔ ایک ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چُن کر اپنے جس بھروسے کا اظہار کیا ہے، وہ یقیناً بڑے سے بڑا بھروسہ ہے، جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک ساتھی پر کر سکتے تھے۔ یہ بہت بڑی عزت ہے، اس لیے بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ میں اس عزت کے لیے شکر گزار ہوں، اور ذمہ داری کے لیے آپ کی رفاقت کا سہارا چاہتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ جس گرمجوشی کے ساتھ آپ نے اس اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ ویسی ہی گرمجوشی کے ساتھ آپ کی رفاقتیں بھی میرا ساتھ دیتی رہیں گی۔

وقت کا اصلی سوال

اب میں سمجھتا ہوں، مجھے بغیر کسی تمہید کے وقت کے اصلی سوال پر آ جانا چاہیے۔

ہمارے لیے وقت کا سب سے پہلا اور سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ۳ستمبر ۱۹۳۹ء کے اعلانِ جنگ کے بعد ہم نے جو قدم اُٹھایا ہے، وہ کس طرف جا رہا ہے؟ اور اس وقت ہم کہاں کھڑے ہیں؟

غالباً کانگریس کی تاریخ میں اُس کے ذہنی نقشے کا یہ ایک نیا رنگ تھا کہ ۱۹۳۶ء کے اجلاس لکھنؤ میں یورپ کی بین الاقوامی (انٹرنیشنل) صورتِ حال پر ایک لمبی تجویز منظور کر کے اُس نے اپنے نقطۂ خیال کا صاف صاف اعلان کر دیا، اور اس کے بعد سے وہ کانگریس کے سالانہ اعلانوں کا ایک اہم اور ضروری حصہ بن گئی۔ یہ گویا اس بارے میں ہمارا ایک سوچا سمجھا ہوا فیصلہ تھا، جو ہم نے دنیا کے سامنے رکھ دیا۔

ان تجویزوں کے ذریعے ہم نے دنیا کے سامنے ایک ہی وقت میں دو باتوں کا اعلان کیا تھا:

سب سے پہلی بات، جسے میں نے ہندوستانی سیاست کے ایک نئے رنگ سے تعبیر کیا ہے، ہمارا یہ احساس ہے کہ ہم اپنی آج کل کی مجبوری کی حالت میں بھی دنیا کی سیاسی صورتِ حال سے الگ تھلگ

جہالت اور شرارت دونوں سے مرکب ہوتا ہے۔"
یہ میں نے اس ذاتی علم کی بنا پر کہا ہے جو بے شمار مقدمات کی نسبت مجھے حاصل ہے۔ تاہم میں تسلیم کرتا ہوں کہ سی آئی ڈی کے جن آدمیوں نے میرے خلاف شہادت دی ہے۔ انھوں نے اس اعتماد کے سوا جو اپنے کام پر ظاہر کیا ہے کوئی بات بھی غلط نہیں کہی ہے۔

میری تقریروں میں جو بحث کی گئی ہیں ان میں بھی کوئی بات شرارت کی نہیں پاتا۔ جس قدر ان کے اغلاط اور نقائص ہیں، صرف ناقابلیت کا نتیجہ ہیں۔ ایک دو مقامات ایسے ہیں جن کی نسبت خیال کیا جا سکتا ہے کہ دانستہ خراب کر کے دکھلائے۔ مثلاً جہاں جہاں میں نے لوگوں کو باامن رہنے، ہڑتال نہ کرنے، ہر طرح کے مظاہرات سے مجتنب رہنے کی تلقین کی ہے۔ وہ بقیہ حصّوں سے بھی زیادہ اُلجھے ہوئے اور بے ربط ہیں۔ متعدد مقامات پر "امن" کو "ایمان" کر دیا ہے جو بالکل بے ربط ہے۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی قاعدہ کے نقائص اور ذاتی ناقابلیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شرارت سے۔

البتہ میرا یقین ہے کہ انھوں نے اپنے کام پر جو اعتماد ظاہر کیا ہے اور جس غرض سے یہ کام انجام دیا ہے وہ ضرور معصیت ہے لیکن ساتھ ہی مجھے ان کی کمزوری بھی معلوم ہے۔ وہ محض چند روپیہ کی نوکری کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں اور اتنا قوی ضمیر نہیں رکھتے کہ سچائی کو ہر بات پر ترجیح دیں پس میرے دل میں ان کے لیے رنج و ملامت نہیں ہے۔ میں اس کام کے لیے انھیں معاف کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ خدا بھی معاف کر دے۔

پبلک پراسیکیوٹر بھی جو ان مقدمات میں کام کر رہا ہے۔ میرا ایک ہم وطن بھائی ہے۔ اس کی ضمیر یا رائے میرے سامنے نہیں ہے محض مزدوری ہے جو اس کام کے لیے گورنمنٹ سے حاصل کرتا ہے پس اس کی طرف سے بھی میرے دل میں کوئی رنج نہیں۔ البتہ میں ان سب کے لیے وہی دعا مانگوں گا جو پیغمبرِ اسلام نے ایک موقع پر مانگی تھی:-

"خدایا! ان پر راہ کھول دے کیونکہ یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں۔"

فَاقْضِ مَاۤ اَنْتَ قَاضٍ

میں مجسٹریٹ کی نسبت بھی کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ زیادہ سے زیادہ سزا جو اس کے اختیار میں ہے، بلا تامل مجھے دے دے۔ مجھے شکایت یا رنج کا کوئی احساس نہ ہوگا۔ میرا معاملہ پوری مشینری سے ہے، کسی ایک پرزے سے نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ جب تک مشین نہیں بدلے گی، پرزے اپنا فعل نہیں بدل سکتے۔

میں اپنا بیان اٹلی کے قتیلِ صداقت "گارڈ ینیو برونو" کے لفظوں پر ختم کرتا ہوں۔ جو میری ہی طرح عدالت کے سامنے کھڑا کیا گیا تھا۔

"زیادہ سے زیادہ سزا جو دی جا سکتی ہے، بلا تامل دے دو۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ سزا کا حکم لکھتے ہوئے جس قدر جنبش تمھارے دل میں پیدا ہوگی، اس کا عشر عشیر اضطراب بھی سزا سن کر میرے دل کو نہ ہوگا۔"

خاتمہ

مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا۔ یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جس کی ترتیب میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصّے میں یہ مجرموں کا کٹہرا ہے۔ تمھارے حصّہ میں وہ مجسٹریٹ کی کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لیے وہ کرسی بھی اتنی ہی ضروری چیز ہے، جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ بننے والے کام کو جلد ختم کریں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک یہ کام جاری رہے گا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا دروازہ کھل جائے گا۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے۔ وقت اس کا جج ہے۔ وہ فیصلہ لکھے گا اور اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔

وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ اَوَّلًا وَّ اٰخِرًا ط

۱۱ر جنوری ۱۹۲۲ء

پریذیڈنسی جیل، علی پور، کلکتہ

(احمد)

مولانا آزاد کے زمانۂ وزارت میں ایک بڑا کام یہ ہوا کہ ۱۹۴۸ء میں یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن کا قیام عمل میں آیا جس کے صدر ڈاکٹر رادھا کرشنن اور جس کے ممبروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین بھی تھے۔
"ابوالکلام آزاد" از عبدالقوی دسنوی)



میں سانس لے رہا ہے۔ لیکن ہم سب کو معلوم ہے کہ اس موقع پر برطانوی حکومت کا طرزِ عمل کیسا رہا۔ تبدیلی کی کوئی ذرا سی پرچھائیں بھی اس پر پڑتی ہوئی دکھائی نہیں دی۔ ٹھیک اسی طرح جیسا کہ اس کے سامراجی مزاج کا ڈیڑھ صدی سے خاصہ رہا ہے۔ اس نے اپنے طرزِ عمل کا فیصلہ کرلیا، اور بغیر اس کے کہ کسی شکل اور کسی درجے تک بھی ہندوستان کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا موقع دیا گیا ہو، لڑائی میں اس کے شامل ہوجانے کا اعلان کردیا گیا۔ اس بات کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی کہ ان نمائندہ اسمبلیوں ہی کو اپنی رائے ظاہر کرنے کا ایک موقع دے دیا جائے جسے خود برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی بخششوں کی نمائش کرتے ہوئے ہندوستان کے سر تھوپا ہے۔

تمام دنیا کی طرح ہمیں بھی معلوم ہے کہ اس موقع پر برٹش امپائر کے تمام ملکوں کو اپنے اپنے طرزِ عمل کے فیصلہ کا کس طرح موقع دیا گیا تھا۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ، آئرلینڈ، سب نے لڑائی میں شریک ہونے کا فیصلہ اپنی اپنی قانون ساز مجلسوں میں بغیر کسی باہر کی مداخلت کے کیا۔ اور اس کے اس فیصلہ پر برطانیہ کے کسی باشندے کو تعجب نہیں ہوا۔ مسٹر ڈی ولیرا نے برطانیہ کے ہمسایہ میں کھڑے ہوکر صاف صاف کہہ دیا تھا کہ جب تک آلسٹر (Ulster) کا سوال قابلِ اطمینان طریقہ پر طے نہیں ہوتا، وہ برطانیہ کی مدد کرنے سے انکار کرتا ہے۔

لیکن برطانوی نوآبادیوں (Domini-ons) کے اس پورے مرقع میں ہندوستان کی جگہ کہاں دکھائی دے رہی ہے؟ جس ہندوستان کو آج یہ قیمتی خوش خبری سنائی جارہی ہے کہ اسے برطانوی حکومت کے فیاض ہاتھوں سے جلد، مگر کسی نامعلوم زمانے میں برطانوی نوآبادیوں (Dominions) کا درجہ (Status) ملنے والا ہے، اس کی ہستی کا کیونکر اعتراف کیا گیا؟ اس طرح کہ اسے دنیا کی تاریخ کی شاید سب سے بڑی بننے والی لڑائی میں اچانک دھکیل دیا گیا بغیر اس کے کہ اُسے معلوم بھی ہوا ہو کہ وہ لڑائی میں شریک ہو رہا ہے۔

صرف یہی ایک واقعہ اس کے لیے کافی ہے کہ برطانوی حکومت کے موجودہ مزاج اور رُخ کو ہم اُس کے اصلی رنگ روپ میں دیکھ لیں۔ مگر نہیں ہمیں جلدی نہیں کرنی چاہیے۔ ہمیں اور موقع بھی پیش آنے والے ہیں۔ وہ وقت دُور نہیں، جب ہم اُسے اور زیادہ نزدیک سے، اور اور زیادہ بے پردہ دیکھنے لگیں گے۔

۱۹۱۴ء کی لڑائی کی پہلی چنگاری بلقان کے ایک گوشہ میں سُلگی تھی۔ اس لیے انگلستان اور فرانس نے چھوٹی قوموں کے حقوق کا نعرہ لگانا شروع کردیا تھا۔ پھر بادشاہ بجز، پریسیڈنٹ ولسن کے چودہ نکتے دنیا کے سامنے آئے۔ اور ان کا جو کچھ حشر ہوا، دنیا کو معلوم ہے۔ اس مرتبہ صورتِ حال دوسری تھی۔ پچھلی لڑائی کے بعد انگلستان اور فرانس نے اپنی فتحمندی کے نشے میں چور ہوکر جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ ایک نیا ردِ فعل (Reaction) شروع ہوجائے۔ وہ شروع ہوا۔ اس نے اٹلی میں فیشزم اور جرمنی میں نازیزم کا روپ اختیار کیا۔ اور وحشیانہ طاقت کی بنیادوں پر بے روک آمریت دنیا کے امن اور آزادی کو چیلنج دینے لگی۔ جب یہ صورتِ حال پیدا ہوئی تو قدرتی طور پر دو نئی صفیں دنیا کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔ ایک جمہوریت اور آزادی کا ساتھ دینے والی، دوسری ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کو آگے بڑھانے والی۔ اور اس طرح لڑائی کا ایک نیا نقشہ بننا شروع ہوگیا۔ مسٹر چیمبرلین کی حکومت جس کے لیے فیشسٹ اٹلی اور نازی جرمنی سے کہیں زیادہ سوویٹ روس کی ہستی ناقابلِ برداشت تھی، اور جو اسے برطانوی سامراج کے لیے ایک زندہ چیلنج سمجھتی تھی، تین برسوں تک اس منظر کا تماشا دیکھتی رہی۔ اتنا ہی نہیں، بلکہ اُس نے اپنے طرزِ عمل سے کھلے طور پر فیشسٹ اور نازی قوتوں کی جرأتیں ایک کے بعد ایک بڑھائیں۔ ابے سینیا، اسپین، آسٹریلیا، چیکوسلاواکیا، اور البانیا کی ہستیاں ایک کے بعد ایک دنیا کے نقشے سے مٹتی گئیں۔ اور برطانوی حکومت نے اپنی ڈگمگاتی ہوئی پالیسی سے انھیں دفن کرنے میں برابر مدد دی۔ لیکن جب اس طرزِ عمل کا قدرتی نتیجہ اپنی انتہائی شکل میں اُبھر آیا، اور نازی جرمنی کا قدم بے روک آگے بڑھنے لگا، تو برطانوی حکومت بالکل بے بس ہوگئی۔ اُسے لڑائی کے میدان میں اُترنا پڑا۔ کیونکہ اگر اب نہ اترتی تو جرمنی کی طاقت برطانوی شہنشاہی کے لیے ناقابلِ برداشت ہوجاتی۔ اب چھوٹی قوموں کی آزادی کے پرانے نعرے کی جگہ "جمہوریت"، "آزادی" اور عالمگیر امن کے نئے نعروں نے لی، اور تمام دنیا ان صداؤں سے گونجنے لگی۔ ۳ ستمبر کا اعلانِ جنگ انگلستان اور فرانس نے ان ہی صداؤں کی گونج میں کیا۔ اور دنیا کی ان تمام بے چین روحوں نے جو یورپ کی نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی وحشیانہ زور آزمائیوں اور عالمگیر بدامنی کے عذاب سے حیران اور سراسیمہ ہو رہی تھیں، ان خوشنما صداؤں پر کان لگا دیے!



نہیں رہ سکتے۔ یہ ضروری ہے کہ اپنے مستقبل کی راہ بناتے ہوئے، ہم صرف اپنے چاروں طرف ہی نہ دیکھیں، بلکہ اس سے باہر کی دنیا پر بھی برابر نظر رکھیں۔ زمانے کی بے شمار تبدیلیوں نے ملکوں اور قوموں کو اس طرح ایک دوسرے سے نزدیک کر دیا ہے، اور فکر اور عمل کی لہریں ایک گوشے میں اُبھر کر اس تیزی کے ساتھ دوسرے گوشوں پر اپنا اثر ڈالنا شروع کر دیتی ہیں کہ آج کل کی حالت میں ممکن نہیں، ہندوستان اپنے مسئلوں کو صرف اپنی چار دیواری کے اندر ہی بند رہ کر سوچ سکے۔ یہ ناگزیر ہے کہ باہر کے حالات، ہمارے حالات پر فوری اثر ڈالیں۔ اور ناگزیر ہے کہ ہماری حالتوں اور فیصلوں سے دنیا کی حالتوں اور فیصلوں پر اثر پڑے۔ یہی احساس تھا جس نے اس فیصلے کی شکل اختیار کی۔ ہم نے ان تجویزوں کے ذریعے اعلان کیا کہ یورپ میں جمہوریت اور انفرادی اور قومی آزادی کے خلاف فیشزم اور نازی ازم کی جو ارتجاعی (Reactionary) (ری ایکشنری) تحریکیں روز بروز طاقت پکڑتی جاتی ہیں، ہندوستان انھیں دنیا کی ترقی اور امن کے لیے ایک عالمگیر خطرہ تصور کرتا ہے۔ اور اُس کا دل اور دماغ اُن قوموں کے ساتھ ہے جو جمہوریت اور آزادی کی حفاظت میں اِن تحریکوں کا مقابلہ کر رہی ہیں۔

لیکن جب فیشی ازم اور نازی ازم کے خطروں کے خلاف ہمارا دماغ جا رہا تھا تو ہمارے لیے ناممکن تھا کہ ہم اُس پرانے خطرے کو بھلا دیتے۔ جو ان نئی قوتوں سے کہیں زیادہ قوموں کے امن اور آزادی کے لیے مہلک ثابت ہو چکا ہے، اور جس نے فی الحقیقت ان نئی ارتجاعی (Reactionary) تحریکوں کی پیدائش کا سارا مواد بہم پہنچایا ہے۔ میرا اشارہ برطانیہ کی سامراجی قوت کی طرف ہے۔ اسے ہم ان نئی ارتجاعی (Reactionary) قوتوں کی طرح دُور سے نہیں دیکھ رہے، یہ خود ہمارے گھر پر قبضہ جمائے ہمارے سامنے کھڑی ہے۔ اس لیے ہم نے صاف صاف لفظوں میں یہ بات بھی کھول دی کہ اگر یورپ کی اس نئی کشمکش نے لڑائی کی شکل اختیار کر لی تو ہندوستان جو اپنے آزاد ارادے اور آزاد پسند سے محروم کر دیا گیا ہے، اس میں کوئی حصّہ نہیں لے گا۔ وہ صرف اسی حالت میں حصّہ لے سکتا ہے، جب کہ اُسے اپنی آزاد مرضی اور پسند سے فیصلہ کرنے کی حیثیت حاصل ہو۔ وہ نازی ازم اور فیشی ازم سے بیزار ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ برطانوی شہنشاہیت سے بیزار ہے۔ اگر ہندوستان اپنی آزادی کے قدرتی حق سے محروم رہتا ہے، تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت اپنی تمام تر روایتی خصوصیتوں کے ساتھ زندہ ہے۔ اور ہندوستان کسی حال میں تیار نہیں کہ برطانوی شہنشاہی کی فتحمندیوں کے لیے مدد دے۔

یہ دوسری بات تھی جس کا یہ تجویزیں لگاتار اعلان کرتی رہیں۔

یہ تجویزیں کانگریس کے اجلاس لکھنؤ سے لے کر اگست ۱۹۳۹ء تک منظور ہوتی رہیں۔ اور "لڑائی کی تجویزوں" کے نام سے مشہور رہیں۔

کانگریس کے یہ تمام اعلان برٹش گورنمنٹ کے سامنے تھے کہ اچانک اگست ۱۹۳۹ء کے تیسرے ہفتے میں لڑائی کے بادل گرجنے لگے۔ اور ۳ ستمبر کو خود لڑائی بھی شروع ہو گئی۔

اب میں اس موقع پر آپ کو ایک لمحہ کے لیے آگے بڑھنے سے روکوں گا۔ اور درخواست کروں گا کہ ذرا پیچھے مڑ کر دیکھیے، پچھلے اگست کو آپ نے کن حالات میں چھوڑا ہے۔؟

برطانوی حکومت نے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء ہندوستان کے سر جبراً تھوپا، اور حسب معمول دنیا کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ اس نے ہندوستان کو اس کے قومی حق کی ایک بہت بڑی قسط دے دی ہے۔ کانگریس کا فیصلہ اس بارے میں دنیا کو معلوم ہے۔

تاہم اس نے کچھ عرصہ کے لیے دم لینے کا ارادہ کیا، اور اس پر آمادہ ہو گئی کہ ایک خاص شرط کے ساتھ وزارتوں کا قبول کرنا منظور کرے۔ اب گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں اس کی وزارتیں کامیابی کے ساتھ کام کر رہی تھیں، اور یہ بات خود برطانوی حکومت کے حق میں تھی کہ اس حالت کو جس قدر زیادہ مدت تک قائم رکھا جا سکتا ہے قائم رکھے۔ ساتھ ہی صورت حال کا ایک دوسرا پہلو بھی تھا۔ جہاں تک لڑائی کی ظاہری صورت کا تعلق ہے، ہندوستان صاف صاف لفظوں میں نازی جرمنی سے اپنی بیزاری کا اعلان کر چکا تھا۔ اُس کی ہمدردیاں جمہوریت پسند کرنے والی قوموں کے ساتھ تھیں، اور صورتِ حال کا یہ پہلو بھی برطانوی حکومت کے حق میں تھا۔ ایسی حالت میں قدرتی طور پر یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ اگر برطانوی حکومت کی پرانی سامراجی ذہنیت (Mentality) میں کچھ بھی تبدیلی ہوئی ہے تو کم از کم ڈپلومیسی (Diplomacy) ہی کی خاطر وہ اس کی ضرورت ضرور محسوس کرے گی۔ کہ اس موقع پر اپنا پرانا ڈھنگ بدل دے، اور ہندوستان کو ایسا محسوس کرنے کا موقع دے کہ اب وہ ایک بدلی ہوئی آب وہوا



نکلا، آج بھی وہی پالسی اُس کے سامنے ہے۔ اس سے زیادہ اور اس سے بہتر وہ کچھ نہیں کرسکتی۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو وائسرائے کا اعلان شائع ہوا، اور ۲۲ اکتوبر کو ورکنگ کمیٹی اس پر غور کرنے کے لیے واردھا میں بیٹھی۔ وہ بغیر کسی بحث کے اس نتیجہ پر پہنچی کہ یہ جواب کسی طرح بھی اسے مطمئن نہیں کرسکتا، اور اب اسے اپنا وہ فیصلہ بلا تامل کردینا چاہیے جو اس وقت تک اس نے ملتوی کر رکھا تھا۔ جو فیصلہ کمیٹی نے کیا، وہ اُس کی تجویز کے لفظوں میں یہ ہے:

"ان حالات میں کمیٹی کے
لیے ممکن نہیں کہ وہ برطانوی
حکومت کی سامراجی پالیسی کو
منظور کرے۔ کمیٹی کانگریس
وزارتوں کو ہدایت کرتی ہے کہ
جو رویہ ہمارے سامنے کھل گئی
ہے، اس کی طرف بڑھتے ہوئے
بطور ایک ابتدائی قدم کے اپنے
اپنے صوبوں کی حکومتوں سے مستعفی
ہو جائیں۔"

چنانچہ آٹھوں صوبوں میں وزارتوں نے استعفا دے دیا۔

یہ تو اس سلسلے کی ابتدا تھی۔ اب دیکھنا چاہیے کہ یہ سلسلہ زیادہ سے زیادہ کہاں تک پہنچتا ہے۔ وائسرائے ہند کا یک کمیونکے جو ۵ فروری کو دہلی سے شائع ہوا اور جو اس گفتگو کا خلاصہ بیان کرتا ہے جو مہاتما گاندھی سے ہوئی تھی۔ اور پھر خود مہاتما گاندھی کا بیان جو انھوں نے ۶ فروری کو شائع کیا، اس کی آخری کڑی سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کا خلاصہ ہم سب کو معلوم ہے۔ برطانوی حکومت اس بات کی پوری خواہش رکھتی ہے کہ ہندوستان جلد سے جلد وقت میں جو صورت حال کے لحاظ سے ممکن ہو، برطانوی نوآبادیوں کا درجہ حاصل کرلے، اور درمیانی زمانے کی مدت جہاں تک ممکن ہو کم کی جائے۔ مگر وہ ہندوستان کا یہ حق ماننے کے لیے تیار نہیں کہ بغیر باہر کی مداخلت کے وہ اپنا دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) خود اپنے چنے ہوئے نمائندوں کے ذریعہ بنا سکتا ہے، اور اپنی قسمت کا فیصلہ کرسکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں برطانوی حکومت ہندوستان کے لیے خود اختیاری فیصلے (Self-determination) کا حق تسلیم نہیں کرسکتی۔

حقیقت کی ایک چھوت (Touch) سے دکھاوے کا سارا طلسم کس طرح نابود ہوگیا! پچھلے چار برسوں سے جمہوریت اور آزادی کی حفاظت کے نعروں سے دنیا گونج رہی تھی۔ انگلستان اور فرانس کی حکومتوں کی زیادہ سے زیادہ ذمہ دار ربانیں اس بارے میں جو کچھ کہتی رہی ہیں، وہ ابھی اس قدر تازہ ہیں کہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں۔ مگر جونہی ہندوستان نے یہ سوال اٹھایا، حقیقت کو بے پردہ ہوکر سامنے آجانا پڑا۔ اب ہمیں بتایا جاتا ہے کہ قوموں کی آزادی کی حفاظت بلاشبہ اس لڑائی کا مقصد ہے، مگر اس کا دائرہ یورپ کی جغرافیائی حدوں سے باہر نہیں جاسکتا۔ ایشیا اور افریقہ کے باشندوں کو یہ جرأت نہیں کرنی چاہیے کہ امید کی نگاہ اٹھائیں۔ مسٹر چیمبرلین نے ۲۴ فروری کو برمنگھم میں تقریر کرتے ہوئے یہ حقیقت اور زیادہ واضح کردی ہے، اگرچہ ان کی تقریر سے پہلے بھی ہمیں اس بارے میں کوئی شبہ نہ تھا۔ انھوں نے ہمارے لیے برطانوی حکومت کے صاف طرزِ عمل کے ساتھ صاف قول بھی بہم پہنچا دیا۔ وہ لڑائی کے برطانوی مقاصد کا اعلان کرتے ہوئے دنیا کو یہ یقین دلاتے ہیں:

"ہماری لڑائی اس لیے ہے کہ
ہم اس امر کی ضمانت حاصل کریں
کہ یورپ کی چھوٹی قومیں آئندہ
اپنی آزادی کو بے جا زیادتیوں
کی دھمکیوں سے بالکل محفوظ
پائیں گی۔"

برطانوی حکومت کا یہ جواب اس موقع پر اگرچہ برطانی زبان سے نکلا ہے، مگر فی الحقیقت وہ اپنی قسم میں خالص برطانی نہیں ہے، بلکہ ٹھیک ٹھیک برِ اعظم یورپ کی اُس عام ذہنیت کی ترجمانی کررہا ہے جو تقریباً دو صدیوں سے دنیا کے سامنے رہی ہے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں انسان کی انفرادی اور جماعتی آزادی کے جس قدر اصول قبول کیے گئے، ان کے مطالبے کا حق صرف یورپی قوموں ہی کے لیے خاص سمجھا گیا، اور یورپ کی قوموں میں بھی مسیحی یورپ کے تنگ دائرے سے کبھی باہر نہ جاسکا۔ آج بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دنیا اس قدر بدل چکی ہے کہ پچھلی صدی کے فکر اور عمل کے نقشے تاریخ کی پرانی کہانیوں کی طرح سامنے آتے ہیں اور ہمیں ان سنگ نشانوں کی طرح دکھائی دیتے ہیں جنھیں ہم بہت دُور پیچھے چھوڑ آئے۔ لیکن ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کم از کم ایک نشان اب بھی ہمارے پیچھے نہیں ہے، وہ ہمارے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ وہ انسانی حقوق کے لیے یورپ کا امتیازی نشان ہے۔

ٹھیک ٹھیک معاملہ کا ایسا ہی نقشہ ہندوستان کے سیاسی اور قومی حق کے سوال نے بھی اُبھار سے

کانگریس کا مطالبہ

۳ ستمبر کو لڑائی کا اعلان ہوا۔ اور ۸ ستمبر کو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی واردھا میں اکٹھی ہوئی تاکہ صورتِ حال پر غور کرے۔ ورکنگ کمیٹی نے اس موقع پر کیا کیا؟ کانگریس کے وہ تمام اعلان اس کے سامنے تھے جو ۱۹۳۶ء سے لگاتار ہوتے رہے ہیں۔ اعلانِ جنگ کے بارے میں جو طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا، وہ بھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھا۔ یقیناً اسے ملامت نہیں کی جا سکتی تھی، اگر وہ کوئی ایسا فیصلہ کر دیتی، جو اس صورتِ حال کا منطقی نتیجہ تھا۔ لیکن اس نے پوری احتیاط کے ساتھ اپنے دل و دماغ کی نگرانی کی۔ اس نے وقت کے ان تمام جذبوں سے جو تیز رفتاری کا تقاضہ کر رہے تھے، اپنے کانوں کو بند کر لیا۔ اس نے معاملے کے تمام پہلوؤں پر پورے سکون کے ساتھ غور کر کے وہ قدم اٹھایا، جسے آج ہندوستان سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتا ہے، کہ اس صورتِ حال میں اس کے لیے وہی ایک ٹھیک قدم تھا۔ اس نے اپنے سارے فیصلے ملتوی کر دیے۔ اس نے برطانوی حکومت سے سوال کیا کہ وہ پہلے اپنا فیصلہ دنیا کے سامنے رکھ دے جس پر نہ صرف ہندوستان کا بلکہ دنیا کے امن و انصاف کے سارے مقصدوں کا فیصلہ موقوف ہے۔ اگر اس لڑائی میں شریک ہونے کی ہندوستان کو دعوت دی گئی ہے، تو ہندوستان کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑائی کیوں لڑی جا رہی ہے؟ اس کا مقصد کیا ہے؟ اگر انسانی ہلاکت کی اس سب سے بڑی المناکی (Tragedy) کا بھی وہی نتیجہ نکلنے والا نہیں ہے، جو پچھلی لڑائی کا نکل چکا ہے، اور یہ واقعی اس لیے لڑی جا رہی ہے کہ آزادی، جمہوریت اور امن کے ایک نئے نظم (Order) سے دنیا کو آشنا کیا جائے، تو پھر یقیناً ہندوستان کو اس مطالبے کا حق حاصل ہے کہ وہ معلوم کرے، خود اس کی قسمت پر ان مقصدوں کا کیا اثر پڑے گا؟

ورکنگ کمیٹی نے اپنے اس مطالبے کو ایک مفصل اعلان کی صورت میں مرتب کیا۔ اور ۱۴ ستمبر ۱۹۳۹ء کو یہ شائع ہو گیا۔ اگر میں امید کروں کہ یہ اعلان ہندوستان کی نئی سیاسی تاریخ میں اپنے لیے ایک مناسب جگہ کا مطالبہ کرے گا، تو مجھے یقین ہے، میں آنے والے مورخ سے کوئی بے جا توقع نہیں کر رہا ہوں۔ یہ سچائی اور معقولیت (Reason) کا ایک سادہ مگر ناقابلِ رد نوشتہ (Document) ہے، جس کو صرف مسلح طاقت کا بے پروا گھمنڈ ہی رد کر سکتا ہے۔ اس کی آواز اگرچہ ہندوستان میں اٹھی، لیکن فی الحقیقت یہ صرف ہندوستان ہی کی آواز نہ تھی، یہ عالمگیر انسانیت کی زخمی امیدوں کی چیخ تھی۔ پچیس برس ہوئے کہ دنیا بربادی اور ہلاکت کے ایک سب سے بڑے عذاب میں، جسے تاریخ کی نگاہیں دیکھ سکی ہیں، مبتلا کی گئی۔ اور صرف اس لیے مبتلا کی گئی تاکہ اس کے بعد اس سے بھی زیادہ ایک سخت عذاب کی تیاریوں میں لگ جائے۔ کمزور قوموں کی آزادی، اس کی ضمانت، خود اختیاری فیصلہ (Self-determination) ہتھیاروں کی حدبندی، بین الاقوامی (International) پنچایت کا قیام، یہ اور اسی طرح کے سارے اونچے اور خوشنما مقصدوں کی صداؤں سے قوموں کے کانوں پر جادو کیا گیا۔ ان کے دلوں میں امیدیں سلگائی گئیں۔ مگر بالآخر کیا نتیجہ نکلا؟ ہر صدا فریب نکلی! ہر جلوہ خواب و خیال ثابت ہوا! آج پھر قوموں کے گلوں کو خون اور آگ کی ہولناکیوں میں دھکیلا جا رہا ہے۔ کیا معقولیت (Reason) اور حقیقت کی موجودگی سے ہمیں اس درجہ مایوس ہو جانا چاہیے کہ ہم موت اور بربادی کے سیلاب میں کودنے سے پہلے یہ بھی معلوم نہیں کر سکتے کہ یہ سب کچھ کیوں ہو رہا ہے اور خود ہماری قسمت پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

برطانوی حکومت کا جواب اور کانگریس کا پہلا قدم

کانگریس کے اس مطالبے کے جواب میں برطانوی حکومت کی جانب سے بیانوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا جو ہندوستان اور انگلستان میں ہوتے رہے۔ اس سلسلے کے لیے پہلی کڑی وائسرائے ہند کا وہ اعلان بہم پہنچاتا ہے جو ۱۷ اکتوبر کو دہلی سے شائع ہوا۔ یہ اعلان جو شاید حکومتِ ہند کے سرکاری علم ادب (Official Literature) کے الجھے ہوئے انداز اور تھکا دینے والی طوالت کا سب سے زیادہ مکمل نمونہ ہے۔ صفحوں کے صفحے پڑھ جانے کے بعد بھی اس قدر بتانے پر مشکل آمادہ ہوتا ہے کہ لڑائی کے مقصد کے لیے برطانوی وزیر اعظم کی ایک تقریر پڑھنی چاہیے، جو صرف یورپ کے امن اور بین الاقوامی (International) رشتوں کی درستگی کا ذکر کرتی ہے۔ "جمہوریت" اور "قوموں کی آزادی" کے لفظ اس میں نہیں ڈھونڈے جا سکتے۔ جہاں تک ہندوستان کے مسئلہ کا تعلق ہے، وہ ہمیں بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت نے ۱۹۱۹ء کے قانون کی تمہید میں اپنی جس پالیسی کا اعلان کیا تھا اور جس کا نتیجہ ۱۹۳۵ء کے قانون کی شکل میں

ہے۔ دنیا کی یہ نئی بیداری جس نے پچھلی لڑائی کے بعد سے انسانی روحوں کی گہرائیوں میں کروٹ بدلنا شروع کردیا تھا، اب روز بروز دماغوں اور زبانوں کی سطح پر اُبھر رہی ہے، اور اس طرح ابھر رہی ہے کہ شاید تاریخ میں کبھی نہیں اُبھری۔ ایسی حالت میں کیا یہ بات وقت کے امکانوں کے دائرے سے باہر تھی کہ تاریخ میں اس کے پُرانے فیصلوں کے خلاف ایک نئے فیصلے کا اضافہ ہوتا؟ کیا ممکن نہیں کہ دنیا کی دو بڑی قومیں جنھیں حالات کی رفتار نے حکومت اور محکومیت کے رشتے سے جمع کردیا تھا، آیندہ کے لیے معقولیت، انصاف اور امن کے رشتوں سے اپنا نیا تعلق جوڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ عالمگیر جنگ کی مایوسیاں کس طرح امیدوں کی ایک نئی زندگی میں بدل جاتیں، معقولیت اور انصاف کے دَور کی ایک نئی صبح کس طرح دنیا کو ایک نئے سورج کا پیام دینے لگتی۔ انسانیت کی کیسی بے مثال اور عالمگیر فتح مندی ہوتی، اگر آج برطانی قوم سر اٹھا کر دنیا سے کہہ سکتی کہ اس نے تاریخ میں ایک نئی مثال بڑھانے کا کام انجام دیا ہے!

یقیناً یہ ناممکن نہیں ہے، مگر دنیا کی تمام دشواریوں سے کہیں دشوار ہے۔

وقت کی ساری پھیلی ہوئی اندھیاریوں میں انسانی فطرت کا یہی ایک روشن پہلو ہے، جو مہاتما گاندھی کی عظیم روح کو کبھی تھکنے نہیں دیتا۔ وہ باہمی مفاہمت کے دروازے میں جو ان پر کھولا جاتا ہے، بغیر اس کے کہ اپنی جگہ کو ذرا بھی کمزور محسوس کریں، بلا تامل قدم رکھنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

برطانوی کابینہ (Cabinet) کے متعدد ممبروں نے لڑائی کے بعد دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ برطانوی سامراج کا پچھلا دور اب ختم ہو چکا اور آج برٹش قوم صرف امن اور انصاف کے مقصدوں کو اپنے سامنے رکھتی ہے۔ ہندوستان سے بڑھ کر اور کونسا ملک ہو سکتا ہے جو آج کسی ایسے اعلان کا استقبال کرتا! لیکن واقعہ یہ ہے کہ باوجود ان اعلانوں کے، برطانوی سامراج آج بھی اُسی طرح امن اور انصاف کی راہ روکے کھڑا ہے، جس طرح لڑائی سے پہلے تھا۔ ہندوستان کا مطالبہ اس طرح کے تمام دعووں کے لیے ایک حقیقی کسوٹی تھی۔ دعوے کسوٹی پر کَسے گئے، اور اپنی سچائی کا ہمیں یقین نہ دلا سکے۔

ہندوستان کا سیاسی مستقبل اور اقلیتیں

جہاں تک وقت کے اصلی سوال کا تعلق ہے، معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے، جو میں نے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھ دیا۔ گذشتہ ستمبر میں جب اعلان جنگ کے بعد کانگریس نے اپنا مطالبہ ترتیب دیا، تو اُس وقت ہم میں سے کسی شخص کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہیں گذری تھی کہ اس صاف اور سادہ مطالبہ میں جو ہندوستان کے نام پر کیا گیا ہے، اور جس سے ملک کے کسی فرقہ اور کسی گروہ کو بھی اختلاف نہیں ہو سکتا، فرقہ وارانہ مسئلہ کا سوال [illegible] جا سکے گا۔ بلا شبہ ملک میں ایسی جماعتیں موجود ہیں، جو سیاسی جد و جہد کے میدان میں وہاں تک نہیں جا سکتیں۔ جہاں تک کانگریس کے قدم پہنچ گئے ہیں، اور براہِ راست اقدامِ عمل (ڈائرکٹ ایکشن) کے طریقہ سے جو سیاسی ہندوستان کی اکثریت نے اختیار کرلیا ہے، متفق نہیں ہیں۔ لیکن جہاں تک ملک کی آزادی اور اس کے قدرتی حق کے اعتراف کا تعلق ہے، ہندوستان کی ذہنی بیداری اب اُن ابتدائی منزلوں سے بہت دُور نکل چکی کہ ملک کا کوئی گروہ بھی اس مقصد سے اختلاف کرنے کی جرأت کرسکے۔ وہ جماعتیں بھی جو اپنے طبقہ (کلاس) کے خاص مفاد کے تحفظ کے لیے مجبور ہیں، کہ موجودہ سیاسی صورتِ حال کی تبدیلی کے خواہش مند نہ ہوں۔ وقت کی عام آب و ہوا کے تقاضہ سے بے بس ہو رہی ہیں اور انھیں بھی ہندوستان کی سیاسی منزلِ مقصود کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ تاہم جہاں وقت کے [illegible] سوال نے صورتِ حال کے دوسرے گوشوں پر سے پردے اُٹھا دیے، وہیں اس گوشے کو بھی بے نقاب کردیا۔ ہندوستان اور انگلینڈ، دونوں جگہ یکے بعد دیگرے اس طرح کی کوششیں کی گئیں کہ وقت کے سیاسی سوال کو فرقہ وارانہ مسئلہ کے ساتھ خلط ملط کرکے سوال کی اصلی حیثیت مشتبہ کردی جائے۔ بار بار دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کے حل کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ حارج ہو رہا ہے۔

اگر پچھلے ڈیڑھ سو برس کے اندر ہندوستان میں برطانوی شہنشاہی کا یہ طرزِ عمل رہ چکا ہے کہ ملک کے باشندوں کے اندر [illegible] اختلافات کو اُبھار کر نئی نئی صفوں میں تقسیم کیا جائے، اور پھر ان صفوں کو اپنی حکومت کے استحکام کے لیے کام میں لائے، تو یہ ہندوستان کی سیاسی محکومیت کا ایک قدرتی نتیجہ تھا۔ اور ہمارے لیے اب بے سود



سامنے پیش کر دیا ہے۔ ہم نے جب اعلانِ جنگ کے بعد یہ سوال اٹھایا کہ لڑائی کا مقصد کیا ہے، اور ہندوستان کی قسمت پر اس کا کیا اثر پڑنے والا ہے؟ تو ہم اس بات سے بے خبر نہ تھے کہ برطانوی حکومت کی پالیسی ۱۹۱۷ء اور ۱۹۱۹ء میں کیا رہ چکی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے تھے کہ ۱۹۳۹ء کی اُس دنیا میں جو دنوں کے اندر صدیوں کی چال سے بدلتی اور پلٹتی ہوئی دوڑ رہی ہے، ہندوستان کو برطانوی حکومت کس جگہ سے دیکھنا چاہتی ہے! اس کی جگہ اب بھی بدلی ہے یا نہیں؟ ہمیں صاف جواب مل گیا کہ نہیں بدلی۔ وہ اب بھی سامراجی مزاج میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی ہے۔ ہمیں یقین دلایا جاتا ہے کہ برطانوی حکومت بہت زیادہ اس کی خواہش مند ہے کہ ہندوستان جہاں تک جلد ممکن ہو، نوآبادیات (Dominion Status) کا درجہ حاصل کرلے۔ ہمیں معلوم تھا کہ برطانوی حکومت نے اپنی یہ خواہش ظاہر کی ہے۔ اب ہمیں یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ وہ اس کی "بہت زیادہ خواہش مند ہے۔" مگر سوال برطانوی حکومت کی خواہش اور اس کی خواہش کے مختلف درجوں کا نہیں ہے۔ صاف اور سادہ سوال ہندوستان کے حق کا ہے۔ ہندوستان کو یہ حق حاصل ہے یا نہیں کہ وہ اپنی قسمت کا خود فیصلہ کرے؟ اسی سوال کے جواب پر وقت کے سارے سوالوں کا جواب موقوف ہے۔ ہندوستان کے لیے یہ سوال بنیاد کی اصل اینٹ ہے۔ وہ اسے نہیں ہلنے دے گا۔ اگر یہ ہل جائے تو اس کی قومی ہستی کی ساری عمارت ہل جائے گی۔

جہاں تک لڑائی کے سوال کا تعلق ہے، ہمارے لیے صورتِ حال بالکل واضح ہو گئی۔ ہم برطانوی سامراج کا چہرہ اس لڑائی کے اندر بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہے ہیں، جس طرح ہم نے پچھلی لڑائی میں دیکھا تھا۔ ہم تیار نہیں کہ اس چہرے کی فتح مندیوں کے لیے لڑائی میں حصہ لیں۔ ہمارا مقدمہ بالکل صاف ہے۔ ہم اپنی محکومیت کی عمر بڑھانے کے لیے برطانوی سامراج کو زیادہ طاقتور اور زیادہ فتح مند نہیں دیکھنا چاہتے۔ ہم ایسا کرنے سے صاف صاف انکار کرتے ہیں۔ ہماری راہ یقیناً بالکل اس کے مقابل سمت جارہی ہے۔

ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟

اب ہم اس جگہ پر واپس آجائیں، جہاں سے ہم چلے تھے۔ ہم نے اس سوال پر غور کرنا چاہا تھا کہ ۳ ستمبر کے اعلان جنگ کے بعد جو قدم ہم اٹھا چکے ہیں، اس کا رُخ کس طرف ہے؟ اور ہم آج کہاں کھڑے ہیں؟ میں یقین کرتا ہوں کہ ان دونوں سوالوں کا جواب اس وقت ہم میں سے ہر شخص کے دل میں اس طرح صاف صاف ابھر آیا ہوگا کہ اب اسے صرف زبانوں تک پہنچنا ہی باقی رہ گیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ کے لب ہلیں، میں آپ کے لبوں کو ہلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ ہم نے عارضی تعاون (Coopera-tion) کا جو قدم ۱۹۳۱ء میں اٹھایا تھا، ہم نے اعلان جنگ کے بعد واپس لے لیا۔ اس لیے قدرتی طور پر ہمارا رُخ ترک تعاون (Non Co-operation) کی طرف تھا۔ ہم آج اس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے کہ اس رُخ کی طرف آگے بڑھیں، یا پیچھے ہٹیں؟ جب قدم اٹھا دیا جائے، تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر رکے گا تو پیچھے ہٹے گا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں۔ ہم صرف یہی کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے ساتھ ملا رہا ہوں، جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم آگے بڑھیں گے!

باہمی مفاہمت

اس سلسلے میں قدرتی طور پر ایک سوال سامنے آجاتا ہے۔ تاریخ کا فیصلہ ہے کہ قوموں کی کشمکش میں ایک طاقت جبھی اپنا قبضہ چھوڑ سکتی ہے جبکہ دوسری طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کردے۔ اور معقولیت اور اخلاق کے اعلیٰ اصول افراد کا طرزِ عمل بدلتے رہے ہیں، مگر غلبہ جمائی ہوئی قوموں کی خود غرضیوں پر کبھی اثر نہیں ڈال سکے۔ آج بھی ہم عین بیسویں صدی کے درمیانی عہد میں دیکھ رہے ہیں کہ یورپ کی نئی ارتجاعی (Reactionary) قوموں نے کس طرح انسان کے انفرادی اور قومی حقوق کے تمام عقیدے تہ و بالا کردیے، اور انصاف اور معقولیت (Reason) کی جگہ صرف وحشیانہ طاقت کی دلیل فیصلوں کے لیے اکیلی دلیل رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی جہاں دنیا تصویر کا یہ مایوس رُخ اُبھار رہی ہے، وہیں امید کا ایک دوسرا رُخ بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بلا امتیاز دنیا کے بے شمار انسانوں کی ایک نئی عالمگیر بیداری بھی ہے جو نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف اُبھر رہی ہے۔ یہ دنیا کے پرانے نظم (Order) کی نامرادیوں سے تھک گئی ہے، اور معقولیت، انصاف اور امن کے ایک نئے نظم کے لیے بے قرار



ہے، جس کی بنا پر کانگریس کو اس کا فرض یاد دلانے کی ضرورت ہو؟ کانگریس اپنے اس فرض کی خامیوں پر غور کرنے کے لیے ہمیشہ تیار رہی ہے اور آج بھی تیار ہے۔

میں انیس برس سے کانگریس میں ہوں۔ اس تمام عرصے میں کانگریس کا کوئی اہم فیصلہ ایسا نہیں ہوا، جس کے ترتیب دینے میں مجھے شریک رہنے کی عزت حاصل نہ رہی ہو۔ میں کہہ سکتا ہوں کہ اس انیس برس میں ایک دن بھی ایسا کانگریس کے دماغ پر نہیں گزرا، جب اس نے اس مسئلہ کا فیصلہ اس کے سوا کسی طریقہ سے بھی کرنے کا خیال کیا ہو۔ یہ صرف اس کا اعلان ہی نہ تھا اس کا مضبوط اور طے کیا ہوا طرز عمل تھا۔ پچھلے پندرہ برسوں کے اندر بار بار اس طرز عمل کے لیے سخت سے سخت آزمائشیں پیدا ہوئیں، مگر یہ چٹان اپنی جگہ سے کبھی نہ ہل سکی۔

آج بھی اس نے دستور ساز مجلس (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) کے سلسلے میں اس مسئلہ کا جس طرح اعتراف کیا ہے، وہ اس کے لیے کافی ہے کہ ان دونوں اصولوں کو ان کی زیادہ سے زیادہ صاف شکل میں دیکھ لیا جائے۔ تسلیم شدہ اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر وہ چاہیں تو خالص اپنے ووٹوں سے اپنے نمائندوں کو چن کر بھیجیں۔ ان کے نمائندوں کے کاندھوں پر اپنے فرقہ کی رایوں کے سوا اور کسی کی رائے کا بوجھ نہ ہوگا۔ جہاں تک اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے مسائل کا تعلق ہے، فیصلہ کا ذریعہ مجلس (اسمبلی) کی کثرت رائے نہیں ہوگی، خود اقلیتوں کی رضامندی ہوگی۔ اگر کسی مسئلہ میں اتفاق نہ ہو سکے، تو کسی غیر جانبدار پنچایت کے ذریعہ فیصلہ کرایا جا سکتا ہے، جسے اقلیتوں نے بھی تسلیم کر لیا ہو۔ آخری تجویز محض ایک احتیاطی پیش بندی ہے۔ ورنہ اس کا بہت کم امکان ہے کہ اس طرح کی صورتیں پیش آئیں گی۔ اگر اس تجویز کی جگہ کوئی دوسری قابل عمل تجویز ہو سکتی ہے، تو اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔

اگر کانگریس نے اپنے طرز عمل کے لیے یہ اصول سامنے رکھ لیے ہیں، اور پوری کوشش کر چکی ہے اور کر رہی ہے کہ ان پر قائم رہے، تو پھر اس کے بعد اور کونسی بات رہ گئی ہے جو برطانوی مدبروں کو اس پر مجبور کرتی ہے کہ اقلیتوں کے حقوق کا مسئلہ ہمیں بار بار یاد دلائیں؟ اور دنیا کو اس غلط فہمی میں مبتلا کریں کہ ہندوستان کے مسئلہ کی راہ میں اقلیتوں کا مسئلہ راستہ روکے کھڑا ہے؟ اگر فی الحقیقت اسی مسئلہ کی وجہ سے رکاوٹ پیش آ رہی ہے، تو کیوں برطانوی حکومت ہندوستان کی سیاسی قسمت کا صاف صاف اعلان کر کے ہمیں اس کا موقع نہیں دے دیتی کہ ہم سب مل کر بیٹھیں اور باہمی رضامندی سے اس مسئلہ کا ہمیشہ کے لیے تصفیہ کر لیں؟

ہم میں تفرقے پیدا کیے گئے اور ہمیں الزام دیا جاتا ہے کہ ہم میں تفرقے ہیں۔ ہمیں تفرقوں کے مٹانے کا موقع نہیں دیا جاتا اور ہم سے کہا جاتا ہے کہ ہمیں تفرقے مٹانے چاہییں۔ یہ صورت حال ہے جو ہمارے چاروں طرف پیدا کر دی گئی ہے۔ یہ بندھن ہیں، جو ہمیں ہر طرف سے جکڑے ہوئے ہیں۔ تاہم اس حالت کی کوئی مجبوری بھی ہمیں اس سے باز نہیں رکھ سکتی کہ سعی اور ہمت کا قدم آگے بڑھائیں، کیونکہ ہماری راہ تمام تر دشواریوں کی راہ ہے اور ہمیں ہر دشواری پر غالب آنا ہے۔

ہندوستان کے مسلمان اور ہندوستان کا مستقبل

یہ ہندوستان کی اقلیتوں کا مسئلہ تھا۔ لیکن کیا ہندوستان میں مسلمانوں کی حیثیت ایک ایسی اقلیت کی ہے، جو اپنے مستقبل کو شک اور خوف کی نظر سے دیکھ سکتی ہے، اور وہ تمام اندیشے اپنے سامنے لا سکتی ہے، جو قدرتی طور پر ایک اقلیت کے دماغ کو مضطرب کر دیتے ہیں؟

مجھے نہیں معلوم، آپ لوگوں میں کتنے آدمی ایسے ہیں، جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں۔ اگر چند اشخاص بھی ایسے موجود ہیں، تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ وہ اپنا حافظہ تازہ کر لیں۔ میں نے اس زمانے میں بھی اپنے اس عقیدے کا اظہار کیا تھا، اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی ہے، جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے۔ اور اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔ اس ایک بنیادی غلطی نے بے شمار غلط فہمیوں کی پیدائش کا دروازہ کھول دیا۔ غلط بنیادوں پر غلط دیواریں چنی جانے لگیں۔ اس نے ایک طرف تو خود مسلمانوں پر ان کی حقیقی حیثیت مشتبہ کر دی، دوسری طرف دنیا کو ایک ایسی غلط فہمی میں مبتلا کر دیا، جس کے بعد وہ ہندوستان کو اس کی صحیح صورت حال میں نہیں دیکھ سکتی۔

اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل کے ساتھ بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط اور بناوٹی شکل

ہے کہ اس کی شکایت سے اپنے جذبات میں کڑواہٹ پیدا کریں۔ ایک اجنبی حکومت یقیناً اس ملک کے اندرونی اتحاد کی خواہش مند نہیں ہو سکتی جس کی اندرونی پھوٹ ہی اس کی موجودگی کے لیے سب سے بڑی ضمانت ہے۔ لیکن ایک ایسے زمانہ میں جبکہ دنیا کو یہ باور کرانے کی کوششیں کی جا رہی ہیں کہ برطانوی شہنشاہیت کی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دَور ختم ہو چکا' یقیناً یہ کوئی بڑی توقع نہ تھی اگر ہم برطانوی مدبروں سے امید رکھتے تھے کہ کم ازکم اِس گوشے میں وہ اپنے طرزِ عمل کو پچھلے عہد کی دماغی وراثت سے بچانے کی کوششیں کریں گے۔ لیکن پچھلے پانچ مہینوں کے اندر واقعات کی جو رفتار رہ چکی ہے، اس نے ثابت کر دیا کہ ابھی ایسی امیدوں کے رکھنے کا وقت نہیں آیا ہے، اور جس دَور کی نسبت دنیا کو یقین دلایا جا رہا ہے کہ ختم ہو گیا، اسے ابھی ختم ہونا باقی ہے۔

بہرحال اسباب خواہ کچھ ہی رہے ہوں لیکن ہم تسلیم کرتے ہیں کہ دنیا کے تمام ملکوں کی طرح ہندوستان بھی اپنے اندرونی مسائل رکھتا ہے، اور ان مسئلوں میں ایک اہم مسئلہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا ہے۔ ہم برطانوی حکومت سے یہ توقع نہیں رکھتے، اور ہمیں رکھنی بھی نہیں چاہیے کہ وہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف نہیں کرے گی۔ یہ مسئلہ موجود ہے اور اگر ہم آگے بڑھنا چاہتے ہیں، تو ہمارا فرض ہے کہ اس کی موجودگی مان کر قدم اُٹھائیں۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ ہر قدم جو اس کی موجودگی سے بے پروا رہ کر اُٹھے گا، یقیناً ایک غلط قدم ہوگا۔ لیکن فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی کے اعتراف کے معنی صرف یہی ہونے چاہئیں کہ اس کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے۔ یہ معنی نہیں ہو چاہئیں کہ اسے ہندوستان کے قومی حق کے خلاف بطور ایک آلہ کے استعمال کیا جائے۔ برطانوی شہنشاہی ہمیشہ اِس مسئلہ کو اسی غرض سے کام میں لاتی رہی۔ اگر اب وہ اپنی ہندوستانی تاریخ کا پچھلا دَور ختم کرنے پر مائل ہے، تو اُسے معلوم ہونا چاہیئے کہ سب سے پہلا گوشہ جس میں ہم قدرتی طور پر اس تبدیلی کی جھلک دیکھنی چاہیں گے، وہ یہی گوشہ ہے۔

کانگریس نے فرقہ وارانہ مسئلہ کے بارے میں اپنے لیے جو جگہ بنائی ہے، وہ کیا ہے؟ کانگریس کا اوّل دن سے دعوا رہا ہے کہ وہ ہندوستان کو بہ حیثیت مجموعی اپنے سامنے رکھتی ہے، اور جو قدم بھی اُٹھانا چاہتی ہے، ہندوستانی قوم کے لیے اٹھانا چاہتی ہے۔ ہمیں تسلیم کرنا چاہیے کہ کانگریس نے یہ دعوا کر کے دنیا کو اس بات کا حق دے دیا ہے کہ وہ جس قدر بے رحم نکتہ چینی کے ساتھ چاہے، اس کے طرزِ عمل کا جائزہ لے اور کانگریس کا فرض ہے کہ اس جائزہ میں اپنے کو کامیاب ثابت کرے۔ میں چاہتا ہوں کہ معاملہ کا یہ پہلو سامنے رکھ کر ہم آج کانگریس کے طرزِ عمل پر نئے سرے سے ایک نگاہ ڈال لیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی آپ سے کہا ہے، اس بارے میں قدرتی طور پر تین باتیں ہی سامنے آسکتی ہیں: فرقہ وارانہ مسئلہ کی موجودگی، اس کی اہمیت' اس کے فیصلے کا طریقہ۔

کانگریس کی پوری تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے کہ اُس نے اس مسئلہ کی موجودگی کا ہمیشہ اعتراف کیا۔ اس نے اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اس نے اس کے فیصلہ کے لیے وہی طریقہ تسلیم کیا، جس سے زیادہ قابلِ اطمینان طریقہ اس بارے میں کوئی نہیں تبلایا جا سکتا، اور اگر تبلایا جا سکتا ہے، تو اس کی طلب میں اس کے دونوں ہاتھ ہمیشہ بڑھے رہے اور آج بھی بڑھے ہوئے ہیں!

اس کی اہمیت کا اعتراف اس سے زیادہ ہمارے تخیل پر کیا اثر ڈال سکتا ہے کہ اسے ہندوستان کے قومی مقصد کی کامیابی کے لیے سب سے پہلی شرط یقین کریں؟ میں اس واقعہ کو بطور ایک ناقابلِ انکار حقیقت کے پیش کروں گا کہ کانگریس کا ہمیشہ ایسا ہی یقین رہا۔

کانگریس نے ہمیشہ اس بارے میں دو بنیادی اصول اپنے سامنے رکھے، اور جب کبھی کوئی قدم اُٹھایا تو ان دونوں اصولوں کو صاف صاف اور قطعی شکل میں مان کر اُٹھایا:

۱۔ ہندوستان کا جو دستورِ اساسی (کانسٹی ٹیوشن) بھی آئندہ بنایا جائے، اس میں اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کی پوری ضمانت ہونی چاہیے۔

۲۔ اقلیتوں کے حقوق اور مفاد کے لیے کن کن تحفّظات (سیف گارڈز) کی ضرورت ہے؟ اس کے لیے جج خود اقلیتیں ہیں نا کہ اکثریتیں۔ اس لیے تحفظات کا فیصلہ ان کی رضامندی سے ہونا چاہیے، نہ کہ کثرتِ رائے سے۔

اقلیتوں کا مسئلہ صرف ہندوستان ہی کے حصّے میں نہیں آیا ہے۔ دنیا کے دوسرے حصّوں میں بھی رہ چکا ہے۔ میں آج اس جگہ سے دنیا کو مخاطب کرنے کی جرأت کرتا ہوں۔ میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ کیا اس سے بھی زیادہ کوئی صاف اور بے لاگ طرزِ عمل اس بارے میں اختیار کیا جا سکتا ہے؟ اگر کیا جا سکتا ہے تو وہ کیا ہے؟ کیا اس طرزِ عمل میں کوئی بھی ایسی خامی رہ گئی

اکثریت کی جگہ حاصل ہے۔ ایسی حالت میں کوئی وجہ نہیں کہ انھیں کو ایک اقلیت گروہ ہونے کا احساس مضطرب کرسکے۔

ہندستان کا آئندہ دستور اساسی (Constitution) اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو، مگر اس کی ایک بات ہم سب کو معلوم ہے۔ وہ کامل معنوں میں ایک آل انڈیا وفاق (Federations) کا جمہوری دستور ہوگا، جس کے تمام حلقے (Units) اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہوں گے، اور فیڈرل مرکز کے حصے میں صرف وہی معاملات رہیں گے، جن کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا۔ مثلاً بیرونی تعلقات، دفاع، کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا ممکن ہے کہ کوئی دماغ جو ایک جمہوری دستور کے پوری طرح عمل میں آنے اور دستوری شکل میں چلنے کا نقشہ تھوڑی دیر کے لیے بھی اپنے سامنے لاسکتا ہے۔ ان اندیشوں کو قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائے، جنھیں اکثریت اور اقلیت کے اس پُر فریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے یہ باور نہیں کرسکتا کہ ہندستان کے مستقبل کے نقشے میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔ دراصل یہ تمام اندیشے اس لیے پیدا ہورہے ہیں کہ ایک برطانی مدبّر کے مشہور لفظوں میں جو اس نے آئرلینڈ کے بارے میں کہے تھے:

"ہم ابھی تک دریا کے کنارے کھڑے ہیں، اور گو تیرنا چاہتے ہیں، مگر دریا میں اترتے نہیں۔ ان اندیشوں کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ ہمیں دریا میں بے خوف وخطر کود جانا چاہیے۔"

جوں ہی ہم نے ایسا کیا، ہم معلوم کرلیں گے کہ ہمارے تمام اندیشے بے بنیاد تھے۔

مسلمانانِ ہند کے لیے ایک بنیادی سوال

تقریباً تیس برس ہوئے، جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان کے اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی، اور عام طور پر وہی ذہنیت ہر طرف چھائی ہوئی تھی، جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی اختیار کر لی گئی تھی۔ وقت کی یہ آب وہوا میرے غور وفکر کی راہ نہ روک سکی۔ میں بہت جلد ایک آخری نتیجہ تک پہنچ گیا اور اس نے میرے سامنے یقین اور عمل کی راہ کھول دی۔ میں نے غور کیا کہ ہندستان اپنے تمام حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں، اور اس کی رفتار سے بے پروا نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرزِ عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیونکر کر سکتے ہیں؟ صرف اس طرح کہ معاملہ کی سطح پر نہ رہیں، اس کی بنیادوں تک اُتریں، اور پھر دیکھیں کہ ہم اپنے آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں۔ میں نے ایسا کیا، اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے۔ ہم ہندوستانی مسلمان ہندستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں، یا خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے؟ اگر پہلی صورت ہے، تو بلاشبہ ہماری راہ بالکل دوسری ہوجاتی ہے۔ وقت کا کوئی اعلان، آئندہ کا کوئی وعدہ، دستورِ اساسی کا کوئی تحفظ، ہمارے شک اور خوف کا اصلی علاج نہیں ہوسکتا۔ ہم مجبور ہوجاتے ہیں کہ کسی تیسری طاقت کی موجودگی برداشت کریں۔ یہ تیسری طاقت موجود ہے اور اپنی جگہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں، اور ہمیں بھی خواہش رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی جگہ نہ چھوڑ سکے، لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں، ہمیں خود اعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے۔ تو پھر ہماری راہِ عمل بالکل صاف ہوجاتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو بالکل ایک دوسرے عالم میں پانے لگتے ہیں۔ شک، تذبذب، بے عملی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پرچھائیں بھی نہیں پڑسکتی۔ یقین، جماؤ، عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ، حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ، معاملوں کی کوئی چبھن، ہمارے قدموں کا رُخ نہیں بدل سکتی۔ ہمارا فرض ہوجاتا ہے کہ ہندوستان کے قومی مقصد کی راہ میں قدم اٹھائے بڑھے جائیں!

مجھے اس سوال کا جواب معلوم کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی۔ میرے دل کے ایک ایک ریشے نے پہلی حالت سے انکار کیا۔ میرے لیے ناممکن تھا کہ اس کا تصور بھی کرسکوں۔ میں کسی مسلمان کے لیے بشرطیکہ اس نے اسلام کی روح اپنے دل کے ایک ایک کونے سے ڈھونڈ کر نکال نہ پھینکی ہو، یہ ممکن نہیں سمجھتا کہ اپنے کو پہلی حالت میں دیکھنا برداشت کرے!

میں نے ۱۹۱۰ء میں "الہلال" جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ آپ کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں

گذشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن ہاتھوں سے ڈھلی؟ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ کی پیداوار ہے، جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے شروع ہونے کے بعد ہندستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع ہو گیا تھا، اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی اس نئی سیاسی بیداری کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقشہ میں دو باتیں خاص طور سے ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ ہندستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں: ایک ہندو قوم ہے، اور ایک مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلہ میں بہت کم ہے، اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہو جائے گی، اور مسلمانوں کی ہستی خطرہ میں پڑ جائے گی۔ میں اس وقت اور زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اتنی بات آپ کو یاد دلا دوں گا کہ اگر اس معاملہ کی ابتدائی تاریخ آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کو ایک سابق وائسرائے ہند، لارڈ ڈفرن اور ایک سابق لیفٹیننٹ گورنر مغربی و شمالی (اب یونائیٹڈ پراونسز) سر آکلینڈ کالون کے زمانے کی طرف لوٹنا چاہیے۔

برطانوی سامراج نے ہندستان کی سرزمین میں وقتاً فوقتاً جو بیج ڈالے، ان میں سے ایک بیج یہ تھا۔ اس نے فوراً پھول پتے پیدا کیے۔ اور گو پچاس برس گزر چکے ہیں، مگر ابھی تک اس کی جڑوں میں نمی خشک نہیں ہوئی!

سیاسی بول چال میں جب کبھی "اقلیت" کا لفظ بولا جاتا ہے، تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو، لازمی طور پر "اقلیت" ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیت، دونوں اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کر سکے۔ اس حیثیت کے تصور کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایک گروہ کی تعداد کی نسبت دوسرے گروہ سے کم ہو، بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ بجائے خود کم ہو، اور اتنی کم ہو کہ اس سے اپنی حفاظت کی توقع نہ کی جا سکے۔ ساتھ ہی اس میں تعداد (Number) کے ساتھ نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔ فرض کیجیے، ایک ملک میں دو گروہ موجود ہیں۔ ایک کی تعداد ایک کروڑ ہے۔ دوسرے کی دو کروڑ ہے۔ اب اگرچہ ایک کروڑ، دو کروڑ کا نصف ہوگا اور اس لیے دو کروڑ سے کم ہوگا، مگر سیاسی نقطۂ خیال سے ضروری نہ ہوگا کہ صرف اس نسبتی فرق کی بنا پر ہم اسے ایک اقلیت فرض کر کے اس کی کمزور ہستی کا اعتراف کر لیں۔ اس طرح کی اقلیت ہونے کے لیے تعداد کے نسبتی فرق کے ساتھ دوسرے عوامل (Factors) کی موجودگی بھی ضروری ہے۔

اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف ایک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت "اقلیت" کی کمزوریوں کا گمان بھی کرنا اپنی نگاہ کو صریح دھوکا دینا ہے۔

اس کی مجموعی تعداد ملک میں آٹھ نو کروڑ کے اندر ہے۔ وہ ملک کی دوسری جماعتوں کی طرح معاشرتی اور نسلی تقسیموں میں بٹی ہوئی نہیں ہے۔ اسلامی زندگی کی مساوات اور برادرانہ یک جہتی کے مضبوط رشتے نے اُسے معاشرتی تفرقوں کی کمزوریوں سے بہت حد تک محفوظ رکھا ہے۔ بلاشبہ یہ تعداد ملک کی پوری آبادی میں ایک چوتھائی سے زیادہ نسبت نہیں رکھتی۔ لیکن سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے، خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانی مواد کی اتنی عظیم مقدار کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی کوئی جائز وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندستان میں اپنے حقوق و مفاد کی خود نگہداشت نہیں کر سکے گی؟

یہ تعداد کسی ایک ہی رقبہ میں سمٹی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ایک خاص تقسیم کے ساتھ ملک کے مختلف حصوں میں پھیل گئی ہے۔ ہندستان کے گیارہ صوبوں میں سے چار صوبے ایسے ہیں، جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے، اور دوسری مذہبی جماعتیں اقلیت کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر برٹش بلوچستان کا بھی اس میں اضافہ کر دیا جائے، تو چار کی جگہ مسلم اکثریت کے پانچ صوبے ہو جائیں گے۔ اگر ہم ابھی مجبور ہیں کہ مذہبی تفریق کی بنا پر ہی "اکثریت" اور "اقلیت" کا تصور کرتے رہیں، تو بھی اس تصور میں مسلمانوں کی جگہ محض ایک "اقلیت" کی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ اگر سات صوبوں میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو پانچ صوبوں میں انھیں

میں آیا، اُسی دن سے قدرت کے مخفی ہاتھوں نے، پُرانے ہندوستان کی جگہ ایک نئے ہندوستان کے ڈھالنے کا کام شروع کردیا۔

ہم اپنے ساتھ اپنا ذخیرہ لائے تھے، یہ سرزمین بھی اپنے ذخیروں سے مالامال تھی۔ ہم نے اپنی دولت اس کے حوالے کردی اور اس نے اپنے خزانوں کے دروازے ہم پر کھول دیے۔ ہم نے اُسے اسلام کے ذخیرے کی وہ سب سے زیادہ قیمتی چیز دے دی، جس کی اُسے سب سے زیادہ احتیاج تھی۔ ہم نے اسے جمہوریت اور انسانی مساوات کا پیام پہنچا دیا۔

تاریخ کی پوری گیارہ صدیاں اس واقعے پر گزر چکی ہیں۔ اب اسلام بھی اس سرزمین پر ویسا ہی دعوا رکھتا ہے، جیسا دعوا ہندو مذہب کا ہے۔ اگر ہندو مذہب کئی ہزار برس سے اس سرزمین کے باشندوں کا مذہب رہا ہے، تو اسلام بھی ایک ہزار برس سے اس کے باشندوں کا مذہب چلا آتا ہے۔ جس طرح آج ایک ہندو فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ وہ ہندوستانی ہے، اور ہندو مذہب کا پیرو ہے، ٹھیک اسی طرح ہم بھی فخر کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم ہندوستانی ہیں اور مذہبِ اسلام کے پیرو ہیں۔ میں اس دائرے کو اس سے زیادہ وسیع کروں گا۔ میں ہندوستانی مسیحی کا بھی یہ حق تسلیم کروں گا کہ وہ آج سر اُٹھا کے کہہ سکتا ہے کہ میں ہندوستانی ہوں، اور باشندگانِ ہند کے ایک مذہب یعنی مسیحیت کا پیرو ہوں۔

ہماری گیارہ صدیوں کی مشترک (ملی جلی) تاریخ نے ہماری ہندوستانی زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب، ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے رسم و رواج، ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتیں، کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے، جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگی ہو۔ ہماری بولیاں الگ تھلگ تھیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے۔ ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے، مگر انھوں نے مل جل کر ایک نیا سانچا پیدا کرلیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پُرانی تصویروں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں دیکھا جاسکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے، اور ہم اسے چھوڑ کر اس زمانے کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے، جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں، جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں، تو انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں، اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں، جو چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب اور معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسطِ ایشیا سے لائے تھے، تو میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں، بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے۔ اور حقیقت کی زمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے۔ میں ان لوگوں میں ہوں جن کا اعتقاد ہے کہ تجدید (Revival) کی مذہبیت میں ضرورت ہے، مگر معاشرت میں یہ ترقی سے انکار کرنا ہے۔

ہماری اس ایک ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچا ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے۔ وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا۔ اور قسمت کی مہر اُس پر لگ چکی۔ ہم پسند کریں یا نہ کریں، مگر اب ہم ایک ہندوستانی قوم، اور ناقابلِ تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔ علیحدگی کا کوئی بناوٹی تخیل ہمارے اس ایک ہونے کو دو نہیں بنا سکتا۔ ہمیں قدرت کے فیصلے پر رضامند ہونا چاہیے، اور اپنی قسمت کی تعمیر میں لگ جانا چاہیے۔

خاتمہ

حضرات! میں اب آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گا۔ میں اب اپنی تقریر ختم کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن قبل اس کے کہ ختم کروں، مجھے ایک بات کے یاد دلانے کی اجازت دیجیے۔ آج ہماری ساری کامیابیوں کا دارومدار تین چیزوں پر ہے: اتحاد، ڈسپلن (Discipline) اور مہاتما گاندھی کی رہنمائی پر اعتماد۔ یہی ایک تنہا رہنمائی ہے، جس نے ہماری تحریک کا شاندار ماضی تعمیر کیا، اور صرف اسی سے ہم ایک فتح مند مستقبل کی توقع کرسکتے ہیں۔

ہماری آزمائش کا ایک نازک وقت ہمارے سامنے ہے۔ ہم نے تمام دنیا کی نگاہوں کو نظارے کی دعوت دے دی ہے۔ کوشش کیجیے کہ ہم اس کے اہل ثابت ہوں۔

(خطباتِ آزادؔ مرتبہ مالک رام، شائع کردہ ساہتیہ اکادمی)



بے اثر نہیں رہیں ۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانانِ ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا۔ ۱۹۲۰ء کے اواخر میں جب چار برس کی نظر بندی کے بعد میں رہا ہوا، تو میں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اس واقعہ پر بیس برس گزر چکے۔ اس عرصے میں طرح طرح کے اُتار چڑھاؤ ہوتے رہے۔ حالات کے نئے نئے سیلاب بہے۔ خیالات کی نئی نئی لہریں اٹھیں۔ تاہم ایک حقیقت بغیر کسی تبدیلی کے اب تک قائم ہے۔ مسلمانوں کی عام رائے پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔

ہاں، وہ اب پیچھے لوٹنے کے لیے تیار نہیں۔ لیکن آگے بڑھنے کی راہ اُس پر پھر مشتبہ ہو رہی ہے۔ میں اس وقت اسباب میں نہیں جاؤں گا۔ میں صرف اثرات دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء میں جس جگہ سے انھیں مخاطب کیا تھا، آج بھی میں اسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے، اُن میں سے کوئی حالت ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گزری ہو۔ میری آنکھوں نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے صرف گزرتے ہی نہ رہے۔ میں اُن کے اندر کھڑا رہا اور میں نے ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں، میرے لیے ممکن نہیں کہ اپنے یقین سے لڑوں۔ میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصے میں ان سے کہتا رہا ہوں، اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نو کروڑ مسلمانوں کے لیے صرف وہی راہِ عمل ہو سکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا، مگر آج انھیں مجھ سے اختلاف ہے، میں انھیں اس اختلاف کے لیے ملامت نہیں کروں گا، مگر میں ان سے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا۔ یہ قوموں اور ملکوں کی قسمتوں کا معاملہ ہے، ہم اسے وقتی جذبات کی رو میں بہہ کر طے نہیں کر سکتے۔ ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بنا پر اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں۔ ایسی دیواریں روز بنائی اور ڈھائی نہیں جا سکتیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا غبار آلود ہو رہی ہے۔ مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے۔ وہ آج بھی ہر پہلو سے معاملے پر غور کریں، وہ اس کے سوا کوئی راہِ عمل اپنے سامنے نہیں پائیں گے۔

مسلمان اور متحدہ قومیت

میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تیرہ سو برس کی شاندار روایتیں میرے ورثے میں آئی ہیں۔ میں تیار نہیں کہ اس کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی ضائع ہونے دوں۔ اسلام کی تعلیم، اسلام کی تاریخ، اسلام کے علوم و فنون، اسلام کی تہذیب، میری دولت کا سرمایہ ہے۔ اور میرا فرض ہے کہ اس کی حفاظت کروں۔ بحیثیت مسلمان ہونے کے میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں۔ اور میں برداشت نہیں کر سکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔ لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں، جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا کیا ہے۔ اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی، وہ اس راہ میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندستانی ہوں۔ میں ہندستان کی ایک اور ناقابلِ تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر ہوں۔ میں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں، جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے۔ میں اس کی تکوین (بناوٹ) کا ایک ناگزیر عامل (Factor) ہوں، میں اپنے اس دعوے سے کبھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔

ہندوستان کے لیے قدرت کا یہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ اس کی سرزمین انسان کی مختلف نسلوں، مختلف تہذیبوں، اور مختلف مذہبوں کے قافلوں کی منزل بنے۔ ابھی تاریخ کی صبح بھی نمودار نہیں ہوئی تھی کہ ان قافلوں کی آمد شروع ہو گئی۔ اور پھر ایک کے بعد ایک سلسلہ جاری رہا۔ اس کی وسیع سرزمین سب کا استقبال کرتی رہی، اور اس کی فیاض گود نے سب کے لیے جگہ نکالی۔ ان ہی قافلوں میں ایک آخری قافلہ ہم پیروانِ اسلام کا بھی تھا۔ یہ بھی پچھلے قافلوں کے نشان راہ پر چلتا ہوا یہاں پہنچا۔ اور ہمیشہ کے لیے بس گیا۔ یہ دنیا کی دو مختلف قوموں اور تہذیبوں کے دھاروں کا ملاپ تھا۔ یہ گنگا اور جمنا کے دھاروں کی طرح پہلے ایک دوسرے سے الگ الگ بہتے رہے، لیکن پھر، جیسا کہ قدرت کا اٹل قانون ہے، دونوں کو ایک سنگم میں مل جانا پڑا۔ ان دونوں کا میل تاریخ کا ایک عظیم واقعہ تھا۔ جس دن یہ واقعہ ظہور

ملکی غلامی سے ہے۔ جس کے ہاتھوں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔ ایک دن تھا جب ہماری قوم کے قدم کسی جنگ کے آغاز کی طرف تھے، اور آج تم اس جنگ کے انجام سے مضطرب ہو۔ آخر تمھاری اس عجلت پر کیا کہوں؟ کہ اِدھر سفر کی جستجو ختم نہیں ہوئی اور اُدھر گمرہی کا خطرہ بھی پیش آگیا۔

میرے بھائی! میں نے ہمیشہ سیاست کو ذاتیات سے الگ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس پُرخار وادی میں قدم نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ میری بہت سی باتیں کنایوں کا پہلو لیے ہوتی ہیں۔ لیکن مجھے آج جو کچھ کہنا ہے، اسے بے روک ہو کر کہنا چاہتا ہوں۔ متحدہ ہندوستان کا بٹوارہ بنیادی طور پر غلط تھا۔ مذہبی اختلاف کو جس ڈھب سے ہوا دی گئی اس کا لازمی نتیجہ یہی آثار و مظاہر تھے، جو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھے اور بدقسمتی سے بعض مقامات میں آج بھی دیکھ رہے ہیں۔

پچھلے سات برس کے روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں، اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے۔ البتہ ہندوستان کے مسلمانوں پر جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلط قیادت کی فاش غلطیوں ہی کا نتیجہ ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں۔ میں پچھلے دنوں ہی سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔

اب ہندوستان کی سیاست کا رُخ بدل چکا ہے۔ مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اب یہ ہمارے اپنے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے اندازِ فکر میں بھی سوچ سکتے ہیں یا نہیں۔ اسی لیے میں نے نومبر کے دوسرے ہفتہ میں ہندوستان کے مسلمان رہنماؤں کو دہلی بلانے کا قصد کیا ہے... دعوت نامے بھیج دیے گئے ہیں۔ ہراس کا موسم عارضی ہے۔ میں تم کو یقین دلاتا ہوں کہ ہم کو ہمارے سوا کوئی زیر نہیں کر سکتا۔ میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا راستہ چھوڑ دو، شک سے ہاتھ اٹھالو، اور بدعملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دو دھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے، جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمھارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔

یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو، اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ، اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمھارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جا رہے ہو اور کیوں جا رہے ہو؟

یہ دیکھو، مسجد کے بلند مینار تم سے اچک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ جمنا کے کنارے تمھارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم ہو کہ تمھیں یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔ حالاں کہ دہلی تمھارے خون سے سینچی ہوئی ہے۔

عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصے پہلے تمھارا جوش و خروش بیجا تھا، اسی طرح آج یہ تمھارا خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی، یا مسلمان اور اشتعال، ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ سچے مسلمانوں کو نہ تو کوئی طمع ہلا سکتی ہے، اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔ چند انسانی چہروں کے غائب از نظر ہو جانے سے ڈرو نہیں۔ انھوں نے تمھیں جانے کے لیے اکٹھا کیا تھا۔ آج انھوں نے تمھارے ہاتھ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے تو یہ عیب کی بات نہیں۔ یہ دیکھو، تمھارے دل تو ان کے ساتھ ہی رخصت نہیں ہو گئے۔ اگر دل ابھی تک تمھارے پاس ہیں، تو اسے خدا کی جلوہ گاہ بناؤ جس نے آج سے تیرہ سو برس پہلے عرب کے ایک اُمّی کی معرفت فرمایا تھا: "جو خدا پر ایمان لائے اور اس پر جم گئے تو پھر ان کے لیے نہ تو کسی طرح کا ڈر ہے اور نہ کوئی غم۔" ہوائیں آتی ہیں اور گزر جاتی ہیں۔ یہ صرصر سہی لیکن اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں۔ ابھی دیکھتی آنکھوں ابتلا کا موسم گزرنے والا ہے۔ یوں بدل جاؤ جیسے تم پہلے کبھی اس حالت ہی میں نہ تھے۔

میں کلام میں تکرار کا عادی نہیں ہوں۔ لیکن مجھے تمھاری تغافل کیشی کے پیش نظر بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ تیسری طاقت اپنی گھمنڈ کا پشتارہ اٹھا کر رخصت ہو چکی ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو کر رہا۔ سیاسی ذہنیت اپنا پچھلا سانچہ توڑ چکی ہے اور اب نیا سانچہ ڈھل رہا ہے۔ اگر اب بھی تمھارے دلوں کا معاملہ بدلا نہیں، اور دماغوں کی چبھن ختم نہیں ہوئی، تو پھر حالت دوسری ہے۔ لیکن اگر واقعی تمھارے اندر سچی تبدیلی کی خواہش پیدا ہو گئی ہے تو پھر اس طرح بدلو، جس طرح تاریخ نے اپنے تئیں بدل لیا ہے۔ آج بھی کہ ہم ایک دورِ انقلاب کو پورا کر چکے ہیں، ہمارے ملک کی تاریخ میں کچھ صفحے خالی ہیں اور ہم ان صفحوں میں زیبِ عنوان بن سکتے ہیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم اس کے لیے تیار بھی ہوں۔

عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے، لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔

میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو، جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمھارا شعار رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جو



مسلمانانِ دہلی کا اجتماع

(جامع مسجد دہلی — اکتوبر ۱۹۴۷ء)

میرے عزیزو! آپ جانتے ہیں کہ وہ کونسی چیز ہے، جو مجھے یہاں لے آئی ہے۔ میرے لیے شاہ جہاں کی اس یادگار مسجد میں یہ اجتماع کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں نے اس زمانہ میں جس پر لیل و نہار کی بہت سی گردشیں بیت چکی ہیں، تمھیں یہیں سے خطاب کیا تھا۔ جب تمھارے چہروں پر اضمحلال کی بجائے اطمینان تھا اور تمھارے دلوں میں شک کی بجائے اعتماد۔ آج تمھارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند برسوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ تمھیں یاد ہے، میں نے تمھیں پکارا تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردیے۔ میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے۔ میں نے کروٹ لینی چاہی، تم نے میری کمر توڑ دی۔ حتیٰ کہ پچھلے سات برس کی تلخ نوا سیاست جو تمھیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے، اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمھیں خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف احتراز کیا، بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کریں۔ نتیجہ معلوم کہ آج ان ہی خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے، جن کا اندیشہ تمھیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔

سچ پوچھو تو میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا، جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گذاری ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں، یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی۔ بلکہ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمھاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔ میرا احساس زخمی اور میرے دل کو صدمہ ہے۔ سوچو تو سہی، تم نے کون سی راہ اختیار کی؟ کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں؟ کیا تمھارے حواس میں اختلال نہیں آگیا ہے؟ یہ خوف تم نے خود ہی فراہم کیا ہے۔ یہ تمھارے اپنے اعمال کے پھل ہیں۔

ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا، جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریہ حیاتِ معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے، اس کو چھوڑ دو۔ یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہے۔ نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں۔ لیکن تم نے سُنی اَن سُنی برابر کردی، اور یہ نہ سوچا کہ وقت اور اس کی تیز رفتار تمھارے لیے اپنا ضابطہ تبدیل نہیں کرسکتے۔ وقت کی رفتار تھمی نہیں۔ تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمھیں بھروسہ تھا، وہ تمھیں لاوارث سمجھ کر، تقدیر کے حوالے کر گئے۔ وہ تقدیر جو تمھارے دماغی لغت کی منشاء سے مختلف مفہوم رکھتی ہے۔ یعنی ان کے نزدیک فقدانِ ہمت کا نام تقدیر ہے۔

انگریز کی بساط تمھاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہ نمائی کے وہ بت جو تم نے وضع کیے تھے، وہ بھی دغا دے گئے۔ حالاں کہ تم نے یہی سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے، اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمھاری زندگی ہے۔ میں تمھارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمھارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔ لیکن اگر کچھ دُور ماضی کی طرف پلٹ جاؤ، تو تمھارے لیے بہت سی گرہیں کھل سکتی ہیں۔ ایک وقت تھا، میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمھیں پکارا تھا اور کہا تھا۔

"جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے روک نہیں سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے اور اس کی غلامانہ زنجیریں بیسویں صدی کی ہوائے حریت سے کٹ کر گرنے والی ہیں۔ اگر تم نے وقت کے پہلو بہ پہلو قدم اٹھانے سے پہلوتہی کی اور تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمھارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا، ملک کی آزادی کے بارے میں وہ روِیہ اختیار کیا، جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ آج ہندوستان کا جھنڈا اپنے پورے شکوہ سے لہرا رہا ہے۔ یہ وہی جھنڈا ہے جس کی اڑانوں سے حاکمانہ غرور کے دل آزار قہقہے تمسخر کیا کرتے تھے۔"

یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمھاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی، بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی اور یہی وہ انقلاب ہے، جس کی ایک کروٹ نے تمھیں بہت حد تک خوفزدہ کر دیا ہے۔ تم خیال کرتے ہو کہ تم سے کوئی اچھی شے چھن گئی ہے اور اس کی جگہ بُری شے آگئی ہے۔ ہاں، تمھاری بیقراری اسی لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بری شے کو ملجیٰ و ماویٰ سمجھ رکھا تھا۔ میری مراد غیر



مہاتما گاندھی کی یادگار

(نئی دہلی — فروری ۱۹۴۸ء)

[گاندھی جی کے حادثۂ قتل کے چند ہی روز بعد فروری ۱۹۴۸ء میں کانسٹی ٹیوشن کلب (نئی دہلی) میں ایک اجتماع ہوا تھا، جہاں یہ مسئلہ زیر بحث تھا کہ گاندھی جی کی یادگار کس شکل میں قائم کی جائے۔ اس جلسے کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی تھی۔ یہ ان کی صدارتی تقریر ہے۔]

آج مہاتما گاندھی کے بعد نہ صرف ہندوستان میں، بلکہ تمام دنیا میں ان کی یادگار مختلف شکلوں میں قائم ہے۔ حال ہی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی چھ اصحاب پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی ہے، جو مہاتما گاندھی کی ایک ایسی یادگار قائم کرنے کے مسئلے پر غور و فکر کرے گی، جو ان کے پاکیزہ مقصدِ حیات اور اس کی روح کو دنیا کے سامنے نمایاں کردے۔

اس کے علاوہ دوسرے طریقوں سے بھی ان کی خدمات کے تذکرے اور قلمی یادگاریں، ان کے کارنامے محفوظ کیے جارہے ہیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں جب ان کی زندگی کا مطالعہ کریں، تو ایک روشن حقیقت ان کے سامنے آجائے۔

یہ سب کچھ ہے لیکن میں جب بھی سوچتا ہوں ایک چیز بار بار میرے سامنے آتی ہے، اور وہ یہ کہ اس طرح جو کچھ بھی کیا جارہا ہے، اس میں مجھے ایک بڑا خانہ خالی نظر آتا ہے، اور اگر اس کو پُر نہ کیا گیا، تو ایک بڑی کمی رہ جائے گی۔

آپ کو معلوم ہے کہ مہاتما جی کی زندگی مختلف کاموں میں گزری ہے، لیکن ان جیسی شخصیتیں دنیا میں کبھی کبھی ابھرا کرتی ہیں، جو دنیا کی تمام خود ساختہ حد بندیوں سے بالاتر ہوا کرتی ہیں۔

تاریخ انسانی کے ہر دور میں آپ دیکھیں گے کہ انسان نے دنیا میں بہت سی حد بندیاں قائم کی ہیں۔ جیسے جغرافیائی حد بندی، کہا جاتا ہے: یہ یورپ ہے، یہ ایشیا، یہ عرب ہے، یہ ہندوستان وغیرہ، مذہبی حد بندی، ہم کہتے ہیں: یہ مسلمان ہے، یہ عیسائی، یہ ہندو، یہ سکھ وغیرہ۔

قومی حد بندی: کہا جاتا ہے "یہ انگریز ہے" یہ "اٹالین" یہ ہندی وغیرہ

لسانی حد بندی: کہا جائے گا "یہ فلاں زبان کا بولنے والا ہے اور یہ فلاں زبان کا وغیرہ ایسے ہی رنگ و نسل کی حد بندی وغیرہ۔

یہ تمام حد بندیاں ہماری زندگی کی قدرتی ضروریات ہیں۔ لیکن جب تک یہ تعمیری دائرہ میں رہتی ہیں، ہمارے لیے ایک بڑا سہارا بنتی ہیں۔ اور جب یہ تخریبی رنگ اختیار کرلیتی ہیں تو گروہ انسانی کو تباہ کردینے والی اور مٹادینے والی بن جایا کرتی ہیں۔

دنیا کی پوری تاریخ میں جب بھی ان حد بندیوں کا غلط استعمال ہونے لگتا ہے، تو وہی مقاصد جو ان کے سہارے چمکتے تھے، خاک میں مل جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر مذہب کی حد بندی کو لیجیے سب جانتے ہیں کہ مذہب دنیا کی اصلاح کے لیے آیا ہے۔ اور صلح و آشتی، امن و انصاف وغیرہ ایسی چیزیں ہیں، جن کو ہر مذہب بنیادی طور پر صحیح مانتا ہے۔ لیکن یہی مذہبی حد بندی جب تخریبی جامہ پہن لیتی ہے، تو ہزاروں خوں ریزیوں کا باعث بن جاتی ہے۔ دنیا کی تاریخ میں ہزاروں کشت و خون ہیں، جو اسی مذہب کے نام پر ہوئے ہیں۔

اپنے ہی ماحول کو دیکھیے۔ آج ہمارے چاروں طرف جو کچھ ہوچکا ہے، وہ خدا کا نام لے کر ہی کیا گیا ہے۔ ایسے ہی جغرافیائی حد بندی کو لیجیے۔ قرآن کی بولی میں یہ بندشیں اس لیے تھیں کہ لِتَعَارَفُوْا تم میں باہم پہچان پیدا ہو۔ لیکن یہی حد بندی جب تباہی کی شکل میں آتی ہے تو دنیا میں بڑی بربادیوں کا باعث بن جاتی ہے۔

یہی حال قومی حد بندی کا ہے۔ اس کا مقصد بھی وہی لِتَعَارَفُوْا ہے۔ یعنی آپس کی پہچان کا ذریعہ! لیکن یہی قومیت کی حد بندی، جو ایک ذریعہ پہچان کا تھی، جب اپنی حدوں سے گذر جاتی ہے، تو دنیا میں بڑی خوں ریزیاں سی قومی حرص و طمع اور غرور و گھمنڈ کے نتیجے میں ہوئی ہیں

غرض کہ دنیا میں بہت سی حد بندیاں جو ہماری زندگی پر چھا گئی ہیں، اور ہم ان میں ایسے بندھ گئے ہیں کہ اگرچہ ہم میں بڑی سے بڑی روح بڑائی کی بڑی سے بڑی جگہ پیدا کرسکتی ہے، لیکن ان حدود کے اندر ہی اندر رہ کر، ان سے آگے قدم رکھنے کی ان میں جرأت ہی پیدا نہیں ہوسکتی۔ لیکن جس طرح نیچر ایک خاص ڈھنگ پر چلتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اپنا رنگ چھوڑ دیتا ہے۔ ایسے ہی ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ کے افق پر کبھی کبھی ایسی شخصیتیں ابھرتی ہیں کہ دنیا کی



اجلے نقش و نگار تمھیں اس ہندوستان میں ماضی کی یادگار کے طور پر نظر آ رہے ہیں، وہ تمھارا ہی قافلہ تھا، انھیں بھلاؤ نہیں۔ انھیں چھوڑو نہیں۔ ان کے وارث بن کر رہو، اور سمجھ لو کہ اگر تم بھاگنے کے لیے تیار نہیں، تو پھر تمھیں کوئی طاقت بھگا نہیں سکتی۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے، ہم اس کے لیے ہیں اور اس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔

آج زلزلوں سے ڈرتے ہو، کبھی تم خود ایک زلزلہ تھے۔ آج اندھیرے سے کانپتے ہو، کیا یاد نہیں کہ تمھارا وجود ایک اجالا تھا۔ یہ بادلوں نے میلا پانی برسایا ہے تم نے بھیگ جانے کے خدشے سے اپنے پائینچے چڑھا لیے ہیں۔ وہ تمھارے ہی اسلاف تھے، جو سمندروں میں اتر گئے، پہاڑوں کی چھاتیوں کو روند ڈالا، بجلیاں آئیں، تو ان پر مسکرا دیے۔ بادل گرجے تو قہقہوں سے جواب دیا۔ صرصر اٹھی، تو اس کا رخ پھیر دیا۔ آندھیاں آئیں، تو ان سے کہا کہ تمھارا راستہ یہ نہیں ہے۔ یہ ایمان کی جان کنی ہے کہ شہنشاہوں کے گریبانوں سے کھیلنے والے، آج خود اپنے گریبانوں سے کھیلنے لگے۔ اور خدا سے اس درجہ غافل ہو گئے کہ جیسے اس پر کبھی ایمان ہی نہیں تھا۔

عزیزو! میرے پاس تمھارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ وہی پرانا نسخہ ہے، جو برسوں پہلے کا ہے وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسن لایا تھا۔ وہ نسخہ ہے قرآن کا یہ اعلان کہ لَا تَہِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ۔

آج کی صحبت ختم ہو گئی مجھے جو کچھ کہنا تھا، وہ اختصار کے ساتھ کہہ چکا ہوں۔ پھر کہتا ہوں اور بار بار کہتا ہوں: اپنے حواس پر قابو رکھو، اپنے گرد و پیش اپنی زندگی خود فراہم کرو۔ یہ منڈی کی چیز نہیں کہ تمھیں خرید کر لا دوں۔ یہ تو دل کی دکان ہی میں سے اعمالِ صالحہ کی نقدی سے دستیاب ہو سکتی ہے۔

والسّلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہ!

("خطباتِ آزاد" مرتبہ مالک رام)



تھی، جس کا ایک حرف بھی چھپا ہوا نہ تھا۔ انسانیت کی عظمت کے لیے سب سے بڑی کسوٹی ہے اور اس معیار پر پورے اترنے والے تمام تاریخِ انسانی میں صرف چند انسان ہوئے ہیں جنھیں آپ اپنی انگلیوں پر گن سکتے ہیں۔

جن کو تمام دنیا کی حد بندیوں نے الجھانے کی کوشش کی، لیکن وہ الجھ نہ سکے۔ تمام بندشوں نے ان کا دامن پکڑنا چاہا، مگر وہ گرفت میں نہ آ سکے میرے نزدیک گاندھی جی کی سب سے بڑی عظمت یہی ہے۔

یہ نہ تھا کہ مہاتما جی ہندو نہ تھے۔ وہ بیشک ہندو تھے۔ لیکن انھوں نے ہندو مذہب و دماغ کی ایک نئی تعبیر کی تھی۔ اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا، جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا تھا۔ اور وہ ایک ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں، نہ اور دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہنچ سکے، تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔

ہندو مذہب کا پرانا دماغ اور نقشہ جو ہمارے سامنے آتا ہے، اس میں بہت زیادہ وسعتیں تھیں۔ اور جہاں تک میرا مطالعہ ہے، دنیا کے تمام مذاہب میں نظریۂ توحید کو جس مذہب نے سب سے زیادہ قریب سے دیکھا ہے، وہ ہندو مذہب ہے میرے پاس اس کے بہت سے تاریخی شواہد و نظائر موجود ہیں، لیکن آج ہندو دھرم کی وہ شکل باقی نہیں ہے۔ اور اس کے بہت سے خانے خالی ہو چکے ہیں ہندو مذہب نے ابتدائی دور میں یونانیوں کو وہ درجہ دیا تھا، جو ایک برہمن کا ہوتا ہے۔ صرف اس لیے کہ یونان علم دوست ملک تھا۔ لیکن دوسری جگہ یہ ہے کہ ہندو دماغ گرنے لگا۔ چھوت چھات اور تنگ دماغ پیدا ہوگیا۔ تب ہی سے ہندو دھرم اپنی بلند سطح سے گر گیا۔

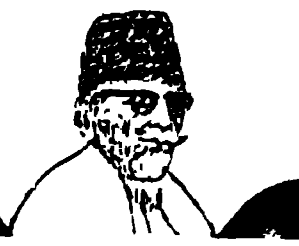
گاندھی جی ہندو تھے اور ہندو ہی رہے لیکن انھوں نے ہندو دھرم کی اتنی اونچی جگہ بنائی تھی کہ جب وہ اس بلندی پر سے دیکھتے تھے تو دنیا کے تمام جھگڑے ان کو مٹتے ہوئے نظر آتے تھے۔ ان کے سامنے ایک کھلی ہوئی سچائی تھی جو کسی ایک کا ورثہ نہیں ہے، بلکہ سورج اور اس شعاعوں کی طرح سب کے لیے ہے۔

پس ہمیں گاندھی جی کی عظمت ان ادنیٰ درجے کی چیزوں میں نہیں ڈھونڈھنی چاہیے، بلکہ پردہ اٹھاکر دیکھنا چاہیے۔ تب حقیقت کا چہرہ صاف نظر آئے گا۔ وہ اتنی بلندی پر تھے کہ دنیا کی کوئی حد بندی ان کا راستہ روک نہیں سکی۔

آج ہم ان کی کوئی بھی یادگار بنائیں، وہ نامکمل ہوگی۔ جب تک کہ وہ ان کی اس سربلندی کو ظاہر نہ کرے۔ اس لیے مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ گاندھی جی کی یادگار اس شکل میں ہونی چاہیے جو مہاتما جی کی اس سربلندی کو ظاہر کرے۔ آنے والی نسلوں کو اپنی خاموش زبان سے بتا دے کہ مہاتما جی کا مشن اور مقصدِ حیات یہ تھا، جو دنیا بھر کے زائرین کو اپنی زبانِ حال سے گاندھی جی کی عظمت و بلندی کی تاریخ بتا سکے۔

آپ کتنی ہی یادگاریں بنائیں، لیکن وہ بیکار ہیں، جب تک کہ ان کی انگلی اس عالمگیر سچائی کی طرف نہ اٹھے، جو گاندھی جی کے پیشِ نظر تھی۔

("خطباتِ آزاد" مرتبہ مالک رام)



کوئی حد بندی بھی انھیں بڑائی تک پہنچنے سے نہیں روک سکتی۔ مذہب کی حد بندی ان کی آنکھوں کو بند نہیں کر سکتی۔ قومیت کی حد بندی ان کے پاؤں کی زنجیر نہیں بن سکتی۔ وطنیت کی حد بندی ان کے ہاتھوں کو پکڑ نہیں سکتی۔ وہ ان تمام حدود سے بہت اونچے اور بلند ہوتے ہیں۔

جب یہ شخصیتیں ان بندشوں کی حدود سے بالاتر ہو جاتی ہیں، تب آپ دیکھیں گے کہ ان کی آنکھوں میں سچائی کا نور پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کی نگاہ میں تعصب کا ایک ثمر نہیں رہتا۔ ان کی نظر ہر طرف اور ہر گوشے پر یکساں پڑتی ہے۔ دنیا کا تمام اچھا بُرا ان کے سامنے ہوتا ہے۔ وہ سب کو ایک ہی نور سے دیکھتے اور پہچانتے ہیں۔ انھیں جہاں کہیں حسن نظر آتا ہے، وہ دوڑتے ہیں کہ یہ تو ہمارے لیے ہے۔ انھیں جس طرف خوبی نظر آتی ہے، وہ اس کو اپناتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ ہمارا حق ہے۔ لیکن آپ یاد رکھیے، تاریخ میں ایسی ہستیاں بہت ہی کم ہوا کرتی ہیں۔

مہاتما جی کی ہستی تاریخِ عالم کی ان ہی ہستیوں میں سے ایک تھی۔ وہ دنیا کی ان تمام حد بندیوں سے بلند تر تھے۔ اور ان کی نگاہ میں ہر قوم اور ہر وطن، ہر نسل اور ہر گروہ ایک ہی حیثیت رکھتا تھا۔ اور وہ ہر ایک کی خوبیوں کو اپناتے اور پسند کرتے تھے۔ جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے، مجھے ان کا تعارف سب سے پہلے ۱۹۰۸ء میں ہوا، جب کہ والد مرحوم نے انتقال فرمایا۔ بمبئی، ٹرانسوال وغیرہ میں والد مرحوم نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ اور ان اطراف میں اُن کے بہت سے مریدین و معتقدین تھے۔ ان دِنوں گاندھی جی ان اطراف کے حالات سے دلچسپی لے رہے تھے اور ٹرانسوال کانگریس کے پروگراموں میں سرگرمِ عمل تھے۔ اس وقت مجھے ایک ٹیلی گرام مِلا جس کے نیچے گاندھی جی کے دستخط تھے۔ انھوں نے اس ٹیلی گرام میں والدِ مرحوم کی تعزیت کی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۱۸ء تک مجھے ان سے خط و کتابت یا زیارت و ملاقات کا موقع نہ ملا۔ ۱۹۱۸ء میں جب میں رانچی جیل میں نظر بند تھا ان دنوں گاندھی جی بہار کے دورے کے لیے آئے، اور انھوں نے ایک شخص کے ذریعہ مجھے جیل میں پیغام بھیجا کہ میں بہار آیا ہوا ہوں، اور تم سے مِلنا چاہتا ہوں۔ مگر گورنر بہار نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی۔ اس کے بعد جب میں رانچی جیل سے رہا ہوا۔ اور ایک جلسہ میں شرکت کے لیے ۱۹۲۰ء کی ۲۰ جنوری کو دہلی آیا، تو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے مکان پر سب سے پہلے مجھے گاندھی جی سے نیاز حاصل ہوا۔ اس دن سے آج تک جب کہ ۱۹۴۸ء ہے، ۲۸ برس گذر چکے ہیں۔ ۲۸ برس کے یہ دن ہم پر ایسے گذرے ہیں کہ گویا ہم ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔

اس عرصے میں بسا اوقات ان سے اختلافات بھی ہوئے۔ چنانچہ اس لڑائی کے زمانے میں میرا اور ان کا جو اختلاف ہوا تھا، اس سے آپ بھی واقف ہوں گے۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں میری یہ قطعی رائے تھی، جس پر ممبران کی اکثریت کو اتفاق تھا کہ اگر برطانیہ یہ مان لے کہ جنگ کے بعد ہندوستان کو آزادی دی جائے گی، تو ہم لڑائی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ ان کو اس سے سخت اختلاف تھا، وہ بالکل دوسری جانب جا رہے تھے۔ وہ کہتے تھے، ہم ایسی آزادی لینا ہی نہیں چاہتے، جو لڑائی کے سائے میں ہم کو مِلے۔ اس لیے وہ کسی طرح بھی لڑائی میں شرکت کے لیے تیار نہ تھے۔

آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی تجاویز کا ڈرافٹ گاندھی جی ہی بنایا کرتے تھے چنانچہ اس مرتبہ بھی اپنے اس ریزولیوشن کا ڈرافٹ بنوانے کے لیے میں اور پنڈت نہرو، گاندھی جی کے پاس گئے۔ اور انھوں نے اپنے پورے اختلاف کے باوجود اس تجویز کا ڈرافٹ بنا دیا۔

غرض اس طویل مدّت میں بہت سے موقعے آئے کہ ہم میں اور ان میں اختلاف ہوا اور کشمکش تک نوبت پہنچی، انھوں نے اور ہم نے، دونوں ہی نے اپنی اپنی جگہ اس کو محسوس بھی کیا۔ لیکن اس پوری زندگی میں کوئی ایسا وقت نہیں آیا کہ ہمارے دلوں کا رُخ پھر گیا ہو۔ ایسے ایسے اختلافوں کے باوجود ان کی عظمت کی جو رسّی ہماری گردنوں میں پڑی ہوئی تھی۔ ہم کبھی اس سے باہر نہ ہو سکے۔

اس موقعے پر آپ سے یہ کہہ دوں کہ میری طبیعت میں ایک طرح کا نقص اور خامی ہے۔ وہ یہ کہ جب تک کسی کی کوئی خصوصیت میرے سامنے نہ آجائے، جو میرے دماغ پر چھا جائے اور میری گردن کو دبا لے، اس وقت تک وہ مجھے اپنے سامنے جھکا نہیں سکتا۔ "میری گردن کی رگیں سخت ہیں"۔ میرے سامنے جب کوئی دماغ آتا ہے، تو پہلے میرا ذہن اس کے خلاف ہی جانا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ میرے ذہن کو اپنی مضبوط گرفت میں لے لے۔ چنانچہ آپ میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے مِلا، اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی، جو انسان کی آنکھوں کو بند کر دیا کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت کو میرے دل میں راسخ کر دیا۔ اور جو دن گذرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں، بڑھتا ہی چلا گیا۔ ہم دو آدمیوں کو ان سے انتہائی قرب تھا اور ہمیں بہت طویل موقع مِلا۔ وہ ایک کھلی ہوئی کتاب تھے، جس کا ہر ورق کھلا ہوا، ہر سطر روشن، اور ہر لفظ دھلا ہوا اور ہر حرف چمکتا ہوا تھا۔

آج تمام دنیا میں شاید ان ہی کی زندگی ایسی

جن (Gin) کا مرکب پینے والے اس رطلِ گراں کے متحمل نہیں ہوسکیں گے۔ مولانائے روم نے ایسے ہی معاملات کی طرف اشارہ کیا تھا:

بادۂ آں در خورِ ہر ہوش نیست
حلقۂ آں سخرۂ ہر گوش نیست

آپ کہیں گے، قید خانہ کی زندگی رواقیت کے لیے تو موزوں ہوئی کہ زندگی کے رنج و راحت سے بے پروا بنا دینا چاہتی ہے لیکن لذّتیہ کی عشرت اندوزیوں کا وہاں کیا موقع ہوا؟ جو نامراد قید خانے سے باہر کی آزادیوں میں بھی زندگی کی عیش کوشیوں سے تہی دست رہتے ہیں، انھیں قید و بند کی محروم زندگی میں اس کا سر و سامان کہاں میسر آسکتا ہے؟ لیکن میں آپ کو یاد دلاؤں گا کہ انسان کا اصلی عیش دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں۔ میں لذّتیہ سے ان کا دماغ لے لیتا ہوں، جسم ان کے لیے چھوڑ دیتا ہوں۔ داغ مرحوم نے ناصح سے صرف اس کی زبان لے لینی چاہی تھی:

ملے جو حشر میں لے لوں زبان ناصح کی
عجیب چیز ہے یہ طولِ مدّعا کے لیے

اور غور کیجیے، تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہی ہے کہ سر و سامانِ کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈھتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردۂ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں ہے، خود ہمارے اندر ہی موجود ہے۔ عیش و مسرت کی جن گل شگفتگیوں کو ہم چاروں طرف ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے، وہ ہمارے نہاں خانۂ دل کے چمن زاروں میں ہمیشہ کھلتے اور مرجھاتے رہتے ہیں۔ لیکن محرومی ساری یہ ہوئی کہ ہمیں چاروں طرف کی خبر ہے مگر خود اپنی خبر نہیں۔ وَفِیْ اَنْفُسِکُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔

کہیں تجھ کو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈھا
پھر آخر دل ہی میں پایا، بغل ہی میں سے تو نکلا!

جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوئی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود رہتا ہے جہاں کہیں اپنے پر کھول دے گا، ایک چمنستانِ بوقلموں کھل جائے گا:

نہ با صحرا سرے دارم نہ با گلزار سودائے
نہ ہر جا می روم، از خویش می جوشد تماشائے

قید خانے کی چار دیواری کے اندر بھی سورج ہر روز چمکتا ہے اور چاندنی راتوں نے کبھی قیدی اور غیر قیدی میں امتیاز نہیں کیا۔ اندھیری راتوں میں جب آسمان کی قندیلیں روشن ہو جاتی ہیں، تو وہ صرف قید خانے کے باہر ہی نہیں چمکتیں، اسیرانِ قید و محن کو بھی اپنی جلوہ فروشیوں کا پیام بھیجتی رہتی ہیں۔ صبح جب طباشیر بکھیرتی ہوئی آئے گی اور شام جب شفق کی گلگوں چادریں پھیلانے لگے گی، تو صرف عشرت سراؤں کے دریچوں ہی سے ان کا نظارہ نہیں کیا جائے گا، قید خانے کے روزنوں سے لگی ہوئی نگاہیں بھی انھیں دیکھ لیا کریں گی۔ فطرت نے انسان کی طرح کبھی یہ نہیں کیا کہ کسی کو شاد کام رکھے کسی کو محروم کردے۔ وہ جب کبھی اپنے چہرے سے نقاب الٹتی ہے، تو سب کو یکساں طور پر نظارۂ حسن کی دعوت دیتی ہے۔ یہ ہماری غفلت اندیشی ہے کہ نظر اٹھا کر دیکھتے نہیں اور دعوت اپنے گرد و پیش ہی میں کھوتے رہتے ہیں:

محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

جس قید خانے میں صبح ہر روز مسکراتی ہو، جہاں شام ہر روز پردۂ شب میں چھپ جاتی ہو، جس کی راتیں کبھی ستاروں کی قندیلوں سے جگمگانے لگتی ہوں، کبھی چاندنی کی حسن افروزیوں سے جہاں تاب رہتی ہوں، جہاں دوپہر ہر روز چمکے، شفق ہر روز نکھرے، پرند ہر صبح و شام چہکیں، اسے قید خانہ ہونے پر بھی عیش و مسرت کے سامانوں سے خالی کیوں سمجھ لیا جائے! یہاں سر و سامانِ کار کی تو اتنی فراوانی ہوئی کہ کسی گوشہ میں بھی گم نہیں ہوسکتا۔ مصیبت ساری یہ ہے کہ خود ہمارا دل و دماغ ہی گم ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے سے باہر ساری چیزیں ڈھونڈھتے رہیں گے، مگر اپنے کھوئے ہوئے دل کو کبھی نہیں ڈھونڈھیں گے، حالانکہ اگر اسے ڈھونڈھ نکالیں، تو عشرت و مسرت کا سارا سامان اسی کوٹھڑی کے اندر سمٹا ہوا مل جائے:

بخیۂ دل ہمہ نقش و نگار بے معنی ست
ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا ایں جاست

ایوان و محل نہ ہوں، تو کسی درخت کے سایے سے کام لے لیں، دیبا و مخمل کا فرش نہ ملے تو سبزۂ خودرو کے فرش پر جا بیٹھیں۔ اگر برقی روشنی کے کنول میسّر نہیں ہیں، تو آسمان کی قندیلوں کو کون بجھا سکتا ہے! اگر دنیا کی ساری مصنوعی خوشنمائیاں اوجھل ہو گئی ہیں تو ہو جائیں، صبح اب بھی ہر روز مسکرائے گی، چاندنی اب بھی ہمیشہ جلوہ فروشیاں کرے گی، لیکن اگر دلِ زندہ پہلو میں نہ رہے تو خدارا بتلائیے، اس کا بدل کہاں ڈھونڈھیں! اس کی خالی جگہ بھرنے کے لیے کس چولھے کے انگارے کام دیں گے:

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ! تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

میں آپ کو بتلاؤں اس راہ میں میری کامرانیوں کا راز کیا ہے! میں اپنے دل کو مرنے نہیں دیتا۔ کوئی

حکایتِ بادہ و تریاک

(۱)

قلعۂ احمد نگر

۲۷ اگست ۱۹۴۲ء

صدیقِ مکرم

انسان اپنی ایک زندگی کے اندر کتنی ہی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانے سے باہر کی، ایک اندر کی :

ہم سمندر باش و ہم ماہی کہ در اقلیمِ عشق
رُوے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

دونوں زندگیوں کے مرقعوں کی الگ الگ رنگ و روغن سے نقش آرائی ہوئی ہے۔ آپ شاید ایک کو دیکھ کر دوسری کو پہچان نہ سکیں :

لباسِ صورت اگر واژگوں کنم بینند
کہ خرقۂ خشنم مایۂ طلا باف است

قید سے باہر کی زندگی میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا، خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لیے بارِ خاطر نہیں ہوتا، لیکن یارِ شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں :

تاکے چو موجِ بحر بہر سو شتافتن
در عینِ بحر پاے چو گرداب بند کن

لیکن جونہی حالات کی رفتار قید و بند کا پیام لاتی ہے میں کوشش کرنے لگتا ہوں کہ اپنے آپ کو یک قلم بدل دوں۔ میں اپنا پچھلا دماغ سر سے نکال دیتا ہوں اور ایک نئے دماغ سے اس کی خالی جگہ بھرنی چاہتا ہوں۔ حریمِ دل کے طاقوں کو دیکھتا ہوں کہ خالی ہو گئے، تو کوشش کرتا ہوں کہ نئے نئے نقش و نگار بناؤں اور انھیں پھر سے آراستہ کروں :

وقتست دگر بُت کدہ سازند حرم را

اس تحولِ صورت (Metamorphism) کے عمل میں کہاں تک مجھے کامیابی ہوتی ہے، اس کا فیصلہ تو دوسروں ہی کی نگاہیں کر سکیں گی، لیکن خود میرے فریبِ حال کے لیے اتنی کامیابی بس کرتی ہے کہ اکثر اوقات اپنی پچھلی زندگی کو بھولا رہتا ہوں اور جب تک اس کے سراغ میں نہ نکلوں اسے واپس نہیں لا سکتا :

دل کہ جمع ست غم از بے سروسامانی نیست
فکرِ جمعیت اگر نیست، پریشانی نیست

اگر آپ مجھے اس عالم میں دیکھیں تو خیال کریں، میری پچھلی زندگی مجھے قید خانے کے دروازے تک پہنچا کر واپس چلی گئی، اور اب ایک دوسری ہی زندگی سے سابقہ پڑا ہے۔ جو زندگی کل تک اپنی حالتوں میں گم، اور خوش کامیوں اور دل شگفتگیوں سے بہت کم آشنا تھی، آج اچانک ایک ایسی زندگی کے قالب میں ڈھل گئی جو شگفتہ مزاجیوں اور خندہ روئیوں کے سوا اور کسی بات سے آشنا ہی نہیں۔ "ہر وقت خوش رہو اور ہر ناگوار حالت کو خوشگوار بناؤ"، جس کا دستور العمل ہے :

حاصل کارگہ کون و مکاں این ہمہ نیست
بادہ پیش آر کہ اسبابِ جہاں این ہمہ نیست

پنج روزے کہ دریں مرحلہ مہلت داری
خوش بیاسا زمانے کہ زماں این ہمہ نیست

میں نے قید خانے کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے۔ اس میں ایک جُز رواقیہ (Stoics) کا ہے ایک لذتیہ (Epicureans) کا :

پنبہ را آتشی ایں جا بہ شرر افتاد است !

جہاں تک حالات کی ناگواریوں کا تعلق ہے، رواقیت سے ان کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور ان کی چُبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں :

ہر وقتِ بد کہ رُوے دہد آب سیل داں
ہر نقشِ خوش کہ جلوہ کند موجِ آب گیر

جہاں تک زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے، لذتیہ کا زاویۂ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں :

ہر وقتِ خوش کہ دست دہد مغتنم شمار
کس را وقوف نیست کہ انجامِ کار چیست !

میں نے اپنے کاک ٹیل (Cocktail) کے جام میں دونوں بوتلیں انڈیل دیں۔ میرا ذوقِ بادہ آشامی بغیر اس جامِ مرکب کے تسکین نہیں پا سکتا تھا۔ اسے قدیم تعبیر میں یوں سمجھیے کہ گویا حکایتِ بادہ و تریاک میں نے تازہ کر دی ہے :

چناں افیون ساقی در مے افگند
حریفاں را نہ سر ماند و نہ دستار

البتہ کاک ٹیل کا یہ نسخۂ خاص ہر خامکار کے بس کی چیز نہیں ہے۔ صرف بادہ گسارانِ کُہن مشق ہی اسے کام میں لا سکتے ہیں۔ ورموتھ (Vermouth) اور

دوسری قوموں سے بہتر سمجھا تھا۔ ایک پرانے چینی مقولہ میں سوال کیا گیا ہے "سب سے زیادہ دانشمند آدمی کون ہے؟" پھر جواب دیا ہے: "جو سب سے زیادہ خوش رہتا ہے" اس سے ہم چینی فلسفۂ زندگی کا زاویۂ نگاہ معلوم کر سکتے ہیں، اور اس میں شک نہیں کہ یہ بالکل سچ ہے :

نہ ہر درخت تحمل کند جفائے خزاں
غلامِ ہمتِ سرو کہ ایں قدم دارد!

اگر آپ نے یہاں ہر حال میں خوش رہنے کا ہنر سیکھ لیا ہے تو یقین کیجیے کہ زندگی کا سب سے بڑا کام سیکھ لیا۔ اب اس کے بعد اس سوال کی گنجائش ہی نہیں رہی، کہ آپ نے اور کیا کیا سیکھا؟ خود بھی خوش رہیے اور دوسروں سے بھی کہتے رہیے کہ اپنے چہروں کو غمگین نہ بنائیں :

چو مہمانِ خراباتی، بعشرت باش باَرنداں
کہ دردِ سر کشی جاناں، گراین مستی خمار آلود

زمانۂ حال کے ایک فرانسیسی اہلِ قلم آندرے ژیدا (Andre Gide) کی ایک بات مجھے بہت پسند آئی جو اس نے اپنی خود نوشتہ سوانح میں لکھی ہے :

خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں ہے، بلکہ ایک اخلاقی ذمّہ داری ہے۔ یعنی ہماری انفرادی زندگی کی نوعیت کا اثر صرف ہم ہی تک محدود نہیں رہتا، وہ دوسروں تک بھی متعدّی ہوتا ہے، یا یوں کہیے کہ ہماری ہر حالت کی چھوت دوسروں کو بھی لگتی ہے۔ اس لیے ہمارا اخلاقی فرض ہوا کہ خود افسردہ خاطر ہو کر دوسروں کو افسردہ خاطر نہ بنائیں :

افسردہ دل افسردہ کند انجمنے را

ہماری زندگی ایک آئینہ خانہ ہے۔ یہاں ہر چہرے کا عکس بیک وقت سینکڑوں آئینوں میں پڑنے لگتا ہے۔ اگر ایک چہرے پر غبار آجائے گا، تو سینکڑوں چہرے غبار آلود ہو جائیں گے۔ ہم میں سے ہر فرد کی زندگی محض ایک انفرادی واقعہ نہیں ہے، وہ پورے مجموع کا حادثہ ہے۔ دریا کی سطح پر ایک لہر تنہا اٹھتی ہے، لیکن اسی ایک لہر سے بے شمار لہریں بنتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں ہماری کوئی بات بھی صرف ہماری نہیں ہوتی؛ ہم جو کچھ اپنے لیے کرتے ہیں، اس میں بھی دوسروں کا حصہ ہوتا ہے۔ ہماری کوئی خوشی بھی ہمیں خوش نہیں کر سکے گی، اگر ہمارے چاروں طرف غمناک چہرے اکٹھے ہو جائیں گے۔ ہم خود خوش رہ کر دوسروں کو خوش کرتے ہیں، اور دوسروں کو خوش دیکھ کر خود خوش ہونے لگتے ہیں یہی حقیقت ہے جسے عرفی نے اپنے شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا تھا :

بدیدارِ تو دل شادند باہم دوستانِ تو
ترا ہم شادماں خواہم چو رُوئے دوستاں بینی

یہ عجیب بات ہے کہ مذہب، فلسفہ اور اخلاق۔ تینوں نے زندگی کا مسئلہ حل کرنا چاہا اور تینوں میں خود زندگی کے خلاف رجحان پیدا ہو گیا۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ ایک آدمی جتنا زیادہ بجھا دل اور سُوکھا چہرہ لے کر پھرے گا، اتنا ہی زیادہ مذہبی، فلسفی اور اخلاقی قسم کا ہوگا۔ گویا علم اور تقدس، دونوں کے لیے یہاں ماتمی زندگی ضروری ہوئی۔ زندگی کی تحقیر اور توہین صرف یونان کے کلبیہ (Cynics) ہی کا شعار نہ تھا، بلکہ رواقی (Stoics) اور مشّائی (Peripatetic) نقطۂ نگاہ میں بھی اس کے عناصر برابر کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ افسردہ دلی اور تُرش روئی فلسفیانہ مزاج کا ایک نمایاں خط و خال بن گئی۔ اخلاق سے اگر اس کے مذہبِ طمانیت و مسرّت (Eudemonism) اور مادّیاتی مذہبِ عشرت (Hedonism) کے تصوّرات مستثنیٰ کر دیجیے، تو اس کا عام طبعی مزاج بھی فلسفیانہ سرکہ روئی سے خالی نہیں ملے گا۔ مذہب اور روحانیت کی دنیا میں تو زہدِ خشک اور طبعِ خنک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرے کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دینداری اور ثقالتِ طبع تقریباً مرادف لفظ بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ قاآنی کو کہنا پڑا تھا :

اسبابِ طرب را ببر از مجلسِ بیروں
زاں پیش کہ ناگاہ ثقیلے رسد از در

آپ جانتے ہیں کہ اہلِ ذوق کی مجلسِ طرب تنگ دلوں کے گوشۂ خاطر کی طرح تنگ نہیں ہوتی، اس کی وسعت میں بڑی سمائی ہے۔ نظامی گنجوی نے اس کی تصویر کھینچی تھی :

ہر چہ در جملہ بہ آفاق دریں جا حاضر
مومن وارمنی و گبر و نصارا و یہود!

لیکن اتنی سمائی ہونے پر بھی اگر کسی چیز کی وہاں گنجائش نہ نکل سکی تو وہ زاہدانِ خشک کے ضخیم اور گنبد نما عمامے تھے۔ ایک عمامہ بھی پہنچ جاتا ہے تو پوری مجلس تنگ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے بعض یارانِ بے تکلّف کو کہنا پڑا تھا :

در مجلسِ ما زاہد! زنہار تکلف نیست
البتہ تو می گنجی، عمّامہ نمی گنجد

یہ سچ ہے کہ جن مسئلوں کو دنیا سینکڑوں برس کی کاوشوں سے بھی حل نہ کر سکی، آج ہم اپنی خوش طبعی کے چند لطیفوں سے انھیں حل نہیں کر دے سکتے۔ تاہم یہ ماننا پڑے گا، کہ یہاں ایک حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک فلسفی، ایک زاہد، ایک سادھو کا خشک چہرہ بنا کر ہم اس مرقع میں کھپ نہیں سکتے، جو نقاشِ فطرت کے موقلم نے یہاں کھینچ دیا ہے

جگہ ہو، اس کی تڑپ کبھی دھیمی نہیں پڑے گی۔ میں جانتا ہوں کہ جہانِ زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدۂ خلوت کے دم سے ہیں۔ یہ اُجڑا، اور ساری دنیا اُجڑ گئی:

ازصد سخنِ پیرم یک حرف مرا یاد ست
"عالم نہ شود ویراں، تا میکدہ آباد ست"

باہر کے ساز و سامانِ عشرت مجھ سے چھن جائیں، لیکن جب تک یہ نہیں چھنتا، میرے عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے؟:

دیدمش خرّم و خنداں قدحِ بادہ بدست
واندراں آئینہ صد گونہ تماشا می کرد
گفتم: "ایں جامِ جہاں بیں بتو کے داد حکیم؟"
گفت: "آں روز کہ ایں گنبدِ مینا می کرد"

آپ کو معلوم ہے، میں ہمیشہ صبح تین بجے سے چار بجے کے اندر اٹھتا ہوں اور چائے کے پیہم فنجانوں سے جامِ صبوحی کا کام لیا کرتا ہوں، خواجہ شیراز کی طرح میری صدائے حال بھی یہ ہوتی ہے کہ:

خورشیدِ مے زمشرقِ ساغر طلوع کرد
گر برگِ عیش می طلبی ترکِ خواب کن

یہ وقت ہمیشہ میرے اوقاتِ زندگی کا سب سے زیادہ پُرکیف وقت ہوتا ہے۔ لیکن قید خانے کی زندگی میں تو اس کی سرمستیاں اور خود فراموشیاں ایک دوسرا ہی عالم پیدا کر دیتی ہیں۔ یہاں کوئی آدمی ایسا نہیں ہوتا، جو اس وقت خواب آلود آنکھیں لیے ہوئے اٹھے اور قرینہ سے چائے بنا کر میرے سامنے دھر دے۔ اس لیے خود اپنے ہی دستِ شوق کی سرگرمیوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ میں اُس وقت بادۂ کہن کے شیشہ کی جگہ چینی چائے کا تازہ ڈبّا کھولتا ہوں، اور ایک ماہرِ فن کی دقیقہ سنجیوں کے ساتھ چائے دم دیتا ہوں۔ پھر جام و صراحی کو میز پر داہنی طرف جگہ دوں گا کہ اس کی اوّلیت اسی کی مستحق ہوئی۔ قلم و کاغذ کو بائیں طرف رکھوں گا کہ سر و سامانِ کار میں ان کی جگہ دوسری ہوئی۔ پھر کرسی پر بیٹھ جاؤں گا، اور کچھ نہ پوچھیے کہ بیٹھتے ہی کس عالم میں پہنچ جاؤں گا۔ کسی بادہ گسار نے شامپین اور بورڈو کے صد سالہ تہ خانوں کے عرقِ کُہن سال میں بھی وہ کیف و سرور کہاں پایا ہوگا، جو چائے کے اس دَورِ صبحگاہی کا ہر گھونٹ میرے لیے مہیّا کر دیتا ہے:

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم
اے بے خبر ز لذّتِ شُربِ مدامِ ما!

آپ کو معلوم ہے کہ میں چائے کے لیے روسی فنجان کام میں لاتا ہوں۔ یہ چائے کی معمولی پیالیوں سے بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ اگر بے ذوقی کے ساتھ پیجیے، تو دو گھونٹ میں ختم ہو جائیں۔ مگر خدا ناخواستہ میں ایسی بے ذوقی کا مرتکب کیوں ہونے لگا! میں جُرعہ کشانِ کُہن مشق کی طرح ٹھہر ٹھہر کر پیوں گا، اور چھوٹے چھوٹے گھونٹ لوں گا۔ پھر جب پہلا فنجان ختم ہو جائے گا، تو کچھ دیر کے لیے رک جاؤں گا، اور اس درمیانی وقفہ کو امتدادِ کیف کے لیے جتنا طول دے سکتا ہوں، طول دوں گا۔ پھر دوسرے اور تیسرے کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا، اور دنیا کو اور اس کے سارے کارخانۂ سود و زیاں کو یک قلم فراموش کر دوں گا:

خوش تراز فکرِ مے و جام چہ خواہد بودن
تا بہ بینیم، سرانجام چہ خواہد بودن

اس وقت بھی کہ یہ سطریں بے اختیار نوکِ قلم سے نکل رہی ہیں۔ اسی عالم میں ہوں، اور نہیں جانتا کہ ۹ر اگست کی صبح کے بعد سے دنیا کا کیا حال ہوا، اور اب کیا ہو رہا ہے:

شرابِ تلخ دہ ساقی کہ مرد افگن بود زورش
کہ تا یک دم بیاسایم ز دنیا و شر و شورش
کمندِ صیدِ بہرامی بیفگن، جامِ مے بردار
کہ من پیمودم ایں صحرا، نہ بہرام ست، نے گورش

میرا دوسرا پُرکیف وقت دوپہر کا ہوتا ہے، یا زیادہ صحتِ تعیّن کے ساتھ کہوں کہ زوال کا ہوتا ہے۔ لکھتے لکھتے تھک جاتا ہوں، تو تھوڑی دیر کے لیے لیٹ جاتا ہوں، پھر اٹھتا ہوں، غسل کرتا ہوں، چائے کا دور تازہ کرتا ہوں اور تازہ دم ہو کر پھر اپنی مشغولیتوں میں گم ہو جاتا ہوں۔ اس وقت آسمان کی بے داغ نیلگونی اور سورج کی بے نقاب درخشندگی کا جی بھر کے نظارہ کروں گا، اور رواقِ دل کا ایک ایک دریچہ کھول دوں گا۔ گوشہ ہائے خاطر افسردگیوں اور گرفتگیوں سے کتنے ہی غبار آلود ہوں، لیکن آسمان کی کشادہ پیشانی اور سورج کی چمکتی ہوئی خندہ روئی دیکھ کر ممکن نہیں کہ اچانک روشن نہ ہو جائیں:

بازم بہ کُلبہ کیست، نہ شمع و نہ آفتاب
بام و درم ز ذرّہ و پروانہ پُر شدہ ست

لوگ ہمیشہ اس کھوج میں لگے رہتے ہیں کہ زندگی کو بڑے بڑے کاموں کے لیے کام میں لائیں، لیکن نہیں جانتے کہ یہاں ایک سب سے بڑا کام خود زندگی ہوئی، یعنی زندگی کو ہنسی خوشی کاٹ دینا۔ یہاں اس سے زیادہ سہل کام کوئی نہ ہوا کہ مر جائیے۔ اور اس سے زیادہ مشکل کام کوئی نہ ہوا کہ زندہ رہیے۔ جس نے یہ مشکل حل کر لی، اس نے زندگی کا سب سے بڑا کام انجام دے دیا:

ناصحم گفت کہ، جز غم چہ ہنر دارد عشق
گفتم: "اے خواجۂ عاقل! ہنرے بہتر ازیں؟"

غالباً قدیم چینیوں نے زندگی کے مسئلہ کو

کا سکون متاثر نہیں ہوا، تو یہ صریح بناوٹ ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ طبیعت متاثر ہوئی اور تیزی اور شدت کے ساتھ ہوئی، لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس حالت کی عمر چند گھنٹوں سے زیادہ نہ تھی۔ چنانچہ گرفتاری کے دوسرے ہی دن جب حسبِ معمول علی الصباح اٹھا اور جام و مینا کا دور گردش میں آیا تو ایسا محسوس ہونے لگا۔ جیسے طبیعت کا سارا انقباض اچانک دور ہو رہا ہو، اور افسردگی و تنگی کی جگہ انشراح و شگفتگی دل کے دروازے پر دستک دے رہی ہو۔ ہا، مخلص خان عالمگیری نے کیا خوب لف و نشر مرتب کیا ہے۔ اس ذوقِ سخن میں میرا ساتھ دیجیے:

خُمارِ ما در توبہ و دلِ ساقی
بیک تبسّمِ مینا شکست و بست و گُشاد

اب معلوم ہوا کہ اگرچہ نگاہوں اور کانوں کی ایک محدود دنیا کھوئی گئی ہے، مگر فکر و تصوّر کی کتنی ہی نئی دنیائیں اپنی ساری پہنائیوں اور بے کناریوں کے ساتھ سامنے آکھڑی ہوئی ہیں۔ اگر ایک دروازے کے بند ہونے پر اتنے دروازے کُھل سکتے ہیں، تو کون ایسا زیاں عقل ہوگا جو اس سودے پر گلہ مند ہو:

نقصاں نہیں جنوں میں بلا سے ہو گھر خراب
دو گز زمیں کے بدلے بیاباں گراں نہیں

باقی رہی قید و بند کی تنہائی اور علائق کا انقطاع، تو حقیقت یہ ہے کہ یہ حالت کبھی میرے لیے موجبِ شکایت نہ ہوسکی۔ میں اس سے گریزاں نہیں رہتا، اس کا آرزومند رہتا ہوں۔ تنہائی خواہ کسی حالت میں آئے اور کسی شکل میں، میرے دل کا دروازہ ہمیشہ کُھلا پائے گی۔

بَاطِنُهٗ فِيهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَاب۔ ۱۵

ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبعِ وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے، اس لیے بہ تکلّف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے، مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈھتی ہے۔ جونہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کامجوئیوں میں لگ گئی:

درخرابات نہ دیدستی خراب
بادہ پنداری کہ پنہاں می زنم

لوگ لڑکپن کا زمانہ کھیل کود میں بسر کرتے ہیں، مگر بارہ تیرہ برس کی عمر میں میرا یہ حال تھا کہ کتاب لے کر کسی گوشہ میں جا بیٹھتا اور کوشش کرتا کہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل رہوں۔ کلکتہ میں آپ نے ڈلہوزی اسکوائر ضرور دیکھا ہوگا۔ جنرل پوسٹ آفس کے سامنے واقع ہے؛ اسے عام طور پر لال ڈگی کہا کرتے تھے۔ اس میں درختوں کا ایک جُھنڈ تھا کہ باہر سے دیکھیے تو درخت ہی درخت ہیں؛ اندر جائیے تو اچھی خاصی جگہ ہے اور ایک بینچ بھی بچھی ہوئی ہے۔ معلوم نہیں اب بھی یہ جُھنڈ ہے کہ نہیں۔ میں جب سیر کے لیے نکلتا، تو کتاب ساتھ لے جاتا اور اس جُھنڈ کے اندر بیٹھ کر مطالعہ میں غرق ہو جاتا۔ والد مرحوم کے خادمِ خاص حافظ ولی اللہ مرحوم ساتھ ہوا کرتے تھے۔ وہ باہر ٹہلتے رہتے اور جھنجلا جھنجلا کر کہتے: "اگر تجھے کتاب ہی پڑھنی تھی، تو گھر سے نکلا کیوں؟" یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور ان کی آواز کانوں میں گونج رہی ہے۔ دریا کے کنارے ایڈن گارڈن میں بھی اس طرح کے کئی جُھنڈ تھے۔ ایک جُھنڈ جو برمی پگوڈا کے پاس مصنوعی نہر کے کنارے تھا، اور شاید اب بھی ہو، میں نے چُن لیا تھا۔ کیونکہ اس طرف لوگوں کا گذر بہت کم ہوتا تھا۔ اکثر سہ پہر کے وقت کتاب لے کر نکل جاتا اور شام تک اس کے اندر گم رہتا۔ اب وہ زمانہ یاد آجاتا ہے تو دل کا عجیب حال ہوتا ہے:

عالمِ بے خبری، طُرفہ بہشتے بود است
حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم!

کچھ یہ بات نہ تھی کہ کھیل کود اور سیر و تفریح کے وسائل کی کمی ہو۔ میرے چاروں طرف ان کی ترغیبات پھیلی ہوئی تھیں، اور کلکتہ جیسا ہنگامہ گرمِ کُن شہر تھا؛ لیکن میں طبیعت ہی کچھ ایسی لے کر آیا تھا کہ کھیل کود کی طرف رخ ہی نہیں کرتی تھی:

ہمہ شہر پُر زخوباں، منم و خیالِ ماہے
چہ کنم کہ نفس بدخو نکند بکس نگاہے

والد مرحوم میرے اس شوقِ علم سے خوش ہوتے مگر فرماتے: یہ لڑکا اپنی تندرستی بگاڑ دے گا۔ معلوم نہیں جسم کی تندرستی بگڑی یا سنوری، مگر دل کو تو ایسا روگ لگ گیا کہ پھر کبھی پنپ نہ سکا:

کہ گفتہ بود کہ دردش دوا پذیر مباد

میری پیدائش ایک ایسے خاندان میں ہوئی، جو علم و مشیخت کی بزرگی اور مرجعیت رکھتا تھا۔ اس لیے خلقت کا جو ہجوم و احترام آج کل سیاسی لیڈری کے عروج کا کمال مرتبہ سمجھا جاتا ہے، وہ مجھے مذہبی عقیدتمندیوں کی شکل میں بغیر طلب و سعی کے مل گیا تھا۔ میں نے ابھی ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ لوگ پیرزادہ سمجھ کر میرے ہاتھ پاؤں چومتے تھے اور ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ خاندانی پیشوائی و مشیخت کی اس حالت میں نوعمر طبیعتوں کے لیے بڑی ہی آزمایش ہوتی ہے۔ اکثر حالتوں میں ایسا ہوتا ہے کہ ابتدا ہی سے طبیعتیں برخود غلط ہو جاتی ہیں اور نسلی غرور اور پیدایشی خود پرستی کا وہی روگ لگ جاتا ہے جو خاندانی امیرزادوں کی تباہی کا باعث ہوا کرتا ہے۔ ممکن ہے، اس کے کچھ نہ کچھ اثرات میرے حصہ میں بھی آئے ہوں کیونکہ اپنی چوریاں پکڑنے کے لیے خود اپنے کمیں میں



جس مرقع میں سورج کی چمکتی ہوئی پیشانی، چاند کا ہنستا ہوا چہرہ، ستاروں کی چشمک، درختوں کا رقص، پرندوں کا نغمہ، آبِ رواں کا ترنّم اور پھولوں کی رنگین ادائیں اپنی اپنی جلوہ طرازیاں رکھتی ہوں۔ اس میں ہم ایک بجھے ہوئے دل اور سوکھے ہوئے چہرہ کے ساتھ جگہ پانے کے یقیناً مستحق نہیں ہو سکتے۔ فطرت کی اس بزمِ نشاط میں تو وہی زندگی سج سکتی ہے جو ایک دہکتا ہوا دل پہلو میں اور چمکتی ہوئی پیشانی چہرے پر رکھتی ہو اور جو چاندنی میں چاند کی طرح نکھر کر، ستاروں کی چھاؤں میں ستاروں کی طرح چمک کر، پھولوں کی صف میں پھولوں کی طرح کھل کر اپنی جگہ نکال سکتی ہو۔ صائب کیا خوب کہہ گیا ہے:

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی
گشادہ رُوے تر از رازِ ہاے مستاں باش
تمیزِ نیک و بدِ روزگار کارِ تو نیست
چو چشمِ آئینہ در خوب و زشت حیراں باش

(۲)

قلعۂ احمد نگر
۲۹ اگست ۱۹۴۲ء

این رسم و راہِ تازہ ز حرمانِ عہدِ ماست
عنقا بہ روزگار کسے نامہ بر نہ بود

صدیقِ مکرم!

وہی چار بجے صبح کا جانفزا وقت ہے۔ چائے کا فنجان سامنے دھرا ہے، اور طبیعت درازنفسی کے بہانے ڈھونڈھ رہی ہے۔ جانتا ہوں کہ میری صدائیں آپ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ تاہم طبعِ نالہ سنج کو کیا کروں کہ فریاد و شیون کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ سُن رہے ہوں یا نہ سُن رہے ہوں، میرے ذوقِ مخاطبت کے لیے یہ خیال بس کرتا ہے کہ رُوے سخن آپ کی طرف ہے:

اگر نہ دیدی تپیدنِ دل، شنیدنی بود نالۂ ما

بانسری اندر سے خالی ہوتی ہے مگر فریادوں سے بھری ہوتی ہے، یہی حال میرا ہے:

بہ فسانۂ ہوسِ طرب تہی از خودیم و پُر از طلب
چہ دمد ز صنعتِ صُفرِ نے[1] بجز اینکہ نالہ فزوں کند

قید و بند کے جتنے تجربے اس وقت تک ہوئے تھے، موجودہ تجربہ ان سب سے کئی باتوں میں نئی قسم کا ہوا۔ اب تک یہ صورت رہتی تھی کہ قید خانے کے قواعد کے ماتحت عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جایا کرتا تھا۔ نجی کی خط و کتابت روکی نہیں جاتی تھی۔ اخبارات دیے جاتے تھے، اور اپنے خرچ سے منگوانے کی بھی اجازت ہوتی تھی۔ خاص خاص حالتوں میں اس سے بھی زیادہ دروازہ کھلا رہتا تھا، چنانچہ جہاں تک خط و کتابت اور ملاقاتوں کا تعلق ہے، مجھے ہمیشہ زیادہ سہولتیں حاصل رہیں۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ گو ہاتھوں میں زنجیریں اور پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی تھیں، لیکن کان بند نہیں ہو جاتے تھے اور آنکھوں پر پٹیاں نہیں بندھتی تھیں۔ قید و بند کی ساری رکاوٹوں کے ساتھ بھی آدمی محسوس کرتا تھا کہ ابھی تک اُسی دنیا میں بس رہا ہے، جہاں گرفتاری سے پہلے رہا کرتا تھا:

زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

کھانے پینے اور ساز و سامان کی تکلیفیں ان لوگوں کو پریشان نہیں کر سکتیں جو جسم کی جگہ دماغ کی زندگی بسر کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔ آدمی اپنے آپ کو احساسات کی عام سطح سے ذرا بھی اونچا کرے، تو پھر جسم کی آسائشوں کا فقدان اسے پریشان نہیں کر سکے گا۔ ہر طرح کی جسمانی راحتوں سے محروم رہ کر بھی ایک مطمئن زندگی بسر کر دی جا سکتی ہے، اور زندگی بہرحال بسر ہو ہی جاتی ہے:

رغبتِ جاہ چہ و نفرتِ اسباب کدام
زیں ہوسہا بگذر، یا نگذر، می گذرد

یہ حالت انقطاع و تجرّد کا ایک نقشہ بناتی تھی، مگر نقشہ ادھورا ہوتا تھا، کیونکہ نہ تو باہر کے علاقے پوری طرح منقطع ہو جاتے تھے، نہ باہر کی صداؤں کو زنداں کی دیواریں روک سکتی تھیں:

قید میں بھی ترے وحشی کو رہی زلف کی یاد
ہاں، کچھ اک رنجِ گرانباریِ زنجیر بھی تھا

لیکن اس مرتبہ جو حالت پیش آئی، اس نے ایک دوسری ہی طرح کا نقشہ کھینچ دیا۔ باہر کی نہ صرف تمام صورتیں ہی یک قلم نظروں سے اوجھل ہو گئیں، بلکہ صدائیں بھی بیک دفعہ رک گئیں۔ اصحابِ کہف کی نسبت کہا گیا ہے۔ فَضَرَبْنَا عَلٰٓى اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا، تو ایسی ہی ضرب علی الاذان کی حالت ہم پر بھی طاری ہو گئی۔ گویا جس دنیا میں بستے تھے، وہ دنیا ہی نہ رہی:

كَاَنْ لَّمْ يَكُنْ بَيْنَ الْحَجُوْنِ اِلَى الصَّفَا
اَنِيْسٌ وَّلَمْ يَسْمُرْ بِمَكَّةَ سَامِرُ!

اچانک ایک نئی دنیا میں لا کر بند کر دیے گئے جس کا جغرافیہ ایک سو گز سے زیادہ پھیلاؤ نہیں رکھتا، اور جس کی ساری مردم شماری پندرہ زندہ شکلوں سے زیادہ نہیں۔ اسی دنیا میں ہر صبح کی روشنی طلوع ہونے لگی، اسی میں ہر شام کی تاریکی پھیلنے لگی:

گویا نہ وہ زمیں ہے، نہ وہ آسماں ہے اب

اگر کہوں کہ اس ناگہانی صورتِ حال سے طبیعت

---

[1] بانسری میں جو سوراخ بنائے جاتے ہیں، انھیں فارسی میں "صفرِ نے" کہتے ہیں، یعنی بانسری کے نقطے۔

اصل میں ایسا ہی ہو۔

بہر حال جو صورتِ حال پیش آئی ہے اس سے جو کچھ بھی انقباضِ خاطر ہوا تھا، وہ صرف اس لیے ہوا تھا کہ باہر کے علائق اچانک یک قلم قطع ہو گئے۔ اور ریڈیو سٹ اور اخبار تک روک دیے گئے، ورنہ قید و بند کی تنہائی کا شکوہ نہ پہلے ہوا ہے نہ اب ہے:

دماغِ عطر پیراہن نہیں ہے
غمِ آوارگی ہائے صبا کیا

اور پھر جو کچھ بھی زبانِ قلم پر طاری ہوا صورتِ حال کی حکایت تھی، شکایت نہ تھی کیونکہ اس راہ میں شکوہ و شکایت کی تو گنجایش ہی نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں اختیار ہے کہ اپنا سر ٹکراتے رہیں، تو دوسرے کو بھی اختیار ہے کہ نئی نئی دیواریں چنتا رہے۔ بیدل کا یہ شعر موجودہ صورتِ حال پر کیا چسپاں ہوا ہے:

دوریِ وصلش طلسمِ اعتبارِ ما شکست
ورنہ ایں عجزے کہ می بینی، غبارِ ناز بود

اگرچہ یہاں تنہا نہیں ہوں، گیارہ رفیق ساتھ ہیں، لیکن چونکہ ان میں سے ہر شخص از راہِ عنایت میرے معمولات کا لحاظ رکھتا ہے، اس لیے حسبِ دلخواہ یکسوئی اور خود مشغولیت کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ دن بھر میں صرف چار مرتبہ کمرے سے نکلنا پڑتا ہے کیونکہ کھانے کا کمرہ قطار کا آخری کمرہ ہے، اور چلنے اور کھانے کے اوقات میں وہاں جانا ضروری ہوا۔ باقی تمام اوقات کی تنہائی اور خود مشغولی بغیر کسی خلل کے جاری رہتی ہے:

خوش فرشِ بوریا و گدائی و خوابِ امن
کیں عیش نیست درخورِ اورنگِ خسروی

زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود سے باہر تھا، اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ! وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا، اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا، سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اسے سجاتا ہوں اور اس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں:

آیینہ نقش بندِ طلسمِ خیال نیست
تصویرِ خود بہ لوحِ دگر می کشیم ما

گرفتاری چونکہ سفر کی حالت میں ہوئی تھی، اس لیے مطالعہ کا کوئی سامان ساتھ نہ تھا، صرف دو کتابیں میرے ساتھ آگئی تھیں، جو سفر میں دیکھنے کے لیے رکھ لی تھیں، اسی طرح دو چار کتابیں بعض ساتھیوں کے ساتھ آئیں۔ یہ ذخیرہ بہت جلد ختم ہو گیا۔ اور مزید کتابوں کے منگوانے کی کوئی راہ نہیں نکلی۔ لیکن اگر پڑھنے کے سامان کا فقدان ہوا تو لکھنے کے سامان میں کوئی کمی نہیں ہوئی، کاغذ کا ڈھیر میرے ساتھ ہے۔ اور روشنائی کی احمد نگر کے بازار میں کمی نہیں۔ تمام وقت خامہ فرسائی میں خرچ ہوتا ہے:

در جنوں بیکار نتواں زیستن
آتشم تیز است و داماں می زنم

جب تھک جاتا ہوں تو کچھ دیر کے لیے برآمدہ میں نکل کر بیٹھ جاتا ہوں یا صحن میں ٹہلنے لگتا ہوں:

بیکاریِ جنوں میں ہے سر پیٹنے کا شغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں تو پھر کیا کرے کوئی

میں نے جو خط انسپکٹر جنرل کو لکھا تھا۔ وہ اس نے گورنمنٹ کو بھیج دیا تھا۔ کل اس کا جواب ملا۔ اب نئے احکام ہمارے لیے یہ ہیں کہ اخبار دیے جائیں گے، قریبی رشتہ داروں کو خط لکھا جا سکتا ہے، لیکن ملاقات کسی سے نہیں کی جا سکتی۔ چیتہ خان نے یہاں کے فوجی مس (MESS) سے ٹائمز آف انڈیا کا تازہ پرچہ منگوا لیا تھا، وہ اس نے خط کے ساتھ حوالہ کیا۔ اخبار کا ہاتھ میں لینا تھا کہ تین ہفتے پہلے کی دنیا جو ہمارے لیے معدوم ہو چکی تھی، پھر سامنے آکھڑی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ ہمارے گرفتار ہو جانے سے ملک میں امن چین نہیں ہو گیا، بلکہ نئے ہنگاموں نے نئے غلغلے برپا کیے:

ہے ایک خلق کا خوں اشک خونفشاں پہ مرے
سکھائی طرز اسے دامن اٹھا کے آنے کی

میں نے چیتہ خان سے کہا کہ اگر ۹ اگست سے ۲۷ تک کے پچھلے پرچے کہیں سے مل سکیں تو منگوا دے۔ اس نے ڈھونڈھوایا، تو بہت سے پرچے مل گئے۔ رات دیر تک انھیں دیکھتا رہا تھا:

دیوانگاں ہزار گریباں دریدہ اند
دستِ طلب بہ دامنِ صحرا نمی رسد

مگر مجھے یہ قصّہ یہاں نہیں چھیڑنا چاہیے۔ میری آپ کی مجلس آرائی اس افسانہ سرائی کے لیے نہیں ہوا کرتی:

از ما بجز حکایتِ مہر و وفا مپرس

میری دکانِ سخن میں ایک ہی طرح کی جنس نہیں رہتی۔ لیکن آپ کے لیے کچھ نکالتا ہوں تو احتیاط کی چھلنی میں اچھی طرح چھان لیا کرتا ہوں کہ کسی طرح کی سیاسی ملاوٹ باقی نہ رہے۔ دیکھیے، اس چھان لینے کے مضمون کو شریف خان شیرازی نے کہ جہانگیر کے عہد میں امیر الامرا ہوا، کیا خوب باندھا ہے:

شرر نالہ بہ غربالِ ادب می بیزم
کہ بگوشِ تو مبادا رسد آوازِ درشت

یہ وہی امیر الامرا ہے جس کے حسبِ ذیل شعر پر جہانگیر نے شعرائے دربار سے غزلیں لکھوائی تھیں اور خود بھی طبع آزمائی کی تھی:

بگزر مسیح از سرِ ما کشتگانِ عشق
یک زندہ کردنِ تو بہ صد خوں برابر ست

("غبارِ خاطر"، مرتبہ: مالک رام
شائع کردہ: ساہتیہ اکادمی)



بیٹھنا جیسا کہ عرفی نے کہا ہے آسان نہیں:

خواہی کہ عیبہائے تو روشن شود ترا
یک دم منافقانہ نشیں در کمین خویش

لیکن جہاں تک اپنی حالت کا جائزہ لے سکتا ہوں، مجھے یہ کہنے میں تامّل نہیں کہ میری طبیعت کی قدرتی افتاد مجھے بالکل دوسری ہی طرف لے جارہی تھی۔ میں خاندانی مریدوں کی ان عقیدتمندانہ پرستاریوں سے خوش نہیں ہوتا تھا، بلکہ طبیعت میں ایک طرح کا انقباض اور توحش رہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کوئی ایسی راہ نکل آئے کہ اس فضا سے بالکل الگ ہو جاؤں اور کوئی آدمی آکر میرے ہاتھ پاؤں نہ چومے۔ لوگ یہ کمیاب جنس ڈھونڈھتے ہیں، اور ملتی نہیں۔ مجھے گھر بیٹھے ملی، اور میں اس کا قدر شناس نہ ہوسکا:

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

البتہ اب سوچتا ہوں کہ یہ معاملہ بھی فائدہ سے خالی نہ تھا، اور یہاں کا کونسا معاملہ ہے جو فائدہ سے خالی ہوتا ہے! یہی فائدہ کیا کم ہے کہ جس غذا کے لیے دنیا کی طبیعتیں للچاتی رہتی ہیں، اس سے پہلے ہی دن اپنا جی سیر ہو گیا اور طبیعت میں للچاہٹ باقی نہ رہی۔ فیضی نے ایک شعر ایسا کہا ہے کہ اگر اور کچھ نہ کہتا جب بھی فیضی تھا:

کعبہ را ویران مکن اے عشق کانجا یک نفس
گہ گہے پس ماندگان راہ منزل می کنند

طبیعت کی اس افتاد نے ایک بڑا کام یہ دیا کہ زمانے کے بہت سے تجربے میرے لیے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیرتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو، اور زیادہ منت گزار ہونے لگتا ہے کیونکہ ان کا جو ہجوم لوگوں کو خوشحال کرتا ہے، میرے لیے بسا اوقات ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں، تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی، اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈھا تھا، سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا، جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا:

ما نبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فنِ ما

اسی طرح اگر حالات کی رفتار قید و بند کا باعث ہوتی ہے، تو اس حالت کی جو رکاوٹیں اور پابندیاں دوسروں کے لیے اذیت کا موجب ہوتی ہیں، میرے لیے یکسوئی اور بےخود مشغولی کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور کسی طرح بھی طبیعت کو افسردہ نہیں کرسکتیں۔ میں جب بھی قید خانے میں سُنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قیدِ تنہائی کی سزا دی گئی ہے، تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی کی حالت آدمی کے لیے سزا کیسے ہوسکتی ہے! اگر دنیا اسی کو سزا سمجھتی ہے، تو کاش، ایسی سزائیں عمر بھر کے لیے حاصل کی جاسکیں!:

حسد بتہمتِ آزادیِ سروم بگداخت
کیں مرا دلیست کہ بر تہمتِ آں ہم حسد ست

ایک مرتبہ قید کی حالت میں ایسا ہوا کہ ایک صاحب نے جو میرے آرام و راحت کا بہت خیال رکھنا چاہتے تھے، مجھے ایک کوٹھڑی میں تنہا دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی۔ سپرنٹنڈنٹ فوراً تیار ہو گیا کہ مجھے ایسی جگہ رکھے جہاں اور لوگ بھی رکھے جاسکیں، اور تنہائی کی حالت باقی نہ رہے۔ مجھے معلوم ہوا تو میں نے اُن حضرت سے کہا: آپ نے مجھے راحت پہنچانی چاہی، مگر آپ کو معلوم نہیں کہ جو تھوڑی سی راحت یہاں حاصل تھی، وہ بھی آپ کی وجہ سے اب چھینی جارہی ہے! یہ تو وہی غالب والا معاملہ ہوا کہ:

کی ہم نفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر
اچھے رہے آپ اُس سے مگر مجھ کو ڈبو آئے

میں اپنی طبیعت کی اس افتاد سے خوش نہیں ہوں، نہ اسے حسن و خوبی کی کوئی بات سمجھتا ہوں۔ یہ ایک نقص ہے کہ آدمی بزم و انجمن کا حریف نہ ہو، اور صحبت و اجتماع کی جگہ خلوت و تنہائی میں راحت محسوس کرے:

حریفِ صافی و دُردی نہ، خطا اینجاست
تمیزِ ناخوش و خوش می کنی، بلا اینجاست

لیکن اب طبیعت کا سانچہ اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اسے توڑا جاسکتا ہے، مگر موڑا نہیں جاسکتا:

قطرہ از تشویشِ موجِ آخر نہاں شد در صدف
گوشہ گیری ہائے خلق از انفعالِ صحبت ست

اس افتادِ طبع کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں، اور لوگوں کو حقیقتِ حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور و پندار پر محمول کرتے ہیں، اور سمجھتے ہیں، میں دوسروں کو سُبک تر تصور کرتا ہوں، اس لیے ان کی طرف بڑھتا نہیں حال آنکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا، دوسروں کی فکر میں کہاں رہ سکتا ہوں! غنی کشمیری نے ایک شعر کیا خوب کہا ہے:

طاقتِ برخاستن از گردِ دنیا کم نہ ماند
خلق پندارد کہ مے خوردست و مست افتادہ است

سرخوش نے کلمات الشعراء میں جو شعر نقل کیا ہے اس میں "خلق می داند" ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں، یہ محل "دانستن" کا نہیں ہے "پنداشتن" کا ہے! اس لیے "پندارد" زیادہ موزوں ہوگا اور عجب نہیں،

وَحْدَهٗ اَنْجَزَ وَعْدَهٗ نَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَحْدَهٗ.

[خدا صرف خدا، معبودِ برحق کوئی اس کا شریک نہیں۔ ملک اس کا حمد اس کے لیے وہی جِلاتا ہے وہی مارتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس نے اپنا وعدہ پورا کردیا۔ اس نے اپنے بندے کی امداد فرمائی اور اکیلے نے تمام قبائلی جمعیتیں پاش پاش کردیں۔]

۸ ذی الحجہ کو منیٰ میں قیام فرمایا۔ ۹ کو جمعہ کے روز نماز ادا کر کے منیٰ سے روانہ ہوئے اور وادیِ نمرہ میں آ ٹھہرے، دن ڈھلے میدانِ عرفات میں تشریف لائے تو ایک لاکھ ۲۴ ہزار خدا پرستوں کا مجمع سامنے تھا۔ ورزمین سے آسمان تک تکبیر و تہلیل کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ اب سرکارِ دوعالمؐ قصواء پر سوار ہو کر آفتابِ عالمتاب کی طرح کوہِ عرفات کی چوٹی سے طلوع ہوئے تاکہ خطبۂ حج ارشاد فرمائیں۔ پہاڑ کے دامن میں عائشہؓ اور صفیہؓ اور علیؓ۔ فاطمہؓ۔ ابوبکرؓ اور عمرؓ۔ خالدؓ بلالؓ اصحابِ صفہ اور عشرۂ مبشرہؓ اور دوسری سینکڑوں اسلامی جماعتیں اور قبائلی جمعیتیں جلوہ فرما تھیں۔ اور پہلی نظر سے یہ معلوم ہوجاتا تھا کہ والیِ امت اپنی امت کی موجودات لے رہے ہیں اور محافظ حقیقی کو اس کا چارج سپرد فرما رہے ہیں۔

خطبۂ حجۃ الوداع

رسول اللہؐ کے آخری آنسو جو اس امت کے غم میں بہے حجۃ الوداع کے خطبے میں جمع ہیں اس وقت دولت و حکومت کا سیلاب مسلمانوں کی طرف امنڈا چلا آرہا تھا اور رسول اللہؐ کا غم یہ تھا کہ دولت کی یہ فراوانی آپ کے بعد آپ کی امت سے رابطۂ اتحاد کو پارہ پارہ کردے گی۔ اسی لیے اتحادِ امت کا موضوع اپنے سامنے رکھ لیا اور پھر دردِ نبوت کی پوری توانائی اسی موضوع پر صرف فرمادی۔ پہلے نہایت ہی درد انگیز الفاظ میں قیامِ اتحاد کی اپیل کی۔ پھر فرمایا کہ پس ماندہ طبقات کو شکایت کا موقع نہ دینا تاکہ حصارِ اسلام میں کوئی شگاف نہ پڑ جائے۔ پھر اسبابِ نفاق کی تفصیل پیش کر کے ان کی بیخ کنی کا عملی طور پر سر و سامان فرمایا۔ پھر واضح کیا کہ جملہ مسلمانوں کے اتحاد کا سنگِ اساس کیا ہے؟ آخری وصیت یہ فرمائی کہ ان ہدایات کو آئندہ نسلوں میں پھیلانے اور پہنچانے کے فرض میں کوتاہی نہ کرنا۔ خاتمۂ تقریر کے بعد حضورؐ نے اپنی ذاتی سرخروئی کے لیے حاضرین سے شہادت پیش کرتے ہوئے اس طرح بار بار اللہ کو پکارا کہ مخلوقِ خدا کے دل پگھل گئے آنکھیں پانی بن گئیں اور روحیں انسانی جسموں کے اندر تڑپ تڑپ کر الامان اور الغیاث کی صدائیں بلند کرنے لگیں۔

حمد و صلوٰۃ کے بعد خطبۂ حج کا پہلا درد انگیز فقرہ یہ تھا:

"اے لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ آج کے بعد میں اور تم اس اجتماع میں کبھی دوبارہ جمع نہیں ہوں گے۔"

اس ارشاد سے اجتماع کی غرض و غایت بے نقاب ہو کر سب کے سامنے آگئی اور جس شخص نے بھی یہ ارشادِ مبارک سنا تڑپ کر رہ گیا۔ اب اصل پیغام کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

"اے لوگو! تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھارا ننگ و ناموس، اسی طرح ایک دوسرے پر حرام ہے، جس طرح یہ دن (جمعہ) یہ مہینہ (ذی الحج) اور یہ شہر (مکہ مکرمہ) تم سب کے لیے قابلِ حرمت ہے۔"

اسی نکتے پر مزید زور دے کر ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! آخر تمھیں بارگاہِ ایزدی میں پیش ہونا ہے، وہاں تمھارے اعمال کی باز پرس کی جائے گی۔ خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہوجانا، کہ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹنا شروع کردو۔"

رسولِ پاکؐ کی یہ دردمندانہ وصیت پاک زبان سے نکلی اور تیر کی طرح دلوں کو چیر گئی۔ اب اُن نفاق انگیز شگافوں کی طرف توجہ دلائی، جن کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ تھا۔ یعنی یہ کہ اقتدارِ اسلام کے بعد غریب اور پس ماندہ گروہوں پر ظلم کیا جائے گا۔

اس سلسلے میں فرمایا:

"اے لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اپنے اللہ سے ڈرتے رہنا۔ تم نے نام خدا کی ذمہ داری سے انھیں زوجیت میں قبول کیا ہے اور اللہ کا نام لے کر ان کا جسم اپنے لیے حلال بنایا ہے۔ عورتوں پر تمھارا یہ حق ہے کہ وہ غیر کو تمھارے بستر پر نہ آنے دیں، اگر وہ ایسا کریں تو تم انھیں ایسی مار مارو جو نمایاں نہ ہو اور عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ انھیں بافراغت کھانا کھلاؤ اور بافراغت کپڑا پہناؤ۔"

اِسی سلسلے میں فرمایا:

اے لوگو! تمھارے غلام، جو خود کھاؤ گے وہی انھیں کھلانا جو خود پہنو گے وہی انھیں پہنانا

عرب میں فساد و خوں ریزی کے بڑے بڑے موجبات دو تھے ادائے سود کے مطالبات اور مقتولوں کے انتقام۔ ایک شخص، دوسرے شخص سے اپنے قدیم خاندانی سود کا مطالبہ کرتا تھا۔ اور یہی جھگڑا پھیل کر خون کا دریا بن جاتا تھا۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کو قتل کردیتا۔ اس سے نسلاً بعد نسلٍ قتل و انتقام کے سلسلے جاری ہوجاتے تھے۔

رسول اللہؐ انھیں دونوں اسبابِ فساد کو باطل فرماتے ہیں:

"اے لوگو! آج میں جاہلیت کے تمام قواعد و رسوم

رحلتِ نبوی

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰہِ وَالۡفَتۡحُ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ہ فَسَبِّحۡ بِحَمۡدِ رَبِّکَ وَاسۡتَغۡفِرۡہُ ط اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا ہ

جب اللہ کی مدد آگئی اور مکہ فتح ہوا تم نے دیکھ لیا کہ لوگ، دینِ خداوندی میں فوج در فوج داخل ہو رہے ہیں۔ اب تم اللہ کی یاد میں مصروف ہو جاؤ اور استغفار کرو، بیشک وہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔]

آخری حج کی تیاری

جب یہ سورت نازل ہوئی تو پیغمبرِ انسانیت نے اللہ کی مرضی کو پا لیا کہ اب وقتِ رحلت قریب آگیا ہے۔ حضورؐ اس سے پہلے خانۂ کعبہ میں تطہیرِ حرم کا آخری اعلان کر چکے تھے کہ آئندہ کسی مشرک کو اللہ کے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی اور کوئی برہنہ شخص خانۂ کعبہ کا طواف نہیں کر سکے گا۔ حضورؐ نے ہجرت کے بعد فریضۂ حج ادا نہیں فرمایا تھا۔ اب سنہ۱۰ ہجری میں آرزو پیدا ہوئی کہ سفرِ آخرت سے پہلے تمام امت کے ساتھ مل کر آخری حج کر لیا جائے۔ بڑا اہتمام کیا گیا کہ کوئی عقیدت کیش ہمرکابی کی سعادت سے محروم نہ رہ جائے۔ حضرت علیؓ کو یمن سے بلایا گیا۔ قبائل کو آدمی بھیج کر ارادۂ پاک کی اطلاع دی گئی تمام ازواجِ مطہراتؓ کو رفاقت کی بشارت سنائی۔ حضرت فاطمہؓ کو تیاری کا حکم دیا۔ ۲۵۔ ذیقعد کو مسجدِ نبوی میں جمعہ ہوا اور وہیں ۲۶ر کی روانگی کا اعلان ہو گیا۔ جب ۲۶ر کی صبح منوّر ہوئی تو چہرۂ انور سے روانگی کی مسرتیں نمایاں ہو رہی تھیں۔ غسل کر کے لباس تبدیل فرمایا اور ادائے ظہر کے بعد حمد و شکر کے ترانوں میں مدینۂ منورہ سے باہر نکلے۔ اس وقت ہزارہا خدّامِ اُمت اپنے نبیِ رحمت کے ہمرکاب تھے۔ یہ قافلۂ مقدس مدینۂ منوّرہ سے ۶ میل دور ذی الحلیفہ میں پہنچ کر رکا اور شب بھر اقامت فرمائی۔ دوسرے روز حضورِ پاک نے دوبارہ غسل فرمایا۔ حضرت صدیقہؓ نے جسمِ پاک پر اپنے ہاتھوں سے عطر ملا۔ راہ سپار ہونے سے پہلے آپ پھر اللہ کی حاضری میں کھڑے ہو گئے اور بڑے درد و گداز سے دو رکعتیں ادا کیں۔ پھر قصوا پر سوار ہو کر احرام باندھا اور ترانۂ لبیک بلند کیا۔

لَبَّیۡکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیۡکَ لَبَّیۡکَ لَا شَرِیۡکَ لَکَ لَبَّیۡکَ اِنَّ الۡحَمۡدَ وَالنِّعۡمَۃَ لَکَ وَالۡمُلۡکَ لَکَ لَا شَرِیۡکَ لَکَ۔

اس ایک صدائے حق کی اقتدا میں ہزارہا خدا پرستوں کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ آسمان کا جوف حمدِ خدا کی صداؤں سے لبریز ہو گیا اور دشت و جبل توحید کے ترانوں سے گونجنے لگے۔ حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ حضور سرورِ عالمؐ کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں، جہاں تک انسان کی نظر کام کرتی تھی، انسان ہی انسان نظر آتے تھے۔ جب اونٹنی کسی اونچے ٹیلے پر سے گزرتی تو تین مرتبہ صدائے تکبیر بلند فرماتے آوازۂ نبویؐ کے ساتھ لاکھوں آوازیں اور اٹھتیں اور کاروانِ نبوت کے سروں پر نعرہ ہائے تکبیر کا ایک دریائے رواں جاری ہو جاتا۔ سفرِ مبارک نو روز جاری رہا۔

۴۔ ذی الحج کو طلوعِ آفتاب کے ساتھ مکۂ معظمہ کی عمارتیں نظر آنے لگی تھیں۔ اور ہاشمی خاندان کے معصوم بچے اپنے بزرگ کائناتؐ کی تشریف آوری کی ہوا سُن کر اپنے اپنے گھروں سے دوڑتے ہوئے نکل رہے تھے کہ چہرۂ انور کی مسکراہٹوں کے ساتھ لپٹ جائیں۔ ادھر سرورِ عالمؐ شفقتِ منتظر کی تصویر بن رہے تھے۔ حضورِ پاکؐ نے اپنے کم سن بچوں کے معصوم چہرے دیکھے تو جوشِ محبت سے جھک گئے اور کسی کو اونٹ کے آگے بٹھا لیا اور کسی کو پیچھے سوار کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد کعبۃ اللہ کی عمارت پر نظر پڑی تو فرمایا۔

"اے اللہ! خانۂ کعبہ کو اور زیادہ شرف و امتیاز عطا فرما۔"

معمارِ حرم نے سب سے پہلے کعبۃ اللہ کا طواف فرمایا۔ پھر مقامِ ابراہیم کی طرف تشریف لے گئے اور دوگانۂ تشکر ادا کیا۔ اس وقت زبانِ پاک پر یہ آیت جاری تھی :

وَاتَّخِذُوۡا مِنۡ مَّقَامِ اِبۡرٰھِیۡمَ مُصَلًّی۔

اور مقامِ ابراہیم کو سجدہ گاہ بناؤ۔

کعبۃ اللہ کی زیارت کے بعد صفا اور مروہ کے پہاڑوں پر تشریف لے گئے۔ یہاں پر آنکھیں کعبۃ اللہ سے دوچار ہوئیں تو زبانِ پاک سے ابرِ گہربار کی طرح کلماتِ توحید و تکبیر جاری ہو گئے۔

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحۡدَہٗ لَا شَرِیۡکَ لَہٗ لَہُ الۡمُلۡکُ وَلَہُ الۡحَمۡدُ یُحۡیٖ وَیُمِیۡتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ قَدِیۡرٌ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ

قیمت کا نہ تھا۔ اختتام خطبہ کے بعد حضرت بلالؓ نے اذان بلند کی اور حضورؐ نے ظہر اور عصر کی نماز ایک ساتھ پڑھائی۔ یہاں سے ناقے پر سوار ہو کر موقف میں تشریف لائے اور دیر تک بارگاہِ الٰہی میں کھڑے دعائیں کرتے رہے۔ جب غروب آفتاب کے قریب ناقۂ نبویؐ ہجوم خلائق میں سے گذری تو آپ کے خادم اسامہ بن زیدؓ آپ کے ساتھ سوار تھے اور کثرت ہجوم کے باعث لوگوں میں اضطراب سا پیدا ہو رہا تھا اس وقت حضورؐ ناقے کی مہار کھینچتے جاتے تھے اور زبانِ پاک سے ارشاد فرماتے جاتے تھے:

السکینہ ایہاالناس السکینہ
ایہاالناس

لوگو! سکون کے ساتھ لوگو! آرام کے ساتھ

مزدلفہ میں نماز مغرب ادا کی اور سواریوں کو آرام کے لیے کھول دیا گیا۔ پھر نمازِ عشاء کے بعد لیٹ گئے اور صبح تک آرام فرماتے رہے محدثینؒ لکھتے ہیں کہ عمر بھر میں یہی ایک شب ہے جس میں آپ نے نمازِ تہجد ادا نہیں فرمائی۔ ۱۰ ذی الحج کو ہفتہ کے روز جمرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ اس وقت آپ کے چچیرے بھائی فضل بن عباسؓ آپ کے ساتھ سوار تھے۔ ناقہ قدم بہ قدم جاری تھی۔ چاروں طرف ہجوم تھا لوگ مسائل پوچھتے تھے اور آپ جواب دیتے تھے۔ جمرہ کے پاس ابن عباسؓ نے کنکریاں چن کر دیں تو آپ نے انھیں پھینکا اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! مذہب میں غلو کرنے سے بچتے رہنا تم سے پہلی قومیں اسی سے برباد ہوئی ہیں۔"

تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد فراقِ امت کے جذبات تازہ ہو جاتے تھے آپ اس وقت ارشاد فرماتے تھے:

"اس وقت حج کے مسائل سیکھ لو، میں نہیں جانتا کہ شاید اس کے بعد مجھے دوسرے حج کی نوبت آئے۔"

میدانِ منیٰ اور غدیرِ خم کے خطبات

یہاں سے منیٰ کے میدان میں تشریف لائے، ناقے پر سوار تھے، حضرت بلالؓ مہار تھامے کھڑے تھے اسامہ بن زیدؓ پیچھے بیٹھے کپڑا تان کر سایہ کیے ہوئے تھے آگے پیچھے اور دائیں بائیں مہاجرین انصار قریش اور قبائل کی صفیں، دریا کی طرح رواں تھیں۔ اور ان میں ناقۂ نبویؐ کشتی نوحؑ کی طرح ستارۂ نجات بن رہی تھی اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ باغبان ازل نے قرآن کریم کے انوار سے صدق و اخلاص کی جو نئی دنیا بسائی تھی، اب وہ شگفتہ و شاداب ہو چکی ہے۔ حضورؐ نے اسی دورِ جدید کی یاد تازہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

"آج زمانے کی گردش دنیا کو پھر اسی نقطۂ فطرت پر لے آئی جبکہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق ارض و سما کی ابتدا کی تھی۔"

پھر ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب کی حرمت کا اعلان کرتے ہوئے مجمع کو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا:

پیغمبرِ انسانیت: آج کون سا دن ہے؟

مسلمان: اللہ اور رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبرِ انسانیت: (طویل خاموشی کے بعد) کیا آج قربانی کا دن ہے؟

مسلمان: بے شک! قربانی کا دن ہے۔

پیغمبرِ انسانیت: یہ کون سا مہینہ ہے؟

مسلمان: اللہ اور رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبرِ انسانیت: (طویل خاموشی کے بعد) کیا یہ ذی الحجہ نہیں ہے؟

مسلمان: بے شک یہ ذی الحجہ ہے۔

پیغمبرِ انسانیت: یہ کون سا شہر ہے؟

مسلمان: اللہ اور رسولؐ بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبرِ انسانیت: (طویل خاموشی کے بعد) کیا یہ بلدۃ الحرام نہیں ہے؟

مسلمان: بے شک یہ بلدۃ الحرام ہے۔

اس کے بعد فرمایا:

"مسلمانو! تمہارا خون، تمہارا مال، تمہاری آبرو، اسی طرح محترم ہیں جس طرح یہ دن، یہ مہینہ اور یہ شہر محترم ہیں۔ تم میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ اے لوگو! تمھیں اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا اگر کسی نے جرم کیا تو وہ اپنے جرم کا ذمہ دار ہوگا۔ باپ بیٹے کے جرم کا ذمہ دار نہیں اور بیٹا باپ کے جرم کا ذمہ دار نہیں۔ اب شیطان اس بات سے مایوس ہو گیا ہے کہ تمہارے اس شہر میں کبھی اس کی پرستش کی جائے گی۔ ہاں تم چھوٹی چھوٹی باتوں میں اس کی پیروی کرو گے تو وہ ضرور خوش ہوگا اے لوگو! توحید، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج ہی جنت کا داخلہ ہے، میں نے تمھیں حق کا پیغام پہنچا دیا ہے، اب موجود لوگ، یہ پیغام ان لوگوں تک پہنچاتے رہیں، جو بعد میں آئیں گے۔"

یہاں سے قربان گاہ میں تشریف لائے اور ۶۳ اونٹ خود ذبح فرمائے اور ۳۷ کو حضرت علیؓ سے ذبح کرایا اور ان کا گوشت اور پوست سب خیرات کر دیا۔ پھر عبداللہ بن معمر کو طلب کر کے سر کے بال اتروائے اور یہ موئے مبارک تبرکاً تقسیم ہو گئے۔ یہاں سے اٹھ کر خانۂ کعبہ کا طواف فرمایا۔ اور زمزم پی کر منیٰ میں تشریف لے گئے اور ۱۲ ذی الحجہ تک وہیں اقامت فرما رہے۔ ۱۳ کو خانۂ کعبہ کا آخری طواف کیا اور انصار و مہاجرین کے ساتھ مدینۂ منورہ کی طرف مراجعت فرمائی۔ جب غدیرِ خم پہنچے تو صحابہؓ کو جمع کر کے ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! میں بھی بشر ہوں۔ ممکن ہے اللہ کا بلاوا اب جلد آجائے اور مجھے قبول کرنا پڑے میں تمہارے

کو اپنے قدموں سے پامال کرتا ہوں۔ میں جاہلیت کے قتلوں کے جھگڑے ملیامیٹ کرتا ہوں اور سب سے پہلے خود اپنے خاندانی مقتول ربیعہ بن حارث کے خون سے جسے ہذیل نے قتل کیا تھا، دست بردار ہوتا ہوں۔ میں زمانۂ جاہلیت کے تمام سودی مطالبات باطل قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے خود اپنے خاندانی سود عباس بن عبدالمطلب کے سود سے دست بردار ہوتا ہوں۔"

سود اور خون کے قرض معاف کر دینے کے بعد فردِ عدالت نفاق کی طرف متوجہ ہوئے اور وراثت، نسب مقروضیت اور ضمانت کے تنازعات کے متعلق فرمایا:

"اب اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حقدار کا حق مقرر کر دیا ہے، لہٰذا کسی کو وارثوں کے حق میں وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بچہ جس کے بستر پر ہوا ہو، اس کو دیا جائے اور زناکاروں کے لیے پتھر ہے اور ان کی جواب دہی اللہ پر ہے۔ جو لڑکا، باپ کے سوا کسی دوسرے نسب کا دعویٰ کرے اور غلام اپنے مولا کے سوا کسی طرف اپنی نسبت کرے، ان پر خدا کی لعنت ہے۔ عورت شوہر کے بلا اجازت اس کا مال صرف نہ کرے۔ قرض ادا کیے جائیں عاریت واپس کی جائے۔ عطیات لوٹائے جائیں اور ضامن تاوان ادا کرنے کا ذمہ دار ہے۔"

اہلِ عرب کے نزاع اور اسبابِ نزاع کا دفعیہ ہو چکا تو اس بین الاقوامی تفریق کی طرف توجہ فرمائی جو صدیوں کے بعد عرب و عجم یا گورے اور کالے کے نام سے پیدا ہونے والی تھی۔ ارشاد فرمایا:

"ہاں اے لوگو! تم سب کا خدا بھی ایک ہی ہے اور تم سب کا باپ بھی ایک ہے۔ لہٰذا کسی عربی کو عجمی پر، کسی سُرخ کو سیاہ پر، کسی سیاہ کو سرخ پر کوئی پیدائشی برتری یا امتیاز حاصل نہیں ہوگا ہاں افضل وہی ہے جو پرہیزگاری میں افضل ہو۔"

"ہر مسلمان دوسرے کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک برادری ہیں۔"

اتحادِ اسلام کی مستقل اساس کی طرف راہنمائی فرمائی:

"اے لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ اگر تم نے اُسے مضبوطی کے ساتھ پکڑے رکھا تو تم کبھی گمراہ نہیں ہوگے، وہ چیز اللہ کی کتاب قرآن ہے۔"

اتحادِ اُمّت کے عملی پروگرام کی طرف راہنمائی فرمائی:

"اے لوگو! میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے، اور نہ میرے بعد کوئی نئی امت ہے۔ پس تم سب اپنے اللہ کی عبادت کرو۔ نماز پنجگانہ کی پابندی کرو، رمضان کے روزے رکھو، خوش دلی سے اپنے مالوں کی زکوٰۃ دیا کرو۔ اللہ کے گھر کا حج کرو۔ حکام اُمت کے احکام مانو اور اپنے اللہ کی جنت میں جگہ حاصل کرلو۔"

آخر میں فرمایا:

وَ اَنْتُمْ تُسْئَلُوْنَ عَنِّیْ فَمَا اَنْتُمْ قَائِلُوْنَ ط

[ایک دن اللہ تعالیٰ تم لوگوں سے میرے متعلق گواہی طلب کرے گا تم اس وقت کیا جواب دو گے؟]

اس پر مجمع عام سے پُرجوش صدائیں بلند ہوئیں۔

اِنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّیْتَ وَنَصَحْتَ

[اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے احکام پہنچا دیے۔ اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے فرضِ رسالت ادا کر دیا۔ اے اللہ کے رسولؐ! آپ نے کھرے کھوٹے کو الگ کر دیا۔]

اس وقت سرورِ عالمؐ کی انگشتِ شہادت آسمان کی طرف اٹھی۔ ایک دفعہ آسمان کی طرف اُنگلی اٹھاتے تھے اور دوسری دفعہ مجمع کی طرف اشارہ فرماتے تھے اور کہتے جاتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ

[اے اللہ خلقِ خدا کی گواہی سُن لے۔ اے اللہ! مخلوقِ خدا کا اعتراف سُن لے۔]

اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ

[اے اللہ! گواہ ہو جا۔]

اس کے بعد ارشاد ہوا:

"جو لوگ موجود ہیں، وہ ان لوگوں تک جو یہاں موجود نہیں ہیں، میری ہدایات پہنچاتے چلے جائیں ممکن ہے کہ آج کے بعض سامعین سے زیادہ پیام تبلیغ کے سننے والے اس کلام کی محافظت کریں[1]۔"

تکمیلِ دین و اتمامِ نعمت

خطبۂ حج سے فارغ ہوئے تو جبریلِ امین وحیِ تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا تاج لے آئے اور یہ آیت نازل ہوئی:

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا[2]

[آج میں نے تمھارے لیے تمھارا دین مکمل کر دیا تم پر اپنی نعمت مکمل کر دی اور دین اسلام پر اپنی رضا مندی کی مہر لگا دی۔]

سرکارِ دو عالمؐ نے جب لاکھوں کے اجتماع میں اتمامِ نعمت اور تکمیلِ دینِ فطرت کا یہ آخری اعلان فرمایا تو آپ کی سواری کا سامان ایک روپے سے زیادہ

۱۔ صحیح بخاری ج ۱ ص ۔ ۲۳۴ ۔ نور محمد کراچی ۱۹۶۱ء

۲۔ المائدہ آیت ۳

سکے۔ حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ نے رسولؐ کردگار کے دونوں بازو تھامے اور آپ بڑی مشکل سے حجرۂ عائشہؓ میں تشریف لائے۔ حضرت صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کبھی بیمار ہوتے تھے یہ دعا اپنے ہاتھوں پر دم کر کے جسم مبارک پر ہاتھ پھیر لیتے تھے۔

اِذْهِبِ الْبَأْسَ رَبَّ النَّاسِ وَاشْفِ
أَنْتَ الشَّافِي لَا شِفَاءَ إِلَّا شِفَاؤُكَ شِفَاءً
لَا يُغَادِرُ سَقَمًا

[اے مالکِ انسانیت! خطرات دور فرما دے، اے شفا دینے والے تو شفا عطا فرما دے، شفا عطا فرما دے، شفا وہی ہے جو تو عنایت کرے۔ وہ صحت عطا کر کہ کوئی تکلیف باقی نہ رہے۔]

اس مرتبہ میں نے یہ دعا پڑھی اور نبی خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں پر دم کر کے یہ چاہا کہ جسمِ اطہر پر مبارک ہاتھ پھیر دوں۔ مگر حضورؐ نے ہاتھ پیچھے ہٹا لیے اور ارشاد فرمایا:

اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِي وَالْحِقْنِي بِالرَّفِيْقِ الْأَعْلٰى

[اے اللہ! معافی اور اپنی رفاقت عطا فرما دے۔]

وفات سے پانچ روز پہلے

وفاتِ اقدس سے ۵ روز پہلے (چہار شنبہ) پتھر کے ایک ٹب میں بیٹھ گئے اور سر مبارک پر پانی کی سات مشکیں ڈلوائیں۔ اس سے مزاجِ اقدس میں خنکی اور تسکین سی پیدا ہو گئی۔ مسجد میں تشریف لائے اور فرمایا:

"مسلمانو! تم سے پہلے ایک قوم گذر چکی ہے جس نے اپنے انبیاء و صلحاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنا لیا تھا، تم ایسا نہ کرنا۔" پھر فرمایا: "ان یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو جنھوں نے اپنے نبیوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنایا۔"

پھر فرمایا: "میری قبر کو میرے بعد وہ قبر نہ بنا دینا کہ اس کی پرستش شروع ہو جاتے۔"

پھر فرمایا: "مسلمانو! وہ قوم اللہ کے غضب میں آجاتی ہے جو قبور انبیاء کو مساجد بنا دے۔"

پھر فرمایا: "مسلمانو! دیکھو میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں، دیکھو اب پھر بھی وصیت کرتا ہوں۔ اے اللہ تو گواہ رہنا۔ اے اللہ تو گواہ رہنا۔"

پھر یہ ارشاد فرمایا:

"خدا تعالیٰ نے اپنے ایک بندے کو اختیار فرمایا ہے کہ وہ دنیا و مافیہا کو قبول کرے یا آخرت کو۔ مگر اس نے صرف آخرت کو قبول کر لیا ہے۔"

یہ سن کر رمز شناس نبوت حضرت صدیق اکبرؓ آنسو بھر لائے اور رونے لگے اور کہا: "یا رسول اللہ ہمارے ماں باپ ہماری جانیں اور ہمارے زر و مال آپ پر قربان ہو جائیں۔" لوگوں نے ان کو تعجب سے دیکھا کہ حضور انورؐ تو ایک شخص کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں۔ پھر اس میں رونے کی کون سی بات ہے؟ مگر یہ بات انھوں نے سمجھی جو رو رہے تھے۔ حضرت صدیقؓ کی اس بے کلی نے خیالِ اشرف کو دوسری طرف مبذول کر دیا۔ ارشاد فرمایا:

"میں سب سے زیادہ جس شخص کی دولت اور رفاقت کا مشکور ہوں وہ ابوبکرؓ ہیں۔ اگر میں اپنی امت میں سے کسی ایک شخص کو اپنی دوستی کے لیے منتخب کر سکتا تو وہ ابوبکرؓ ہوتے لیکن اب رشتۂ اسلام میری دوستی کی بنا ہے اور وہی کافی ہے۔ مسجد کے رُخ پر کوئی دریچہ ابوبکرؓ کے دریچے کے سوا باقی نہ رکھا جائے۔"

انصارِ مدینہ حضورؐ کے زمانۂ علالت میں برابر رو رہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عباسؓ وہاں سے گذرے تو انھوں نے انصار کو روتے دیکھا، دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا "آج ہمیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبتیں یاد آ رہی ہیں۔" انصار کی اس دردمندی اور بے دلی کی اطلاع سمع مبارک تک پہنچ چکی تھی ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! میں اپنے انصار کے معاملے میں تم کو وصیت کرتا ہوں، عام مسلمان روز بروز بڑھتے جائیں گے۔ مگر میرے انصار کھانے میں نمک کی طرح رہ جائیں گے۔ یہ لوگ میرے جسم کا پیرہن اور میرے سفرِ زندگی کا توشہ ہیں۔ انھوں نے اپنے فرائض ادا کر دیے مگر ان کے حقوق باقی ہیں جو شخص اُمت کے نفع اور نقصان کا متولی ہو، اس کا فرض ہے کہ وہ انصار نکوکار کی قدر افزائی کرے اور جن انصار سے لغزش ہو جائے ان کے متعلق درگذر سے کام لے۔"

حضورؐ نے حکم دیا تھا کہ حضرت اسامہؓ بن زید شام پر حملہ آور ہوں اور اپنے شہید والد کا انتقام لیں۔ اس پر منافقین کہنے لگے ایک معمولی نوجوان کو اکابر اسلام پر سپہ سالار مقرر کر دیا گیا ہے، اس سلسلے میں پیغمبر مساوات نے ارشاد فرمایا:

"آج اسامہؓ کی سرداری پر تم کو اعتراض ہے اور کل اس کے باپ زیدؓ کی سرداری پر تم کو اعتراض تھا۔ خدا کی قسم! وہ بھی اس منصب کے مستحق تھے اور یہ بھی۔ وہ بھی مجھے سب سے زیادہ محبوب تھے اور اس کے بعد یہ بھی سب سے زیادہ محبوب ہیں۔"

پھر فرمایا: "حلال و حرام کے تعین کو میری طرف منسوب نہ کرنا۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جسے قرآن نے حلال کیا ہے اور اسی کو حرام قرار دیا ہے، جسے خدا نے حرام کیا ہے۔"

اب آپ اہلِ بیت کی طرف متوجہ ہوئے کہ کہیں رشتۂ نبوت کا غرور، انھیں عمل و سعی سے بیگانہ نہ بنا دے، ارشاد فرمایا:

"اے رسولؐ کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبرِ خدا

لیے دو مرکزِ ثقل قائم کر چلا ہوں ایک اللہ کی کتاب ہے جس میں ہدایت اور روشنی جمع ہے اسے مضبوطی اور استواری کے ساتھ پکڑو‘ دوسرا مرکز میرے اہلِ بیت ہیں۔ میں اپنے اہلِ بیت کے بارے میں تمھیں خدا ترسی کی وصیت کرتا ہوں۔"

گویا یہ اجتماع اُمت کے لیے اہل و عیال کے حقوق و احترام کی وصیت تھی۔ تاکہ وہ کسی بحث میں الجھ کر حضورؐ کے مختصر سے خاندان کے ساتھ بے لحاظی کا سلوک نہ کریں۔ مدینے کے قریب پہنچ کر رات ذوالحلیفہ میں ٹھہرے اور دوسرے دن مدینۂ منورہ میں داخل ہو گئے۔ محفوظ و مامون حمد کرتے ہوئے اور شکر بجالاتے ہوئے۔

مُلکِ بقا کی تیاری

حضور سرورِ دو عالمؐ مدینۂ منورہ میں پہنچ کر فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ کی تعمیل میں معروف ہو چکے تھے۔ بارگاہِ ایزدی کی حاضری کا شوق روز بروز بڑھتا جاتا تھا۔ صبح و شام معبودِ حقیقی کے ذکر و یاد کی طلب تھی اور بس۔

رمضان المبارک میں ہمیشہ دس روز کا اعتکاف فرماتے تھے سنہ ۱۰ھ میں ۲۰ روز کا اعتکاف فرمایا۔ ایک دن حضرت فاطمہ بتولؓ تشریف لائیں تو ان سے فرمایا "پیاری بیٹی اب مجھے اپنی رحلت قریب معلوم ہوتی ہے۔" انھیں ایام میں شہدائے اُحد کی تکلیف‘ بے بسی کی شہادت اور مردانہ وار قربانیوں کا خیال آگیا تو گنجِ شہیداں میں تشریف لے گئے اور بڑے درد و گداز سے ان کے لیے دعائیں کیں۔ نمازِ جنازہ پڑھی اور انھیں اس طرح الوداع کہی جس طرح ایک بزرگ شفیق‘ اپنے کم سن بچوں سے پیار کرتا ہے اور پھر انھیں الوداع کہتا ہے یہاں سے واپس آئے تو منبرِ نبوی پر جلوہ طراز ہوئے اور اربابِ صدق و صفا سے نہایت دردمندانہ لہجے میں مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا:

"دوستو! اب میں تم سے آگے منزلِ آخرت کی طرف چلا جا رہا ہوں تاکہ بارگاہِ ایزدی میں تمھاری شہادت دوں۔ واللہ مجھے یہاں سے وہ اپنا حوض نظر آرہا ہے جس کی وسعت ایلہ سے جحفہ تک ہے۔ مجھے تمام دنیا کے خزانوں کی کنجیاں دے دی گئی ہیں۔ اب مجھے یہ خوف نہیں کہ میرے بعد تم شرک کرو گے۔ البتہ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ کہیں دنیا میں مبتلا نہ ہو جاؤ اور اس کے لیے آپس میں کشت و خون نہ کرو۔ اس وقت تم اسی طرح ہلاک ہو جاؤ گے جس طرح پہلی قومیں ہلاک ہوئیں۔"

کچھ دیر کے بعد قلبِ صافی میں زید بن حارثؓ کی یاد تازہ ہو گئی۔ انھیں حدودِ شام کے عربوں نے شہید کر دیا تھا۔ "اسامہ بن زیدؓ فوج لے کر جائیں اور اپنے والد کا انتقام لیں۔"

ان ایام میں خیالِ مبارک زیادہ تر گزرے ہوئے نیاز مندوں ہی کی طرف مائل محبت رہتا تھا۔ ایک بار آسودگانِ بقیع کا خیال آگیا۔ یہ عام مسلمانوں کا قبرستان تھا۔ جوشِ محبت سے آدھی رات کو اٹھ کر وہاں تشریف لے گئے اور عام امتیوں کے لیے بڑے سوز سے دعا فرماتے رہے۔ پھر یہاں کے روحانی دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمایا: انا بکم سلاحقون میں اب جلد تمھارے ساتھ شامل ہو رہا ہوں۔

ایک دن مسجد نبوی میں پھر مسلمانوں کو یاد فرمایا۔ اجتماع ہو گیا تو ارشاد فرمایا:

"مسلمانو! مرحبا اللہ تعالیٰ تم سب پر اپنی نعمتیں نازل فرمائے تمھاری دل شکستگی دور فرمائے تمھاری اعانت و دستگیری فرمائے تمھیں عزت و رفعت سے سرفراز فرمائے۔ تمھیں دولتِ امن و عافیت سے شاد کام فرمائے۔ میں اس وقت تمھیں صرف خوفِ خدا و اتقا کی وصیت کرتا ہوں اب اللہ تعالیٰ ہی تمھارا وارث اور خلیفہ ہے اور میری تم سے اپیل اسی کے خوف کے لیے ہے۔ اس لیے کہ میرا منصب نذیرِ مبین ہے۔ دیکھنا اللہ کی بستیوں اور بندوں میں تکبر اور برتری اختیار نہ کرنا۔ یہ حکمِ ربانی ہر وقت تمھارے ملحوظِ خاطر رہنا چاہیے۔"

تِلْكَ الدَّارُ الْآخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِينَ لَا يُرِيدُونَ عُلُوًّا فِي الْأَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ۔

[یہ آخرت کا گھر ہے ہم یہ ان لوگوں کو دیتے ہیں جو زمین میں غرور اور فساد کا ارادہ نہیں کرتے آخرت کی کامیابی پرہیزگاروں کے لیے ہے۔]

پھر فرمایا:

أَلَيْسَ فِي جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِينَ۔

کیا تکبر کرنے والوں کا ٹھکانہ دوزخ نہیں ہے؟

آخری الفاظ یہ ارشاد فرمائے:

"سلام تم سب پر اور ان سب لوگوں پر جو واسطۂ اسلام سے میری بیعت میں داخل ہوں گے۔"

علالت کی ابتدا

۲۹ صفر بروز دوشنبہ ایک جنازے سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ اثنائے راہ میں سر کے درد سے علالت کا آغاز ہو گیا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے تھے کہ سرکارِ دو جہاں کے سرِ مبارک پر رومال بندھا تھا میں نے ہاتھ لگایا۔ یہ اس قدر جل رہا تھا کہ ہاتھ کو برداشت نہ ہوتی تھی۔ دوشنبہ تک اشتدادِ مرض نے مرضِ اقدس پر زیادہ قابو پالیا۔ اس واسطے ازواجِ مطہرات نے اجازت دے دی کہ اب حضورؐ کا مستقل قیام حضرت عائشہؓ صدیقہ کے ہاں کر دیا جائے۔ اس وقت مزاجِ اقدس پر ضعف اس قدر طاری تھا کہ خود قدموں سے چل کر حجرۂ عائشہؓ تک تشریف نہیں لے جا



شرم آتی ہے کہ رسول اپنے اللہ سے ملے اور اس کے گھر میں دولت دنیا پڑی ہو۔" اس ارشاد پر گھر کا گھر صاف کر دیا گیا۔ آخری رات کاشانۂ نبویؐ میں چراغ جلانے کے لیے تیل تک موجود نہیں تھا۔ یہ ایک پڑوسی عورت سے ادھار لیا گیا۔ گھر میں کچھ ہتھیار باقی تھے انھیں مسلمانوں کو ہبہ کر دیا گیا۔ زرہ نبوی ۳۰ صاع جَو کے عوض ایک یہودی کے پاس رہن تھی۔ چوں کہ ضعف لحہ بہ لحہ ترقی پذیر تھا اس واسطے بعض درد مندوں نے دوا پیش کی۔ مگر انکار فرمایا۔ اسی وقت غشی کا دورہ آگیا اور تیمارداروں نے منہ کھول کر دوا پلادی۔ افاقے کے بعد جب اس کا احساس ہوا تو فرمایا اب یہی دوا ان پلانے والوں کو بھی پلائی جائے۔ یہ اس لیے کہ جس وجود باجود کی صحت کے لیے ایک دل گرفتہ دنیا دعائیں کر رہی تھی وہ اپنے اللہ کی دعوت کو اس طرح قبول کر چکا تھا کہ اب اس میں نہ دعا کی گنجائش باقی تھی اور نہ دوا کی۔

یومِ وفات

۹ ربیع الاول دوشنبہ کو مزاج اقدس میں قدرے سکون تھا۔ نمازِ صبح ادا کی جارہی تھی کہ حضورؐ نے مسجد اور حجرہ کا درمیانی پردہ سرکا دیا۔ اب چشم اقدس کے رُوبرو نمازیوں کی صفیں مصروفِ رکوع و سجود تھیں سرکار دو عالمؐ نے اس پاک نظارے کو جو حضور پاکؐ کی تعلیم کا نتیجہ تھا بڑے اشتیاق سے ملاحظہ فرمایا اور جوشِ مسرت سے ہنس پڑے۔ لوگوں کو خیال ہوا کہ مسجد میں تشریف لارہے ہیں۔ نمازی بے اختیار سے ہو گئے۔ صفیں ٹوٹنے لگیں اور حضرت صدیقؓ نے جو امامت فرما رہے تھے پیچھے ہٹنا چاہا۔ مگر حضور پاکؐ نے اشارۂ مبارک سے سب کو تسکین دی اور چہرۂ انور کی ایک جھلک دکھا کر پھر حجرے کا پردہ ڈال دیا۔ اجتماعِ اسلام کے لیے رسولؐ کا یہ جلوۂ زیارت آخری تھا اور شاید یہ انتظام بھی خود قدرت کی طرف سے ہوا کہ رفیقانِ صلوٰۃ جمال جہاں آرا کی آخری جھلک دیکھتے جائیں۔

۹ ربیع الاول کی حالت صبح ہی سے نہایت عجیب تھی۔ ایک سورج بلند ہو رہا تھا اور دوسرا سورج غروب ہو رہا تھا۔ کاشانۂ نبویؐ میں پے در پے غشی کے بادل آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وجودِ اقدس پر چھا گئے "ایک بے ہوشی گذر جاتی تھی تو پھر دوسری وارد ہو جاتی تھی۔ انھیں تکلیفوں میں پیاری بیٹی کو یاد فرمایا۔ وہ مزاج اقدس کا یہ حال دیکھ کر سنبھل نہ سکیں۔ سینۂ مبارک سے لپٹ گئیں اور رونے لگیں۔ بیٹی کو اس طرح نڈھال دیکھ کر ارشاد فرمایا:

"میری بیٹی! رو نہیں' میں دنیا سے رخصت ہو جاؤں تو اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ کہنا اسی میں ہر شخص کے لیے سامانِ تسکین موجود ہے۔" حضرت فاطمہؓ نے پوچھا: کیا آپ کے لیے بھی؟ فرمایا ہاں اس میں میری بھی تسکین ہے۔

جس قدر رسول اللہؐ کا درد و کرب بڑھ رہا تھا حضرت فاطمہؓ کا کلیجہ بھی کٹتا جارہا تھا۔ حضرت رحمۃ للعالمینؐ نے ان کی اذیت کو محسوس کر کے کچھ کہنا چاہا تو پیاری بیٹی نے سرورِ کائناتؐ کے لبوں سے اپنے کان لگا دیے۔ آپ نے فرمایا: "بیٹی میں اس دنیا کو چھوڑ رہا ہوں" فاطمہؓ بے اختیار رو دیں۔ پھر فرمایا: "فاطمہؓ! میرے اہلِ بیت میں تم سب سے پہلے مجھے ملو گی۔" فاطمہؓ بے اختیار ہنس دیں کہ یہ جدائی قلیل ہے۔

پیغمبرِ انسانیتؐ کی حالت نازک ترین ہوتی جارہی تھی۔ یہ حال دیکھ کر فاطمہؓ نے کہنا شروع کیا وا کرب اباہُ! ہائے میرے باپ کی تکلیف' ہائے میرے باپ کی تکلیف! فرمایا: "فاطمہؓ آج کے بعد تمھارا باپ کبھی بے چین نہیں ہوگا۔" حسنؓ اور حسینؓ بہت غمگین ہو رہے تھے۔ انھیں پاس بلایا دونوں کو چوما پھر ان کے احترام کی وصیت فرمائی پھر ازواجِ مطہرات کو طلب فرمایا اور انھیں نصیحتیں فرمائیں اسی دوران میں ارشاد فرماتے تھے۔

مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ

[ان لوگوں کے ساتھ جن پر خدا نے انعام فرمایا۔]

کبھی ارشاد فرماتے:

اَللّٰهُمَّ بِالرَّفِيْقِ الْاَعْلٰى

اے خداوندا! بہترین رفیق۔

پھر حضرت علیؓ کو طلب فرمایا۔ آپ نے سر مبارک کو اپنی گود میں رکھ لیا۔ انھیں بھی نصیحت فرمائی۔ پھر ایک دم اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا:

اَلصَّلٰوةَ اَلصَّلٰوةَ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ

نماز، نماز، لونڈی، غلام اور پس ماندگان

اب نزع کا وقت آ پہنچا تھا۔ حضرت رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت عائشہؓ کے ساتھ ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ پانی کا پیالہ پاس رکھا تھا اس میں ہاتھ ڈالتے تھے اور چہرۂ انور پر پھیر لیتے تھے روئے اقدس کبھی سرخ ہو جاتا تھا اور کبھی زرد پڑ جاتا تھا۔ زبانِ مبارک آہستہ آہستہ ہل رہی تھی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ اِنَّ لِلْمَوْتِ سَكَرَاتٌ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور موت تکلیف کے ساتھ ہے۔

حضرت عبدالرحمن بن ابوبکرؓ ایک تازہ مسواک کے ساتھ آئے تو حضور پاکؐ نے مسواک پر نظر جما دی۔ حضرت عائشہؓ سمجھ گئیں کہ مسواک فرمائیں گے۔ ام المومنینؓ نے دانتوں میں نرم کر کے مسواک پیش کی۔ اور آپ نے بالکل تندرستوں کی طرح مسواک کی دہانِ مبارک پہلے ہی طہارت کا سراپا تھا۔ اب مسواک کے بعد اور بھی مجلا ہو گیا تو یک لخت ہاتھ اونچا کیا کہ گویا



کی پھوپھی صفیہ! خدا کے ہاں کے لیے کچھ کرلو۔ میں تمھیں خدا کی گرفت سے نہیں بچا سکتا۔"

یہ خطبۂ درد، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا آخری خطبہ تھا جس میں حضور نے حاضرینِ مسجد کو خطاب فرمایا، اختتامِ کلام کے بعد حجرۂ عائشہؓ میں تشریف لے آئے۔ شدتِ مرض کی حالت یہ تھی کہ عالمِ بے تابی میں کبھی ایک پاؤں پھیلاتے تھے، اور کبھی دوسرا سمیٹتے تھے۔ کبھی گھبرا کر چہرۂ انور پر چادر ڈال لیتے تھے اور کبھی الٹ دیتے تھے۔ ایسی حالت میں حضرتِ عائشہ صدیقہؓ نے زبانِ مبارک سے یہ الفاظ سنے۔

"یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انھوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے۔"

وفات سے چار روز پہلے

وفات سے چار روز پہلے (جمعرات) حضرت عائشہؓ سے ارشاد فرمایا اپنے والد ابوبکرؓ اور اپنے بھائی عبدالرحمٰنؓ کو بلا لیجیے اسی سلسلے میں فرمایا: "دوات کاغذ لے آؤ۔ میں ایک تحریر لکھوا دوں جس کے بعد تم گمراہ نہیں ہو گے۔" یہ شدتِ مرض میں حضورؐ سرورِ عالم کا ایک خیال تھا۔ حضرت فاروقؓ نے یہ رائے ظاہر کی کہ حضورؐ کو اس حال میں تکلیف دینا مناسب نہیں ہے۔ اب تکمیلِ شریعت کا کوئی ایسا نکتہ باقی نہیں رہا جس میں قرآن کافی نہ ہو۔ بعض دوسرے صحابہؓ نے اس رائے سے مطابقت نہ کی۔ جب شور زیادہ ہوا تو بعض نے کہا "خود حضورؐ ہی سے دریافت کر لیا جائے۔" ارشاد فرمایا: "مجھے چھوڑ دو۔ میں جس مقام میں ہوں وہ اس سے بہتر ہے۔ جس کی طرف تم مجھے بلا رہے ہو۔"

اسی روز تین وصیتیں اور فرمائیں:

(۱) کوئی مشرک عرب میں نہ رہے (۲) سفیروں اور وفود کی بدستور عزت و مہمانی کی جائے (۳) قرآن پاک کے متعلق بھی کچھ ارشاد فرمایا جو راوی کو یاد نہیں رہا ہے۔

سرکارِ پاکؐ علالت کی تکلیف اور بے چینی کے باوجود ۱۱ روز تک برابر مسجد میں تشریف لاتے رہے۔ جمعرات کے روز مغرب کی نماز بھی خود پڑھائی اور اس میں سورۂ مرسلات تلاوت فرمائی۔ عشا کے وقت آنکھ کھولی اور دریافت فرمایا: "کیا نماز ہو چکی؟"

مسلمانوں نے عرض کیا: "مسلمان حضورؐ کے منتظر بیٹھے ہیں۔" لگن میں پانی بھروا کر غسل فرمایا اور ہمت کر کے اٹھے مگر غش آگیا۔ تھوڑی دیر میں پھر آنکھ کھولی اور وہی سوال دہرایا: "کیا نماز ہو چکی ہے؟" لوگوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! مسلمان آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس مرتبہ پھر اٹھنا چاہا۔ مگر بے ہوش ہو گئے۔ کچھ دیر کے بعد پھر آنکھ کھولی اور وہی سوال دہرایا: "کیا نماز ہو چکی ہے؟" لوگوں نے عرض کیا: "یارسول اللہ! سب لوگوں کو حضور ہی کا انتظار ہے۔" تیسری مرتبہ جسمِ مبارک پر پانی ڈالا اور جب اٹھنا چاہا تو غشی آگئی۔ افاقہ ہونے پر ارشاد فرمایا: "ابوبکرؓ نماز پڑھا دیں۔" حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا: "ابوبکرؓ نہایت رقیق القلب آدمی ہیں۔ جب وہ آپ کی جگہ پر کھڑے ہوں گے تو نماز نہیں پڑھا سکیں گے۔"

ارشاد فرمایا: "وہی نماز پڑھائیں۔" حضرت عائشہؓ کا خیال یہ تھا کہ جو شخص رسول اللہؐ کے بعد امام مقرر ہوگا لوگ اسے لازماً منحوس خیال کریں گے روایت ہے کہ اس وقت صدیق اکبرؓ تشریف فرما نہیں تھے۔ اس واسطے حضرت عمرؓ کو آگے بڑھایا گیا مگر حضورؐ نے تین مرتبہ فرمایا: "نہیں، نہیں، نہیں، ابوبکرؓ نماز پڑھائیں۔"

رسول اللہؐ کا منبر چند روز پہلے خالی ہو چکا تھا۔ آج رسول اللہ کا مصلیٰ بھی خالی ہو گیا۔ جب ابوبکر صدیقؓ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جگہ کھڑے ہوئے تو عالمِ یاس نے مسجدِ نبویؐ پر اپنے پردے تان دیے اور مسلمانوں کے دل بے اختیار رو دیے۔ اور خود صدیق اکبرؓ کے قدم بھی لڑکھڑا گئے۔ چوں کہ رسول اللہؐ کے ارشاد کے ساتھ توفیقِ الٰہی شامل تھی اس واسطے یہ کٹھن گھاٹی بھی گذر گئی۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے حیاتِ پاک نبویؐ میں اسی طرح سترہ نمازیں پڑھائیں۔

وفات سے دو روز پہلے

حضرت صدیق اکبرؓ ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے کہ حضورؐ کی طبیعت نے مسجد کی طرف رجوع کیا اور حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے کندھوں پر سہارا لیتے ہوئے جماعت میں تشریف لے آئے نمازی نہایت بے قراری کے ساتھ حضورؐ کی طرف متوجہ ہوتے اور صدیق اکبرؓ بھی مصلّے سے پیچھے ہٹے۔ مگر حضورؐ نے دستِ مبارک سے ارشاد فرمایا: "پیچھے مت ہٹو۔" پھر حضرت صدیقؓ کے برابر بیٹھ گئے اور نماز ادا کرنے لگے۔ حضورؐ کی اقتدا صدیق اکبرؓ کرتے تھے اور صدیقؓ کی اقتدا مسلمان کرتے تھے۔ یہ پاک نماز اسی طرح مکمل ہو گئی تو حضور پاکؐ حجرۂ عائشہ میں تشریف لے گئے۔

وفات سے ایک روز پہلے

مخدومِ انسانیت جو قیدِ دنیا سے آزاد ہو رہے تھے صبح بیدار ہوئے تو پہلا کام یہ کیا کہ سب غلاموں کو آزاد فرمایا۔ یہ تعداد میں ۴۰ تھے۔ پھر اثاث البیت کی طرف توجہ فرمائی۔ اس وقت کاشانۂ نبویؐ کی ساری دولت صرف سات دینار تھے۔ حضرت عائشہؓ سے فرمایا: "انھیں غریبوں میں تقسیم کر دو، مجھے

حضرت عائشہ صدیقہؓ کے دل وجان پر غم کی گھٹائیں چھا گئی تھیں اور زبان اخلاقِ نبویؐ کی ترجمانی کر رہی تھی:

"حیف، وہ نبی جس نے تموّل پر فقیری کو چُن لیا۔ جس نے تونگری کو ٹھکرا دیا اور مسکینی قبول کر لی۔"

"آہ! وہ دین پرور رسولؐ جو اُمّتِ عاصی کے غم میں ایک پوری رات بھی آرام سے نہ سویا۔"

"آہ! وہ صاحبِ خلقِ عظیم، جو ہمیشہ آٹھوں پہر نفس سے جنگ آزما رہا۔"

"آہ! وہ اللہ کا پیغمبرؐ، جس نے ممنوعات کو کبھی آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔"

"آہ! وہ رحمۃ للعالمینؐ جس کا بابِ فیض فقیروں اور حاجتمندوں کے لیے ہر وقت کُھلا رہتا تھا۔ جس کا رحیم دل اور پاک ضمیر کبھی دشمنوں کی ایذا رسانی سے غبار آلود نہ ہوا۔"

"جس کے موتی جیسے دانت توڑے گئے اور اس نے پھر بھی صبر کیا۔"

"جس کی پیشانیِ انور کو زخمی کیا گیا اور اس نے پھر بھی دامنِ عفو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔"

"آہ! کہ آج اسی وجودِ سرمدی سے ہماری دنیا خالی ہے۔"

تجہیز و تکفین

سہ شنبہ سے تجہیز و تکفین کا کام شروع ہوا۔ فضل بن عباسؓ اور اسامہ بن زیدؓ پردہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ انصار نے دروازے پر پہنچ کر آواز دی کہ ہم رسول اللہؐ کی آخری خدمت گذاری میں اپنا حصّہ طلب کرنے آئے ہیں۔ حضرت علیؓ نے اوس بن خولی انصاریؓ کو اندر بلایا، وہ پانی کا گھڑا بھر کر لاتے تھے۔ حضرت علیؓ نے جسم مبارک سینے سے لگا رکھا تھا، حضرت عباسؓ اور ان کے صاحبزادے جسم مبارک کی کروٹیں بدلتے تھے اور حضرت اسامہ بن زیدؓ اُوپر سے پانی ڈالتے تھے۔ حضرت علیؓ غسل دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے:

"میرے مادر پدر قربان! آپ کی وفات سے وہ دولت گم ہوئی ہے جو کسی دوسری موت سے گم نہیں ہوئی۔"

"آج نبوّت، اخبارِ غیب اور نزولِ وحی کا سلسلہ کٹ گیا ہے۔ آپ کی وفات تمام انسانوں کے لیے یکساں مصیبت ہے۔"

"اگر آپ صبر کا حکم نہ دیتے اور گریہ وزاری سے منع نہ فرماتے تو ہم دل کھول کر آنسو بہاتے لیکن پھر بھی یہ دکھ لاعلاج ہوتا اور یہ زخم لازوال رہتا۔"

"ہمارا درد بے درماں ہے، ہماری مصیبت بے دوا ہے۔"

"اے حضورؐ! میرے والدین آپ پر قربان جب آپ بارگاہِ الٰہی میں پہنچیں تو ہمارا ذکر فرمائیں اور ہم لوگوں کو فراموش نہ کر دیں۔"

تین سوتی سفید کپڑوں میں کفن دیا گیا۔ چوں کہ وصیت پاک یہ تھی کہ آپ کی قبر ایسی جگہ نہ بنائی جائے کہ اہلِ عقیدت اسے سجدہ گاہ بنالیں۔ اس لیے حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے کے مطابق حجرۂ عائشہؓ میں قبر کھودی گئی جہاں آپ نے انتقال فرمایا تھا۔ حضرت طلحہؓ نے لحدی قبر کھودی۔ چوں کہ زمین میں نمی تھی اس واسطے وہ بستر جس میں وفات پائی تھی قبر میں بچھا دیا گیا۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو اہلِ ایمان نماز کے لیے ٹوٹ پڑے۔ چوں کہ جنازہ حجرے کے اندر تھا۔ اس واسطے باری باری جماعتیں اندر جاتی تھیں اس نماز میں امام کوئی نہیں تھا۔ پہلے کنبے والوں نے جنازہ پڑھا، پھر مہاجرین نے، پھر انصار نے مردوں نے الگ جنازہ پڑھا، پھر عورتوں نے الگ اور بچوں نے الگ۔ یہ سلسلہ رات اور دن برابر جاری رہا۔ اس لیے تدفین مبارک چہارشنبہ کی شب کو یعنی رحلت پاک سے ۳۲ گھنٹے بعد عمل میں آئی۔ جسمِ مبارک کو حضرت علیؓ، فضل بن عباسؓ اسامہ بن زیدؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے قبر میں اُتارا اور آخر اس علم کے چاند، دین کے سورج اور اتقار کے گلزار کو اہلِ دنیا کی نگاہ سے اوجھل کر دیا گیا۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

متروکات

صاحبِ سیرۃ النبیؐ نے کتنا اچھا لکھا ہے، حضور پاک اپنی زندگی ہی میں اپنے پاس کیا رکھتے تھے جو مرنے کے بعد چھوڑ جاتے۔ پہلے ہی اعلان فرما چکے تھے۔ لانورث ماترکنا صدقہ۔ ہم نبیوں کا کوئی وارث نہیں ہوتا ہم جو کچھ چھوڑیں وہ صدقہ ہے۔

عمرو بن حویرثؓ سے روایت ہے کہ حضورؐ نے مرتے وقت کچھ نہ چھوڑا۔ نہ درہم، نہ دینار نہ غلام نہ لونڈی اور نہ کچھ اور، صرف اپنا سفید خچر، ہتھیار اور کچھ زمین تھی جو عام مسلمانوں پر صدقہ کر گئے۔

آثار متبرکہ چند یادگاریں صحابہؓ کے پاس باقی رہیں۔ حضرت طلحہؓ کے پاس موئے مبارک تھے۔ حضرت انس بن مالک کے پاس موئے مبارک کے علاوہ نعلین مبارک اور ایک لکڑی کا ٹوٹا ہوا پیالہ تھا۔ ذوالفقار حضرت علیؓ کے پاس تھی۔ حضرت عائشہؓ کے پاس وہ کپڑے تھے جن میں انتقال فرمایا۔ مُہر منوّرہ اور عصائے مبارک حضرت صدیق اکبرؓ کو تفویض ہوئے ان کے علاوہ سب سے بڑی نعمت اور دولت جو عرشِ عظیم سے بھی زیادہ بیش قیمت تھی، آپ اس

کہیں تشریف لے جا رہے ہیں اور پھر زبانِ اقدس سے نکلا ۔ بَلِ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی ۔ اب اور کوئی نہیں صرف اسی کی رفاقت منظور ہے ۔

بَلِ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی ۔ بَلِ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی ۔ بَلِ الرَّفِیْقُ الْاَعْلٰی

تیسری آواز پر ہاتھ لٹک آئے پتلی اوپر کو اُٹھ گئی اور روح شریف عالمِ قدس کو ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی ۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ وَّبَارِکْ وَسَلِّمْ ۔

یہ ربیع الاوّل ۱۱ھ دوشنبہ کا دن اور چاشت کا وقت تھا عمرِ مبارک قمری حساب سے ۶۳ سال اور ۴ دن ہوئی ۔

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

صحابۂ کرامؓ میں اضطرابِ عظیم

خبرِ وفات کے بعد مسلمانوں کے جگر کٹ گئے قدم لڑکھڑا گئے چہرے بجھ گئے ۔ آنکھیں خون بہانے لگیں ۔ ارض و سما سے خوف آنے لگا ۔ سورج تاریک ہوگیا ۔ آنسو بہہ رہے تھے اور تھمتے نہیں تھے ۔ کئی صحابہؓ حیران و سرگرداں ہو کر آبادیوں سے نکل گئے کوئی جنگل کی طرف بھاگ گیا جو بیٹھا تھا بیٹھا رہ گیا جو کھڑا تھا اس کو بیٹھ جانے کا یارا نہ ہوا ۔ مسجدِ نبویؐ قیامت سے پہلے قیامت کا نمونہ پیش کر رہی تھی ۔ حضرت صدیق اکبرؓ تشریف لائے اور چپ چاپ حجرۂ عائشہ صدیقہؓ میں داخل ہوگئے ۔ یہاں حضرت رحمۃ للعالمین کی میت پاک رکھی تھی حضرت صدیقؓ نے چہرۂ اقدس سے کپڑا اٹھا کر پیشانی پر بوسہ دیا ۔ پھر چادر ڈھک دی اور رو کر کہا :

" حضورؐ پر میرے ماں باپ قربان ! آپؐ کی زندگی بھی پاک تھی اور موت بھی پاک ہے ۔ واللہ اب آپ پر دو موتیں وارد نہیں ہوں گی ۔ اللہ نے جو موت لکھ رکھی تھی آج آپؐ نے اس کا ذائقہ چکھ لیا اور اب اس کے بعد موت ابد تک آپؐ کا دامن نہ چھو سکے گی ۔"

جب صدیق اکبرؓ مسجدِ نبوی میں تشریف لائے ، حضرت عمر فاروقؓ غایت بے بسی سے نڈھال کھڑے تھے اور بڑے درد و جوش سے یہ اعلان کر رہے تھے " منافقین کہتے ہیں کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم انتقال فرما گئے ہیں ۔ واللہ ! آپ نے وفات نہیں پائی ۔ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حضرت موسیٰؑ کی طرح طلب کیے گئے ہیں جو ۴۰ روز غائب رہ کر واپس آگئے تھے ۔ اس وقت حضرت موسیٰؑ کی نسبت بھی یہی کہا جاتا تھا کہ آپ وفات پا گئے ہیں ۔ خدا کی قسم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی انھیں کی طرح دنیا میں واپس تشریف لائیں گے اور ان لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیں گے جو آپ پر وفات کا الزام لگاتے ہیں ۔"

حضرت صدیق اکبرؓ نے عمر فاروقؓ کا کلام سنا تو فرمایا عمرؓ ! سنبھلو اور خاموش ہو جاؤ ۔ جب عمر فاروقؓ اپنی وارفتگی میں بہے چلے گئے تو حضرت صدیق اکبرؓ نہایت دانشمندی کے ساتھ ان سے الگ ہٹ گئے اور خود گفتگو شروع کر دی ۔ جب حاضرینِ مسجد بھی حضرت عمرؓ کو چھوڑ کر ادھر متوجہ ہو گئے تو آپ نے پہلے حمد و ثنا بیان کی ۔ پھر فرمایا :

" اے لوگو ! تم میں سے جو شخص محمدؐ کو پوجتا تھا وہ سمجھ لے کہ محمد وفات پا گئے ہیں اور جو شخص خدا کا پرستار ہے وہ جان لے کہ خدا تعالیٰ زندہ ہے اور وہ کبھی مرے گا نہیں اور یہ حقیقت خود قرآن پاک نے واضح کر دی ہے :

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓی اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِی اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۔

نہیں ہیں محمدؐ مگر ایک رسول ۔ ان سے پہلے رسول گزر چکے ہیں ۔ کیا اگر وہ مر جائیں یا شہید ہو جائیں تو تم دین سے برگشتہ ہو جاؤ گے ؟ جو شخص برگشتہ ہو جائے گا وہ اللہ تعالیٰ کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا اور اللہ عنقریب شکر گذاروں کو جزا دے گا ۔"

اس آیت پاک کو سن کر تمام مسلمان چونک پڑے ۔ حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ " خدا کی قسم ! ہم لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ آیت اس سے پہلے نازل ہی نہیں ہوئی تھی ۔" حضرت عمرؓ فرماتے ہیں " حضرت ابوبکرؓ سے یہ آیت سن کر میرے پاؤں ٹوٹ گئے اور کھڑے رہنے کی قوت باقی نہیں رہی ۔ میں زمین پر گر پڑا اور مجھ کو یقین ہو گیا کہ واقعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم رحلت فرما گئے ہیں ۔"

حضرت فاطمہؓ غم سے نڈھال تھیں اور فرما رہی تھیں ۔

" پیارے باپ نے دعوتِ حق کو قبول کیا اور فردوس بریں میں نزول فرمایا ۔"

آہ ! وہ کون ہے جو جبریلِ امینؑ کو اس حادثۂ غم کی اطلاع کر دے ۔ الٰہی ! فاطمہ کی روح کو محمد مصطفیٰؐ کی روح کے پاس پہنچا دے ۔ الٰہی مجھے دیدارِ رسولؐ کی مسرت عطا فرما دے ۔

الٰہی ! مجھے اس مصیبت کے ثواب سے بہرہ ور کر دے ۔ الٰہی ! مجھے رسولِ امینؐ کی شفاعت سے محروم نہ رکھنا ۔"

اولیاء اللہ و اولیاء الشیطان

اصحاب النار و اصحاب الجنۃ

قرآن حکیم کے تدبر و مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حق و باطل، ایمان و کفر، نور و ظلمت، تعلق علوی و رشتہ سفلی اور اعمال صالحہ و کاروبار مفسدہ وسیئہ کے اختلاف کے اعتبار سے دو بالکل متضاد اور باہم دگر مخالف گروہ دنیا میں ہمیشہ سے ہوتے چلے آئے ہیں۔ اور جب کبھی حق و باطل کا معرکہ گرم ہوتا ہے تو انھیں دو جماعتوں کی قطاریں ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہوتی ہیں۔

قرآن حکیم نے مختلف ناموں سے ان دونوں جماعتوں کا ذکر کیا ہے اور جا بجا ان کے آثار و علائم اور خواص و اعمال کی تشریح کی ہے۔

مثلاً ۳۲ سے زیادہ مقامات میں ایک ایسی جماعت کا ذکر کیا ہے جس نے اپنے دلوں کو حق کے قبول کے لیے مستعد کر لیا ہے۔ اور جو اپنی تمام قوتوں اور تمام جذبوں سے اللہ اور اس کی صداقت کو چاہنے والی اور پیار کرنے والی ہے۔ اور اس لیے اللہ نے بھی اسے اپنا دوست اور ساتھی بنا لیا ہے۔

اس جماعت کو "اولیاء اللہ" کے لقب سے پکارا گیا ہے یعنی وہ خدا کے دوست ہیں اور اس کے چاہنے والوں کے گروہ میں داخل ہیں۔ چنانچہ سورۂ بقر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ط

[اللہ تعالیٰ مومنوں کا ولی (دوست) ہے وہ انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔]

آل عمران میں کہا:

والله ولی المومنین

[اور اللہ مومنوں کا ولی اور دوست ہے۔]

سورۂ جاثیہ میں متقین کہا:

والله ولی المتقین

[اللہ متقی انسانوں کا ولی ہے۔]

سورۂ اعراف میں صالحین کہا:

وَهُوَ يَتَوَلَّى الصّٰلِحِيْنَ

[اللہ صالح انسانوں کا دوست ہے۔]

اولیاء اللہ کی پہچان

سورۂ جمعہ میں اس گروہ کے لیے ایک آزمائش بتلائی جس میں پڑکر معلوم ہو جائے گا کہ کون اولیاء اللہ میں سے ہے اور کون اولیاء الشیطان میں سے ہے؟

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۵

[اے پیغمبر! یہودیوں سے کہہ دو کہ اگر تم کو اس بات کا دعویٰ ہے کہ تمام بندوں میں سے صرف تم ہی اللہ کے ولی اور دوست ہو تو اس کی آزمائش یہ ہے کہ خدا کی راہ میں موت کی آرزو کرو۔ اگر تم سچے ہوگے تو ضرور ایسا ہی کروگے۔]

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اللہ کے دوستوں کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ جب انھیں جان دینے اور زندگی اور اس کی لذتوں سے دست بردار ہو جانے کی دعوت دی جاتی ہے۔ تو وہ لبیک کہتے ہوئے اس طرح دوڑتے ہیں گویا بھوکوں کو غذا کی اور پیاسوں کو پانی کی پکار سنائی دی۔ پر جو جھوٹے ہیں اور اللہ کی ولایت سے محروم، وہ انکار کر دیتے ہیں۔ اور یہ ان کے جھوٹے ہونے کی مہر ہے۔ جو خود انھوں نے اپنے اوپر لگا دی۔

وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ط

[اور یہ اللہ اور اس کی صداقت کی دوستی کا جھوٹا دم بھرنے والے کبھی بھی موت کی تمنا کرنے والے نہیں کیوں کہ انھوں نے ایسے کام کیے جو انھیں موت کے تصور سے ڈراتے ہیں اور زندگی کی مہلت کو غنیمت سمجھے ہوئے ہیں۔]

موت کی تمنا سے مقصود ہرگز یہ نہیں ہے کہ کوئی آدمی موت کو پکارے اور اس کے لیے التجا کرے۔ اللہ کا مقصود اس سے یہ تھا کہ سچے اور جھوٹے کی پہچان کے لیے ایک کسوٹی دے دے۔ پس فرمایا کہ اگر خدا کے دوست ہو تو موت کی تمنا کرو یعنی اس کے لیے اور اس کے کلمۂ حق کے لیے ایسے کاموں میں پڑو جن میں جان دینے، اپنا خون بہانے، اپنے جسم کو طرح طرح کی مہلک مشقتوں میں ڈالنے اور زندگی کے عیش و نشاط سے محروم ہونے کی ضرورت ہے۔ اس کے بعد پھر خود ہی فیصلہ کیا کہ یہ کام اولیاء اللہ کا ہے۔ اولیاء الشیطان کبھی بھی ایسا نہیں کریں گے کیوں کہ یہ موت کے نام سے ڈرتے اور کانپتے ہیں اور زندگی کے عشق میں پاگل ہو گئے ہیں۔

پوری انسانیت کو عطا فرما گئے۔ یہ نعمتِ عظیم اللہ کی کتاب قرآن ہے۔
وَقد ترکت فیکم مالن تضلوا [اے لوگو! میں تم میں وہ چیز چھوڑ چلا ہوں کہ
بعدہٗ ان اعتصمتم بہ کتاب اللہ۔
اگر اسے مضبوط پکڑو گے، تو کبھی گمراہ نہ ہو گے۔ یہ اللہ کی کتاب قرآن ہے]
("انسانیت موت کے دروازے پر")

تعبدوالشیطن انہ لکم عدو مبین ○ وان اعبدونی ھذا صراط مستقیم ط

[اے اولادِ آدم! کیا ہم نے تمھیں تاکید نہیں کر دی تھی کہ شیطان کی پوجا نہ کرنا۔ وہ تمھارا کھلا دشمن ہے۔ اور یہ کہ صرف ہماری ہی بندگی کرنا یہی انسان کے لیے سیدھا راستہ ہے۔]

چنانچہ سورۂ اعراف میں صاف صاف اس کی تصریح کی :

فریقا ھدی وفریقا حق علیھم الضلالۃ انھم اتخذوا الشیاطین اولیاء من دون اللہ ویحسبون انھم مھتدون ○

[خدا نے دو فرشتوں میں سعادت و شقاوت کو تقسیم کر دیا۔ اس نے ایک جماعت کو ہدایت دی ہے۔ اور ایک فریق ہے کہ گمراہی اس پر چھا گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں (یعنی دوسری جماعت کے گمراہ) کہ انھوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا ولی بنا لیا ہے۔ اور بایں ہمہ اس زعمِ باطل میں گرفتار ہیں کہ وہ ہی راہِ راست پر چل رہے ہیں۔]

اسی سورت میں اس سے کچھ پہلے ایمان و مومنین کے مقابلے میں "اولیاء الشیطان" کا ذکر کیا ہے :

انا جعلنا الشیاطین اولیاء الذین لایومنون ○

[ہم نے شیطانوں کو ان لوگوں کا ولی یعنی آشنا و ہم دم بنا دیا ہے جو ایمان سے محروم ہیں۔]

معرکۂ قتال و جدال

پس اس آیت سے صاف صاف ہمارا استدلال واضح ہو گیا۔ یعنی دو فرقے ہیں جن میں سے ایک کو خدا نے اولیاء اللہ کے نام سے پکارا اور دوسرے کی نسبت تصریح کی کہ اس نے شیطان کو اپنا ولی بنا لیا ہے۔

سورۂ کہف میں شیطان کا ذکر کر کے فرمایا :

افتتخذونہ وذریتہ اولیاء من دونی وھم لکم عدو بئس للظالمین بدلا ○

[آیا تم ہم کو چھوڑ کر شیطان کو اور اس کی نسل کو اپنا ولی بناتے ہو۔ حالانکہ وہ تمھارا دشمن ہے۔ ظالموں کے لیے یہ کیا ہی بُرا بدلہ ہے کہ وہ خدا کی جگہ نسلِ شیطانی کے ماتحت آ گئے۔]

پس ایک طرف تو اولیاء اللہ اور دوسری طرف اولیاء الشیطان۔ اولیاء الشیطان کے بھی مثل اولیاء اللہ کے مختلف مدارج و مراتب ہیں۔ آخری مرتبہ درجۂ "کفر" ہے۔ اور اس کا سب سے بڑا اضل واشقی گروہ "الکافرین" کا ہوتا ہے۔ یہ دونوں جماعتیں ہمیشہ ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا رہتی ہیں اور باہم معرکۂ جنگ و قتال گرم رہتا ہے۔

الذین امنوا یقاتلون فی سبیل اللہ والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت ○

[پس جو لوگ مومن اور اللہ کے ولی ہیں۔ وہ تو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں۔ مگر جن لوگوں نے "کفر" اختیار کیا وہ "طاغوت" کی راہ میں لڑنے کے لیے نکلتے ہیں۔]

طاغوت

"طاغوت" سے مراد بھی قوتِ ابلیسی و شیطانی اور اس کے مختلف مظاہر ہیں۔ خواہ وہ پتھر کے بُت ہوں یا بولنے والے انسان۔ اسی لیے سورۂ بقرۃ کی آیتِ کریمہ میں اولیاء اللہ کا ذکر کر کے اولیاء الشیطان کی نسبت فرمایا کہ والذین کفروا اولیاءھم الطاغوت۔ جن لوگوں نے حق سے انکار کیا، ان کا دوست اور ولی خدا نہیں ہے، طاغوت ہیں۔

حکم قتال

غرض کہ پہلی جماعت اللہ کی راہ میں اپنے تئیں قربان کرنے کے لیے نکلتی ہے۔ اور دوسری جماعت شیطان کی راہ میں جنگ و قتال کرنے کے لیے

فقاتلوا اولیاء الشیطن ان کید الشیطان کان ضعیفا ○

[پس اولیاء الشیطان کو قتل کرو۔ تاکہ دنیا ظلم و فساد سے نجات پائے اور صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔ شیطان کے مکر و فریب خواہ کتنے ہی مہیب اور ڈراونے نظر آئیں تاہم یقین کرو کہ اولیاء اللہ کے مقابلے میں بالکل کمزور و ضعیف ہیں۔]

اگر ان تمام آیتوں کو جمع کیا جائے جن میں ان متضاد اور مخالف دو جماعتوں کے خواص و اعمال کا اور ان کی پہچان کی نشانیوں کا ذکر کیا گیا ہے، تو مضمون اس قدر بڑھ جائے کہ اصل مطلب کی گزارش کی، نہیں معلوم، کتنی اشاعتوں کے بعد نوبت آئے۔ پس میں نہایت اختصار سے کام لوں گا۔ اور صرف اشاراتِ موجزہ پر اکتفا کروں گا۔

ماوجدنا علیہ اباءنا

ازاں جملہ اس جماعت کا ایک خاصہ یہ ہے کہ جب کبھی اولیاء اللہ اسے برائیوں اور معصیتوں سے روکتے ہیں تو وہ کہتی ہے کہ :

وجدنا علیہ اباءنا۔ واللہ امرنا بھا قل ان اللہ لایامر بالفحشاء اتقولون علی اللہ مالا تعلمون ○

[ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریقہ پر پایا اور



قل ان الموت تفسرون منہ فانہ ملاقیکم ثمّ تُرَدُّونَ الی عالم الغیب والشہادۃ فینبکم بما کنتم تعلمون ۵

[ان سے کہہ دو کہ اے نفس پرستو! جس موت سے کہ تم اس قدر بھاگتے ہو وہ کچھ تمھیں چھوڑ نہ دے گی، ایک دن ضرور ہی آئے گی۔ پھر تم اسی خدا کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ جو پوشیدہ اور ظاہر سب کچھ جانتا ہے۔]

لاخوف علیھم ولاھم یحزنون

سورۂ یونس میں ان کی ایک بہت بڑی علامت یہ بتلائی کہ ان کے لیے خوف اور غم نہ تو دنیا میں ہوتا ہے اور نہ آخرت میں۔

الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم ولاھم یحزنون ○ الذین اٰمنوا وکانو یتّقون ○ لھمُ البشری فی الحیٰوۃ الدّنیا وفی الاخرۃ ط لاتبدیل لکلمات اللہ، ذالک ھوالفوز العظیم!

[یاد رکھو کہ اولیاء اللہ پر نہ تو کسی طرح کا ڈر اور خوف طاری ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ پر سچّی روحوں کی طرح ایمان لائے اور اپنے اعمال میں اس کا خوف پیدا کیا۔ پس ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی خوش خبری ہے اور آخرت میں بھی۔ یہ اللہ کا قانون ہے۔ اور اللہ کے کلمات میں ذرا بھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ انسان کے لیے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔]

دارالسّلام

سورۂ انعام میں ان اربابِ حق کا ذکر کیا۔ جن کے دلوں کو خدا نے اسلام کے لیے کھول دیا ہے۔

فمن یرد اللہ ان یھدیہٗ یشرح صدرہ للاسلام

اور جو ان لوگوں کے مقابلے میں ہیں جن کے دل فشارِ کفر و ضلالت سے اس قدر تنگ ہو گئے ہیں کہ اب ان کا انشراحِ روحانی ہو نہیں سکتا۔

ومن یرد ان یضلہ یجعل صدرہ ضیقا حرجاً

اس کے بعد اول الذکر جماعت کے لیے بشارت دی۔

لھم دارالسّلام عند ربّھم وھو ولیھم بما کانوا یعملون ○

[ان کے پروردگار کے پاس ان کے لیے امن اور سلامتی کا گھر ہے اور ان کے نیک عملوں کے صلے میں وہی ان کا ولی ہے۔]

قال انّنی من المسلمین

سورۂ حٰم سجدہ میں ان مومنینِ کاملین کا حال بیان کیا ہے۔ جنھوں نے پہلے مقامِ عبودیۃ و اعترافِ ربوبیت حاصل کیا۔ پھر مقامِ استقامت و ثباتِ عمل و ایمان تک مرتفع ہوئے۔ ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا، ان کی نسبت فرمایا کہ تتنزل علیھم الملائکۃ الاتخافوا ولاتحزنوا وابشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون۔ یعنی ایسے صاحبانِ استقامت و کاملین پر نزولِ ملائکہ ہوتا ہے۔ جو طمانیت، سکنیت اور بے خوفی اور بے غمی کا مقام ان پر طاری کر دیتے ہیں۔ جس نعمت جنّت کا وعدہ کیا گیا ہے، اس کی انھیں بشارت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

نحن اولیآءکم فی الحیٰوۃ الدنیا و فی الاخرۃ ولکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون ○ نزلا من غفور رحیم ○ ومن احسن قولا ممّن دعا الی اللہ وعمل صالحا وقال انّنی من المسلمین ○

[ہم تمھارے مددگار ہیں دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اور تمھیں اس حیاتِ بہشتی میں ہر طرح کا اختیار اور حکم بخش دیا گیا ہے۔ جس چیز کو تمھارا جی چاہے تمھارے لیے مہیا کرتا ہے اور جو نعمت اللہ سے مانگو گے تمھیں عطا ہوگی۔ یہ مقام تمھیں خدائے غفور الرحیم کی طرف سے عطا ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ اس شخص سے بڑھ کر اور کس کی بات ہو سکتی ہے۔ جو اللہ کی طرف لوگوں کو دعوت دے۔ اور اعمالِ صالح اختیار کرے۔ نیز کہے کہ میں مسلم ہوں۔]

اولیاءالشیطان

لیکن اس جماعت کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت ہے جو اپنے خواص و اعمال میں بالکل اس کی ضد اور مخالف واقع ہوئی ہے۔ قرآن کریم اسے "اولیاء الشیطان" سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام قوتیں جو تعلق الٰہی اور رشتۂ حق و صداقت کے مخالف ہیں۔ شیطانی قوت ہیں اور ان میں ہر قوت اور ہر عمل شیطانِ لعین کا ایک مظہرِ خبیث ہے۔ پس جو لوگ حق و عدالت کی راہِ روشن سے ہٹ کر اعمالِ باطلہ کی تاریکی میں گم ہو جاتے ہیں اور اللہ کا رشتہ ان کے ہاتھوں میں نہیں ہے۔ وہ خواہ کسی حال اور کسی شکل میں ہوں لیکن درحقیقت شیطان کے ولی، اس کے پرستار، اس کی نسل کے چاکر ..... اور اس کی پادشاہت کے غلام ہیں یہی وہ شیطان کی ولادت اور پرستش ہے جس کے متعلق نبیِ آدم سے ربوبیت الٰہیہ نے عہد لیا تھا۔

الم اعھد الیکم یابنی آدم ان لا

ویحسبون انھم مہتدون

ایک علامت ان کی یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے زعمِ باطل میں اپنے تئیں حق و ہدایت پر سمجھتے ہیں۔ اس کا انھیں بڑا دعویٰ ہے اور بڑا ہی گھمنڈ۔ حالاں کہ وہ ہدایت سے اس قدر دور ہوتے ہیں۔ جس قدر باوجود اتصال کے روشنی سے تاریکی۔

انھم اتخذوا الشیاطین اولیاء من دون اللہ ویحسبون انھم مہتدون

[انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیطانی قوتوں کو اپنا دوست بنالیا ہے۔ بایں ہمہ اس زعمِ باطل میں گرفتار ہیں کہ وہی راہ ہدایت پر ہیں۔]

وحیِ شیطانی

شیاطین ہمیشہ اپنے اولیاء پر وحی کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ خدا کے دوستوں سے شیطانی الہامات کے مطابق بحث وجدل کرسکیں۔ اور انھیں اللہ کی پادشاہت سے نکال کر شیطانی حکومتوں میں داخل ہونے کی ترغیب دیں۔

وان الشیاطین لیوحون الی اولیاءھم لیجادلوکم وان اطعتموھم انکم لمشرکون ۵

[اور شیاطین اپنے ولیوں کی طرف وحی کرتے رہتے ہیں تاکہ وہ تمھارے ساتھ شیطانی القا کے بموجب بحث وجدل کریں۔ لیکن اگر تم نے ان کی باتوں کی اطاعت کرلی تو جان رکھو کہ پھر تمھارا شمار بھی مشرکوں میں ہوگا۔]

حزب اللہ و حزب الشیطان

قرآنِ کریم ان دو جماعتوں کو ایک دوسری اصطلاح سے بھی موسوم کرتا ہے۔ سورۃ مائدہ میں مسلمانوں کو اس سے منع کیا ہے کہ اللہ اور اس کی شریعت کے مقابلے میں یہود و نصاریٰ کو اپنا ولی بنائیں۔ لا تتخذوا الیہود والنصریٰ اولیاء اس کے بعد فرمایا ہے کہ اگر لوگ اللہ کی دوستی کی راہ چھوڑ کر الگ ہوجائیں تو اسلام کے کاموں کا کچھ بھی نقصان نہ ہوگا۔ خدا ایک دوسری جماعت سچے مومنوں اور اپنے دوستوں کی پیدا کردے گا۔ جن کی ولایت الٰہی اور محبت ربّانی یہاں تک بڑھی ہوگی کہ وہ اللہ کے چاہنے والے ہوں گے اور اللہ ان سے پیار کرے گا۔ یحبھم ویحبونہ۔ پھر کہا کہ :

انما ولیکم اللہ ورسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ وھم رٰکعون ۵ ومن یتول اللہ والذین امنوا فان حزب اللہ ھم الغالبون ۵

[مسلمانو! تمھارا دوست اللہ اور اس کا رسول ہے اور وہ مومن جو ایمان لاچکے ہیں۔ جو صلوٰۃ الٰہی کو دنیا میں قائم کرتے ہیں۔ جو خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور جو ہر وقت اللہ اور اس کے حکموں کے آگے جھکے رہتے ہیں۔ پس جو شخص اللہ اور اس کے رسولؐ اور مومنوں کا دوست و ولی ہوکر رہے گا، وہ حزب اللہ میں سے ہے۔ اور یقین کرو کہ حزب اللہ ہی کے لوگ غالب ہونے والے ہیں۔]

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ جو لوگ اللہ کے ولی اور اس کے دوست ہیں۔ ان کا ایک نام لسان اللہ الحکیم میں "حزب اللہ" بھی ہے۔ حزب کہتے ہیں گروہ اور جماعت کو۔ حزب اللہ سے مقصود وہ لوگ ہوئے جو اللہ کی جماعت ہیں۔

چنانچہ سورۃ حشر میں فرمایا کہ جو لوگ اللہ کی محبت کی راہ میں دنیا کے تمام رشتوں کی کچھ پروا نہ کریں۔ حتیٰ کہ ماں باپ اور عزیز و اقربا کی محبت اور دامن گیری کو بھی ہیچ سمجھیں۔ اور خدا کی پکار جب ان کے کانوں میں پڑجائے تو سب کو چھوڑ چھاڑ کر اسی کی طرف دوڑ جائیں تو ایسے لوگ "حزب اللہ" ہیں۔

اولٓئک حزب اللہ الا ان حزب اللہ ھم المفلحون ۵

[یہی لوگ حزب اللہ ہیں۔ سن رکھو، کہ یقیناً حزب اللہ ہی کے افراد فلاح پانے والے ہیں۔]

جس طرح اولیاء اللہ کا ایک نام یا ایک درجہ "حزب اللہ" ہے۔ اسی طرح "اولیاء الشیطان" کا بھی دوسرا نام "حزب الشیطان" ہے۔

استحوذ علیھم الشیطان فانساھم ذکر اللہ ط اولٓئک حزب الشیطٰن الا ان حزب الشیطٰن ھم الخاسرون ۵

[شیطان اور اس کی قوتیں ان پر مسلّط ہوگئی ہیں۔ پس انھوں نے خدا کے ذکر اور رشتے کو فراموش کردیا ہے۔ یہی لوگ "حزب الشیطان" ہیں اور جان رکھو کہ حزب الشیطان کے لیے آخر کار نقصان اور خسران ہی ہے۔]

اصحاب النّار و اصحاب الجنّۃ

اور یہی وہ دو جماعتیں ہیں جن کو صدہا مقامات میں "اصحاب النّار و اصحاب الجنّۃ" کے لقب سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ اور ان کے اعمال و خواص کی جا بجا توضیح کی گئی ہے۔ چنانچہ سورۂ بقر کی آیت کو ایک بار اور پڑھو اور اس کے بقیہ ٹکڑے کے الفاظ پر غور کرو:

والذین کفروا اولیاءھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات ط اولٓئک اصحٰب النار ط ھم فیھا خٰلدون ۵

[اور جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی سو ان کے

اسی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں ان گمراہوں سے کہہ دو کہ خدا نے کبھی بھی اپنے بندوں کو برائیوں اور فواحش کا حکم نہیں دیا۔ کیا تم اللہ کی نسبت وہ باتیں کہتے ہو جنھیں نہیں جانتے۔]

خسرانِ عاقبت

اولیاء الشیطان کی ایک بہت بڑی علامت یہ بھی ہے کہ کامیابی و فلاح انھیں نصیب نہ ہوگی۔ اور عاقبت کار گھاٹے ہی میں رہیں گے۔

ومن یتخذ الشیطان ولیا من دون اللہ فقد خسر خسرانا مبینا ہ یعدھم ویمنیھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا ○

[اور جس شخص نے اللہ کو چھوڑ کر شیطان کو اپنا دوست بنایا تو یقیناً بڑے ہی سخت گھاٹے میں پڑا۔ شیطان اپنے دوستوں اور پجاریوں سے طرح طرح کے وعدے کرتا اور بڑی بڑی امیدیں دلاتا ہے۔ لیکن یاد رکھو کہ شیطان جو کچھ وعدے کرتا ہے۔ ان میں دھوکے اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔]

تخویفِ شیطانی

شیطان اپنے ولیوں اور پجاریوں کے ذریعہ اللہ کے ولیوں اور پرستاروں کو ہمیشہ ڈراتا اور دھمکاتا رہتا ہے۔ مگر مومنوں کے لیے کوئی خوف نہیں۔

انما ذالکم الشیطان یخوف اولیآء فلا تخافوھم وخافون ان کنتم مومنین ○

[بے شک یہ شیطان تھا جس کا قاعدہ ہے کہ اللہ کے دوستوں کو اپنے دوستوں کی جماعت کا ڈراوا دکھلاتا ہے۔ مگر اے مسلمانو! تم اس سے ذرا بھی نہ ڈرنا۔ اگر تم سچے مسلمان ہو، تو بس ہماری ہی حکومت کا خوف کرو۔]

یخرجونھم من النور الی الظلمات

ایک بہت بڑا فرق حالت یہ بھی ہے کہ اولیاء اللہ ایسے عہد میں ہوتے ہیں جب کہ حق اور سچائی محدود، مگر باطل اور فساد عام ہوتا ہے۔ اور گمراہی کی تاریکی اس طرح پھیل جاتی ہے کہ کوئی گوشہ بھی پوری طرح روشن و منور نہیں ہوتا۔ ایسی ہی سوسائٹی اور اسی طرح کے گرد و پیش میں وہ پرورش پاتے ہیں۔ اور انہی خیالات کو آنکھیں کھول کر ہر طرف دیکھتے ہیں۔ ان کے سامنے جو کچھ ہوتا ہے۔ وہ بھی یک سر گمراہی ہوتی ہے۔ ان کے کان جو کچھ سنتے ہیں اس میں بھی ضلالت ہی کی صدا اٹھتی ہے۔ اور دماغ و فکر جو کچھ سوچتا ہے۔ اس کا بیان بھی سر تا سر گمراہی و باطل ہی کے واسطے سے میسّر آتا ہے۔

لیکن جب کہ وہ اس طرح چاروں طرف کی پھیلی ہوئی اندھیاری میں گھرے ہوتے ہیں تو یکایک خدا کا ہاتھ چمکتا ہے اور انھیں گمراہی سے نکال کر حق و ہدایت کے اجالے میں لے آتا ہے۔ ان کی ہدایت کی مثال بالکل ایسی ہوتی ہے۔ جیسے کوئی معذور آدمی اندھیری رات میں ٹھوکروں سے قریب اور غاروں کے کنارے کھڑا ہوا اور اندھوں کی طرح دیکھنے اور چلنے سے معذور ہو گیا ہو۔ اتنے میں ایک واقفِ راہ اور باخبر ہاتھ ظاہر ہو کر اس کا ہاتھ تھام لے اور ٹھوکروں سے بچاتے ہوئے اور گڑھوں اور غاروں سے نگرانی کرتے ہوئے ایک سیدھے اور محفوظ شاہراہ سے منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ یا یوں سمجھنا چاہیے کہ جب کہ گمراہی اور باطل پرستی کی رات آنکھوں کو اندھا اور بصارت کو بے فائدہ کر دیتی ہے تو اس وقت خدا تعالیٰ اپنے دوستوں کے لیے ہدایت کا سورج چمکا دیتا ہے۔ اور ان کے دلوں کا اس کی روشنی کے اخذ و انعکاس کے لیے انشراح کر دیتا ہے۔

لیکن جو لوگ قوائے الٰہیہ کی جگہ قوائے شیطانیہ کو اپنا مولیٰ اور آقا بناتے ہیں اور شیطان کے عاشقوں اور پیار کرنے والوں کے جرگے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ سو ان کی حالت ان لوگوں سے بالکل برعکس ہوتی ہے۔ پہلی جماعت تاریکی سے نکل کر روشنی میں آتی ہے۔ پر یہ جماعت روشنی سے نکال کر تاریکی میں ڈالی جاتی ہے۔ پہلی جماعت کی اصلی اور ابتدائی حالت تاریک ہوتی ہے مگر اللہ انھیں سعادت و ہدایت کی نورانیت میں نکال لاتا ہے۔ دوسری جماعت کے لیے ابتدا میں تو ہدایت و سعادت موجود ہوتی ہے۔ لیکن بعد کو شیطان سعادت سے نکال کر شقاوت میں دھکیل دیتا ہے۔

چنانچہ سورۂ بقر کی آیت کریمہ اوپر گزر چکی ہے۔ اس کے لفظوں پر غور کرو:

اللہ ولی الذین امنوا یخرجھم من الظلمت الی النور ط والذین کفروا اولیاء ھم الطاغوت یخرجونھم من النور الی الظلمات ط

[اللہ مومنوں کا دوست اور ولی ہے۔ وہ انھیں تاریکی سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ان کے دوست طاغوت ہیں۔ جو انھیں اللہ کی روشنی سے نکال کر شیطان کی اندھیاری میں ڈالتے ہیں۔]

اولیاء اللہ کی نسبت کہا کہ:

یخرجھم من الظلمات الی النور ط

اور اولیاء الشیطان کے لیے کہا:

یخرجونھم من النور الی الظلمات ط

مختلف مدارج ہیں۔ اور اسی بنا پر اصحاب النّار کو "اصحاب الجحیم" اور "اصحاب السعیر" بھی کہا گیا ہے۔ مگر میں بحث کو طول نہ دوں گا۔

تمام آیتوں کے جمع کرنے سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ نفوس مومنہ وصالحہ جو اعتقادِ حق اور عملِ صالح کے ساتھ متصف ہیں اور جنھوں نے اللہ کے رشتے اور تعلّق کے آگے تمام باطل اور خبیث قوّتوں کے رشتوں کو توڑ ڈالا ہے اور اس کی بخشی ہوئی قوّتوں کو اسی کے بتلائے ہوئے صالح اور صحیح کاموں میں خرچ کرتے ہیں۔ سو ایسے تمام لوگ اصحاب الجنّۃ میں داخل ہیں۔ ھم فیھا خلدون ○ ہمیشہ ہر طرح کی کامیابیاں اور خوبیاں انہی کے لیے ہیں۔ لیکن جو لوگ اعتقادِ حق اور عملِ صالح سے محروم ہیں۔ اور اللہ کے تاج و تختِ قدوس سے باغی ہوگئے ہیں۔ خواہ کسی بھیس اور کسی ہی روپ میں ہوں لیکن وہ سب کے سب اصحاب النّار میں داخل ہیں۔ ان کے تمام کاموں کے لیے آگ کی تپش اور سوختگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جنگل کی سوکھی لکڑی اور درختوں کے خشک پتّے جس طرح بھڑکتے ہوئے شعلوں میں جلتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح وہ بھی جلیں گے۔

(الہلال)

اشاریہ آجکل (جلد اوّل)

"آجکل" اردو کا ایک اہم ادبی ماہنامہ ہے۔ یہ ۱۹۴۲ء میں جاری ہوا تھا اور ۱۹۴۷ء کے تین مہینے چھوڑ کر اب تک باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے ایڈیٹروں میں جوش ملیح آبادی سید وقار عظیم، عرش ملسیانی، شہباز حسین، مہدی عباس حسینی اور راج نرائن راز جیسے شاعر اور [illegible] رہے ہیں اور نائب مدیروں میں طالب دہلوی، شان الحق حقی، معین احسن جذبی، [illegible] اور [illegible] سنگھ کے نام شامل ہیں۔

یہ اسی اہم رسالے کا اشاریہ ہے۔ [illegible] کی عدم موجودگی تحقیق کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اگر کوئی ریسرچ اسکالر یہ معلوم کرنا چاہے کہ کسی ادبی جریدے میں اس کے موضوع سے متعلق کیا مواد [illegible] ہے تو اسے اس رسالے کا پورا فائل تلاش کرنا پڑے گا اور ممکن ہے کہ اس تمام محنت و سعی کے بعد ایک آدھ مقالہ ہی اس کے ہاتھ لگے۔ [illegible] اہم علمی ادبی، تحقیقی، تنقیدی مضامین اور اعلیٰ درجے کے تخلیقی ادب کا [illegible] ادبی [illegible] ہے اس سرمایے تک ہماری رسائی اس لیے مشکل ہے کہ ان رسالوں کے [illegible] اور آج کی مصروف زندگی میں ہمارے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ ہزاروں صفحات کی ورق گردانی [illegible] ماہنامہ "آجکل" کی [illegible] مشکل اردو اکادمی نے یہ کتاب شائع کرکے آسان کر دی ہے۔

یہ "آجکل" کی [illegible] سال کی فائلوں کا اشاریہ ہے۔ اسے دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک حصّہ ادبی مضامین سے متعلق ہے اور دوسرا ادب کے علاوہ دیگر مضامین سے۔

یہ کتاب [illegible]

[illegible]

مرتب : [illegible]

صفحات : ۶۸۳

قیمت : ۷۷ روپے

حواشیِ ابوالکلام آزاد

جو لوگ مولانا ابوالکلام آزاد کے نام سے واقف ہیں وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ مولانا کو اوائلِ عمر ہی سے پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا۔ عمر کا جو حصّہ بچّے کھیل کود میں گزارتے ہیں، مولانا نے کتابوں کے مطالعے میں صرف کیا اور ان کا یہ ذوق آخر عمر تک ان کے ساتھ رہا۔ مولانا نے کسی مدرسے میں تعلیم نہیں پائی، گھر پر ہی پڑھا اور پھر انھیں ایسے مواقع ملے کہ اردو، فارسی اور عربی کے علاوہ انھوں نے انگریزی اور فرانسیسی سے بھی واقفیت حاصل کی اور ان زبانوں میں قدیم و جدید علوم کا جو سرمایہ تھا اسے اپنی شخصیت میں سمو لیا۔

یہ کتاب ان حواشی کا مجموعہ ہے جو مولانا ابوالکلام آزاد نے دورانِ مطالعہ مختلف کتابوں پر لکھے ہیں۔ یہ کتابیں مختلف زبانوں کی ہیں اور مختلف علوم سے تعلق رکھتی ہیں۔ مولانا نے، جب وہ حکومت ہند کے وزیرِ تعلیمات تھے، انڈین کونسل فار کلچرل ریلیشنز کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا۔ [illegible] کتب خانہ [illegible] کتابوں پر مشتمل تھا، اس ادارے کو دے کر ایک لائبریری قائم کر دی تھی۔ [illegible] صاحب [illegible] اس لائبریری میں کام کرتے رہے ہیں [illegible] مولانا کے قلم سے [illegible]

[illegible]

مرتب : [illegible]

صفحات : [illegible]

قیمت : [illegible] روپے

اردو اکادمی دہلی، سے طلب کریں



اولیاء طاغوت ہیں۔ جو انھیں نورو ہدایت سے نکال کر ظلمات و ضلالت میں مبتلا کرتے ہیں۔ یہ لوگ اصحاب النار ہیں۔ اور ہمیشہ دوزخی عذابوں میں رہیں گے۔]

اس آیتِ کریمہ سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں کے اولیاء و سردار "طاغوت" ہوں۔ (طاغوت سے مراد بھی شیطان اور اس کے خلفاء اور مظاہر ہی ہیں) تو ایسے لوگ "اصحاب النار" ہیں۔ کیوں کہ ان کی زندگی ہمیشہ آگ میں جلتے رہنے کی اور سوختنی ہوگی۔ روح کی راحت اور دل کا سکھ انھیں نصیب نہ ہوگا۔ اس سے پہلے ایک آیت گزر چکی ہے۔ جس میں اولیاء اللہ کی نسبت فرمایا کہ تتنزل علیھم الملآئکتہ الا تخافوا ولا تحزنوا وابشروا بالجنتہ التی کنتم توعدون

اس آیتِ کریمہ میں خاص طور پر اولیاء اللہ کو جنّت کی بشارت دی گئی ہے۔ پس فی الحقیقت وہی اصحاب الجنت بھی ہیں۔ کیونکہ ان کی حیات دنیوی اور دینی، جسمی و روحی، ظاہری و معنوی، ہر حال اور عہد و دَور میں کامیابیوں، فتح مندیوں، آرام و راحت، نعائم و لذائذ اور عیش و نشاط کی زندگی ہوگی۔

اعمال و خصائص

سورۂ یونس میں اصحاب الجنتہ اور اصحاب النار کی تعریف پوری وضاحت کے ساتھ بتلادی ہے۔ اور یہ بھی واضح کردیا ہے کہ دونوں جماعتوں کے اعمال کیسے ہوتے ہیں۔ اور کن نتائج کی بنا پر ایک کو جنّت والوں کی اور ایک کو نار والوں کی زندگی ملتی ہے۔

الذین احسنوا الحسنیٰ و زیادۃ ولا یرھق وجوھھم قتر ولا ذلتہ اولٰئک اصحاب الجنّتہ ھم فیھا خلدون ۝

[اور جن لوگوں نے دنیا میں اچھے اور بھلائی کے کام کیے انھیں نیک کاموں کے بدلے میں ویسی ہی بھلائی اور فلاح ملے گی۔ ان کو کبھی بھی ناکامی کا غم، شکست کی رسوائی اور نامرادی و تذلل کی ذلت پیش نہ آئے گی۔ یہی لوگ اصحاب الجنتہ ہیں جو ہمیشہ بہشتی زندگی میں رہیں گے۔]

اس کے بعد دوسرے گروہ کی حالت بتائی:

والذین کسبوا السیّٰات جزآء سیئتہ بمثلھا وترھقھم ذلتہ۔ مالھم من اللہ من عاصم کانما اغشیت وجوھم قطعا من الّیل مظلما اولٰئک اصحب النار ھم فیھا خلدون ۝

[اور جن لوگوں نے دنیا کے کاموں میں برائی حاصل کی اور بدی کا راستہ اختیار کیا۔ تو یہ ظاہر ہے کہ فطرتِ الٰہی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی سے دے گی۔ ذلّت اور نامرادی سے ان کے چہرے ایسے کالے پڑجائیں گے گویا رات کی چادرِ ظلمت کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر ان کے چہروں پر ڈال دیا گیا ہے۔ اللہ کے اس عذاب سے انھیں کوئی نہیں بچا سکتا۔ یہی لوگ اصحاب النار ہیں۔ جن کے لیے ہمیشہ دوزخی زندگی ہوگی۔]

ان آیتوں کی اگر اپنے مذاق کے مطابق تفسیر کروں تو ایک مستقل کتاب ہوجائے۔ اسلامی تعلیم کی حقیقت اور قرآنِ حکیم کے اصول و دروس حقائق و معارف کا ایک بحرِ ذخّار ہے۔ جو ان دو چار جملوں کے اندر بند کردیا گیا ہے۔ ختامہ مسک و فی ذلک فلیتنافس المتنافسون ۝

ثواب و عذاب کی حقیقت، نتائج افعال اور مکافاتِ عمل کے فطری اور طبیعی اصول کی تشریح، مذہب و اخلاق کی اساسات اصلیہ اور امتیازات عملیہ قانون تعالیٰ و تسفل بشری کے مبادی حقائق، اصحابِ جنت و اربابِ نار کی قدرتی تقسیمِ فطرت کا قانون عمل بالمثال اور انسان کے لیے راہِ سعادت و ہدایت کی کلی اور اصولی تعلیم غرضیکہ شریعت و اخلاق اور حکمت و تعلیم کی کوئی اصولی بحث ایسی نہیں ہے جو ان دو آیتوں پر متفرع نہ ہوتی ہو اور ان کی طرف ایک ایک واضح اور بیّن اشارہ ان میں نہ کر دیا گیا ہو تاوقتیکہ تفسیر القرآن کی تحریر و توزیع کا مستقل انتظام نہ ہو ضمنی طور پر یہ چیزیں بیان میں نہیں آسکتیں۔

مندرجہ بالا آیات کے درج کرنے سے مقصود یہ تھا کہ "اصحاب الجنّتہ" اور "اصحاب النّار" کی کھلی کھلی تقسیم کرکے ان کے کاموں اور کاموں کے نتائج کو صاف صاف بتلا دیا ہے۔ پس یہ دو آیتیں میری بحث و استدلال کی اصل و اساس ہیں۔ ان سے واضح ہوگیا کہ دونوں گروہ بالمقابل اور بالضد واقع ہوئے ہیں۔ ایک کے لیے کامیابی، فتح و مراد اور فوز و فلاح ہے۔ اور ذلت و رسوائی سے ہمیشہ محفوظ ہے۔ دوسرے کے لیے شرمندگی، خجالت، ناکامی اور ہمیشہ آگ میں سوکھی لکڑی اور خشک پتّوں کی طرح جلنے کا عذاب الیم ہے۔

دونوں جماعتوں کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ "اصحاب الجنّتہ" ہمیشہ کامیاب و فتح مند ہوں گے اور "اصحاب النّار" کے حصے میں ہمیشہ عاقبت کار اور انجام امور کا خسران و نقصان آئے گا۔

لا یستوی اصحاب النّار و اصحاب الجنّتہ ط اصحاب الجنّتہ ھم الفائزون ۝

[اصحاب الجنتہ اور اصحاب النّار اپنے کاموں اور ان کے نتیجوں میں ایک طرح نہیں ہوسکے۔ اصحاب الجنتہ ہی کامیاب ہونے والے ہیں۔]

موقع تفصیل کا نہیں۔ تقریباً ۸۰ مقامات پر اصحاب النار اور اصحاب الجنتہ کے اعمال و علائم اور آثار و نتائج بہ تفصیل بیان کیے گئے ہیں۔ پھر ان جماعتوں کے بھی

انتظاریہ

"انڈیا وِنز فریڈم" کے ان تیس [30] صفحات کا تعارف و تجزیہ

جو حال ہی میں منظرِ عام پر آئے ہیں

اور

مولانا آزاد کی رفیقۂ حیات زلیخا بیگم کی نوٹ بک کے چند اوراق

اُردو اکادمی دہلی
کے
اغراض و مقاصد

① دہلی کی لسانی تہذیب کے مشترکہ حصّے کے طور پر اُردو زبان اور ادب کا تحفظ اور ارتقا۔

② اُردو میں ادبی اور معیاری تصنیفات اور بچوں کی کتابوں کی اشاعت اور حوصلہ افزائی۔

③ اُردو میں ادبی اور سائنسی اور دوسرے موضوعات سے متعلق ایسی اہم کتابوں کے تراجم کا اہتمام کرنا جن کا ابھی تک اُردو زبان میں ترجمہ نہ ہوا ہو۔

④ اُردو میں حوالہ جاتی کتابوں کی تالیف و اشاعت۔

⑤ قدیم اُردو ادب کی صحیح ترتیب و تدوین کے بعد اشاعت۔

⑥ اُردو کے غیر مطبوعہ معیاری ادب پاروں کی اشاعت۔

⑦ اُردو کے مستحق مصنفین کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی اشاعت میں تعاون۔

⑧ گذشتہ ایک سال کے دوران مطبوعہ اُردو تصنیفات کے مصنفوں کو انعامات کی تقسیم۔

⑨ اُردو کے عمر رسیدہ اور مستحق مصنفین کی ماہانہ مالی اعانت۔

⑩ اُردو اسکالروں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے ایک مقررہ مدت کے لیے مالی اعانت کے ساتھ دوسری سہولتیں بہم پہنچانا۔

⑪ مشہور اسکالروں اور دوسری اہم شخصیتوں کو جلسوں کو خطاب کرنے کے لیے دعوت دینا۔

⑫ ادبی موضوعات پر سیمینار، سمپوزیم، کانفرنس اور نشستیں منعقد کرنا جن میں حالیہ ادبی رجحانات کے پس منظر میں اُردو کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہو اسی کے ساتھ اُردو کی تدریس اور اس کے استعمال سے متعلق سرکاری احکامات کی تعمیل و تکمیل کا جائزہ اور ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے مختلف ایسی ادبی اور تہذیبی تنظیموں کو مالی اعانت دینا جو کہ اسی طرح کی نشستیں منعقد کرتی ہیں لیکن یہ مالی اعانت ایک معاملے میں پانچ سو روپے سے زیادہ نہیں ہوگی۔

⑬ اُردو میں اعلیٰ معیار کے رسالے، جریدے اور اسی طرح کی دوسری مطبوعات کی اشاعت۔

⑭ اِن ضابطوں کے تحت مطبوعات کی فروخت کا اہتمام۔

⑮ اکادمی کے لیے منقولہ اور غیر منقولہ جائداد حاصل کرنا لیکن شرط یہ ہے کہ غیر منقولہ جائداد کے حصول سے پہلے دہلی انتظامیہ کی پیشگی منظوری ضروری ہوگی۔

⑯ اُردو کی تعلیم، اس کے استعمال اور سرکاری احکامات کی تکمیل میں حائل دشواریوں اور اُردو بولنے والوں کے مطالبوں کو دہلی انتظامیہ کے علم میں لانا۔

⑰ ایسے سبھی جائز اقدامات کرنا اور قانونی کارروائیاں کرنا جن سے مذکورہ مقاصد کے فروغ و تکمیل میں مدد مل سکتی ہو۔

⑱ سوسائٹی کی ساری آمدنی سوسائٹی کے اغراض و مقاصد کے حصول ہی کے لیے خرچ کی جائے گی۔



صوبوں کے گورنر بھی یہی سمجھتے تھے۔ اور مسلم لیگ کی رپورٹ نے سمجھدار لوگوں کو بالکل متاثر نہیں کیا۔

مسلم لیگ نے اقلیتوں پر مظالم کی جو کہانیاں پھیلائی تھیں وہ قطعی طور پر من گھڑت تھیں، مگر اس وقت دو باتیں ایسی ہوئیں جن سے صوبائی کانگریس کمیٹیوں کے رویے کے سلسلے میں برے تاثرات پیدا ہوگئے۔ مولانا آزاد افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ بہار اور بمبئی دونوں صوبوں میں کانگریس اپنی قوم پرستی کے امتحان میں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئی۔ کانگریس نے ایک قومی تنظیم کے طور پر فروغ حاصل کیا تھا اور اس نے مختلف فرقوں کے لوگوں کو قیادت کے مواقع فراہم کیے تھے۔ لہٰذا بمبئی میں مسٹر نریمان مقامی کانگریس کے مسلّم قائد تھے۔ جب صوبائی حکومت کی تشکیل کا سوال سامنے آیا تو عام خیال یہ تھا کہ ان کے ریکارڈ اور مرتبے کے مطابق ان ہی سے قیادت کرنے کو کہا جائے گا مگر اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک پارسی چیف منسٹر ہوگا جب کہ کانگریس اسمبلی پارٹی میں اکثریت ہندو ممبروں کی تھی۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھی اس صورت حال سے اتفاق نہ کر سکے۔ ان کا خیال تھا کہ اس اعزاز سے کانگریس کے ہندو حلیفوں کو محروم کرنا غیر منصفانہ اقدام ہوگا۔ لہٰذا مسٹر بی۔ جی۔ کھیر کو آگے لایا گیا اور بمبئی میں انھیں کانگریس اسمبلی پارٹی کا لیڈر منتخب کر لیا گیا۔ جواہر لال جانتے تھے کہ لوگ ان کو سردار پٹیل کا نکتہ چیں اور مخالف سمجھتے ہیں۔ انھوں نے ایسی کوئی بات کرنا مناسب نہ سمجھی جس کے نتیجے میں سردار پٹیل کے دوستوں کو ان کی نکتہ چینی کا موقع ملتا۔ لہٰذا انھوں نے سردار پٹیل کی ہمنوائی کی اور نریمان کی اپیل مسترد کر دی۔ مولانا کا خیال ہے کہ وہ غالباً یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ وہ اپنے عہدے کے دوران سردار پٹیل پر الزام تراشی کی اجازت نہ دیں گے۔

ایسی ہی بات بہار میں بھی ہوئی۔ انتخابات کے وقت ڈاکٹر سید محمود صوبے کے اعلیٰ ترین قائد تھے۔ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جنرل سکریٹری بھی تھے۔ لہٰذا صوبے کے اندر اور باہر بھی ان کی ایک پوزیشن تھی۔ جب کانگریس نے مکمل اکثریت حاصل کر لی تو یہ بات طے شدہ سمجھی گئی کہ ڈاکٹر سید محمود کو لیڈر چنا جائے گا۔ اور صوبائی خود مختاری کے تحت وہ بہار کے چیف منسٹر ہوں گے لیکن ان کے بجائے شری کرشن سنہا اور انوگرہ نرائن سنہا کو جو سنٹرل اسمبلی کے ممبر تھے بہار واپس لایا گیا۔ اور انھیں چیف منسٹر بنانے کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ ڈاکٹر راجندر پرساد نے بہار میں وہی کردار ادا کیا جو بمبئی میں سردار پٹیل نے ادا کیا تھا۔ بہار اور بمبئی میں صرف یہ فرق تھا کہ جب شری کرشن سنہا نے وزارت بنائی تو ڈاکٹر سید محمود کو بھی کابینہ میں شامل کیا گیا۔ ان دو واقعات نے اس وقت بڑی بدمزگی پیدا کی۔ مولانا کہتے ہیں: "ان واقعات پر غور کرنے کے بعد میں یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کانگریس نے اپنے نظریات پر عمل نہیں کیا جن کا وہ اعلان کرتی تھی۔ افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ اس وقت تک کانگریس کی قوم پرستی اس مرحلے پر نہیں پہنچی تھی جہاں وہ فرقہ وارانہ تصورات سے گریز کر کے لیڈروں کا انتخاب اکثریت اور اقلیت کی تفریق کے بغیر استحقاق کی بنیاد پر کرتی۔"

احمد نگر جیل سے ڈاکٹر سید محمود کی رہائی کے سلسلے میں مولانا آزاد رقمطراز ہیں کہ "جب ڈاکٹر سید محمود (رہائی حاصل کرنے کے بعد) پٹنہ پہنچے تو اخبار نویسوں نے ان سے بات چیت کی۔ انھوں نے کہا کہ وہ نہیں جانتے کہ انھیں کیوں رہا کیا گیا ہے۔ ان کے اس بیان کا انتہائی غیر متوقع نتیجہ برآمد ہوا۔ حکومت نے ڈاکٹر سید محمود کے بیان کی تردید کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اخباروں کو وہ خط جاری کر دیا جو ڈاکٹر سید محمود نے احمد نگر سے وائسرائے کو بھیجا تھا۔ حکومت کی جانب سے وضاحت کی گئی کہ اس خط کی بنیاد پر ڈاکٹر محمود کو رہا کیا گیا ہے۔ مولانا لکھتے ہیں: "جب ہم نے احمد نگر جیل میں یہ خط پڑھا تو ہمیں غصہ بھی آیا اور رسوائی بھی محسوس ہوئی۔ ہم کبھی یقین نہ کر سکتے تھے کہ ڈاکٹر محمود اس طرح کا خط لکھ سکتے تھے اور ہمیں اس بات سے بے خبر رکھ سکتے تھے کہ وہ حکومت سے خط و کتابت کر رہے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انھوں نے انگریزی کے چند فقروں اور محاوروں کے سلسلے میں ہم سے مشورہ کیا تھا۔ جواہر لال کا اور میرا خیال تھا کہ وہ کوئی کتاب لکھ رہے ہیں اور کچھ فقروں کے صحیح استعمال کے سلسلے میں یقین حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات کبھی ہمارے دماغ میں نہیں آئی تھی کہ وہ وائسرائے کے نام معافی نامہ تیار کر رہے ہیں۔" اپنے خط میں ڈاکٹر سید محمود نے کہا تھا کہ "ہندوستان چھوڑ دو" قرارداد کی منظوری کے وقت ورکنگ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسوں میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ اس بات نے مولانا کو اور زیادہ حیرت زدہ کیا کیوں کہ وہ موجود تھے اور انھوں نے قرارداد پر بحث میں بھی حصہ لیا تھا۔ مولانا رقمطراز ہیں: "جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں اس واقعے سے ہم سب کو بڑی خفت ہوئی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ کوئی خط لکھیں گے اور اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ تھی کہ پٹنہ میں اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے وہ اس کا کوئی ذکر نہ کریں گے۔ شاید



۳۰ سال بعد

۲۲-۲-۵۸ — ۲۲-۲-۸۸

مولانا ابوالکلام آزاد کے انتقال کے سات ماہ بعد ستمبر ۱۹۵۸ء میں انڈیا ونس فریڈم کا مسودہ اورینٹ لانگ مین (ناشرین) کے حوالے کرتے ہوئے پروفیسر ہمایوں کبیر (مرحوم) نے ناشرین کو مطلع کیا تھا کہ مکمل کتاب کا مسودہ جس میں لگ بھگ تیس صفحات کا مزید مواد شامل ہوگا، مولانا آزاد کی تیسویں برسی کے موقعے پر ۲۲ فروری ۱۹۸۸ء کو اشاعت کے لیے دیا جائے گا۔

لگ بھگ ان تیس صفحات کے مواد کی اشاعت ملتوی کرنے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مولانا آزاد کچھ افراد اور واقعات پر اپنے خیالات کی اشاعت اس وقت نہیں کرنا چاہتے تھے۔ عام طور پر یہ خیال تھا کہ یہ تیس صفحات کتاب کے یک علیحدہ باب کی حیثیت رکھتے ہوں گے لیکن حال ہی میں مکمل کتاب کی اشاعت کے بعد یہ معلوم ہوا کہ ان تیس صفحات کو علیحدہ باب کی حیثیت حاصل نہیں ہے بلکہ ان کا تعلق مختلف شخصیات اور واقعات سے ہے اور یہ صفحات پوری کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں [illegible] تیس صفحات [illegible] چھوڑ [illegible] ہے۔

[illegible] سے [illegible] بالخصوص [illegible] احمد [illegible] ہے۔ [illegible] کے سلسلے میں ڈاکٹر سید محمود نے [illegible] ہے۔ [illegible]

کرنے کے بعد کے کچھ اقدامات کو بھی ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔

مولانا آزاد کا خیال ہے کہ سردار پٹیل نے جو کردار ادا کیا وہ ہمیشہ کانگریس کے اصولوں کے مطابق نہیں تھا۔

مولانا آزاد نہ صرف یہ کہ کرشنا مینن کو پسند نہیں کرتے تھے بلکہ انھیں حقارت کی نظر سے بھی دیکھتے تھے۔ ان کے خیال میں مسٹر مینن ناقابلِ اعتماد آدمی تھے۔ اور جب ۱۹۴۴ء میں جواہر لال نہرو نے مسٹر مینن کو اپنی کابینہ میں شامل کرنا چاہا تھا اس وقت مولانا آزاد نے اپنا استعفیٰ دے دیا تھا۔

مولانا آزاد کے خیال میں جواہر لال نہرو سے کچھ غلطیاں سرزد ہوئیں جو اگر نہ ہوتیں تو ملک تقسیم نہ ہوتا۔

مولانا آزاد رقمطراز ہیں کہ صوبائی مختاری کے اعلان کے بعد ہونے والے پہلے الیکشن میں کانگریس زبردست کامیابی حاصل کی [illegible] ہیں [illegible] [illegible] ملک کی [illegible] حکومت [illegible] سوال پر شدید اختلاف [illegible] پیدا ہو گیا۔ در اثنا تمام صوبوں میں غیر کانگریسی اور چند صوبوں میں کانگریس مخالف عناصر کی عبوری وزارتیں عالم وجود میں آگئیں اور اس طرح رجعت پسند طاقتوں کو دوبارہ اپنے پاؤں مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ کانگریس کے ذریعے صوبوں میں حکومت نہ بنانے کی خاص وجہ یہ دلیل تھی کہ چوں کہ مخصوص اختیارات گورنر کو حاصل ہوں گے اس لیے صوبائی خود مختاری محض ایک ڈھکوسلہ ہوگی۔ کافی بحث و مباحثہ اور غور و خوض کے بعد بالآخر کانگریس نے حکومت بنانے کا فیصلہ کر لیا اور پہلے اس نے ان صوبوں میں حکومت بنائی جہاں اُسے پارلیمانی اکثریت حاصل تھی۔ پھر ان صوبوں میں حکومت بنائی جہاں [illegible] اسمبلی میں سب سے بڑی واحد پارٹی کی حیثیت حاصل تھی [illegible] حکومت بنا [illegible] تھا کہ کانگریس [illegible] اس لیے یہ کانگریس کا امتحان تھا اور لوگ [illegible] پوری [illegible] اپنے [illegible] بلکہ یہ [illegible] قائم [illegible] کانگریسی وزارتیں [illegible] مظالم ڈھا رہی ہیں۔ اس نے ایک کمیٹی قائم کی۔ اس نے ایک رپورٹ پیش کی اس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں سے کانگریس کے غیر منصفانہ سلوک کے سلسلے میں سرخ رنگ کے الزامات لگائے گئے تھے۔ یہ الزامات بالکل بے بنیاد تھے۔ وائسرائے اور مختلف

پروانہ ردولوی

[illegible]



خاں کانگریس کی حمایت سے چیف منسٹر تھے اور وہ قدرتی طور پر اس کے زیرِ اثر آ گئے تھے۔ جواہر لال کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ اکثریتی پارٹی بنے بغیر حکومت میں کانگریس کا شامل ہونا درست نہیں تھا۔ اس کے نتیجے میں کانگریس کو سمجھوتے اور اپنے اصولوں کا سودا کرنا بھی پڑ سکتا ہے۔ میں نے اس کی تردید کی اور کہا کہ کانگریس کے لیے اپنے اصولوں سے ہٹنے کا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں نے یہ بھی کہا کہ اگر ورکنگ کمیٹی کو لاہور میں کیے گئے میرے فیصلے سے اتفاق نہ ہو تو وہ جو نئی پالیسی چاہے اختیار کر سکتی ہے۔ کانگریس نے حکومت میں رہنے کی کوئی گارنٹی نہیں دی تھی اور وہ جب بھی چاہے حکومت سے نکل سکتی ہے۔"

مولانا مزید تفصیل میں جاتے ہوئے کہتے ہیں:

"گاندھی جی نے میرے نظریات کی زبردست حمایت کی۔ انھوں نے کہا کہ پنجاب میں کانگریس اقلیت میں ہے مگر اس نے وزارت کی تشکیل اور کارکردگی میں فیصلہ کن مقام حاصل کر لیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کانگریس کے نقطۂ نظر سے اس سے بہتر کوئی اور حل نہیں ہو سکتا۔ وہ میرے ذریعے کیے گئے فیصلے میں کسی بھی تبدیلی کے خلاف تھے۔ جب گاندھی جی نے واضح طور پر اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تو ورکنگ کمیٹی کے تمام دوسرے ممبروں نے میری حمایت کی اور جواہر لال کو بھی اس سے متفق ہونا پڑا۔" ورکنگ کمیٹی کے سامنے جو دوسرا سوال آیا وہ کیبنٹ مشن سے مذاکرات کا تھا اس وقت تک حکومت سے ہونے والی ہر بات چیت میں کانگریس کا صدر ہی تنظیم کی نمائندگی کرتا رہا تھا جب ۱۹۴۲ء میں اسٹیفورڈ کرپس آئے تھے اس وقت خود جواہر لال جی نے تجویز رکھی تھی کہ کانگریس کی نمائندگی صرف مولانا آزاد کریں گے شملہ کانفرنس میں بھی مولانا ہی واحد نمائندہ تھے اور گاندھی جی تک نے بات چیت میں حصہ نہیں لیا تھا۔ مگر مولانا کے بقول" اس بار جواہر لال نہرو نے دوسرا رُخ اختیار کیا کہ کیبنٹ مشن سے بات چیت ورکنگ کمیٹی کی ایک چھوٹی سب کمیٹی کرے اور کوئی واحد شخص نمائندہ نہ ہو۔"

مولانا لکھتے ہیں: "ان کی تجویز نے مجھے حیرت میں ڈال دیا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ جواہر لال اس طرح کا کوئی سوال اٹھائیں گے۔ چوں کہ میں نے یہ محسوس کیا کہ اب اعتماد کا سوال پیدا ہو گیا ہے اس لیے ان کی مخالفت کی۔ میں نے یاد دلایا کہ اب تک صدر کانگریس ہی تنظیم کا واحد نمائندہ ہوا کرتا تھا اور اب اس طریقے کو تبدیل کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے اگر ورکنگ کمیٹی کا خیال ہو کہ مروجہ طریقے کو بدلنا ضروری ہے تو وہ یقینی طور پر اپنے خیال کو عملی شکل دینے کی مجاز ہے لیکن میں کسی ایسے فیصلے میں فریق نہ بنوں گا۔ درحقیقت میں اسے کانگریس کے صدر کی ذمہ داریوں میں تخفیف سے تعبیر کروں گا۔"

مولانا مزید لکھتے ہیں: "اس موقعے پر بھی گاندھی جی نے میری حمایت کی۔ انھوں نے واضح طور پر کہا کہ انھیں کسی تبدیلی کی ضرورت نظر نہیں آتی اگر کرپس اور واول سے بات چیت میں صدر کانگریس واحد نمائندہ ہو سکتا ہے تو اب کوئی تبدیلی کیوں کی جائے۔ اگر اب کیبنٹ مشن سے بات چیت کے لیے کوئی کمیٹی بنائی گئی تو یہی تاثر لیا جائے گا کہ کانگریس کے صدر میں اعتماد کی کمی ہے۔ تجربے سے بھی یہ ظاہر ہو چکا ہے کہ صدر کانگریس سے بہتر کوئی اور نمائندہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اس مرحلے پر کسی کمیٹی کی تقرری سے کوئی مدد نہ ملے گی۔ بلکہ کانگریس اور عام لوگوں کی صفوں میں الجھن پیدا ہو جائے گی۔"

۱۹۴۶ء میں کیبنٹ مشن کی ہندوستان میں آمد۔ وزارتوں کی تقسیم اور فرقہ وارانہ مسئلے کے حل کے سلسلے میں اپنے خیالات ظاہر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے کانگریس کی صدارت سے اپنی سبکدوشی کے ضمن میں لکھا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ نیا صدرِ کانگریس کوئی ایسا شخص بنے جو ان کی پالیسیوں کو آگے بڑھا سکے۔ اسی خیال سے انھوں نے سردار پٹیل کے نام کی مخالفت کی اور کانگریسیوں سے اپیل کی کہ وہ اتفاق رائے سے جواہر لال نہرو کو صدر چُن لیں۔ اپنے اس فیصلے کے سلسلے میں مولانا آزاد نے اب شائع ہونے والے ان تیس صفحات میں لکھا ہے۔" میں نے اپنے بہترین اندازے کے مطابق عمل کیا لیکن اس کے بعد جس طرح کے حالات رونما ہوتے ان کے نتیجے میں میں نے محسوس کیا کہ یہ میری سیاسی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے اپنے کسی بھی اقدام پر اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا کہ اس نازک مرحلے پر کانگریس کی صدارت سے سبکدوش ہونے کے فیصلے پر ہوا۔ یہ ایک غلطی تھی جو گاندھی جی کے لفظوں میں ہمالیائی غلطی کہی جائے گی۔ میری دوسری غلطی یہ تھی کہ جب خود میں نے کھڑے نہ ہونے کا فیصلہ کر لیا تو سردار پٹیل کی حمایت نہ کی ہمارے درمیان کئی معاملوں میں اختلاف تھا مگر مجھے یقین ہے کہ بطور صدرِ کانگریس اگر وہ میرے جانشین بنتے تو کیبنٹ مشن پلان پر کامیابی سے عمل کراتے۔ ان سے جواہر لال والی غلطی کبھی نہ ہوتی جس نے مسٹر جناح کو پلان کا ستیاناس کرنے کا موقع دے دیا۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں نے یہ غلطی نہ کی ہوتی تو شاید آخری دس برسوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی تو میں خود کو معاف نہیں کر سکتا۔" ان صفحات میں مولانا آزاد نے ۱۰ جولائی ۱۹۴۶ء کو ایک کانفرنس میں جواہر لال نہرو کے اس اخباری بیان کی تفصیل درج کی ہے جو انھوں نے لکھنؤ میں دیا تھا۔ مولانا آزاد

ان کا یہ خیال تھا کہ وائسرائے کے نام ان کا خط صیغۂ راز میں رہے گا۔ جب حکومت نے ان کا خط شائع کر دیا تو وہ بہت گھبرائے اور گاندھی جی سے ملنے آئے ان سے بات چیت کے بعد ڈاکٹر محمود نے یہ بیان جاری کیا کہ انھوں نے خط تو لکھا تھا مگر اسے طویل عرصے تک وائسرائے کو نہیں بھیجا گیا۔ درحقیقت وہ ذہنی طور پر یہ طے نہیں کر سکے تھے کہ انھیں یہ خط بھیجنا چاہیے یا نہیں۔ اس پس و پیش کے عالم میں انھوں نے قرآن سے تین بار فال نکالی اور ہر بار ان کی نظر اس آیت پر پڑی جس میں حکم دیا گیا تھا کہ انھیں اپنی خواہشات کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر محمود نے اپنے بیان میں کہا کہ اسے انھوں نے باری تعالیٰ کا اشارہ سمجھا اور وائسرائے کو خط بھیج دیا۔ مولانا کو ان کی یہ وضاحت ان کے عمل سے زیادہ عجیب لگی۔ مولانا کہتے ہیں: ”اپنی حرکت کی ذمہ داری اللہ پر ڈالنے کے باوجود معاملے میں کوئی سدھار نہیں آیا۔“

گاندھی جی اس طرح کے ہر معاملے میں بہت فراخ دل تھے۔ ڈاکٹر سید محمود نے جب ان سے مل کر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تو انھیں ڈاکٹر محمود پر ترس آ گیا اور انھوں نے یہ بیان دے دیا کہ ڈاکٹر سید محمود کے لیے یہ مناسب نہ تھا کہ جیل میں اپنے دوستوں کو بتائے بغیر اس طرح کا خط وائسرائے کو لکھتے مگر ہندوستان کے لوگوں کو چاہیے کہ ان کے اعتراف کو مدنظر رکھ کر ان کے بارے میں زیادہ سخت رویہ نہ اختیار کریں۔

مولانا آزاد نے ان تیس صفحات میں شملہ کانفرنس کی ناکامی کے بعد ڈاکٹر سید محمود کے ذریعے جاری کیے گئے ایک بیان کا بھی ذکر کیا ہے لکھتے ہیں: ”انھوں نے (ڈاکٹر سید محمود نے) بنارس میں جاری کیے گئے اپنے ایک بیان میں کانفرنس کی ناکامی کا ذمہ دار مجھ کو ٹھہرایا۔ ان کا بیان تھا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی مسلم لیگ کے مطالبات تسلیم کرنے پر تیار ہو گئی تھی مگر میری مخالفت کی وجہ سے کانگریس نے اپنی پوزیشن بدل دی اور لیگ کے مطالبات ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ بالکل غلط بات تھی۔ مجھے افسوس ہوا کہ ڈاکٹر محمود نے اس طرح کا بیان جاری کیا۔ وہ جانتے تھے کہ بڑی مشکل سے رام گڑھ کانگریس کے بعد میں انھیں اپنی ورکنگ کمیٹی میں لے سکا تھا۔ معافی مانگ کر احمد نگر فورٹ سے رہائی حاصل کرنے کے بعد انھیں ورکنگ کمیٹی میں شامل کرنے پر میرے کچھ ساتھیوں نے مجھ پر طنز کیا تھا۔ ڈاکٹر محمود کا خیال تھا کہ چوں کہ انھوں نے یہ بے بنیاد الزامات مجھ پر لگائے ہیں اس لیے میں بہار کابینہ میں انھیں شامل نہ ہونے دوں گا۔ انھیں نہیں معلوم تھا کہ اس طرح کے معاملات میں میں نے کبھی ذاتی محسوسات کو اپنے کسی فیصلے پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ میں نے وائسرائے کو ان کے معافی نامے اور اپنے خلاف ان کے بیان پر بھی اظہار افسوس کیا تھا مگر ملک میں اس وقت کے حالات کے پیش نظر میں نے ان کی کمزوریوں کو نظر انداز کیا۔ بہر حال میں نے اپنے ذہن کو اس بات کے لیے تیار کر لیا تھا کہ حکومت سازی کے سلسلے میں صرف استحقاق پر نظر رکھی جانی چاہیے اور میں نے الزامات کو اپنے فیصلے پر اثر انداز نہ ہونے دیا جب فہرست تیار ہو گئی اور میں نے کانگریس اسمبلی پارٹی کے نام پڑھ کر سنائے تو صاف ظاہر تھا کہ ڈاکٹر محمود کو بڑی حیرت ہوئی اور فہرست میں اپنا نام دیکھ کر انھیں مسرت بھی ہوئی۔“

مولانا آزاد جواہر لال کو دل سے چاہتے تھے۔ مگر ان کا خیال ہے کہ کچھ لوگ جواہر لال سے ان کے تعلقات کو خراب کرنے کے درپے تھے۔ جواہر لال نظریاتی آدمی تھے اس لیے مخالفین نے نظریات کا سہارا لے کر انھیں مولانا کے خلاف کرنے کی کوشش کی انھوں نے جواہر لال جی سے مل کر کہا کہ یونینسٹ پارٹی سے کانگریس کا اتحاد اصولی طور پر غلط ہے۔ انھوں نے یہ دلیل دی کہ مسلم لیگ ایک عوامی تنظیم ہے اس لیے کانگریس کو مسلم لیگ سے مل کر پنجاب میں حکومت بنانی چاہیے نہ کہ یونینسٹ پارٹی سے اتحاد کرکے۔ مولانا لکھتے ہیں: ”کمیونسٹوں نے کھل کر اس نظریے کی تبلیغ کی تھی۔ جواہر لال ان کے نظریات سے جزوی طور پر متاثر تھے اس لیے انھوں نے سوچا ہوگا کہ میں یونینسٹ پارٹی سے اتحاد کرکے بائیں بازو کے اصولوں کو قربان کر رہا ہوں۔ جو لوگ میرے اور جواہر لال کے درمیان خلیج پیدا کرنا چاہتے تھے۔ وہ ان سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ میری تعریف کا مطلب بشمول جواہر لال دوسرے کانگریسی قائدین کی تضحیک کے مرادف ہے۔ اگر خود ان کے اخبار نیشنل ہیرالڈ نے میری اتنی زیادہ تعریف اور توصیف کی تو جلد ہی کانگریس میں میرے مقابلے کا کوئی لیڈر نہ رہ جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان باتوں کا جواہر لال کے ذہن پر کس حد تک اثر ہوا مگر بمبئی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے دوران میں نے دیکھا کہ ہر معاملے میں انھوں نے میرے نقطۂ نظر کی مخالفت شروع کر دی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ پنجاب کے سلسلے میں میری پالیسی صحیح نہیں تھی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ میں نے کانگریس کا وقار گرایا ہے یہ سن کر مجھے حیرت بھی ہوئی اور افسوس بھی ہوا۔ پنجاب میں میں نے جو کچھ کیا تھا وہ یہ تھا کہ کانگریس کو حکومت میں شامل کرایا تھا جب کہ گورنر مسلم لیگ کی وزارت بنوانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ میری کوششوں سے مسلم لیگ الگ تھلگ ہو گئی اور کانگریس نے اقلیت میں ہونے کے باوجود پنجاب میں فیصلہ کن پوزیشن حاصل کر لی خضر حیات



کام دو بڑی پارٹیوں اور ریاستوں کی منظوری سے آگے بڑھے گا۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ اس کے فوراً بعد جواہر لال نے ایک بیان لکھنؤ میں دے دیا تھا جس نے جناح کو کیبنٹ مشن پلان کو پوری طرح مسترد کردینے کا موقع دیا۔ اس کے نتیجے میں مسلم لیگ ممبروں نے آئین ساز اسمبلی کا بائیکاٹ کردیا تھا اور سچ تو یہ ہے کہ لیگ عمومی طور پر کانگریس کی ہر بات کی مخالف تھی۔"

نئے صفحات میں مولانا آزاد نے مزید لکھا ہے کہ "دس سال بعد پچھلے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے مجھے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مسٹر جناح نے جو کچھ بھی کہا تھا اس میں جان تھی۔ کانگریس اور لیگ دونوں ہی معاہدے میں شامل تھیں اور مرکز صوبوں اور گروپوں کے مابین تقسیم ہی کی بنیاد پر لیگ نے پلان منظور کیا تھا کانگریس نے شبہات پیدا کرکے دانشمندی کی بات نہیں کی اگر وہ ہندوستان کے اتحاد کی خواہاں تھی تو کسی حیل و حجت کے بغیر اسے پلان کو منظور کرلینا تھا شکوک و شبہات نے مسلم لیگ کو ہندوستان کے بٹوارے کا موقع فراہم کردیا۔"

نئے صفحات میں مولانا آزاد نے مسٹر کرشنا مینن کی سخت نکتہ چینی کی ہے اور پنڈت جواہر لال کے نقطۂ نظر میں تبدیلی کی ذمہ داری ان پر بھی ڈالی ہے اس سلسلے میں وہ رقمطراز ہیں کہ "ہم سب اپنے معترفین کو پسند کرتے ہیں۔ مگر شاید جواہر لال نہرو دوسروں کے مقابلے میں انھیں زیادہ ہی پسند کرتے ہیں۔ کچھ عرصے بعد تیسرے دہے کے آغاز میں لیبر پارٹی نے مس ایلن ولکنسن کی قیادت میں ایک وفد ہندوستان بھیجا۔ مسٹر مینن اس وفد کے ساتھ ہندوستان آئے وہ لندن میں انڈیا لیگ کی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتے تھے۔ اس عرصے میں ان کے تعلقات خاص طور پر ان لوگوں سے تھے جن کو کمیونسٹ یا ان کے ہم نوا سمجھا جاتا تھا۔ جب جواہر لال دوبارہ لندن گئے تو کرشنا مینن نے اپنے روابط کی تجدید کی اور جواہر لال کے لیے اپنی وفاداری کا پھر اعادہ کیا۔ جب جنگ چھڑی تو کرشنا مینن نے مشورہ دیا کہ انھیں سرمایہ فراہم کیا جائے تاکہ لندن میں ہندوستان کی طرف سے پروپیگنڈہ مہم چلا سکیں۔ جب ہٹلر نے روس پر حملہ کردیا تو انھوں نے لندن میں روسی سفارت خانے سے رابطہ قائم کیا۔ انھوں نے ہمیں بہت سے پیغامات بھیجے جن میں کہا کہ وہ جواہر لال کے ذاتی نمائندے کی حیثیت سے سوویت سفیر سے ملاقاتیں کررہے ہیں۔ انھوں نے ہندوستان کے دوستوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے ہر طرح کی تجاویز بھیجیں انھوں نے کئی اسکیمیں بھی تیار کیں اور کانگریس سے سرمائے کی فراہمی کے لیے کہا۔ جواہر لال ان سے متاثر تھے اور انھوں نے مجھ سے کچھ رقم منظور کرنے کو کہا۔ میں نے رقم فراہم کردی اور معاملہ ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش کیا۔ گاندھی جی اور سردار پٹیل نے کھل کر مجھ سے کہا کہ انھیں میرا یہ اقدام پسند نہیں آیا مگر وہ مزید کچھ نہ کہیں گے کیونکہ میں نے نیک نیتی سے رقم ادا کی ہے۔ لیکن انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں مزید ادائگیاں نہ کروں۔ انھوں نے کہا کہ لندن میں مقیم ہندوستانیوں میں کرشنا مینن کے بارے میں شدید اختلاف رائے ہے۔ ان کے کچھ حمایتی ہیں مگر ایک زبردست حلقہ ان کے خلاف ہے جو ان پر ہر طرح کے الزامات لگاتا ہے۔ میں نے عام تاثر یہ لیا کہ ان کا رویہ نقائص سے پاک نہیں ہے اس لیے میں ان پر پوری طرح بھروسہ نہ کرسکا۔ بعد کے واقعات نے یہ ثابت کردیا کہ کرشنا مینن پر گاندھی جی اور سردار کا شبہ درست تھا۔ ان کے خلاف کم سے کم بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ وہ ناقابلِ اعتماد شخص تھے اور بڑی بے قدری سے پبلک فنڈ خرچ کرتے تھے مگر زیادہ تر لوگوں کا ان کے بارے میں بہت خراب نقطۂ نظر تھا اور وہ انھیں از سر تا پا بے ایمان آدمی سمجھتے تھے۔ جب عبوری حکومت قائم ہوئی تھی تو جواہر لال نے کرشنا مینن کو لندن میں ہائی کمشنر مقرر کرنا چاہا تھا۔ سردار پٹیل نے اس سے اتفاق نہ کیا تھا۔ حکومتِ برطانیہ نے بھی یہ مشورہ دیا تھا کہ ان کی تقرری مناسب نہ ہوگی۔ کیوں کہ انھیں کمیونسٹوں کا حلیف سمجھا جاتا ہے۔ لارڈ واول کے جانے کے فوراً بعد کرشنا مینن ہندوستان آئے اور جواہر لال کے پاس ٹھہرے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے فوراً اندازہ لگا لیا کہ کرشنا مینن جواہر لال کی کمزوری ہیں اور ان کے ذریعے جواہر لال پر اثر انداز ہوا جاسکتا ہے لارڈ ویول نے کرشنا مینن کی تقرری کی مخالفت کی تھی مگر لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ان کی سرپرستی کرنے کا فیصلہ کرلیا اور ان کو کئی بار وائسرائے ہاؤس میں مدعو کیا۔" مولانا آزاد طنزیہ انداز میں لکھتے ہیں: "کرشنا مینن کمیونسٹ نظریات رکھتے تھے مگر جب انھوں نے دیکھا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان کے تئیں دوستانہ روش پر عمل کرتے ہیں اور انھیں کوئی عہدہ دلانے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں تو وہ راتوں رات برطانیہ نواز بن گئے۔

انھوں نے برطانیہ کے لیے اپنے دوستانہ احساسات سے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو متاثر کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سوچا کہ ہندوستان کے بٹوارے کی اسکیم کو جواہر لال سے منظور کرانے کے سلسلے میں کرشنا مینن مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔" مولانا لکھتے ہیں: "مجھے یقین ہے کہ اس سوال پر کرشنا مینن نے جواہر لال کے ذہن کو متاثر کیا۔ جب کچھ عرصے بعد مجھے یہ معلوم ہوا کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لندن میں کرشنا مینن کو ہائی کمشنر مقرر کرنے کے سلسلے میں جواہر لال کو تعاون کی پیش کش کی ہے تو مجھے کوئی حیرت نہیں ہوئی۔"

رقمطراز ہیں کہ جب کچھ اخباری نمائندوں نے ان سے سوال کیا کہ آیا آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ذریعے قرارداد کی منظوری کے بعد کانگریس نے پلان کو من وعن منظور کر لیا ہے جس میں عبوری حکومت کی تشکیل بھی شامل ہے تو انھوں نے یہ حیرت انگیز جواب دیا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں تمام معاہدوں سے آزاد ہو کر داخل ہوگی اور جو صورت حال بھی پیدا ہوگی اس کا سامنا آزادی سے کرے گی۔ آگے چل کر مولانا آزاد نے لکھا ہے کہ مسلم لیگ نے محض دباؤ میں آ کر کیبنٹ مشن پلان منظور کیا تھا۔ قدرتی طور پر مسٹر جناح اس سے زیادہ خوش نہ تھے۔ انھوں نے لیگ کونسل کے جلسے میں اپنی تقریر میں واضح طور پر کہا تھا کہ وہ اس کی منظوری کی سفارش صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ اس سے بہتر کوئی چیز حاصل نہیں کی جاسکتی۔ ان کے سیاسی مخالفوں نے یہ کہہ کر ان کی نکتہ چینی شروع کردی تھی کہ وہ کوئی اچھا حل پیش کرنے میں ناکام ہوگئے ہیں۔ انھوں نے الزام لگایا تھا کہ انھوں نے (مسٹر جناح نے) آزاد اسلامی ریاست کا خیال ترک کردیا ہے۔ انھوں نے ان پر اس طرح کا طنز بھی کیا کہ اگر مسلم لیگ کیبنٹ مشن پلان کو منظور کرنے پر تیار تھی جو مسلمانوں کو علیحدہ ملک بنانے کے حق سے محروم کرتا ہے تو مسٹر جناح نے آزاد مسلم ریاست کے لیے اس قدر غل کیوں مچایا۔ مولانا لکھتے ہیں کہ ان واقعات کی روشنی میں مسٹر جناح کیبنٹ مشن سے مذاکرات کے نتائج سے زیادہ خوش نہ تھے۔

جواہر لال کا بیان ان کے لیے لمحۂ غنیمت ثابت ہوا اور انھوں نے فوراً یہ بیان جاری کردیا کہ صدر کانگریس کا بیان پوری صورت حال پر نظر ثانی کا متقاضی ہے۔ لہٰذا انھوں نے لیاقت علی خان سے لیگ کونسل کا جلسہ طلب کرنے کو کہا اور یہ بیان جاری کیا کہ مسلم لیگ کونسل نے دہلی میں کیبنٹ مشن پلان اس یقین دہانی کی روشنی میں منظور کیا تھا کہ کانگریس نے بھی اسے منظور کر لیا ہے اور یہ پلان ہندوستان کے آئندہ آئین کی بنیاد بنے گا۔ چوں کہ اب کانگریس کے صدر نے یہ بیان دے دیا کہ کانگریس آئین ساز اسمبلی میں اپنی اکثریت کے بل پر اسکیم کو بدل سکتی ہے اس لیے اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اقلیت اکثریت کے رحم وکرم پر ہوگی۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جواہر لال کے اعلان کا مفہوم یہ ہے کہ کانگریس نے کیبنٹ مشن پلان کو مسترد کردیا ہے لہٰذا وائسرائے کو چاہیے کہ وہ مسلم لیگ سے حکومت بنانے کو کہے جس نے پلان کو منظور کرلیا ہے۔

اس واقعے کے بعد مسلم لیگ نے ڈائریکٹ ایکشن کا منصوبہ بنایا اور ۱۶ر اگست کا دن راست اقدام کے لیے مقرر کردیا مسٹر جناح کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ جو چاہیں کریں۔ ۱۶ر اگست کو کلکتہ میں فسادات شروع ہوگئے' اور بے گناہوں کا خون بہنے لگا۔ مولانا آزاد کے خیال میں ۱۶ر اگست ۱۹۴۶ء کا دن صرف کلکتہ ہی کے لیے نہیں پورے ملک کے لیے تاریک دن تھا۔ حالات نے ایک ایسا موڑ اختیار کرلیا کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں مفاہمت ناممکن ہوگئی۔ مولانا آزاد اس سلسلے میں رقمطراز ہیں کہ "یہ ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم ترین المیہ تھا اور مجھے انتہائی دکھ کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اس صورت حال کی ذمہ داری سب سے زیادہ جواہر لال پر تھی۔ ان کے اس افسوسناک بیان نے کہ کانگریس؛ کیبنٹ مشن پلان میں ردو بدل کرنے کے لیے آزاد ہوگی۔ فرقہ وارانہ اور سیاسی سمجھوتے کے سوال کو دوبارہ کھڑا کردیا۔ مسٹر جناح نے ان کی غلطی سے پورا فائدہ اٹھایا اور شروع میں مسلم لیگ کے ذریعے کیبنٹ مشن پلان کی منظوری کے فیصلے سے گریزاں ہوگئے"۔

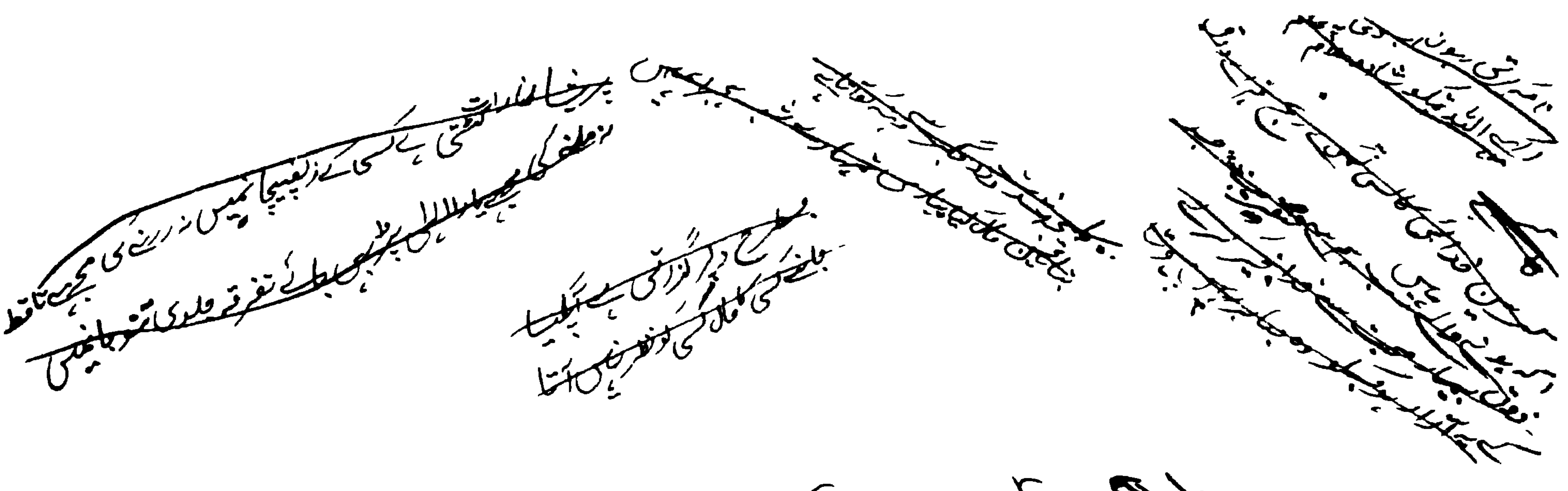
پنڈت جواہر لال کو اپنا عزیز ترین دوست اور ہندوستان کی قومی زندگی میں ان کی خدمات کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے ان تیس صفحات میں مولانا آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ "میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انھوں نے قومی کاز کو زبردست نقصان پہنچایا انھوں نے ۱۹۳۷ء میں بھی اسی طرح کی ایک غلطی کی تھی۔ ۱۹۳۵ء میں گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت جب پہلے انتخابات ہوئے تھے۔ ان انتخابات میں بمبئی اور یو۔پی کو چھوڑ کر مسلم لیگ کو ملک بھر میں زبردست دھکا لگا تھا"۔

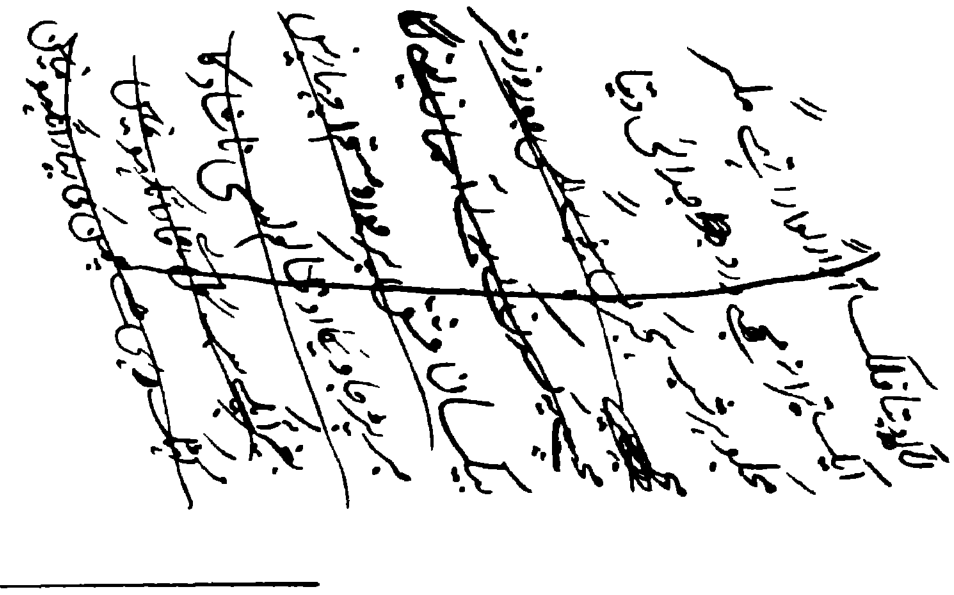
عبوری حکومت میں محکموں کی تقسیم کے سلسلے میں اختلاف رائے کا تفصیلی ذکر مولانا آزاد نے کیا ہے۔ اس اختلاف کا نتیجہ یہ تھا کہ خزانے کا محکمہ مسلم لیگ کو مل گیا۔ مولانا آزاد رقمطراز ہیں کہ "اس تجویز کو مسلم لیگ نے اپنے طویل المیعاد اور قلیل المیعاد دونوں ہی طرح کے مفادات کو مدِنظر رکھ کر منظور کیا تھا۔ درحقیقت مسٹر جناح نے غالباً یہ سوچا تھا کہ چوں کہ کانگریس نے عبوری حکومت کی تجویزیں نامنظور کردی ہیں جبکہ مسلم لیگ نے دونوں کو منظوری دے دی ہے اس لیے انھیں حکومت بنانے کی دعوت دی جائے گی۔ مگر جب وائسرائے نے یہ بیان دے دیا کہ چوں کہ نمائندہ عبوری حکومت بنانے کی کوششیں ناکام ہوگئی ہیں لہٰذا وہ افسروں کی ایک عارضی حکومت قائم کریں گے اور آئین ساز اسمبلی کے انتخاب کے بعد عبوری حکومت کی تشکیل کے لیے دوبارہ بات چیت شروع کریں گے۔ وائسرائے نے اس بات پر بھی مسرت کا اظہار کیا کہ آئین سازی کا

نوشتہ ہائے زلیخا بیگم

زلیخا بیگم مولانا آزاد کی وفا شعار شریک حیات تھیں۔ ان کی ایک نوٹ بک یا ڈائری مندرجہ بالا عنوان سے ان کاغذات میں مجھے دستیاب ہوئی ہے جو مولانا آزاد کے سیکریٹری مولوی محمد اجمل خاں مرحوم نے اپنی وفات سے چند روز قبل آئی سی سی آر کے "آزاد کلکشن" کے لیے مرحمت فرمائے تھے۔ اس ڈائری کے کچھ اوراق پر مرحومہ نے اپنے پسندیدہ اشعار نوٹ کیے ہیں جو زیادہ تر ہجر اور کیفیاتِ ہجر سے متعلق ہیں۔ ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مولانا کی سیاسی مصروفیات اور قید و بند کی زندگی نے انھیں بہت کم موقع دیا کہ وہ اپنی رفیقۂ حیات کی رفاقت کا حق ادا کر سکیں۔ کچھ صفحات پر مرحومہ نے ایک مضمون درج کیا ہے جو لڑکیوں کی اچھی تعلیم و تربیت پر زور دیتا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ مضمون کسی اور کا ہے اور انھوں نے ازراہِ پسندیدگی اسے اپنی نوٹ بک میں نقل کر لیا ہے، یا یہ خود انھی کا لکھا ہوا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ وہ عورتوں کی گھریلو اور سماجی زندگی کی خوشگواری کے لیے کن صفات کو ضروری سمجھتی تھیں۔

ذیل میں اس نوٹ بک کے چند اوراق کا عکس نمونتہً پیش کیا جا رہا ہے:





خواجہ منیر احمد
نگراں شعبۂ مخطوطات آئی سی سی آر لائبریری، آزاد بھون،
نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲



مولانا آزاد نے پہلے ایڈیشن میں ملک کی تقسیم کے اسباب، پاکستان کے قیام اور دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات کی تفصیل بیان کی تھی۔ دہلی میں مسلم کُش فسادات رکوانے کے لیے گاندھی جی نے برت رکھا تھا۔ برت کے پہلے دن جواہر لال، سردار پٹیل اور مولانا آزاد ان کے پاس بیٹھے تھے سردار پٹیل نے گاندھی جی سے کہا کہ ان کے برت کی کوئی منصفانہ بنیاد نہیں ہے اور ان کا طریقۂ کار یہ تاثر دیتا ہے کہ جیسے مسلمانوں کے قتل کی ذمہ داری سردار پٹیل پر ہے۔ اس کا جواب گاندھی جی نے بہت نرم انداز میں دیتے ہوئے کہا تھا کہ "میں چین میں نہیں ہندوستان میں ہوں۔ میری قوتِ بصارت اور قوتِ سماعت ضائع نہیں ہوئی ہے اگر تم میری اپنی آنکھوں اور کانوں کی گواہی پر یقین نہیں کر سکتے اور مجھ سے یہ کہتے ہو کہ مسلمانوں کے لیے شکایت کا کوئی جواز نہیں ہے تو میں یقیناً تم کو مطمئن نہیں کر سکتا اور نہ ہی تم مجھ کو مطمئن کر سکتے ہو۔ ہندو اور سکھ میرے بھائی ہیں۔ وہ میرا گوشت پوست ہیں اور اگر وہ اس وقت غصّے سے پاگل ہو گئے ہیں تو میں ان کو الزام نہ دوں گا مگر مجھے یقین ہے کہ میرا برت ان کی آنکھیں کھول دے گا۔"

نئے صفحات میں مولانا آزاد نے ان واقعات کے ضمن میں یہ باتیں کہی ہیں: "اس جواب سے سردار پٹیل ناراض ہو گئے اور انھوں نے تند لہجے میں گاندھی جی سے بات کی۔ ان کے رویّے سے مجھے اور جواہر لال کو دکھ ہوا اور ہم خاموش نہ رہ سکے۔ میں نے احتجاج کیا اور کہا 'ولبھ بھائی ہو سکتا ہے کہ تم اسے محسوس نہ کرو مگر ہم دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا رویّہ کتنا توہین آمیز ہے۔ اور آپ گاندھی جی کو کس قدر دکھ پہنچا رہے ہیں۔۔۔'" سردار پٹیل کے تناظر میں کتاب کے آخری باب میں مولانا آزاد نے ان نئی سطروں کا اضافہ کیا ہے۔

"ان تمام باتوں سے یہ واضح ہوتا تھا کہ سردار پٹیل گاندھی جی کے خلاف ہو گئے تھے۔ جب گاندھی جی نے مسلمانوں کے تحفظ کے سوال پر برت رکھا تو سردار پٹیل نے لاپروائی سے کام لیا۔ پٹیل کا خیال تھا کہ برت ان کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرے یہ کہنے پر بھی وہ نہ رُکے کہ وہ بمبئی نہ جائیں۔ ان کے رویّے کا مقامی پولیس پر بہت بدبختانہ اثر پڑا۔ مقامی حکام سردار پٹیل کی طرف دیکھتے تھے اور جب انھوں نے دیکھا کہ پٹیل نے گاندھی جی کی سلامتی کے لیے خصوصی حکم نہیں جاری کیا ہے تو انھوں نے کوئی خصوصی اقدام کرنا ضروری نہ سمجھا۔" گاندھی جی کی شہادت کے واقعے کے بعد کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا آزاد نے نئے صفحات میں لکھا ہے کہ "المیہ رونما ہونے کے بعد قدرتی طور پر غصّے کی لہر پیدا ہو گئی۔ کچھ لوگوں نے سردار پٹیل پر کافی انتظام نہ کرنے کا الزام لگایا بلکہ زیادہ سخت باتیں بھی کہیں۔ جے پرکاش نارائن نے اس سوال کو اُٹھانے میں قابلِ ذکر جرأت کا مظاہرہ کیا۔ گاندھی جی کی موت پر دہلی میں جو جلسہ اظہارِ تاسف اور اظہارِ غم کے لیے ہوا تھا اس میں جے پرکاش نارائن نے واضح طور پر کہا کہ حکومت ہند کا وزیرِ داخلہ اس قتل کی ذمّے داری سے بچ نہیں سکتا۔ انھوں نے سردار پٹیل سے اس سوال کا جواب دینے کو کہا کہ جب گاندھی جی کو قتل کرنے کے لیے لوگوں کو اکسانے کی غرض سے کھلا ہوا پروپیگنڈہ ہو رہا تھا اور ان پر ایک بم پھینکا بھی جا چکا تھا تو کوئی خاص اقدام کیوں نہیں کیا گیا۔" یہ ہے ان تیس صفحات کا خلاصہ جو حال ہی میں شائع ہوئے ہیں، لیکن ان نئی باتوں کو پوری کتاب سے الگ کر کے پوری طرح نہیں سمجھا جا سکتا بہتر ہو کہ قارئین انڈیا ونز فریڈم کا جدید مکمل ایڈیشن پڑھیں تاکہ تمام باتوں سے وہ اچھی طرح واقف ہو سکیں۔



یا الٰہی پھر ... دل ناشاد کی
آج پہلو سے صدا آتی نہیں فریاد کی
کیا شکایت میں کروں ظالم تری بیداد کی
دیکھ رہا ہے جل مگر عادت نہیں فریاد کی
زخم کی جا پر لیا بیداد نے تازہ ستم
ہنس دیا غنچہ جو کھلایا نے ذرا فریاد کی
بلبل ... پردہ ناخوش میں نالہ کیا
ہو گئی ... آزادی کی ہستی میں فریاد کی
بے زبانی منہ پایا دین گونگا ہوا
[illegible] خدا نے دی سزا لے بت تیری فریاد کی
نالہ کرتا ہوں میں پوشیدہ ذرا پردہ ساز
ساز کے پردے سے نکلے کی صدا فریاد کی
کہہ رہی ہے شمع رو رو کر زبان حال سے
سرکشی سو بار پہلو سے نہیں فریاد کی



بیٹھیں کیا تم میں اب ہم کہ لیا اگر رقیب نے
[illegible] شعلے ورنہ کلیجہ دبا بیٹھے ہیں

تیرے مریض کی تو سو علاج ہو لیکن
شفا نہ اوس کے نصیبوں میں ہو تو کیا کیجے

یہ کس ہوا میں وتاب و تواں داغ جا چکے
اب بھی جلنے والے ہیں سامان جا چکے

ما براہ پر املو

[illegible] نکلتی ... بر جان [illegible]
عندلیب نو گرفتار چمن گم کردہ ہم
[illegible] ... ہم
آشیانہ نہیں نہ غافل رہیں نشان چمن
[illegible] ہم جیسے دور سمجھتے تھے وہ ازیں
[illegible] باغ میں صیاد وہ بات آتا ہے
[illegible]

[illegible]
[illegible]

دیکھیں وہ ہیوں سوختہ قسمت کہ رہے پھر کے ہمن
شعلہ برق [illegible] درد جگر ہی سے روشن
داغ [illegible] آتش سوزاں ہے سو سینہ گلشن
[illegible] ہیں [illegible] ہو نا [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
سوزش غم نے کیا [illegible] میں فتور
جا ہے [illegible] میں مستور
مجھے پروا [illegible] کیا مغرور
گر گنہگار [illegible] مغفور
[illegible] وتاں پہ کرم
[illegible] کنعم

[illegible]
[illegible]
وہ لوں [illegible] نہیں کرتا
[illegible] نہیں کرتا

کونسا جھونکا بجھا دیگا کسے معلوم ہے
زندگی اک شمع روشن ہے ہوا کے سامنے

خوشگوار امیدیں اور دلی مسرتیں جو ماؤں کے دلوں میں ان کو بچوں
سے پیدا ہوتی ہیں سب کی سب خاک میں مل جاتی ہیں اگر ہم انکے گلشن
مسرت کے پھولوں سے ہرا بھرا دیکھا چاہتے ہیں تو انکے دلوں کو اچھے خیال
سبقوں اور مفید نصیحتوں سے اسقدر بھر دیں کہ انہیں برائیوں کی
نہ ہو سکے تاریخوں سے ظاہر ہے کہ [illegible] بچے اپنے والدین کے
ہت کا سبب ہوئے انکی مائیں شائستہ اور تعلیم یافتہ نہیں اگر مائیں
کبھی نیک اور پارسا ہیں اور باپ محض جاہل ناہموار اور کندہ
تو کوئی مضائقہ نہیں مائیں مائیں اپنی عمدہ رفتار حلم مروت جیسے
اخلاق کے چلتے جادو سے انہیں مسخر کرلینگی ہاں اگر وہ خود
ناشائستہ ہیں اور باپ میں زمانہ بھر کی خوبیاں کوٹ کوٹ کر
بھری ہیں تو بچے مشکل سے اچھے اور تربیت یافتہ نکلینگے گھر ایک ایسا
باغ ہے جہاں حرف نخل الف ہی میں ثمر نہیں آتے بلکہ شاد
عمدہ عادات و اطوار کے ایسے گل تر کھلاتے ہیں جنکی خوشبو سے سب
معطر رکھتی اور گھر بھر میں پھیلی رہتی ہے عورتوں کو تعلیم دینا گویا
پرستی پارسائی اور پاکبازی کا سبق دینا ہے ہم انکی تعلیم
نہیں کہ وہ میٹرک کرکے نوکریاں کریں یا علم کی متفرق شاخوں



ملن کی بہار ماؤں کے ہاتھ میں ہوتی ہے ایسی زمانہ سے وہ عادات و اطوار
بیل ڈالنی ہے بچپنے کے موسم میں جو باتیں دل و نہار بحث میں آتی ہیں
ام کر جاتی ہیں اور انکے پائدار اثر سے بچوں کی شام جوانی اور صبح پیری
خالی نہیں جاتی اور وہ بڑے بڑے کام جو دلی جذبات کی وجہ سے عمل میں
یا انکے دلوں میں گھر کر لیتے ہیں اور گویا بچپن کے زمیں ہو جاتے ہیں پھر اگر
ئد جاہل اور ناشائستہ ہیں تو اپنی اولاد کی کیا خبر لینگی ہر ذی ہوش
ہے کہ بچے بری باتوں کی جانب کسقدر جلد مائل ہو جاتے ہیں اور رجحان
ب دفعہ بگڑا پھر سمجھئے کہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے جاتا رہتا ہے اس
سے اسے محفوظ رکھنے کے لیے عورتوں کی تعلیم کی ضرورت ہے شائستہ
پڑھی لکھی عورتوں کا کام ہے کہ وہ بچوں کو نگاہ کے سامنے رکھیں
اچھی اچھی باتیں بتائیں بری باتوں سے نفرت دلوائیں اخلاق و تربیت
ں یہاں تک کے اسکا یقین ہو جائے کہ نصیحتوں نے اتنا اثر کیا کہ اب وہ
نہ پائینگے اور بری باتوں کے گو نہ جائینگے برائی کے بیج شروع ہی میں اگ گئے
اگر وہ اخلاقی زمین سے نکال کر دور نہ پھینک دئے جائینگے تو ایک
زمانہ میں انہیں سے برائیوں کا ایک انبار لگ جاتا ہے اور وہ

مولانا ابوالکلام آزاد کا باون ۵۲ برس پرانا ایک خط اپنے وقت کے مقبول شاعر ساغر نظامی کے نام

عزیزی! بادۂ مشرق دیکھ کر طبیعت نہایت خوش ہوئی۔ آپ نے اپنی طباعت میں بھی پوری شاعری کی ہے۔ گویا اس اعتبار سے بھی اسے شاعری ہی کا نمود سمجھنا چاہیے۔ اب اس پھول میں رنگ اور بو دونوں جمع ہو گئے!

زمانہ اردو شاعری سے مطالبے کر رہا ہے جو ابھی تک پورے نہیں ہوئے۔ نئی شاعری نشوونما پا رہی ہے کہ ان تقاضوں کا جواب دے۔ اگر آپ نے اس جوہر قابل کی حفاظت کی تو مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ اپنا مستقبل اپنے سے زیادہ فاصلہ پر نہیں پائیں گے۔ بادۂ مشرق اس مستقبل کا اعلان ہے۔

مجھے معلوم نہیں کتاب کی رفتار اشاعت کا کیا حال ہے! مگر میں ان تمام لوگوں سے جو اردو علم و ادب سے کچھ بھی رسم و راہ رکھتے ہیں سفارش کروں گا کہ اس خوبصورت مجموعہ کا ایک نسخہ ضرور لیں۔ والسلام

ابوالکلام

کلکتہ ۲۸ ۳۶ء

(بہ شکریہ محترمہ ذکیہ سلطانہ نیّر)

سے زیادہ خطائیں بیجا آرزوؤں، ناسزا خواہشوں اور خود پسندیوں کی بدولت

ہوتی ہیں اور بچپنے ہی میں آسانی کے ساتھ ان کی اصلاح ہو سکتی ہے کیونکہ

بچہ ماں کے بس میں ہوتا ہے وہ اسے جس طرف پھیرنا چاہے پھیر سکتی ہے جدھر موڑنی چاہے

موڑ سکتی ہے اگر ان اصول کی پیروی اور وہ رنگ طبیعت یا روش

اختیار کرے گا جو ابتدائی تربیت میں اسے اس کی ماں سکھاتی ہے

بدخوئیوں کی بلا سے محفوظ رہے گا تو پھر سمجھے گا پہلے اور بعد کو خوش اخلاق

[illegible] صفات ہوگا اور اس سے نیکیاں عمل میں آئیں گی

زلیخا　زلیخا　زلیخا

اس نوٹ بک کے پہلے صفحے پر مولانا آزاد کی بہن محترمہ آبرو بیگم کے قلم سے یہ عبارت درج ہے۔

[illegible]

1908

7072

5